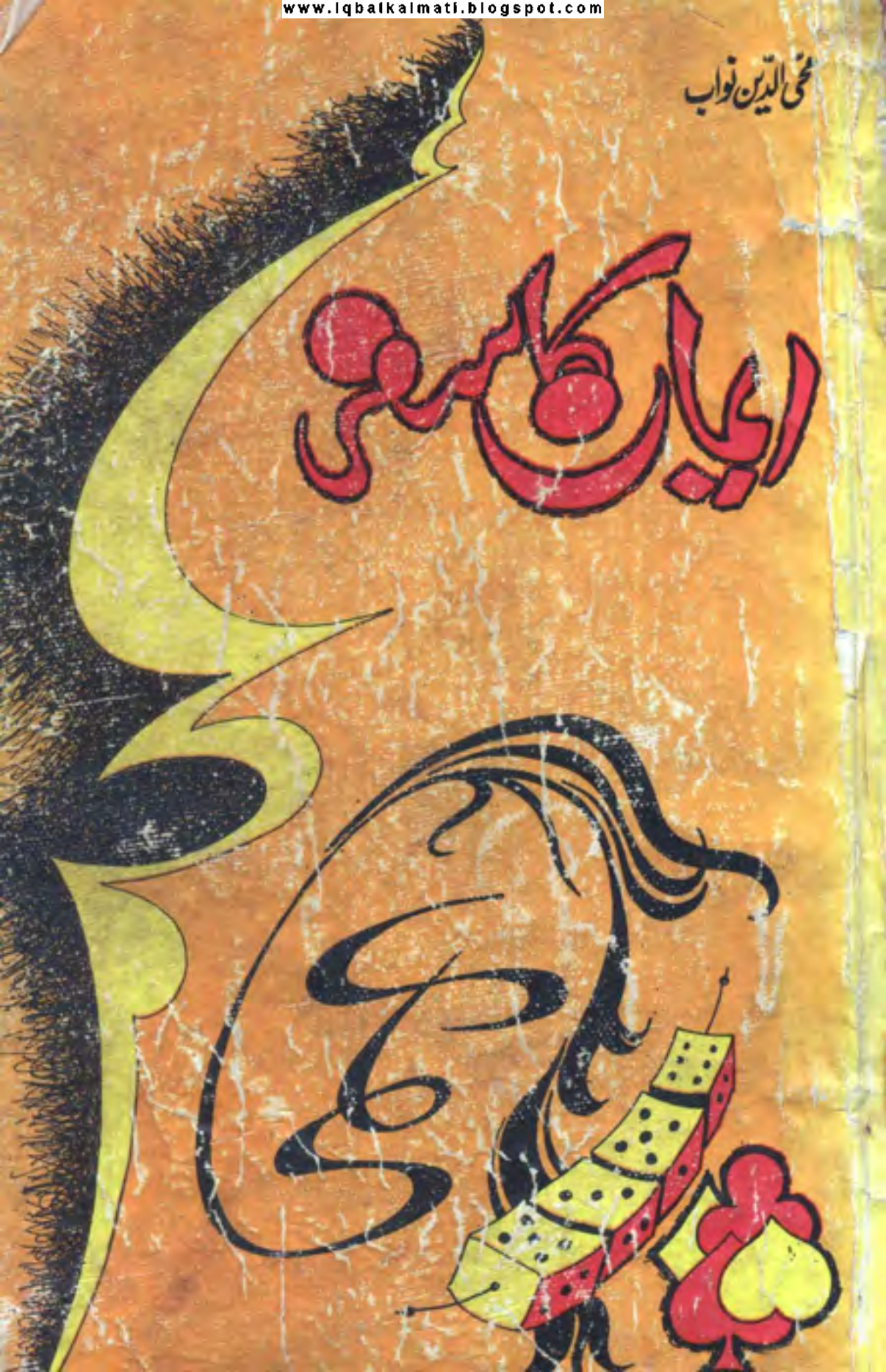


محمی الدین نواب

# ایمان کا معنی



## فہرست

9	ایمان کا سفر	1
107	چور رشتہ	2
147	سدا سہاگن	3
183	میٹھا زہر	4
213	آئینہ خانہ	5
261	آدمی کا باپ	6
293	یشیوں کے میما	7
335	جزیرے کی چاندنی	8
365	ممتا کی واپسی	9
437	کلی کا کفن	10

## حرف اول

محی الدین نواب ایک زندہ اور روشن ادب پیش کرنے والے قلمکار کا نام ہے۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جہاں جہاں اردو زبان کی کہانیاں پڑھی جاتی ہیں وہاں محی الدین نواب کو لوگ پڑھتے ہیں اور یاد رکھتے ہیں۔

اگرچہ زیرِ نظر کہانیاں پچھلے سالوں کے دوران ماہ بہ ماہ شائع ہو چکی ہیں۔ تاہم کتابی صورت میں انہیں اس لیے محفوظ کیا جا رہا ہے تاکہ آئندہ شائقین کہانیوں کے اس الم کو کھول کر پچھلے دور کے مزاج کو سمجھ سکیں۔ انسان پہلے بھی محنت کش تھا، اب بھی ہے۔ فرق صرف یہ ہو گیا کہ وہ پہلے مزدور تھا، اب مشین بن گیا ہے۔ خواہ غریب ہو یا سرایہ دار، سب ہی وقت کی رفتار کے ساتھ تیز رفتار بن گئے ہیں۔ اب ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ کہانیوں میں پیش کیے جانے والے مناظر کی تفصیلات ٹھہر ٹھہر کر پڑھ سکیں۔ وہ اپنے حالات کو اپنی تیز رفتاری کے مطابق پڑھنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نواب اس معاشرے کی کسی بھی ٹیڑھی رگ کو اپنی کہانی کا موضوع بنانا ہے تو لمبے کی گری اور روانی کی طرح تیزی سے اپنے پڑھنے والوں کو اس ٹیڑھی رگ کے آس پاس پنچا رہتا ہے۔

عمر کی چٹکی آدی کو بے حد سنجیدہ بنا دیتی ہے پھر اس میں شوخی برائے نام رہ جاتی ہے۔ نواب نے اپنی عمر کے پچاس برس گزار دیے ہیں۔ نصف صدی کا چہرہ دیکھا ہے۔ زندگی کے بے شمار طعنے کھائے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم، قحط بنگال اور قیام پاکستان ایسے تاریخی موڑ آئے جب وہ آگ اور خون کے دریاؤں سے گزرنا رہا۔ ان حالات میں آدی ضرورت سے زیادہ سنجیدہ اور خشک مزاج ہو جاتا ہے لیکن نواب کی تحریر کی شوخیاں شاید ہیں کہ وہ کانٹوں کے ہنر سے کلاب کی شوخی رنگارنگی اور خوشبو نچوڑتا ہے اور اسے اپنے پڑھنے والوں تک پہنچاتا ہے۔

حالات نے اسے اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ تحریر کا فن حاصل کرنے کے لئے کسی استاد کے آگے زانو ادب نہ کرنا۔ اس نے اپنے بزرگوں اور ہم عصروں کو پڑھ کر یہ مقام حاصل کیا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور، پریم چند، نالدا، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، رابندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی وغیرہ اس کے غائبانہ استاد ہیں۔ زندگی بہت کچھ سکھاتی ہے لیکن ان ادیبوں نے اسے سماجی شعور کو قلم کی نوک سے برستے کا لیتھ سکھا دیا ہے۔

نواب کے پاس نہ خیالات کی کمی ہے اور نہ الفاظ کی۔ لکھتے لکھتے نواب کا ہاتھ تھک جاتا ہے اور انگلیاں دکنے لگتی ہیں لیکن خیالات کی فراوانی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اسی لئے نواب کو شیپ ریکارڈر کی مدد لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ میری دانست میں نواب اردو کا وہ واحد مصنف ہے جو اپنی کہانی شیپ ریکارڈر پر شیپ کراتا ہے اور اس شیپ سے یہ کہانیاں صفحہ قرطاس پر منتقل ہوتی ہیں۔

نواب کی ایک اور خصوصیت اس کے کرداروں کی مانوسیت ہے۔ یہ کردار آفاقی یا تخیلی نہیں بلکہ زندہ اور مجسم ہیں۔ ہمیں اپنے ارد گرد چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ نواب قارئین کو خواب دکھانے کا معلوم دنیا میں لے جانے کا قطعاً قائل نہیں۔ نواب کی باریک بین نگاہیں جس طرح معاشرے اور افراد کا مشاہدہ کرتی ہیں۔ اور ذہن ان کا تجزیہ کرنا ہے وہی زبان قلم قارئین کے سامنے آجاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بہت مختصر سے عرصے میں نواب کی تحریر کی دھوم مچ گئی ہے اور اس نے ہر خاص و عام سے قبولیت کی سند حاصل کر لی ہے۔ موجودہ کہانیاں اگر آپ پہلے پڑھ چکے ہیں، .... بارہ پڑھنے میں ایک نیا لطف محسوس کریں گے اور اگر پہلے نہیں پڑھ چکے تو آپ کو افسوس ہو گا کہ اتنی خوبصورت کہانیوں سے آپ اب تک کیوں محروم رہے۔

معراج رسول

## انتساب

اپنے جواں مرگ بیٹے جمیل الدین نواب کے نام

بیٹے!

تمہاری ماں اپنی مردہ کوکھ کے کتبے سے سر ٹپکے ابھی تک رو رہی ہے۔ وہ تخلیق کے کرب کو نہیں بھولے گی۔ روتے روتے ایک دن مر جائے گی۔  
مگر میرے پاس آنسوؤں کے لیے زیادہ جگہ نہیں ہے۔ میں تمہارے بعد زندہ رہوں گا۔ اس بڑھاپے میں ان سے لڑتا رہوں گا جو تمہاری چھوڑی ہوئی دنیا کی خوبصورتی کو مٹانا چاہتے ہیں۔

محی الدین نواب

## ایمان کا سفر

”میں ایک مسافر  
سماج کے چکلے سے  
برہنہ پا گزر رہا ہوں  
اس لیے کہ ہزار ہا صدی سے  
کائناتوں کی راہ گز سے  
ایمان گزر رہا ہے۔“

”مسافر تم کون ہو؟“

ایمان علی نے اپنے خشک ہونٹوں کو زبان سے بھگوٹے ہوئے اپنا نام بتایا۔ اس اجنبی نے سر ہلا کر کہا۔

”تم حملے سے مولوی نظر آتے ہو، تمہارا نام بھی ایمان علی ہے۔ اور ایمان مسجد کے دروازے پر ہی آتا ہے۔ کیا تم نماز پڑھاؤ گے؟“

## ایمان کا سفر

اس کا نام ایمان علی رکھتے وقت اس کے باپ کے دو بیٹے گمان میں بھی یہ بات نہ ہوئی کہ وہ اس قدر ایمان دار نکلے گا۔ وہ ایسا ایمان دار تھا کہ سچ بول بول کر اپنی کو دشمن بنا چکا تھا اور رزق حلال کے انتظار میں کئی کئی وقت فالتے کرتا رہتا تھا۔ ایمان اچھی چیز ہے نہ، اگر اس سے منافع حاصل ہو۔ مگر جہاں نقصان اٹھانا پڑتا وہاں بھی وہ ایمان ہی کی بات کرتا تھا۔ یہ آئے دن کی ایمانداری اسے ایک بے مصرف سوکھے پتے کی طرح اودھ سے اودھ اڑائے پھر رہی تھی۔

وہ سوکھا چتا حالات کے تھپیڑے کھاتا ہوا، شاہ پور کی ایک مسجد کے دروازے پر آکر کے لیے کھڑے ہونے کے قابل ہو جاؤ۔ ”نماز کے لیے کھڑے ہونے کے لیے کھانے کا نہیں، ایمان کی ضرورت ہوتی ہے۔ نمازی نہ رہے۔“ وہ پچھلی شام سے فالتے کرتا آ رہا تھا۔ صحت پہلے ہی ماشاء اللہ تھی، پاپی پیتا تو وہ بھی خالی پیٹ میں ہلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ تھوک ٹھکانا چاہتا تو حلق میں کانٹے پیچھے خواہش کروں گا۔

گلتے۔ اس کا سر پکرا رہا تھا، وہ بے دم ہو کر کہیں کر جانا چاہتا تھا لیکن ایمان والے کو کرنے کے لیے بھی کسی پاک صاف جگہ کی ضرورت تھی لہذا وہ مسجد کے دروازے پر آکر۔ جہاں انسان روٹی کھاتے کھاتے زندہ رہتا ہے اور روٹی کھاتے کھاتے مر جاتا ہے، وہ اس حق کرنے کے بعد بھی اس میں اتنی قوت برداشت تھی کہ وہ ہوش میں تھا۔ ایسی حالت مرتے مرتے بھی روٹی کے بجائے نماز کی تمنا کر رہا تھا۔

میں انسان روٹی اور صرف روٹی کے متعلق سوچتا ہے۔ اگر روٹی نہ ملے تو وہ کسی کے مکان کا دروازہ توڑ کر وہ روٹیاں حاصل کرنا چاہتا ہے جو بھوسی ٹکڑے کے لیے چھوڑ دی جاتی ہیں۔ لیکن وہ کسی مکان کا دروازہ دیکھنے کے بجائے مسجد کے دروازے کو ہی دیکھ رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا۔

یہ دروازہ بند کیوں ہے؟ نماز کا وقت ہو چکا ہے، نمازی کہاں ہیں؟ یہ مسجد ویران کیوں ہے؟ یہ تمام سوالات اس کے ذہن میں چکرار رہے تھے۔ اس کا سر بھی پکرا رہا تھا، ایسے ہی عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ مگر حمیس تو پیاس لگ رہی ہے، میں ابھی پانی لے کر آتا ہوں۔ یہ یو جالی، جب تک تم دروازہ کھولو۔“

وہ جالی دے کر پانی لینے چلا گیا۔ ایمان علی بڑی مشکل سے دیوار کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا پھر تھکا کھولنے لگا۔ وہ فقرو فالتے کا عادی تھا اس کے باوجود کبھی کبھی بھوک چٹکیاں دیتا تھا۔

لتی تھی جیسے کبھی کبھی بھولے ہوئے زخموں سے ہولے ہولے ٹیس اٹھتی ہیں۔ اسی ”میراثہ چوہدری برکت علی ہے“ میں یہاں زمیندار ہوں اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت کچھ ایمان کے ہاتھوں سے تھپک تھپک کر سلائی ہوئی بھوک اچانک ہڑپڑا کر بیدار ہو جاتی ہے۔ میرے دل میں ایمان کا جذبہ ہے اس لیے میں نے یہ مسجد بنوائی ہے۔“ اور پیٹ کی آتیں سکڑ کر اسے اور بھی تھامت سے آگے کی طرف سکڑتی دیتی تھیں۔ ایمان علی نے کہا۔

”دروازہ کھولنے کے بعد وہ تھامت سے جھٹکا اور ڈنگا تا ہوا مسجد میں داخل ہوا۔“ ”صرف مسجد ہی بنوائی ہے یا نماز بھی پڑھواتے ہو۔ اگر میں نہ آتا تو یہ مسجد اسی طرح کے پختہ فرش پر گر دیتی تھی اور سوکھے پتے اس کی طرح ادھر سے ادھر ڈنگا رہے ان رہ جاتی“ اور کراہتے ہوئے لڑکھڑاتے جا رہے تھے۔ اتنے میں وہ اجنبی اس کے لیے پانی لے آیا۔

”ننگے وقت اس کا حلق دکھ رہا تھا۔ وہ پیٹ میں پہنچ کر ٹھنڈک پہنچا رہا تھا مگر بھوک نہیں۔“ ایسی بات نہیں۔ کل تک یہاں ایک پیش امام رہتے تھے وہی نماز پڑھاتے تھے اور رہا تھا۔ ایمان علی نے سوچا کہ عصر کی نماز مختصر ہوتی ہے، نماز ادا کرنے کے بعد اس کے بچوں کو کوئی تعلیم بھی دیتے تھے لیکن پچھلے دنوں اس مولوی کے دل میں شیطان پیدا روئیاں مل جائیں گی۔ عصر کی مختصر نماز کے متعلق سوچتے ہوئے اچانک اسے اپنی ٹالیا۔ اسی جگہ اس دس برس کی بچی کو تعلیم دینے کے دوران اس نے ایسی ذالمت کا مظاہرہ کا احساس ہوا۔ عابد کو عبادت کا حساب نہیں کرنا چاہیے۔ عبادت کو ماننے اور توڑنا کہ جس کا ذکر ہم نہیں کر سکتے۔ بہر حال ہم نے اسے بری طرح ذلیل کر کے نکال دیا مطلب یہی ہے کہ تھوڑی دیر بعد ملنے والی روٹی کو عبادت کے برابر اہمیت دی جا رہی ہے۔ ہم میں سے کوئی اس قابل نہیں ہے کہ پیش امام کے فرائض انجام دے سکے اسی لیے ”توبہ توبہ“

توبہ کرنے کے بعد اس نے چوڑے پر کھڑے ہو کر اذان دی۔ اذان دینے کے ایک جھاڑو اٹھا کر فرش صاف کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد چند نمازی آگئے۔ نئے مولوی اپنی شیطانی حرکتوں سے بچانا جاتا ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایک مولوی اپنی دیکھ کر انہوں نے سلام کرتے ہوئے اور مصافحہ کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ یہ بات سے دوسرے مولویوں کو بدنام کر دیتا ہے۔“

چوہدری برکت علی نے کہا۔ ”آپ بھوکے ہیں پہلے کچھ کھائیں بعد میں باتیں ہوتی رہیں گی۔“ ایمان علی نے سامنے رکھی ہوئی روٹیوں اور سالن کی پلیٹ کو دیکھا پھر سر اٹھا کر پوچھا۔ ”کیا آپ روٹی کھا چکے ہیں؟“

”جی ہاں“ ”کیا آپ کے پڑوسیوں نے کھالیا؟“

یہ سوال سن کر چوہدری برکت علی ذرا چکر اساکر گیا پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”جی ہاں جی ہاں“ پڑوسیوں نے یقیناً کھالیا ہوگا۔ ”تم یہ بات قیاساً کہہ رہے ہو۔ جب کہ تمہیں اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ تمہارا ”وہ خدا کا نیک بندہ کون ہے جس کے گھر سے مجھے میرے حصے کا رزق مل رہا ہے۔“ اس اجنبی نے جواب دیا۔

نمازیوں میں سے ایک نے کہا۔  
 ”مولوی صاحب! میں چوہدری کا بیٹا ہوں۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ ان کرتے؟ کبھی مسجد میں بھی آیا کرو اور ثواب کی فصل کاٹا کرو۔“  
 رچے ہو۔ جس کھیتی باڑی سے تمہاری عاقبت ہری بھری ہوتی ہے تم وہ محنت کیوں نہیں

پڑوسیوں میں سے کوئی بھوکا نہیں ہے۔ چوہدری صاحب بہت ہی ایماندار اور بہت رحمدل انسان ہیں۔ غریبوں کا بہت ہی خیال رکھتے ہیں۔“

دوسرے چار نمازیوں نے بھی اس کی تائید کی اور چوہدری برکت علی کی حمایت میں سرگوشیاں کرتی تھیں کہ مولوی جو ان ہے مگر نیت کا کھوٹا نہیں ہے، کبھی سر اٹھا کر پرائی ہو بہت کچھ کہنے لگے۔ جب ایمان علی کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ روٹی لانے والے کا بیڑوں کی طرف نہیں دیکھتا۔ ہاں وہ یہی کو شش کرتا تھا کہ کسی کی طرف نہ دیکھے مگر وہ کھڑکی پر دسی بھوکا نہیں ہے اور اس کے پاس جو لوگ بیٹھے ہوئے ہیں وہ سب پیٹ بھر کر کھا دلی کسی نہ کسی طرح نظر آجاتی تھی۔ اس وقت وہ توبہ کر کے فوراً ہی نظر جھکا لیتا تھا۔ پہلے تو ہیں تو وہ بسم اللہ پڑھ کر فاتحہ کشائی کرنے لگا۔ مسجد کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا حجرہ بنا ہوا تھا اس نے حجرے کی کھڑکی بند کر لی تھی۔ شدید گرمی کے باوجود وہ کھڑکی نہیں کھولا تھا۔ گرمی جہاں سے ایک مولوی کو پچھلے دنوں نکالا گیا تھا اب وہاں سے مولوی کو رہنے کی جگہ لے کر آتوں میں یوں تو سب ہی مکان کے باہر چارپائیاں بچھا کر سوتے تھے۔ زمیندار نے اسے بھی۔ ایمان علی روٹیاں کھانے کے بعد حجرے میں آیا تو اسے نہایت صاف ستھرا ایمان علی سونے کے لیے ایک چارپائی دی تھی لیکن وہ نماز عشاء کے فوراً بعد ہی سونے کا عادی زمیندار کا ملازم صفائی کر گیا تھا۔ اب جب میں شام کا اندھیرا پھیلنے ہی والا تھا۔ ایمان علی نہیں تھا۔ نماز پڑھ کر وہ حجرے میں آتا تو چوہدری برکت علی کا ملازم اس کے لیے کھانا لے نے حجرے کی وہ کھڑکی کھولی جو کعبہ کی سمت کھلتی تھی۔ کھڑکی کھولتے ہی اس نے آتا۔ کھانے سے پہلے وہ عاتق ملازم سے پوچھتا۔

”تم کھانے کے ہو؟“

”جی مولوی صاحب!“

”اچھا اب تم جاؤ، میں کھالوں گا۔“

تھی؟ یہ سب کچھ ایمان علی نہ دیکھ سکا کیوں کہ وہ پرائی بسو بیٹیوں کو ایک شاعری نظر نہیں دیکھتا چاہتا تھا اسی لیے اس نے آنکھ بند کرتے ہی وہ کھڑکی بھی بند کر دی۔ طویل بموکھل کر مسجد کے آس پاس جیتے مکانات ہوتے ان کے دروازے پر پھانچ جاتا۔ ان کے کینول جاس اور درپردہ کی ٹھوکروں نے اسے تھکا ڈالا تھا۔ چیتے بھر کر روٹی کھانے کے بعد اس نے ان کی خیریت دریافت کرتا اور ان سے کہتا۔

”میرے پاس خوراک سے دو روٹیاں زیادہ ہیں اگر آپ میں سے کسی کو ضرورت ہو تو  
 بلا تامل میرے کھانے میں شریک ہو جائے۔ دروازے دروازے گھومنے کے بعد وہ مطمئن  
 ہو جانے لگا۔ اس کے پردوس میں کوئی بھوکا نہیں سو رہا ہے۔ مگر یہ نیکی اور شرافت اسے ہنگامی  
 ذرا ٹھہرا دیا ہو گیا۔ دو روزانہ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتا تھا، پڑھنا والوں کے سامنے رہتی تھی کیونکہ اس نیک کام کے لیے اسے اس دروازے پر بھی جانا پڑتا تھا جہاں وہ لڑکی  
 دایمان کی باتیں کرتا تھا اور وہاں کے کسانوں کو سمجھاتا تھا۔  
 پہلے دن نظر آئی تھی۔

”تم یہاں ایسے بیچ بوتے ہو جس کی فصل کا ایک حصہ بھی تمہاری پیٹ میں نہیں اس لڑکی کے ماں باپ بہت بوڑھے تھے۔ باپ اتنا بوڑھا تھا کہ اس کے ہاتھ کاپتے جاتا۔ تم بھوکے رہے ہو، پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے مل چلاتے ہو اور پھر بھی خالی ہاڈ تھے پھر بھی وہ زمیندار کے مویشیوں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور وہ لڑکی اس کی حویلی میں جھاڑو



میں گر کر اپنے رب کریم کے سامنے گڑگڑاتا تھا۔

”میرے معبود! میں نے ہمیری عبادت کے سامنے زندگی کی تمام ضروریات کو بھل کر رکھ دیا ہے۔ یہ ایک ضرورت ایسی ہے جو بچھا نہیں چھوڑتی۔ یہ خواہش ایک بھرے ہوئے غبارے کی طرح ہے اسے جتنا دیا تا ہوں وہ اتنا ہی اچھلتی ہے۔ جب تک میں شرع کے مطابق کسی شریف زادی سے نکاح نہ پڑھواؤں اس وقت میرے پائے استقلال میں لغزش نہ آنے دے۔ میرے معبود!“

اللہ میاں بعض اوقات عجیب مذاق کرتے ہیں۔ اس کے گڑگڑانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ہی دن وہ لڑکی روٹیاں لے کر اس کے حجرے میں آنے لگی۔ اسے دیکھتے ہی ایمان علی کو کھل گیا۔ اس نے جلدی سے نظریں جھکا کر کھلاتے ہوئے پوچھا۔

”تہ۔ تم یہاں کیوں آئی ہو؟“

اس نے روٹیوں کا چھابہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”چوہدری صاحب کا حکم ہے کہ میں روٹیاں پہنچایا کروں۔“ جب وہ روٹیاں رکھنے کے لیے اس کے سامنے جھک رہی تھی تو ایمان علی کی نظریں بے اختیار اٹھ رہی تھیں مگر وہ نظریں اٹھتی ہی گڑبگڑ گئیں۔ ایمان علی نے چیخ کر لالچل پڑتے ہوئے اپنی آنکھوں کو اتنی سختی سے میچ لیا جیسے وہ ان آنکھوں کو اپنی کھوپڑی میں چھپا لیتا چاہتا ہو۔ آنکھیں نہ چھپ سکیں بلکہ بند ہوتے ہی کچھ اور روشن ہو گئیں۔ دماغ کے وسیع آسمان پر غبارے ہی غبارے اڑتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ وہ زرا سی دیر میں پسینہ پسینہ ہو گیا اور غصے سے تھر تھراتے ہوئے کہنے لگا۔

”میں نے کئی بار سمجھایا ہے کہ دوپٹے کو اچھی طرح بدن پر لپیٹا کر۔ تیرے ماں باپ تجھے سمجھاتے نہیں ہیں؟“

وہ معصومیت سے بولی۔

”میری ماں کو نظر نہیں آتا۔ میرے باپ کو چوہدری نے کام سے الگ کر دیا ہے کیوں کہ وہ اتنا بوڑھا ہو گیا ہے کہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے میوٹیوں کو پکڑ کر ایک جگہ نہیں لا سکتا۔ غریبی اور پریشانی سے اس کا سر بیٹھ جھکا رہا ہے۔ اس لیے وہ بھی میری طرف نہیں دیکھتا اور جو لوگ دیکھتے ہیں وہ روکتے ٹوکتے نہیں۔ مولوی صاحب ایک تو یہی ہے جو ٹوکتا رہتا ہے۔ یہ لے میں نے اسے ٹھیک کر لیا ہے۔ اب تو آنکھ کھول دے۔“

دیسے اور برتن مانگنے کا کام کرتی تھی۔ جب ایمان علی اس کے دروازے پر پہنچتا تو اکثر لڑکی اپنے باپ کے بجائے خود چلی آتی اور اس سے کہتی تھی۔

”مولوی صاحب! ہمیری بڑی مہربانی ہم نے پیٹ بھر کر کھا لیا ہے۔ تو ہم سب کا کد خیال رکھتا ہے، پہلا مولوی تو بہت ہی کینہ تھا۔“

اس کے سامنے ایمان علی کی نظریں نہیں اٹھتی تھیں۔ وہ سر جھکا کر اسے صیغہ کرتا۔

”کسی کو اس کی بیٹہ پیچھے کالی نہیں دینا چاہیے۔ ہر شخص کو اس کے برے اعمال کی برا مل جاتی ہے لہذا ہمیں اپنی زبان کو گند انہیں کرنا چاہیے۔“

پھر وہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہچکا کر کھتا۔

”دوپٹہ سلیٹے سے اوڑھا کر سر پر سے اچھل نہیں ڈھلکتا چاہیے۔ اچھی ہو بیٹیوں! اچھے طور طریقے سیکھنے چاہئیں۔“ یہ کہہ کر جب وہ اپنے حجرے کی طرف جانے لگتا تو ہزار بار سوچنے کے باوجود یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ نظریں اٹھا کر تو دیکھتا نہیں۔ پھر وہ کیسے سمجھ جاتا ہے کہ دوپٹہ سینے پر نہیں تھا اور سر سے اچھل ڈھلکا ہوا تھا۔

یہ بات کبھی اس کی سمجھ میں نہ آتی کہ نہ دیکھنے کے باوجود غیر شعوری طور پر جنہ چیزوں کو چور نظروں سے دیکھ لیتا ہے۔ سانس لیتا ہوا سینہ دھونکتی کی طرح ابھر ابھر کر ڈوب رہا ہو تو دیکھنے والی نظریں شرافت سے جھک جھک کر بھی اٹھ اٹھ جاتی ہیں۔ بعد میں گڑا ہوا منظر ایک جوان مولوی کی جوان آنکھوں کے سامنے آوٹھی بلبلو فلم کی طرح گزر جاتا۔ دن رات کئی بار توبہ کرتا تھا مگر یہ کبکھنت جوانی توبہ سے نہیں مانتی۔ توبہ سے شراب کے پیالے ٹوٹ جاتے تھے مگر شاب کا پیالہ خیالی ٹھوکروں سے نہیں ٹوٹتا۔ وہ قبر جیسے ٹھک حجرے میں پسینہ پسینہ ہو جاتا تھا یا دالھی کے لیے سراقے میں بیٹھ جاتا تو ذرا پر سکون ہوتا۔

کے بعد یہ بات اس کی سمجھ میں آئی کہ حجرے کی کھڑکی بند کر دینے سے وہ لڑکی اس دنیا سے مر نہیں جائے گی۔ کھڑکی بند ہو جائے گی تو آنکھیں کھلی رہیں گی۔ وہ آنکھیں بند کرے گا تو خیال کے در پیچے کھل جائیں گے، خیال کو توبہ کے طمانچوں سے بھگائے گا تو آنکھوں سے نیند اڑ جائے گی۔ جب وہ اس دنیا میں پیدا ہو چکا ہے اور گیسوں کا دانہ کھا چکا ہے تو جوانی کی اس چیشی ہوئی عمر میں خواہشات کی چڑیلیں ضرور اس کا پیچھا کریں گی۔ ایسے وقت وہ مجھ سے

ہوئی روٹیاں کھولنے وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، کان پیچھے کی طرف لگے ہوئے تھے کہ وہ جا چکی ہے یا اب تک کھڑی ہوئی ہے؟

”جا چکی ہے۔۔۔ نہیں کھڑی ہوئی ہے۔ نہیں جا چکی ہے۔ نہیں وہ میرے جواب کا انتظار کر رہی ہے۔“

اف! اک ذرا سامنے پھیر لینے سے کتنا تجسس پیدا ہو گیا تھا۔ شیطان اپنی خالہ کو حجرے کے دروازے پر چھوڑ گیا تھا۔ اگر وہ پلٹ کر دیکھتا تو اس کی کمزوری ظاہر ہو جاتی نہ دیکھتا تو روٹی حلق سے نیچے نہ اترتی۔ وہ عجیب تذبذب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ کڑوا نوالہ تھی، اسے نگل نہیں سکتا تھا۔ وہ رس بھری تنہا تھی، اسے اگل نہیں سکتا تھا۔ آخر اس نے جھلا کر پلٹنے ہوئے کہا۔

”چلی جاؤ یہاں سے دور ہو جاؤ۔“

وہ ایک جھٹکے سے رک گیا دروازے کی چوکھٹ تصویر کے فریم کی طرح خالی تھی۔ وہ وقت کی طرح گزر چکی تھی۔ ایک دم سے اس کی بھوک مرگئی، پیاس اڑ گئی، ہاتھ میں لقمہ تھا، اس کو منہ تک لے جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ بھوک نہ ہو تب بھی انسان کھا لیتا ہے لیکن خواہش نہ ہو تو کسی طرح بھی نہیں کھا سکتا۔ اس نے کتنی ہی بار دل کو سمجھایا کہ کھانا کھا لیتا چاہیے، اچھا ہوا وہ چلی گئی ہے۔ اب اسے اطمینان سے پیٹ بھرنا چاہیے مگر بھوک کے باوجود پیٹ بھرا ہوا تھا البتہ سینہ خالی ہو گیا تھا۔

ہائے یہ کیا ہو گیا ہے؟ پہلے تو کبھی سینہ خالی نہیں ہوا تھا، پہلے تو بھوک نہیں لگتی تھی، پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سارے کا سارا جسم ایک جگہ بیٹھا رہے اور دل دوسری طرف چلا جائے۔ حد یہ ہے کہ اس کے سامنے بھوک مٹانے کے لیے خدا کی بھیجی ہوئی نعمت ہے اور وہ اس نعمت سے انکار کر رہا ہے۔ اسے کفرانِ نعمت کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسی باتوں سے ناراض ہوتا ہے۔

یہ سوچتے ہی اس نے پھر ایک بار توبہ کی اور بسم اللہ پڑھ کر لقمہ منہ میں رکھ لیا۔ پھر وہ لقمہ چباتے چباتے نگھٹا رہا اور سیکھنے کو چاہتے چاہتے خیال ہی خیال میں اسے حجرے سے باہر اٹھنا رہا۔ بڑی مشکل ہے نفرت سے بھی یاد کرو تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اسے یاد کیا جا رہا ہے۔ کھانے کے بعد جب وہ سونے کے لیے منجی پر لیٹ گیا تو اس وقت بھی وہ

اس نے آنکھ کھول کر کہا۔

”اب تو یہاں سے چلی جائیں روٹی کھالوں گا۔“

”چلی جاؤں گی تیرے حجرے کے پیچھے ہی تو میرا گھر ہے۔ چوہدری صاحب نے یہاں روٹیاں پہنچانے کے لیے کہا تو میں خوش ہو گئی کہ اس زمانے تجھ سے اچھی اچھی باتیں سیکھتی رہوں گی۔“

”سیکھنے کے لیے تیرا یہاں آنا ضروری نہیں۔ وہ دنو کہاں ہے جو روز یہاں روٹیاں لایا کرتا تھا۔“

”چوہدری صاحب نے اسے دوسرے کام سے لگا دیا ہے۔ اب سیکھ یہاں روٹیاں لایا کرے گی۔“

”کون سیکھ؟“

”میرا ہی نام تو ہے۔ میں تیرے سامنے بیٹھی ہوں اور مجھ ہی سے پوچھ رہا ہے کون سیکھ؟“

”اچھا اب نہیں پوچھوں گا، جایاں سے۔“

”چلی جاتی ہوں مگر مجھے کوئی اچھی سی بات بتا دے۔ میں بہت بری لڑکی ہوں، کوئی اچھا سا کام کرنا چاہتی ہوں۔“

”اچھا کام کرنا چاہتی ہے تو پردہ کیا کر۔ تجھے غیروں کے سامنے اس طرح نہیں آنا چاہئے۔“

”پردہ کروں گی تو حویلی کا کام کیسے کروں گی۔ وہاں تو کتنے ہی غیر مرد آتے جاتے رہتے ہیں۔ وہاں حویلی میں کام کرنے والی کوئی لڑکی پردہ نہیں کرتی۔“

”اچھا تو جہاں بہت زیادہ مجبوری ہو، وہاں نہ کرنا مگر یہاں میرے سامنے تو کر سکتی ہے۔“

”اچھی بات ہے، میں اب تیرے سامنے نہیں آؤں گی۔“

وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی دروازے تک گئی پھر پلٹ کر وہاں سے بولی۔

”میں جارہی ہوں پھر نہ کہنا کہ سیکھ غصہ ہو کر چلی گئی ہے۔“

ایمان علی جواب دینے کے بجائے منہ پھیر کر روٹیاں کھانے بیٹھ گیا۔ کپڑے میں لپٹی

بیوی بچوں کے جھیلے سے دور رہنا چاہتا تھا جب تک وہ تھا تھا خود پر ظلم کر کے زندگی کی ضرورتوں سے دور رہ سکتا تھا۔ ایک بیوی آتی تو وہ اپنے جہیز میں ضرورتوں کا ہجوم لے آتی۔ پھر بچوں کی تعداد بڑھنے لگتی وہ اپنی تمام آرزوؤں سے منہ موڑ سکتا تھا لیکن بیوی بچوں کے آئے دن مطالبات سے ہمیشہ آنکھیں بند کر کے نہیں رہ سکتا تھا اسی لیے وہ ایک بیوی کی ضرورت سے بھی کتر رہا تھا۔ اس نے سوچا یہ آزمائش کی گھڑی ہے اگر اس نے کسی طرح اپنا من مار لیا اور سیکنہ کو اپنے داغ سے جھٹکنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر وہ خواہشات کا غلام نہیں رہے گا۔ یہی غلامی عورت کی غلامی تک لے جاتی ہے اب یہ بات اطمینان کا باعث تھی کہ وہ پردہ کرنے لگی ہے اب وہ اسی طرح چادر میں لپیٹی آئے گی اور روٹیاں رکھ کر چلی جایا کرے گی نہ وہ اسے دیکھے گا نہ اس کے لیے دل مچلے گا۔

اس دن سے وہ اپنے طور پر سنبھل گیا۔ معصم ارادہ کر لیا کہ اب اس کے خیالات کو دل میں جگہ نہیں دے گا۔ تیسری رات بھی وہ اسی طرح چادر لپیٹی ہوئی آئی اس نے خود کو چھپایا تھا مگر بولنے سے باز نہیں آتی تھی۔ روٹیاں رکھنے کے بعد اس نے کہا۔

”پتہ نہیں لوگ عورت سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں اپنے اوپر بس نہیں چلتا تو اسے برقعے کے کفن میں لپیٹ دیتے ہیں۔ مردانگی تو یہ ہے خود پر قابو رکھیں یا پھر اپنی آنکھیں پھوڑ لیں۔“

وہ جلی کٹی سنا کر کوئی جواب سنے بغیر چلی گئی۔ وہ گاؤں کی اس جاہل اور بے وقوف عورت کو کیسے سمجھا تاکہ پردہ کرانے کی وجہ مردانگی کی یا جنس کا خوف نہیں بلکہ حکم خداوندی کی تعمیل ہے۔ آواز میں بھی تو ایک سر ہوتا ہے ایک رسیلی کشش ہوتی ہے جو چھپے ہوئے وجود میں سے رس رس کر کانوں میں شد کی طرح جھپکی ہے زبان سے کچھ نہ کہتے ہوئے بھی یہ سمجھا دیتی ہے کہ وہ چادر کے پیچھے کتنی رس بھری ہے اسی لیے مرد عورت کے درمیان بلا ضرورت گفتگو کو اسلام پابند کرتا ہے۔

پاکل باقی کو اوپر پاگل خواہش کو کوئی روک نہیں سکتا۔ کسی نہ کسی بہانے وہ داغ میں چٹکیاں لپی رہتی ہے۔ جب وہ چوتھی رات بھی اگر چلی گئی تب ایمان علی کی سمجھ میں آیا کہ وہ چھپنے کے بعد اور زیادہ جلوہ گر ہو گئی ہے۔ طور کا جلوہ ایک ہی بار نظر آیا تھا وہ بھی ایک رات نظر آکر دوسری تمام راتوں کے لیے چھپ گئی تھی۔ اب یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی

اسے فخر سے یاد کر رہا تھا اور بڑی عقیدت سے آیت انکر ہی پڑھ رہا تھا۔ اس اطمینان نے اسے سلا دیا کہ سیکنہ آئندہ پردہ کیا کرے گی۔ دوسری صبح ناشتہ اور دوسرے کھانا دیوے کر تیار مکررات کو وہ پھر گئی۔ مگر اس طرح آئی کہ پہلی نظر میں وہ اسے پہچان نہ سکا۔ وہ سر سے پاؤں تک ایک سفید چادر میں لپیٹی ہوئی تھی۔ جس ہاتھ سے اس نے روٹی کا چھابہ لاکر اس کے آگے رکھا وہ ہاتھ بھی چادر میں چھپا ہوا تھا۔ روٹیاں سامنے رکھنے کے بعد اس کی گواہ سنائی دی۔

”میں حکم کی بندی ہوں اپنے مالک کے حکم سے مجبور ہو کر یہاں تک آئی ہوں۔ بس اسی طرح اب آیا کروں گی۔“

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ ایمان علی آنکھیں۔ پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ مگر دیکھا کیا اس کا تو ایک ناخن بھی نظر نہیں آیا تھا صرف سفید چادر ہی نظر آئی تھی۔ تب اس کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے جیتے جی اپنی خواہش کو کفن پر بند کیا ہو۔ اپنے ہاتھوں سے اپنی آرزوؤں کو کچل کر اور انہیں دفن کر کچھ حاصل تو نہیں ہوتا مگر جن دن دنیا گیا ہے اس جگہ کو بار بار کریدنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ زندگی گزارنے کے لیے کوئی ذرا نیت تاک تفریح کا سامان ہو۔ وہ ایک دم سے بے چین ہو گیا جسے وہ چھپانا چاہتا تھا اب وہ چھپی ہوئی حالت میں برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ نہ اس کو ٹھ قرار آ رہا تھا نہ اس کو ٹھ سکون تھا۔ وہ فرشتہ صورت انسان جس نے اپنی زندگی کو اپنی تمام ضرورتوں سے خالی کر دیا تھا وہی خالی زندگی اب کانٹوں کا بستری بن گئی تھی صرف ایک منہ زور ضرورت تھی جو اس بچھونے میں کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔

اب جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس میں سیکنہ کا قصور نہیں تھا۔ سراسر ایمان علی کی غلطی تھی۔ ایک جلوے کو چھپانے کی کیا ضرورت تھی اور جب چھپا دیا تھا تو دیکھنے کو دل کیوں مچل رہا تھا۔ اگر دل مچل ہی رہا تھا تو اب اسے اپنے بس میں رکھنا اس کا اپنا کام تھا صرف سجدے میں گزر گرانے سے بھگتے ہوئے خیالات کو لگام نہیں دی جاسکتی تھی۔

اس نے تہہ کر لیا کہ وہ اپنے نفس کو مارنے کی پوری کوشش کرے گا حالانکہ اسلام میں نفس کشی جائز نہیں ہے۔ وہ شرعی پابندیوں میں رہ کر سیکنہ کو حاصل کر سکتا تھا لیکن حاصل کرنے تک نفس کو مارنا ضروری تھا لیکن اسے اپنا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا کیونکہ وہ

ہے۔ اگر میں نماز کے علاوہ لوگوں کو کلام پاک کی تعلیم دینا شروع کر دوں اور وہ معبود میرے انعام میں ایک گلاس دودھ کا اضافہ کر دے تب میں انکار نہیں کر دوں گا۔ اگر ابھی میں نے دودھ اور چائے جیسی غیر ضروری چیزوں کو منہ لگایا تو یہ اس طرح منہ لگ جائیں گی کہ رفتہ رفتہ میری ضرورت بن جائیں گی۔ ہمیں سے یہ ضرورتیں انسان کو رشوت اور حرام خوری کی طرف مائل کرتی ہیں۔ اگر ہم اپنی اس دنیا کو حرام خوری اور فریب کاریوں سے پاک رکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے سب سے لازمی عمل یہی ہے کہ ہم اپنی تمام ضرورتوں کو کچل دیں۔ صرف زہد اور پرہیزگاری سے ایمان کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

”آپ ایسی باتیں بتاتے ہیں جو اس زمانے میں قابل عمل نہیں ہو سکتیں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔“

”کبھی بھی زمانے میں ایمان نہیں بدل سکتا بشرطیکہ ہم چاہیں۔ آپ زمانے کے بدلنے کی بات کہتے ہیں حالانکہ زمانہ کبھی نہیں بدلتا۔ انسان خود کو بدلتے بدلتے زمانے کو بدل دیتا ہے پھر اسی زمانے کا شکوہ بھی کرتا ہے۔ چوہدری صاحب صرف اپنی سوچ کو بدلنے کی ضرورت ہے“ تیرہ سو سال پہلے کا معاشرہ آج بھی قائم ہو سکتا ہے۔“

”ہمیں نے چالیس برس کی عمر میں آپ جیسا ایک ہی ایمان والا دیکھا ہے۔ ہم سب اپنی ضرورتوں میں اس طرح کھرچکے ہیں کہ زہد اور پرہیزگاری کے معاملے میں آپ کی طرح انتہا پسند نہیں بن سکتے۔ معاف کیجئے گا“ کیا آپ تمام اس معاشرے کو بدل سکتے ہیں؟“

”ایک ایک قطرے سے سمندر بنتا ہے۔ میں ایک قطرہ ہوں۔ آپ بھی ایک قطرے کی طرح مجھ میں مل جائے پھر دیکھیے کہ ایمان کا سمندر کیسے ٹھاٹھیں مارتا ہے۔“

چوہدری نے ہنسنے ہوئے کہا۔

”آپ اتنی اونچی باتیں اس لیے کرتے ہیں کہ اس دنیا میں بالکل تمنا ہیں۔ اگر آپ یوی بچوں کے ساتھ زندگی گزاریں اور پورے ایک کنبے کی پرورش کریں تب آپ کو یہ حقیقت معلوم ہوگی کہ اس دنیا میں وہ کرائے دن کی ضرورتوں سے چھٹا نہیں جھوٹ سکتا۔ تمنا تو جانور بھی جنگلوں میں زندگی گزار لیتے ہیں۔ دنیا داری کرتے ہوئے دین داری کرنا محال ہے۔“

”محال ہو سکتا ہے“ ناممکن نہیں۔ انسان چاہے تو سب کچھ کر سکتا ہے۔“

کہ بار بار دیکھتے رہنے سے اتنی تڑپ پیدا نہیں ہوتی جتنی کہ صرف ایک بار دیکھنے سے ہوتی ہے۔ وہ تجلی صرف ایک بار دماغ کے گوشہ طور سے جھلکتی ہے اور دل میں اگر ہمیشہ کے لیے کھب جاتی ہے پھر وہ نظارہ بھلائے نہیں بھولتا۔ آخر اس نے پریشان ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ دوسرے دن وہ چوہدری صاحب کے پاس جائے گا اور انہیں سمجھائے گا کہ وہ سیکنڈ کے لیے نامحرم ہے لہذا ایک جوان لڑکی کو روٹیاں لے کر اس کے حجرے میں نہیں بھیجنا چاہئے۔ اس رات وہ فیصلہ کرنے کے بعد کرشمیں بدلتے بدلتے ہی سو گیا۔

دوسری صبح نماز کے بعد اس نے چوہدری برکت علی سے کہا ”میں آپ سے تمناؤں میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

چوہدری برکت علی نے کہا۔

”میں بھی آپ سے ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ چلئے اچھا ہے“ آپ میری حویلی میں تشریف لے آئیں، اطمینان سے باتیں کریں گے۔ ابھی میں کچھ تینوں کی طرف جا رہا ہوں۔“

کھنٹے بعد میں حویلی میں آؤں گا۔“

دو گھنٹے بعد ایمان علی حویلی میں پہنچا تو چوہدری اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بڑی عزت سے اسے بیٹھک میں کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا پھر ملازم کو چائے لانے کا حکم دیا۔ ایمان علی نے ہاتھ اٹھا کر انکار کرتے ہوئے کہا۔

”میں چائے نہیں پیتا۔“

چوہدری نے مسکرا کر کہا۔

”آپ تو دودھ بھی نہیں پیتے۔ میرا ملازم کئی بار آپ کے لیے دودھ لے کر گیا مگر آپ نے پینے سے انکار کر دیا۔ آخر کیوں؟“

”جب روٹی اور چٹنی کھا کر پیٹ بھر جاتا ہے تو پھر فاضل خوراک کا عادی بننا کیا ضروری ہے؟“

”اس لیے ضروری ہے کہ یہ سب خدا کی دی ہوئی نعمتیں ہیں“ ان سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔“

”بے شک انکار نہیں کرنا چاہیے اگر یہ نعمتیں اپنی محنت سے حاصل ہوں۔ میں ہاؤ وقت نماز پڑھتا ہوں اور پڑھاتا ہوں“ اللہ تعالیٰ مجھے عین وقت کی روٹیاں انعام میں دے

روحانی میں سیکھ دہلن بنی بیٹھی ہوئی تھی۔ چارپائی کے سرہانے ایک صندوق کے اوپر دودھ کا ایک گلاس اور مٹھائی کی ایک پلیٹ رکھی ہوئی تھی۔ اس کی زندگی میں پہلی بار ایک دہلن آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی غیر ضروری دودھ اور مٹھائیاں آگئی تھیں۔ چوہدری نے اس کا انکار نہیں سنا تھا، یہ کہہ کر وہ چیزیں رکھوا دی تھیں کہ صرف ایک رات غیر ضروری خوراک استعمال کر لینے سے ایمان میں فرق نہیں پڑے گا۔

ایمان علی حجرے کے دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد اسی دروازے سے چپک کر کھڑا رہ گیا۔ دلہن کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے ہی دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس پر ایک عجیب سی گھبراہٹ طاری تھی۔ دروازے سے دلہن کی چارپائی تک صرف دو قدم کا فاصلہ تھا مگر اسے لگ رہا تھا کہ یہ فاصلہ طے کرتے وقت وہ لکھڑا کر گر پڑے گا۔ وہ بار بار کانہ سے پر رکھے ہوئے دہال سے حجرے کا پینہ نہ پوچھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح آگے بڑھے اور آگے بڑھ کر کیا کرے؟

وہ گھبراہٹ میں ایک ہی جگہ کھڑا چھوٹے سے حجرے میں ادھر سے ادھر نظریں دوڑا رہا تھا جیسے دوپٹے والا سارا تلاش کر رہا ہو۔ کبھی کبھی بھوک، کمزوری یا بیماری کے باعث اس کی طبیعت گھبرانے لگتی تو وہ اگر بڑیاں سلگا لیا کرتا تھا۔ بچپن سے اگر بڑی کی نمک نے اسے اکثر سارا دھا لینگین اگر بڑی قبر یا کسی مقدس مقام پر جلائی جاتی ہے۔ آج تک کوئی اگر بڑی سلگا کر اپنی دہن کے پاس نہیں گیا۔ یہ طریقہ رگھین اور رومانی ماحول کے بالکل خلاف ہے پھر وہ کیا کرے؟

وہ ساری رات ایک ہی جگہ کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ دو قدم کا فاصلہ کسی نہ صورت سے طے کرنا ہی تھا۔ اگرچہ اس کے گھٹنے کانپ رہے تھے پھر بھی اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔

دوسرے قدم پر ڈمکاتا ہوا، جھٹکا ہوا چارپائی کا سارا لے کر دلہن کے قریب گرتے گرتے بیٹھ گیا۔ چارپائی نے چرچہ کر اصرار کیا تو کھٹ میں چھپی ہوئی سیکینہ نے سمجھ لیا کہ مولوی کسی طرح کفن باندھ کر میڈان میں آیا ہے۔ اب سے پہلے وہ کفن جیسی چادر میں لپی ہوئی آیا کرتی تھی، اس وقت سرخ جوڑے میں اس کی ساری شوخی اور تیز طراری ہوا ہو گئی تھی۔ وہ اپنے آپ میں حیا سے سنسنے لگی۔ ادھر حیا تھی، ادھر گھر ابٹ۔ وہ ابھی

”آپ زبانی دعویٰ نہ کریں۔ کیا آپ شادی کر کے بیوی بچوں کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے اپنے زہد اور پرہیزگاری کو عملی طور پر ثابت کر سکتے ہیں؟“ ایمان علی اس کا منہ کھٹنے لگا۔ اس نے کبھی شادی کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا۔ چونکہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اپنی ایمانداری کو عملی طور پر ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ چوبدری نے الجھتے دیکھ کر کہا۔

”ایمان والے ہمیشہ اپنے عمل سے دوسروں کو اپنی طرف مائل کرتے ہیں۔ میں آپ کو عمل کی دعوت دیتا ہوں، آپ میرا مشورہ مان کر شادی کر لیں۔ سیکنہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

ایمان علی کے ذہن میں جیسے دھماکہ سا ہوا۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے گڑبڑا گیا۔ بے چینی سے اوپر اُدھر پہلو بدلنے لگا۔ وہ تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ سیکٹہ کو اپنے حجرے میں آنے سے روک دے گا اور پھر دہری اس لڑکی کو اس کی دلہن بنانا چاہتا تھا۔

اچانک ہی وہ اس کی نگاہوں کے سامنے دلہن کی روپ میں آگئی۔ سرخ جوڑے میں اور چاندی کے زیورات میں وہ ایسے جگمگا رہی تھی کہ اس پر نگاہیں نہیں ٹھہر رہی تھی۔ بظاہر خاموش بیٹھا ہوا تھا مگر اس کا دل سینے کی دیوار سے دیوانے کی طرح سر کلرا رہا تھا۔ دھک دھک..... دھک دھک..... کیونہ کیونہ.....

چوہدری نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے فوراً ہی کہا ”میں آپ کی طرح عالم دین نہیں ہوں مگر اولیاء اللہ کے حالات زندگی پر میں نے ایک کتاب پڑھی ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے۔ حضرت خواجہ یازید . سلفی فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ عورتوں سے مجھ کو بچائے رکھ۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ التجا غلط ہے جب کہ ہمارے حضورؐ نے ایسا نہیں چاہا۔ مولوی صاحب پھر آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟ کیا ہمارے حضورؐ نے ایک بڑے کتبے کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے زہد اور پرہیزگاری کو عملی طور پر ثابت نہیں کیا ہے؟“

چوہدری کی بات سن کر ایمان علی کا سر جھک گیا۔



قبر کی طرح تنگ و تاریک حجرہ گلاب کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ لالہ شبنم کی زرد

تک ہانتا ہوا سوچ رہا تھا کہ اپنی دلہن کو کس طرح مخاطب کرے۔ اس کا حلق خشک تھا۔ پہلے پیٹ کی بھوک سے حلق میں کانٹے پڑتے تھے اب جذبات کی بھوک سے پر تھے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا کہ ایک گھونٹ پانی مل جائے مگر وہ مسرتوں کے جھوم جھرے کے اندر پانی رکھنا بھول گیا تھا۔ اب دروازہ کھول کر باہر جانے کا حوصلہ نہیں اس نے دودھ کے گلاس کی طرف دیکھا پھر ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ وہ گلاس کا اپنی دلہن کو پلانا چاہتا تھا۔

آخر اس نے اپنے آپ کو ٹٹولا کہ وہ گھبرا کیوں رہا ہے؟ وہ خدا کا نیک بندہ ہے خدا کے سوا کسی سے ڈرنا یا گھبرانا نہیں چاہیے اور وہ خواہ مخواہ ایک ایسی لڑکی سے کلم ہے جو بیوی بن کر اس کی خدمت گزار کی کے لیے آئی ہے۔ اس میں جب ذرا حوصلہ ہوا تو اس نے بسم اللہ پڑھ کر گھونگھٹ کو تھام لیا۔ پتا نہیں ایسے وقت بسم اللہ ضروری تھا یا نہیں مگر وہ عادت سے مجبور تھا۔

گھونگھٹ کو ہاتھ لگاتے ہی وہ ذرا سا کسمائی پھر اپنے گھونگھٹ کو پکڑ کر غارِ اداؤں سے سمجھانے لگی کہ وہ اتنی آسانی سے گھونگھٹ نہیں اٹھانے دے گی۔ ایمان کو یاد آگیا کہ ایسے وقت کچھ نہ کچھ دلہن کو منہ دکھائی کے لیے دینا پڑتا ہے۔

اس نے کرتے کی جیب سے عطر کی ایک شیشی نکالی اور اسے کھولتے ہوئے کہا۔ ”پچھلے سال رمضان کی ستائیسویں شب کو تراویح عمل کرنے کے سلسلے میں مجھے جوڑا لباس اور عطر کی یہ شیشی ملی تھی۔ ابھی اس میں تھوڑا سا عطریاتی ہے میں لگا دکھائی کے طور پر دے سکتا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے دلہن کے حنائی ہاتھوں پر تھوڑا سا عطر چھڑک دیا پھر شیشی کو کرنے کے بعد وہ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اس کا گھونگھٹ اٹھانے لگا۔ سیکنہ کے انکارِ ادا میں بڑی پیاری لگ رہی تھیں پھر بھی چمکا دکھن چوہ گھونگھٹ کی بدلی سے باہر آگیا۔ ایمان علی دم بخود ہو کر اس حسین کھڑے کو دیکھ رہا گیا۔ اب سے پہلے بھی وہ دیکھ چکا تھا لیکن ایک دلہن کے روپ سنگھار نے اسے حسین شاہکار بنا دیا تھا۔ اس نے ہی دل میں کہا کہ جنت کی حور کا جو تصور ہوتا ہے وہ آج نگاہوں کے سامنے کھل رہا ہے۔ اسے دیکھ دیکھ کر بے اختیار چھوٹے کو دل چل رہا تھا۔ پہلے اس کے لرزتے ہوئے

ہاتھ سیکنہ کے حنائی ہاتھوں پر آئے اور بڑی دیر تک اس کی ملامت کو محسوس کرتے رہے وہاں سے آگے ہاتھ بڑھانے کی جرات نہیں ہو رہی تھی۔ اپنے اندر جرات پیدا کرنے کے لیے یہی بات سمجھ میں آئی کہ پہلے باتیں کر کے اپنی گھبراہٹ کو دور کیا جائے اس لیے وہ لڑکھرائی ہوئی زبان سے کہنے لگا۔

”سخت۔ تم بہت بہت اچھی ہو۔“

اس کے حسن کی تعریف کے لیے اسے اس سے زیادہ الفاظ نہیں مل سکے۔ اس نے اب تک صرف خدا اور رسول کی تعریف کی تھی، ایک حسین عورت کے لیے وہ ایک شاعر کی زبان نہ لاسکا۔ اس لیے اس نے خدا کا ہی سارا الیا اور بڑی عقیدت سے کہنے لگا۔

”اللہ تعالیٰ جب اپنے بندوں سے خوش ہوتا ہے تو انہیں اپنی سب سے پسندیدہ چیز انعام کے طور پر دیتا ہے۔ پہلی بار جب میں نے تمہیں جگرے کی کھڑکی سے دیکھا تھا تو اس وقت میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا معبود تمہیں مجھ سے منسوب کرے گا۔ واقعی اس دینے والے کے انداز نزلے ہیں۔ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر کسی کو ایسی خوشیاں نصیب نہیں ہوتیں۔ وہ چاہے تو دیتا ہے وہ چاہے تو چھین لیتا ہے۔“

وہ بول رہا تھا اور سیکنہ کے حسین کھڑے سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اس اچھوٹے سے جگرے میں سخت گرمی تھی۔ کھڑکی اور دروازہ دونوں ہی بند تھے۔ اسی لیے سیکنہ کی طبیعت گھبرا رہی تھی مگر وہ عورتوں کے معاملے میں اتنا ڈرتا تھا اس لیے سیکنہ کی گھبراہٹ کو نہ سمجھ سکا۔

جب اس نے دونوں کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے چہرے کے گلاب کو چھو لیا تو اسے پتا چلا کہ وہ بھی کانپ رہی ہے اور اسی کی طرح گھبرا رہی ہے۔ وہ لرزتے ہوئے بولا۔

”سیکنہ میری شریک حیات آنکھیں کھولو۔ وہ آنکھ کھولنے کی بجائے اپنے ہاتھ سے حلق کے پاس گلے کو سسلانے لگی۔ ایمان علی نے پوچھا کیا پاس لگ رہی ہے؟“ سیکنہ نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔ ایمان علی نے آگے ہاتھ بڑھا کر دودھ کا گلاس اٹھایا اور اسے دیتے ہوئے کہا۔

”یہ لے، اسے پی لے۔“ اس نے سیکنہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے گلاس تھموا۔ اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ آنکھیں حیا سے بھی بند ہوتی ہیں اور خوف و درشت سے بھی

ہوتے ہیں تو اس کی یہی حالت ہوتی ہے جو اب سیکینہ کی ہو رہی ہے مگر اس کی حالت ایسی کیوں ہو رہی ہے؟ یہ تو پہلی بار دلن بنی بنی میں بھی پہلی بار دلنابن کر اس کی زندگی میں آیا ہوں۔ کیا میں اس کی زندگی کا پہلا دلنابن نہیں ہوں؟ ہاں نہیں ہوں۔ یہ تو سامنے کی بات ہے جو حقیقت ہے وہ سامنے ہے اور سمجھنے کے لیے کیا رہ گیا ہے؟

وہ اس سے ذرا دور کھڑا اسی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ جب بات سمجھ میں آئی تو وہ ایک دم سے تھک کر فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ زیر لب بڑبڑانے لگا۔

”یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ میں ایک دلن کی خواہش کو برسوں سے چھپاتا رہا۔ میں ڈرتا تھا کہ کبھی میں نے شادی کی تو نہ جانے کیسی عورت ملے، وہ میری طرح ایمان والی ہوگی یا نہیں؟ یوں تو بظاہر ہر بی ایمان والیاں ہوتی ہیں لیکن کتنی ہی بے ایمانی، جھوٹ، مکر و فریب کے جہنم میں گھری ہوئی رہتی ہیں، یہ شادی کے بعد پتا چلتا ہے اور مجھے پتا چل رہا ہے۔“

اس نے بڑے کرب سے کراہتے ہوئے خاموش پڑی ہوئی دلن کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں بند تھیں اور جس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

”آؤ! سیکینہ میں نے تیرا کیا بکاڑا تھا۔ تو مجھے ایک ذہنی عذاب میں مبتلا کرنے کیوں آئی؟ میرا گناہ تو صرف اتنا ہی ہے کہ میں نے تیری تمنا کی تھی مگر خدا کی قسم ایک بہت اچھی اور خوشگوار زندگی کے لیے تیری آرزو کی تھی۔ اگرچہ میں نے عہد کیا تھا کہ خدا کے سوا کسی کی آرزو نہیں کروں گا لیکن اب میں دنیا داری کرتے ہوئے یہ مثال پیش کرنا چاہتا تھا کہ رشتے ناٹوں کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہوئے بھی میں پوری طرح ایمان داری سے زندگی گزار سکتا ہوں۔ میں دوسروں کے سامنے ایک مکمل ایمان پیش کرنے کے لیے تجھے اپنی دلن بنا کر لایا ہوں۔ یہ جرم تو نہیں ہے کہ تو نے مجھے اتنی بڑی سزا دی ہے۔ بتا سیکینہ میں نے تیرا کیا بکاڑا تھا؟“

ایمان کی آنکھوں میں آنسو آگئے چارپائی پر لیٹی ہوئی بے ایمانی بھی روئے گی۔ زندگی کے کسی موڑ پر جب ایمان اور بے ایمانی اچانک ہی ٹکرا جاتے ہیں تو ایسے وقت انسان کا ضمیر بہت کچھ سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔ سیکینہ بھی ایمان کی زد میں آکر کانپ گئی تھی اس

بند ہوتی ہیں۔ اگر حیا سے بند ہوئیں تو وہ دودھ پیتے ہوئے شرابی۔ کوئی دہشت تھی جو اس کا گلا خشک کر رہی تھی۔

اس نے گلاس ہونٹوں سے لگا کر دو چار گھونٹ پیئے، دودھ اس کے حلق میں پھنسنے لگا۔ سینے کے اندر سے کوئی چیز لاوے کی طرح ابل کر باہر آنا چاہتی تھی۔ سیکینہ نے برداشت کرنے کی انتہائی کوشش کی لیکن کوشش کے باوجود لاوا ابل پڑا۔ گلاس سے دودھ کو چھٹکے دیکھ کر ایمان علی نے گلاس کو فوراً ہی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سیکینہ ایک بیک تڑپ کر چارپائی کے کنارے جھک گئی اور تے کرنے لگی۔

وہ اس صورت حال سے بوکھلا سا گیا۔ جلدی سے دودھ کا گلاس صندوق پر رکھ کر اس کی پیٹھ کو سہلانے لگا۔ وہ ہانپ رہی تھی اور گھری گھری سانسیں لے رہی تھی۔ ایمان علی نے جلدی سے حجرے کی کھڑکی کھول دی پھر اس کے پاس آکر اس کے چہرے پر پٹکھا جھٹکا لگا۔ سیکینہ شرم و حیا کو بھول کر بستر پر لیٹ گئی تھی۔ ایک بار اس نے آنکھیں کھول کر ایمان علی کو دیکھا پھر دوسری بار آنکھ بند کی تو آنکھوں سے آنسو دھلک پڑے۔ ایمان علی نے اس کے آنسوؤں کو پوچھتے ہوئے کہا۔

”سیکینہ اللہ کا نام لے، وہ تیری تکلیف دور کرے گا۔ میں تیرا مجازی خدا ہوں، مجھے کیا پریشانی ہے؟“

وہ بدستور آنکھیں بند کیے انکار میں سر ہلاتی ہوئی بڑے کرب سے بولی۔  
”میں تجھے پہلے کہہ چکی ہوں کہ میں بہت بری لڑکی ہوں۔ میں سمجھتی تھی کہ مجھے کچھ برا آدمی ملے گا مگر تیرے پاس آکر میرا دل کانپ رہا ہے۔ دھوکا تو انسانوں کو دیا جاتا ہے فرشتوں کو نہیں دیا جاتا۔ میں تجھے دھوکا نہیں دے سکتی۔“

ایمان علی نے پریشان ہو کر پوچھا۔  
”یہ تو کیسی بے بسی، بے بسی کی باتیں کر رہی ہے؟“

”بے بسی والی بے بسی ہوئی باتیں کر سکتی ہے۔ تو سمجھتا کیوں نہیں کہ مجھے مثلی کیوں ہو رہی ہے؟“

ایمان علی ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اب سیکینہ کی باتیں اس کی سمجھ میں آ گئیں۔ اس نے بارہا سنا تھا کہ عورت کے پاؤں بھاری

فرشتے سے اپنی بے ایمانی نہ چھپا سکی تھی اور اس سے بے ایمانی کرنے کے بعد یہ سمجھا: ”بے شک لونڈی اپنے آقا کے حکم کی پابند ہوتی ہے۔ مگر یہ غلاموں اور لونڈیوں کی نہیں آ رہا تھا کہ اس کی تلانی کیسے کرے۔ اسی لیے وہ بے بسی سے رو رہی تھی۔ زید و فروخت کا دور نہیں ہے۔ تولد وارث نہیں ہے، بازار میں بیٹی نہیں مگنی ہے اور نہ ہی ”تیرا بھی قصور ہے کہ تو نے میرا کچھ نہیں بگاڑا“ میں تمہاری میں آتی تھی تو مجھے خرید کر لایا ہے۔ اگر تو اس کی ملکیت رہ چکی ہے تو اسلام میں کسی آقا کے لیے یہ حکم ایمان داری سے شرافت کی چادر میں لپیٹ دیتا تھا۔ اس دنیا میں ایسے ہی لوگوں کا بگڑنا نہیں ہے کہ وہ اپنا گناہ کسی دوسرے کے سرھونپ دے۔ اس آقا پر لازم ہے کہ جو بیچ بویا تجھے تیری شرافت نے کمزور بنایا، مجھے میری غریبی نے تیری طرح مجھ میں بھی اتنا ہے، اس کی فصل کاٹنے تک اپنی لونڈی کو اپنی امان میں رکھے۔ یہ نہیں کہ اسے مصیبت نہیں تھا کہ میں کسی کا کچھ بگاڑ سکتی اسی لیے چوہدری نے مجھے بگاڑ دیا۔“

وہ چوہدری کا نام سن کر چونک گیا اور حیرانی سے اس کا منہ کھلنے لگا۔ اسے یقین نہ پڑتا تھا کہ وہ بے قصور ہے، نہ کائی گئی ہے۔ وہ بھانے کا مجرم ہے، میں اس سے بات کروں گا آ رہا تھا کہ جو شخص اتنا ایمان دار ہو کہ ایمان والوں کے لیے ایک مسجد تعمیر کرائے، وہ لاہور ایمان کی رو سے اسے مجبور کروں گا کہ بچے کی پیدائش تک وہ مجھے اپنی امانت سمجھ کر مسجدوں کو یوں مسار کر سکتا ہے اور اپنے سیاہ عمل کو دلہن کی طرح سنوار کر ایک ماہنے پاس رکھے۔“

وہ ایک بیک بستر سے اٹھ کر بولی۔

”میں اس کے پاس نہیں رہوں گی۔ میں تیری بیوی بن چکی ہوں، کیا تو سمجھتا ہے کہ میں نے بھی تو چوہدری کا کچھ نہیں بگاڑا تھا؟“

”میں نے بھی تو چوہدری کا کچھ نہیں بگاڑا تھا؟ میں نے کہا نا اس دنیا میں ان کا ہی ہمارا نکاح جائز نہیں ہے؟“

وہ اس سوال سے الجھن میں پڑ گیا۔ خاموش بیٹھے بیٹھے دماغ کی لائبریری میں تمام حد۔ شل کو کھنگالنے لگا اور یہ اعتراف کرنے لگا کہ کیلئے اس کا نکاح جائز ہے۔ جب ”اس کی غلطی میں تو برابر کی شریک ہے۔ اگر عورت نہ چاہے تو کوئی اس کی انگلی کوئی لونڈی حاملہ ہو کر کسی کے نکاح میں آئے تو وہ نکاح جائز تو ہوتا ہے لیکن شوہر اس وقت نہیں پکڑ سکتا۔“

تک لونڈی سے محبت نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ وہ حمل سے فارغ نہ ہو جائے۔

”ہاں تو ٹھیک کتا ہے۔ جب تک میں نہیں چاہتی تھی، وہ میری انگلی بھی نہ لینی سیکھ نہ سکتا تھا، ناقابل برداشت بوجھ ہو وہ اسی کے پاس رہے گی کیونکہ نکاح ہو چکا پکڑ سکا۔ مگر عورت کو سمجھانے کے لیے مردوں کے پاس جہاں دولت ہوتی ہے وہاں ہے۔ وہ اس کا مجازی خدا ہے اور مجازی خدا کے آگے ایک لونڈی کے آقا کی اہمیت ختم ایمان کا سارا بھی ہوتا ہے۔ چوہدری نے مجھے سمجھایا کہ جب ایک شخص کینڈوں کو بھابھو جاتی ہے۔ ہاں وہ جو بوجھ لے کر آئی ہے اس بوجھ کا اٹھانا چوہدری پر لازم ہے۔ اس نے اور باندیوں کے نان حقے کا ذمہ دار ہوتا ہے تو اس کی پاؤں کی اڑی سے سر کی چوٹی نکلا۔“

اس کا حق دار بھی ہوتا ہے۔ جب وہ ایمان دھرم سے یہ ثابت کر رہا تھا کہ جو کچھ وہ چاہتا تھا۔ ”بے شک تو میری شریک حیات ہے۔ اب تیری عزت و آبرو اور تیرے جان و مال کی وہ درست ہے، تو پھر جو درست ہے میں اس سے انکار کیسے کر سکتی تھی۔ تو برا عالم ہے زخاقت میرے ذمے ہے۔ لیکن وہ جو بچہ آنے والا ہے، میں اس کا ذمہ دار اور حقدار ایمان سے بنا کیا ایک لونڈی کو اپنے آقا کا حکم نہیں ماننا چاہیے؟“

نہیں ہوں۔ چوہدری کو اس کی پرورش کرنی ہوگی۔“

اس نے ایسا سوال کیا تھا کہ ایمان سوچا رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے تائید میں ”نہیں میں اپنا بچہ کسی کو نہیں دوں گی۔ جس کے لیے عورت لبو لمان ہوتی ہے، جسے ذمہ تک اپنا لبو پلاتی ہے، اس کے لیے اس سے زیادہ کوئی عزیز نہیں ہوتا۔ میرے جگر کا کرکھا۔“



کلوا پھینکتے کے لیے نہیں ہے۔ تو ایمان والا ہے ہزار بار اپنی گردن کٹا کر بھی خدا کا  
 گا۔ میں عورت ہوں ہوس کی قربان گا ہر ایک بار اپنی گردن کٹا کر ساری زندگی اپنے  
 پکاروں گی۔ وہ تیرا ایمان ہے یہ میرا ایمان ہے۔“  
 اس نے سیکڑے کو سمجھانے کی کوشش کی۔  
 ”یہ تیرا ایمان ہو سکتا ہے مگر میں تجھے کیسے سمجھاؤں کہ وہ بچہ کبھی میرے نام سے  
 نہیں جائے گا۔“

”تم چوہدری سے جا کر کہو کہ میں اچھی طرح اس کی آنکھ کھولنے آیا ہوں۔ جاؤ اسے  
 ملازم وہاں سے چلا گیا۔ ایمان علی باہر کھڑا رہا۔ چوہدری وہاں آیا تو اسے دیکھ کر حیرانی  
 کا اظہار کرنے لگا۔“

”اے مولوی صاحب آپ ہیں۔ آئیے اندر تشریف لائیے۔“  
 ”نہیں میں خدا سے ڈرتا ہوں اور بیشہ اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ مجھے شیطان کے  
 دروازے سے دور رکھے۔“

چوہدری کے تیور بدل گئے۔ اس نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔  
 ”تم شیطان کس کو کہہ رہے ہو؟“  
 ”تمہیں کہہ رہا ہوں۔ کیا تم ایمان والوں کے ساتھ لین دین میں دیانت داری سے  
 کام لیتے ہو؟ کیا تم ایک کھوٹا سکہ چکا کر دھوکے سے اسے دوسرے کے حوالے نہیں کرتے  
 ہو؟“

چوہدری سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔  
 ”میں کسی دیوانے کے ساتھ اپنی حویلی کے اندر بیٹھ کر بات نہیں کر سکتا۔ میرے  
 ساتھ آؤ۔“  
 وہ دونوں حویلی سے دور جانے لگے۔ کچے سے ویران راستے پر ان کے پیچھے غارش زدہ  
 کتا دم ہلاتا ہوا چل رہا تھا۔ چوہدری نے کہا۔  
 ”یہ کتا ہے۔ میں اسے ٹھوکریں مارتا ہوں اس کے باوجود یہ میرے پیچھے دم ہلاتا پھرتا  
 ہے۔“

ایمان علی نے غصے سے کپکپاتے ہوئے کہا۔  
 ”میں انسان ہوں مگر تم نہیں۔ تم اپنا جھوٹا کھانا کتے کو دیتے ہو اور جھوٹی عورت  
 میرے حوالے کرتے ہو۔ کیا یہ شرافت ہے؟“

”کسی کے بھی نام منسوب ہو بچہ تو میرا ہی ہو گا۔ ابھی تو نے کہا ہے کہ مجازی نو  
 عورت کی جان و مال کا محافظ ہوتا ہے تو پھر میں مست کی جو دولت لے کر آئی ہوں تو  
 حفاظت کیسے نہیں کرے گا۔ یہاں پہنچ کر تیرا ایمان کیوں ڈنگا رہا ہے۔ تو نے تو اپنا  
 عملی طور پر ثابت کرنے کے لیے مجھ سے شادی کی ہے۔“ ایمان علی کا سر جھک گیا۔  
 عمل اور آزمائش کی گھڑی تھی۔ بڑی سخت آزمائش تھی وہ اندر ہی اندر بری طرح کا  
 تھا۔ کانپتے کانپتے اچانک وہ جوش اور جذبے کے تحت اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایمان دار  
 فرض ہے کہ وہ کسی بھی بے ایمان کا محاسبہ کرے۔ وہ چوہدری کا محاسبہ کرنے کے لیے  
 سے پلٹ کر ایک جھنگلے سے دروازہ کھولتے ہوئے حجرے سے باہر چلا گیا۔ سیکڑے اسے  
 ہی دیتی رہی مگر وہ اس کی آواز سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے  
 سارے پنڈ میں سناٹا چھا گیا تھا۔ مکانوں کے باہر چارپائیوں پر لوگ گہری نیند سو رہے  
 جب وہ حویلی کے دروازے پر پہنچا تو اتنی اونچی حویلی کے سامنے اتنے چھوٹے آدمی کو  
 ایک غارش زدہ کتا بھونکنے لگا۔ اب تک کتنی ہی غارش زدہ بے ایمانیاں اس پر بھونکنے  
 آ رہی تھیں۔ وہ بھونکنے والوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا ایمان کے راستے پر چلتے چلتے ایک  
 ایمان کے دروازے پر آیا۔

دروازے کو پینے لگا۔ وہ بری طرح حواس باختہ ہو گیا تھا۔ وحشت اور جنون نے  
 بھول گیا تھا کہ وہ گوشت پوست کے ایک کمزور ہاتھ سے دولت کے فلولادی دروازے کا  
 رہا ہے ایک ملازم نے جھلاتے ہوئے دروازے کو کھولا۔  
 ”کون گدھا دروازے کو اس طرح پیٹ رہا ہے؟“  
 مولوی کو دیکھتے ہی ملازم ایک دم سے گھبرا گیا۔ پھر جلدی سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

پادری نے ڈھٹائی سے کہا۔

”میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے مجھے نام ہونا پڑے۔ سیکینہ کے باپ برسوں سے میری ملازمت کرتے آئے ہیں۔ یہ غلامی یہ خدمت گزاری سیکینہ کو دور سے ملتی ہے۔ میں اس کے پورے خاندان کی کفالت کرتا ہوں، انہیں روٹی کپڑا دیتا ہوں، اُس کے لیے مکان دیتا ہوں۔ کیا ایک آقا اپنی لونڈی کا ہر طرح سے حقدار نہیں ہوتا؟“

”تم اس مسئلے کی گہرائی کو کیوں نہیں سمجھتے کہ لونڈی کس وجہ سے آقا کے لیے قرار دی گئی تھی اس لیے کہ وہ بازار میں بیچی جاتی تھی۔ دس ہاتھوں میں جانے کے لیے اسے ایک آقا کے پاس محدود کر کے اس کی ملکیت بنادی گئی۔ ایسی صورت میں آقا لونڈی کا ہر طرح سے حقدار ہوتا ہے مگر سیکینہ تو بازار میں بیچی نہیں گئی تھی۔“

”تم سیکینہ کے حالات سے واقف نہیں ہو۔ اس کا ایک بھائی آوارہ اور بد چلن لادھور کی ہیرا منڈی میں رہتا ہے۔ ایک باریہاں آکر سیکینہ کو اپنے ساتھ زبردستی دہلا جانا چاہتا تھا مگر میں نے اسے مار بھجا اور سیکینہ کو بازار میں فروخت ہونے سے بچا۔ خاطر میں نے اسے کثیر کے طور پر رکھ لیا۔ اب بتاؤ میں نے کون سا گناہ کیا ہے؟“

ایمان علی اس بات پر چکر اس گیا۔ اس واقع مسئلے کو سمجھاتے وقت وہ بھول گیا کہ لونڈیاں آج بھی بازاروں میں بیچی جاتی ہیں۔ آج بھی عورت کو خریدنے اور استعمال کا دستور ہے۔ ایمان علی نے سوچا کہ وہ کس لیے محاسبہ کرنے آیا ہے، وہ کون سی بات کہ جس نے اسے بے حد دکھ پہنچایا ہے اور اندر سے اس کے سارے وجود کو جھنجھوڑ دیا ہے۔ جب اسے پتا چلا کہ انسان احمق بننے کے بعد جھنجھوڑا ہے اور احمق بنانے والے غصہ کرتا ہے۔ اس نے کہا ”میں تمہاری بے ایمانی کی شکایت کرنے آیا ہوں۔ تم نے؟“

کو دھوکے سے میری دلہن کیوں بنایا؟ نکاح سے پہلے ہی کیوں نہیں بتایا کہ وہ تمہارے کی ماں بننے والی ہے؟“

چوہدری نے اہانت میں سر ہلا کر کہا ”ہاں کسی حد تک میں اپنی اس غلطی کو حلیم ہوں۔ مجھے نکاح سے پہلے تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا لیکن میں تمہاری طرح مایوس و رندار تو نہیں ہوں، دنیا دار بھی ہوں۔ میں جانتا ہوں کسی چیز میں کھوت پیدا ہو جائے انسان اسے فراخ دل سے قبول نہیں کرتا۔ اگر اس کھوت کا علم تمہیں ہو جاتا تو تم بھی“

غریب لڑکی کا سہارا نہ بننے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے سیکینہ سے بہت زیادہ ہمدردی تھی اور میں اس کے لیے تمہارے جیسا ایک سہارا پیدا کرنا چاہتا تھا۔ نہیں، ہم اس دنیا میں رہ کر صرف اپنے مفاد کو اور اپنی عزت کو دیکھتے ہیں۔ میں زمیندار ہوں۔ زمین فصل پکاتی ہے تو میں اسے کبھی نہیں بچتا۔ عورت فصل پکائے تو میں اسے کھوٹے سکے کے عوض بھی بیچ دیتا ہوں۔ میں نے تم سے ایک پیسہ نہیں لیا۔ تمہارے جیسے مولوی کو جو عین وقت کی روٹیوں کے سوا زندگی کی دوسری ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ایک پیسہ نہیں رکھتا، اسے سیکینہ جیسی خوب صورت لڑکی مفت میں مل گئی ہے۔ میں اب بھی چاہوں تو اسے طلاق دلا کر اور اسے تم سے چھین کر اپنے کسی دوسرے ملازم کو دے سکتا ہوں۔“

ایمان علی غصے سے مٹھیاں بھینچ بھینچ کر اسے دیکھنے لگا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب سیکینہ گھونگھٹ میں چھپی ہوئی اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی تو اس نے اسے پا کر بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا کہ اللہ جب کسی سے خوش ہوتا ہے تو اسے اپنی سب سے عزیز چیز انعام کے طور پر دیتا ہے۔ وہ اپنی کئی ہوئی بات پر خود جیران اور پریشان تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا سیکینہ اللہ کی طرف سے دیا ہوا انعام ہے؟ اس کا عقیدہ تھا کہ اللہ چاہے تو دیتا ہے اور اللہ چاہے تو چھین لیتا ہے۔ مگر چوہدری اس بات کو غلط ثابت کر رہا تھا۔

اس دنیا میں اسے جو بھوک ملی وہ انسانوں کی دی ہوئی تھی۔ یہ انسان ہی ہے جو بابا بلیک شپ کی انگریزی تعلیم دینے کی سوری پے فیس دیتا ہے اور کلام پاک کے سوارو پے دیتا ہے۔ ایمان کا یہ رست خدا نے مقرر نہیں کیا، ایمان والوں کو بھوکا رکھنے کی سازش انسان ہی کرتا ہے۔ وہ چپ چاپ کھڑا غصے سے مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ چوہدری کچھ دیر تک اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا پھر اس نے کہا۔

”مولوی صاحب خاموش کیوں ہو؟ اگر تمہیں میرا دیا ہوا انعام پسند نہیں آیا تو میں اسے واپس بھی لے سکتا ہوں اور اس خوب صورت سے انعام کو کسی دوسرے ملازم کے حوالے بھی کر سکتا ہوں مگر اچھی طرح سوچ لو اس میں مجھ سے زیادہ تمہاری بدنامی ہوگی۔ میں تمہیں اتنا موقع نہیں دوں گا کہ تم مجھے بدنام کر سکو۔ یہاں چاروں طرف میری زمینیں پھیلی ہوئی ہیں، یہاں کے کسان میرے محتاج ہیں، اس پنڈ میں میری حکومت ہے۔ تم میرے منہ گلو گے تو منہ کی کھاؤ گے اور یہاں سے بدنام ہو کر جاؤ گے کہ تم مولوی تھے

جائے گا؟ اور کیا کرے گا؟ وہ خود نہیں جانتا تھا۔ وہ تو بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ اگرچہ چوہدری نے ایک برا انسان ہونے کے باوجود یہ اچھی بات کہ تھی کہ مسجد آخر مسجد ہے اور عبادت کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہ نہ دیکھا جائے کہ اسے بے ایمان نے بنایا ہے، یہ دیکھا جائے کہ اسے ایمان کے لیے بنایا گیا ہے۔ ایمان علی کا اختلاف چوہدری سے ہونا چاہیے، مسجد سے نہیں۔ مگر اس کا دل نہیں مانتا تھا۔ چوہدری کی بے ایمانیوں اور مکاریوں کو دیکھ کر وہ اندر ہی اندر نفرت اور غصے سے تھلا رہا تھا۔ اس کا دل یہی کہہ رہا تھا کہ جب بھی نماز کے اوقات میں سجدے میں سر جھکائے گا تو چوہدری کے فریب کی پوری داستان سجدے میں اس کے سر میں گھومتی رہے گی۔ وہ بظاہر سجدہ کرے گا اور باطن میں اپنے احقر بننے پر اور چوہدری کے احقر بنانے پر کڑھتا رہے گا۔ نہیں وہ ایسی جگہ نماز نہیں پڑھا سکتا۔ پھر وہ کیا کر سکتا ہے؟

یہی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اب وہ کیا کرے گا؟ کہاں جائے گا؟ حالانکہ اس کے قدم بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ بعض اوقات انسان ارادے سے نہیں چلتا، غیر ارادی طور پر اس کے قدم اسے منزل مقصود تک لے جاتے ہیں۔ اس کے قدم حجرے کے دروازے کے پاس پہنچ کر رک گئے۔ وہ گہرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کیا یہی منزل مقصود تھی؟ اس نے تو یہاں آنے کا ارادہ نہیں کیا تھا پھر کون سا جذبہ اسے یہاں تک کھینچ لایا۔ یہاں کون سی ایسی ہستی تھی جو اس کا انتظار کر رہی تھی؟ جب وہ یہاں سے گیا تھا تو وہ اسے پکار رہی تھی۔ وہ جو التجا آمیز پکار تھی، وہ اب تک اس کے ذہن کے کسی گوشے میں چھپی ہوئی تھی جو اسے کشاں کشاں واپس لے آئی ہے۔

دروازے پر آہٹ سن کر سیکنڈ نے سر اٹھایا تو اسے دیکھتے ہی خوشی سے کھل اٹھی۔ آہ کیا اسے دیکھ کر کسی لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ سکتی ہے؟ کسی کا چہرہ انتظار کی طوالت کے بعد اسے دیکھ کر گلاب کی طرح کھل سکتا ہے؟ ہاں یہ جذبہ، یہ خوشیاں اسے مل رہی ہیں۔ وہ جو اس کی سامنے تھی وہ سر سے پاؤں تک اس کی تھی۔ اس کے لیے مسکرا رہی تھی، اس کے لیے کھل رہی تھی اور اس کے انتظار میں اپنی بیماری سے زرد ہونے کے باوجود جاگ رہی تھی۔ اب اس لڑکی کے دماغ میں جتنی سوچیں تھیں، جتنے جذبے تھے، جتنی آرزوئیں تھیں، جتنی سرسختیاں تھیں، وہ سب ایک ایمان کے لیے تھیں۔ وہ کبھی سوچ

مولوی رہے، کسی عورت کے قابل نہ بن سکے۔ کیا تم اپنے سے پہلے والے مولوی کا بھول گئے؟ تمہارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو سکتا ہے۔

وہ بولا جا رہا تھا اور ایمان علی اس کی بات کے وزن کو سمجھتا جا رہا تھا۔ وہ صبح نماز کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس نے غصے سے کہا۔

”یہ بات میری سمجھ میں آگئی کہ انسان اپنے جیسے کسی انسان کو کچھ دیتا ہے تو اس کے پیچھے کوئی غرض پوشیدہ ہوتی ہے یا کوئی فریب چھپا ہوتا ہے۔ تم مفاد پرست ہو تم بھی کرتے ہو صرف اپنے فائدے اور اپنی عزت کے لیے کرتے ہو۔ وہ مسجد بھی تم نے لاچ لیا کسی خاص غرض کے لیے تعمیر کرائی تھی اور اس مسجد میں آنے والے کسی بھی امام کو تم اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہو۔ میں سوچتا ہوں ایسی مسجد میں نماز پڑھنا پڑھنا کہاں تک درست ہے؟“

چوہدری زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔  
”مولوی صاحب تم نادان ہو مسجد کس نے بنوائی؟ کیوں بنائی؟ یہ سوچ کر کیا کرو؟ اسے بنانے والے کی نیت پر چھوڑ دو۔ تم یہ دیکھو کہ وہاں خدا کی عبادت ہوتی ہے یا لوگوں کو سجدہ کرنے کی ایک جگہ مل گئی ہے یا نہیں؟ تمہارا کام نماز پڑھانا ہے، تم کرو۔ دوسرا کیا کرتا ہے؟ دوسرا کس حد تک ایمان والا ہے اور کس حد تک بے ایمان؟ تم دوسروں کے متعلق کیوں سوچتے ہو؟ صرف اپنے ایمان کو کیوں نہیں دیکھتے۔ میں سے کہا تھا کہ جب صحیح معنوں میں زندگی کا بوجھ اٹھاؤ گے، ایک سے دو اور دو سے چارہ رہو گے، ایک کنبے کی پرورش کرو گے تب تمہیں پتہ چلے گا کہ ایمان کو سلامت رکھنا مشکل کام ہے۔ تمہیں ابھی صرف ایک بیوی ملی ہے تو تم اس مسجد کو چھوڑ کر جانا چاہو اور اس بیوی سے بھی کٹنا چاہتے ہو۔ راستے میں کوئی ٹھکرایا ہوا انسان تمہیں نظر آیا کیا تم اسے اور زیادہ ٹھوکر مار کر آگے بڑھ جاؤ گے یا اسے اٹھا کر سہارا دو گے۔ اگر سہارا دینا ایمان ہے تو پھر تمہیں سیکنڈ کو اٹھالیتا چاہیے، اگر اس ایمانی آزمائش ہے گئے تو پھر راتوں رات یہاں سے کہیں دور چلے جاؤ۔ سیکنڈ کو چھوڑ دو اور صاحب! ہونے کا دعویٰ نہ کرو۔“

ایمان علی نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور سر جھکا کر وہاں سے جانے لگا۔

رکھوں گا، مجھے وہ بے ایمان آدمی یاد آتا رہے گا اور میں کڑھتا رہوں گا۔ اس لیے اب میں یہاں نہیں رہوں گا، یہاں سے دور چلا جاؤں گا۔“

”تو کہاں جائے گا؟ اور کیسے جائے گا تو اکیلے جانے کی بات کیوں کرتا ہے؟ میں تو تیری زندگی کا ایک حصہ بن چکی ہوں، سائے کی طرح تیرے ساتھ رہنے آئی ہوں۔ تو جو فیصلہ کرے گا میں اس سے انکار نہیں کروں گی۔ تو ساری زندگی دھوپ میں چلنے کے لیے کھڑے گا تو میں تیرے ساتھ چلتی رہوں گی۔ بول کہاں جانا چاہتا ہے؟ میں بھی تیرے ساتھ چلوں گی۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ تو جہاں بھی جائے گا، تجھے ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا چوہدری ملتا جائے گا۔ تیری عمر مجھ سے زیادہ ہے مگر میری غلامی کا تجربہ تجھ سے زیادہ ہے۔ میں جانتی ہوں کہ غریبوں اور ایمان والوں کی کمزوری سے یہ دنیا والے کس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔“

وہ سیکنہ کا منہ دیکھنے لگا۔ اس کی عمر بے مشکل بیس برس ہوگی اور اس عمر میں وہ بچی ہوئی عمر کے تجربے بیان کر رہی تھی۔ عورت ایک بار ہانڈی کی طرح آگ پر جڑھتی ہے تو چاول کا صرف ایک دانہ نہیں گزاتی، ایک ہی اہل میں وہ تجربات کے سارے دانوں کو پرکھ لیتی ہے۔ اس نے ایک چوہدری کو گھرا کر دنیا کے سارے گلے سڑے چوہدریوں کے چہرے دیکھ لیے تھے۔ اس کے برعکس ایمان علی زمانے بھری ٹھوکریں کھاتا ہوا شاہ پور تک آیا تھا اور تمام تلخ تجربوں کو بھلاتا آیا تھا۔ وہ سیدھا سادا سا انسان اپنے دشمنوں کو معاف کر دینے کا عادی تھا کیونکہ رسول خدا بھی اپنے دشمنوں کو معاف کر دیا کرتے تھے اور اپنے دشمنوں کو سر جھکا کر سوچنے پر مجبور کر دیا کرتے تھے۔ مگر اس اندھیر نگری میں اسے کوئی دشمن سر جھکا کر سوچتا ہوا اور نام ہوتا ہوا نظر نہیں آیا۔ آج تک کسی دشمن نے بھی عداوت سے یہ نہیں کہا کہ مولوی صاحب تم راستی پر ہو۔ وہ یہی کہتے رہے کہ جو زمانے کے ساتھ نہیں چل سکتا، وہ اس زمانے کا سب سے احق انسان ہے۔ اس دور میں زندہ رہنے کے لیے تھوڑی تھوڑی ایمان داری اور تھوڑی تھوڑی بے ایمانی دونوں ہی ہوتی چاہئیں۔ یعنی مسجد کی چھوٹی سی دنیا میں حسب حیثیت تھوڑا تھوڑا کم و فرب ضرور ہو۔ ایک کے منہ سے سونے کا نوالہ چھیننے کے لیے اور دوسرے کے منہ میں جھوٹا لقمہ ٹھونسنے کے لیے یا دوسرے لفظوں میں خود کو اپنی سطح پر زندہ رکھنے کے لیے دوسروں کو اپنی سطح سے نیچے کرانا

بھی نہیں سکتا تھا کہ اک دم سے اسے اتنی ساری جائیداد مل جائے گی اور یہ جائیداد ایک لڑکی کے وجود میں چھپ کر آئے گی۔ وہ پھر اک دم سے ٹھک ہار کر فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ ”آہ! یہ میرے ساتھ کیسا مذاق ہو رہا ہے؟ مجھے خوشیاں بھی دی گئی ہیں تو انہیں جنہر میں ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ یہ میری ہے مگر میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنا نہیں سکتا جب تک کہ یہ پرانے بچے کی ماں بن جائے۔ مجھے کب تک انتظار کرنا ہو گا؟ تو مینے دس بیٹا ایک سال میں گیمبی سزا کاٹوں گا۔ کنویں کے پاس بیٹھا رہوں گا، پیاس کی شدت سے کنویں کا طواف کرتا رہوں گا مگر پانی نہیں پئی سکوں گا۔ یہ میرے ساتھ کیسا مذاق ہو رہا ہے؟ جب اس نے پیاس کے متعلق سوچا تو اسے یاد آیا کہ جب وہ پہلی بار دلہن کے قریب جانا چاہتا تھا تو اس وقت اسے شدت سے پیاس لگ رہی تھی مگر حجرے میں پانی نہیں تھا صرف دودھ کا ایک گلاس تھا جس میں تھوڑا سا دودھ سیکنہ نے پیا تھا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

”مجھے پیاس لگ رہی ہے۔“  
یہ سن کر سیکنہ چارپائی سے اتر کر کھڑی ہو گئی اور دودھ کا گلاس اٹھاتی ہوئی بولی۔  
”یہاں پانی نہیں ہے۔ پتا نہیں تو کہاں چلا گیا تھا اب ٹھک ہار کر آ رہا ہے۔ میں نے بلاتی رہی مگر تو نے جواب نہیں دیا۔ یہ لے دودھ پیا لے۔“  
ایمان علی نے ہاتھ اٹھا کر دودھ لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔  
”میں یہ دودھ نہیں پیوں گا، یہ ایک بے ایمان آدمی کے گھر سے آیا ہے۔“  
سیکنہ نے اس کے قریب اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھتی ہوں کہ تو بہت ایمان والا ہے مگر تو اس دنیا میں لوگوں کی دی ہوئی کس چیز کو ٹھکرائے گا۔ یہاں جو بھی چیز تیرے سامنے آئے گی اس کے پیچھے کوئی نہ لگا رہے ایمانی چھپی ہوگی۔ یہ زمین جہاں تو بیٹھا ہوا ہے یہ بھی اسی بے ایمان آدمی کی ہے۔ مسجد بھی اس کی ہے، یہ پنڈ بھی اسی کا ہے، یہاں کی زمینوں میں اگنے والا اناج بھی اسی کا ہے، یہاں کے کنوؤں سے نکلنے والا پانی بھی اسی کا ہے، تو کتنی چیزوں سے انکار کرے گا۔“  
ایمان علی نے بڑی بے بسی سے اسے دیکھا پھر کہا۔  
”تو ٹھیک کہتی ہے میں بھی یہی سوچتا آ رہا ہوں کہ میں یہاں زمین کے جس حصے پر

پڑتا ہے۔ انسانوں کے درمیان یہ عمل ایک مدت سے جاری ہے۔ اور کتنی مدت! عین نگاہوں کے سامنے تھا۔ ایک پوری عورت اس کے حصے میں آئی تھی۔ اس کی جائداد جاری رہے گا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ ایمان علی نے کہا۔

”تو ٹھیک ہمتی ہے۔ میں بھی اب تک جہاں جہاں گیا، وہاں سجدے کرنے والے۔ اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ اتنی حسین عورت کو چھوڑنے کا دل بھی نہیں چاہتا تھا پھر۔ شرعی طور پر نکاح ہو چکا تھا وہ دل اور دماغ میں بھی سما گئی تھی ہر طرح سے اسے سیکھنے کے آپٹل سے بندھا رہتا تھا۔

وہ اس طرح اکڑوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے اس کے سامنے شباب کی گٹھری بندھی رکھی ہو۔ ایک شوہر ہونے کے ناطے وہ گٹھری کھول سکتا تھا لیکن چھوٹے کا مطلب یہ ہوتا کہ خواہشات سراپا نہیں اور وہ آگے آگے بھٹکا چلا جاتا جب کہ حاملہ دلہن کے ساتھ بھٹکا ممنوع تھا۔ وہ اندر ہی اندر جیسے پک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس عورت کے ساتھ کس طرح آزمائشی زندگی گزارے گا، کب تک پاس رہ کر بھی دور دور رہے گا۔ حجرے کی تنہائی اسے رہ رہ کر صرف ایک جوان عورت کے بارے میں ہمت دور تک سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر کہا۔

”اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔“

سیکنے نے پوچھا۔

”ہم اس وقت کہاں جائیں گے؟ راستے کا علم تو ہونا چاہیے۔“

”بس کہیں بھی جائیں گے؟ مگر یہاں نہیں رہیں گے۔ کسی دوسرے پنڈ میں ہو سکتا ہے، ہمیں سر چھپانے کی جگہ مل جائے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ تو جہاں جائے گا، میں تیرے ساتھ چلوں گی مگر تو ایک جوان عورت کو لے کر اندھری رات میں سفر کرے گا۔ تو کیا راستے میں جو بد معاش نہیں ملیں گے۔ تو بیشک یہ کیوں سوچتا ہے کہ تجھے اتنی رات کو بھی تیرے ہی جیسے ایماندار لوگ راستے دینے کے لیے کھڑے رہیں گے، تیری کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگائیں گے، مجھے تجھ سے چھین کر نہیں لے جائیں گے۔ تو یہ سب سوچتا کیوں نہیں ہے؟“

”کیا مصیبت ہے!“ ایمان علی سر ہٹا کر سوچنے لگا۔ پہلے وہ بڑی بے فکری سے اندھری راتوں میں سفر کرتا تھا۔ اس کے پاس نہ کھانے کے لیے روٹی ہوتی تھی، نہ روٹی خریدنے کے لیے جیب میں پیسہ ہوتا تھا۔ اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی تھی جسے چور

یہ تو ایمان علی نے بھی دیکھا تھا کہ چوہدری ایک ہاتھ سے برائی کرتا تھا اور دوسرے ہاتھ سے نیکی کرتا تھا۔ اس دنیا میں ایسے لوگوں کی اکثریت ہے جو خدا سے ڈرتے بھی گناہ بھی کرتے ہیں پھر اس کا بوجھ کم کرنے کے لیے نیکی بھی کرتے ہیں۔ کسی کے مصیبت میں کام آجاتے ہیں۔ کسی کے بھاپے میں روزی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

زیادہ دولت مند ہوں تو حج کرنے چلے جاتے ہیں تاکہ گناہ دھل جائیں۔ گناہ وہ ضرور کرتے ہیں، کسی کے ساتھ برائی ضرور کرتے ہیں، کسی کو لوٹتے کھوٹتے ضرور ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ نہ کچھ نیکی بھی کرتے جاتے ہیں۔ بس چوہدری ایسا ہی تھا۔ پنڈ والوں کے ہر وقت میں کام آتا رہتا ہے کیونکہ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس کے بوڑھے ماں باپ کو

وقت کی روٹیاں ضرور ملتی رہیں گی۔

لیکن سیکنے کے لیے روٹیوں کا انتظام اب اسے کرنا تھا اور وہ یہ حماقت کر رہا تھا

ایک عورت کا بوجھ لاد کر روٹی حاصل کرنے کی جگہ چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اس نے کل کی

کبھی نہیں کی تھی لیکن اب وہ سیکنے کے لیے سوچ رہا تھا کہ کل وہ اسے روٹی کہاں سے کھلائے گا؟ سوچنے سے تو روٹی نہیں مل جاتی۔ وہ پھر سیکنے کا منہ کھنے لگا گلابی گلابی سا

لیکن سیکنے کے لیے روٹیوں کا انتظام اب اسے کرنا تھا اور وہ یہ حماقت کر رہا تھا

ایک عورت کا بوجھ لاد کر روٹی حاصل کرنے کی جگہ چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اس نے کل کی

کبھی نہیں کی تھی لیکن اب وہ سیکنے کے لیے سوچ رہا تھا کہ کل وہ اسے روٹی کہاں سے کھلائے گا؟ سوچنے سے تو روٹی نہیں مل جاتی۔ وہ پھر سیکنے کا منہ کھنے لگا گلابی گلابی سا

لیکن سیکنے کے لیے روٹیوں کا انتظام اب اسے کرنا تھا اور وہ یہ حماقت کر رہا تھا

ایک عورت کا بوجھ لاد کر روٹی حاصل کرنے کی جگہ چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اس نے کل کی

کبھی نہیں کی تھی لیکن اب وہ سیکنے کے لیے سوچ رہا تھا کہ کل وہ اسے روٹی کہاں سے کھلائے گا؟ سوچنے سے تو روٹی نہیں مل جاتی۔ وہ پھر سیکنے کا منہ کھنے لگا گلابی گلابی سا

ڈاکو راستے میں لوٹ سکیں۔ مگر اب ایک جوان عورت ایک لپٹاتے ہوئے خزانے کی لڑل کر مسجد اور پیش امام کے اخراجات اٹھائیں۔ اس طرح سب لوگ اپنے اپنے گھروں اس کے ساتھ ساتھ چلے والی تھی اور اسے فکر اور پریشانی میں مبتلا کر رہی تھی۔ اب وہ اُسے حسبِ حیثیت چندے کے طور پر چھوٹی بڑی رقیں یا اناج دیں گے اس طرح ہمارا نہیں تھا اس کے پرکٹ دیئے گئے تھے۔ وہ بے پرکار و نہ جو کبھی صرف شمع الٹی کا طواف گزارہ ہو جائے گا۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کے ساتھ چوہدری کی آواز

ایسے وقت پتا چلتا ہے کہ مصلحت اندیشی کسے کہتے ہیں۔ وقت اور حالات کے مطابق۔

انسان کو کام کرنا پڑتا ہے اور حالات کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنی جوان بیوی کو لے کر رات اندھیرے میں نہیں نکل سکتا تھا۔ لہذا اسے ایک بے ایمان کی زمین پر رات گزارنی تھی جب وہ ایک رات گزار سکتا تھا چوہدری کی مسجد میں ایک وقت کی نماز پڑھا سکتا تھا پھر اپنا اور سے ہوئے لئے میں کئے گئے۔

وقت کی نماز میں بھی پڑھا سکتا تھا۔ پھر بات کیا رہ جاتی ہے؟ کس بات کا بھڑکارا جانے سوچا جائے تو بھڑکا کسی بات کا نہیں تھا اور بہت سی باتوں کا تھا۔ لیکن مسجد سے کسی کو وقت نہ جا میں اس سے بات کرتی ہوں۔

اختلاف نہیں تھا مسجد بنانے والے سے تھا۔ اب حالات اسے سوچنے پر مجبور کر رہے تھے۔ ایمان علی نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

کہ سیکینہ کی حفاظت کی خاطر اسے یہاں ٹھہر جانا چاہیے اور اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسجد کے معاملات اپنی جگہ ہیں اور انسانی بھڑکے اپنی جگہ۔ لہذا اسے اسی مسجد میرے سوا تو ہر مرد سے پرہیز کرے گی۔ یہ ہم مردوں کا بھڑکا ہے میں خود ہی منٹ لوں گا۔ تو نماز پڑھنا اور پڑھانا چاہیے۔ اس نے سر اٹھا کر کہا۔

”سیکینہ میں اسی مسجد میں نماز پڑھاؤں گا۔ ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔“

خوش ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے ایمان علی کے لئے کھڑے تھے جیسے ہی وہ باہر آیا چوہدری نے اس کے گریبان کو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے میں ذرا سی لچک پیدا کر دی تھی اور پہلی بار اسے حالات سے سمجھوتہ کرنا سکھایا تھا۔ کہا۔

خوشی سے دودھ کا گلاس پڑھاتے ہوئے بولی۔

”لے لے اے پی لے، تجھے بہت پیاس لگ رہی تھی نا؟“

اس نے سیکینہ کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

”میں اسے منہ نہیں لگاؤں گا۔ میں اسے اپنے لیے حرام سمجھتا ہوں اور حرام آئے گا اسی طرح اس پنڈے کے لیے اناج کی منصفانہ تقسیم ہوگی۔ تو جس طرح مسجد سے ایک لیے کہ چوہدری کے گھر سے آیا ہے۔ میں چوہدری کے گھر کا کھانا بھی نہیں کھاؤں گا۔“

آوی کی اجارہ داری ختم کرنا چاہتا ہے اسی طرح میری دولت، میری جائیداد اور میرے کھیتوں پر سے بھی مجھ جیسے ایک آدمی کی اجارہ داری ختم کرنے کی کوشش کرے گا۔ تو بے سیکینہ نے حیرانی سے کہا۔

”تو پھر ہم روٹی کہاں سے کھائیں گے؟“ اس نے جواب دیا۔

”کل صبح نماز کے بعد میں پنڈوالوں سے کھوں گا کہ وہ ایک مسجد کھیتی بتائیں اور سب رہنے دوں گا۔ اگر تو اپنی خیریت چاہتا ہے تو ابھی اور اسی وقت چپ چاپ یہاں سے چلا جا

ورنہ یہ جوان تیری لاش کو اٹھا کر یہاں سے دور کیس پھینک دیں گے۔“ ایمان علی نے بوکھلا کر کہا۔

”چوہدری یہ یہ تم کیا کر رہے ہو۔ ایک شریف آدمی کا گریبان پکڑنا کہاں تک رہے۔ میں لڑنے جھگڑنے والا آدمی نہیں ہوں۔ سیدھی طرح باتیں کرو۔ میں خود نہیں رہتا چاہتا تھا لیکن دو باتوں نے فی الحال یہاں رہنے پر مجبور کیا تھا۔ ایک سیکڑے چاندنی آگے جانے والے راستے کو روشن نہیں کر سکتی تھی۔ ایمان علی کے ایمان کا نور بھی نہیں رہتا چاہتا تھا لیکن دو باتوں نے فی الحال یہاں رہنے پر مجبور کیا تھا۔ ایک سیکڑے چاندنی آگے جانے والے راستے کی تاریکی کو دور نہیں کر سکتا تھا کیونکہ حسن کا چاند دل کے آسمان پر چمکتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ مسجد کو دیر ان چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ ہاں یہ درست ہے کہ حلال روٹی کھانے کے لیے یہاں مسجد کی بنیاد چاہتا تھا جو تجھے پسند نہیں ہے۔

ناپسندیدگی کے ہمارے تو کس گناہ پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے اور کس طرح خود کو آنا بدنامیوں سے بچانا چاہتا ہے میں یہ اچھی طرح سمجھتا ہوں مگر میں تجھ سے بحث نہیں گا۔ یہاں سے چپ چاپ سیکڑے کو لے کر چلا جاؤں گا۔ تو میرا گریبان چھوڑ دے، میں جا رہا ہوں۔“

چوہدری نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ وہ فوراً ہی پلٹ کر حجرے میں آیا اور بیکر بولا۔

”فیصلہ ہو چکا ہے ہم ابھی یہاں سے جا رہے ہیں۔ میرے ساتھ کوئی مسلمان ہے۔ یہ کپڑا جو میں نے پہنا ہوا ہے بس یہی میرا اپنا ہے۔ تیرے پاس تیرا اپنا جو لباس اسے پہن لے اور یہ دلہن کا سرخ جوڑا اتار دے کیونکہ چوہدری نے اپنے گناہ کا حجرے میں دفن کرنے کے لیے تیرے لیے یہ سرخ کفن سلوایا تھا۔ میں اب اسے بڑا نہیں کر سکتا۔ میں باہر جا رہا ہوں جتنی جلدی ہو سکے لباس بدل لے۔“

یہ کہہ کر وہ اس کا جواب سنے بغیر واپس آگیا اور چوہدری سے تھوڑی دیر کی اجازت چاہی تاکہ اس کی دلہن اپنا لباس بدل لے۔ چوہدری نے سر ہلا کر اسے اجازت دے لیکن وہ اپنے تومبیوں کے ساتھ وہاں کھڑا رہا جب تک کہ سیکڑے اپنے پرانے لباس میں لپیٹ کر باہر نہیں آگئی۔ ایمان علی نے اسے پردہ کرنے کا حکم دیا تھا اسی لیے وہ سر سے تک چادر میں لپیٹی ہوئی تھی۔

چوہدری اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ ایمان علی نے فوراً ہی اپنی دلہن کا ہاتھ تھام لیا وہاں سے دور ہوتا چلا گیا۔

”نہیں جب انہیں معلوم ہو گا کہ تو میرا خاوند ہے تو وہ تیری بڑی عزت کریں۔“  
 وہ کہتے کہتے رک گئی اور ذرا سر تھکا کر اپنے ساتھ چلنے والے مجازی خدا کو دیکھنے  
 پھر سر جھکا کر بڑی آہستگی اور درد بھرے لہجے میں بولی۔  
 ”کیا آج ہماری سہاگ رات ہے؟“

اس کے لہجے میں ایسا درد تھا جو ایمان علی کے دل کو چھو کر گزر گیا۔ واقعی وہ  
 سہاگ رات تھی، دلہانے اچھی طرح اپنی دلہن کا گھونگھٹ بھی نہیں اٹھایا تھا۔ وہ  
 رہا تھا اسے چھو نہیں رہا تھا۔ دلہن اس کے ساتھ تھی مگر سچ کا سفر نہیں تھا۔ ایمان علی  
 پہلے کبھی سہاگ رات نہیں دیکھی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ شب وصال آج کی طرح  
 نہیں ہوتی۔ آج کی رات جذبات کے لاؤ روشن ہوتے ہیں اور خواہشیں دھوم مچاتی  
 وہ سب کچھ سمجھ رہا تھا اور اپنے ساتھ چلتے ہوئے بدن کی آج محسوس کرتا جا رہا تھا۔  
 رہا تھا تڑپ کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔ اس نے بڑی بے بسی سے کہا۔

”ہاں سیکندہ آج سہاگ رات ہے۔ مگر چوہدری کی باتوں میں اگر تو نے جو غلطی کی  
 اس کی سزا تجھے مل رہی ہے اور میں بھی سزا کاٹ رہا ہوں۔ میں تجھے ابھی ہاتھ  
 لگا سکتا۔ ہمارے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے اس کے باوجود میرے اور تیرے در  
 چوہدری کا گناہ سفر کر رہا ہے۔ جب تک کہ وہ گناہ ایک بچے کے روپ میں تجھ سے  
 نہیں ہو گا اس وقت تک تو مجھے پر حرام ہے۔“

وہ چل رہی تھی اور جل رہی تھی۔ ایسے جل رہی تھی جیسے بھری برسات میں گر  
 ہے۔ مگر جلتا بھی ہے اور برسات میں بجھتا بھی ہے اور اپنی راکھ کے ذمیر کے اندر بجھے  
 باوجود کہیں کہیں سے سلگتا بھی رہتا ہے۔ جیسے وہ شرم و حیا کے تحت اوپر سے بھی  
 تھی اور اندر کہیں کہیں سے سلگ رہی تھی۔

وہ چلتے چلتے سنبھلیوں سے ایمان علی کو دیکھنے لگی۔ ہر جوان لڑکی کی طرح اس نے  
 ایک گھبرو جوان کا سپنا دیکھا تھا۔ ایمان علی کسی حد تک اس کے خواب کی تعبیر تھا۔  
 اور لائے قد چوڑی بڑی کا آوی تھا۔ اگر آئے دن فاقے نہ کرتا، بدن پر گوشت ہوتا  
 خوب بھاری بھر کم نظر آتا۔ مگر ایمانداری نے اسے سکھایا تھا کہ وہ لائے پائس کی طرح

آتا تھا۔ اب اس کی ایمانداری سیکندہ کو سکھار ہی تھی۔ سارے جذبات پر اس پر زری  
 تھی۔ ابھی تک وہ اسی انتظار میں تھی کہ یہ ایمان علی اگر حسن کا تمنا ہی ہو گا تو ایک پروانے  
 کی طرح آئے گا۔ اگر جوانی کی مٹھاس پکارے گی تو اس پاس کبھی کی طرح بھینھنائے گا۔ مگر  
 نہ وہ پروانے کی طرح آ رہا تھا، نہ کبھی کی طرح بھینھنا رہا تھا بلکہ ایک بزدل چھمکر کی طرح  
 کانوں کے قریب گنگناتے ہوئے گزر رہا تھا کہ تو مجھ پر حرام ہے۔

سیکندہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شادی سے پہلے وہ کس طرح حلال کر دی گئی اور  
 شادی کے بعد کس طرح حرام ہو گئی۔ یہ درست ہے کہ کھیاں بیماری کا گھر ہوتی ہیں، مٹھائی  
 پر بیٹھ جائیں تو مٹھائی کو ضائع کر دینا چاہیے۔ مگر منگائی کے اس دور میں مٹھائی چیتکی نہیں  
 جاتی صرف کھیاں اڑادی جاتی ہیں۔ اسی طرح سے چوہدری اس پر سے اڑچکا تھا۔ پر ایمان  
 علی کیوں اس مٹھائی سے پرہیز کر رہا تھا؟ یہی بات سیکندہ کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ شرم  
 و حیا کے باعث کچھ پوچھ نہیں سکتی تھی، اس مسئلے پر بحث نہیں کر سکتی تھی اس لیے چپ  
 چاپ چل رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف تاریکی منہ چھاؤں کھڑی تھی اور اسے قدم  
 قدم لٹکتی جا رہی تھی۔ موسم گرما کی ہوائیں تھم تھم کر رہی تھیں۔ چادر میں لپٹے رہنے  
 کے باعث اسے پسینہ آ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا گزر جاتا تو اس کی جان میں جان  
 آتی۔ اس نے پریشان ہو کر چادر کو سر سے ہٹا دیا اور کھلی فضا میں گہری گہری سانسیں لینے  
 لگی۔ اس وقت اسے پتا چلا کہ اس کے ساتھ خاموشی سے چلنے والا اس کی زندگی کا ہم سفر  
 زیر لب گنگناتے ہوئے کچھ کہہ رہا ہے یا کچھ پڑھ رہا ہے۔

”کیا تو کچھ کہہ رہا ہے؟“

ایمان علی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اسے گردن تک بے پردہ دیکھ کر چاروں طرف  
 نظروں دوڑائے لگا کہ کہیں کوئی اس کی دلہن کو بے پردہ تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ صرف اندھیرا  
 دیکھ رہا تھا اور اندھیرے میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے کپے ویران راستے پر کسی کے نظر  
 آنے کی توقع بھی نہیں تھی۔ اس نے مطمئن ہو کر جواب دیا۔

”میں کلام پاک کی تلاوت کر رہا ہوں۔ جب میں تمنا ہوتا ہوں یا لہجے سفر پر نکلتا ہوں تو  
 قرآن خوانی میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ پھر پتا نہیں چلتا کہ اتنا لہجہ کیسے کٹ گیا۔“  
 وہ یہ کہہ کر پھر پڑھنے لگا۔ کچھ اس طرح مصروف ہو گیا کہ زبان پڑھتی جا رہی تھی اور



ایمان علی نے گزیرا کر اسے دیکھا۔ چادر سر سے ہٹی ہوئی تھی مگر تاروں کی روشنی میں اس کی صورت صاف نظر نہیں آئی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

”ہاں اس سے بھی اچھی باتیں ہو سکتی ہیں۔ کیا تجھے کچھ آیتیں یاد ہیں؟“

سکینہ کی بوجھل سی آواز سنائی دی۔

”بچپن میں یاد تھیں۔ جوانی میں چودھری نے بھلا دیں۔“

”میں تجھے پھر سے یاد کراؤں گا چل پڑھ۔“

سکینہ نے جھنجھلا کر کہا۔

”جب مجھے پڑھانا ہی تھا تو در سے میں بلایا ہوتا، اپنے حجرے میں کیوں بلایا تھا؟“

”مورتوں کی یہ بہت بری عادت ہوتی ہے۔ اچھی باتیں سکھاؤ تو حجت کرنے لگتی ہیں۔“

”عورتوں کی نہیں مولویوں کی بری عادت ہوتی ہے۔ ہمیشہ بے وقت نصیحتیں کرتے ہیں دیکھو اتنی دیر میں چاند نکل آیا ہے۔ چاندنی میں یہ ساری دنیا آہستہ آہستہ یوں اجاگر ہو رہی ہے جیسے خالق کائنات ابھی ابھی ہم دونوں کے لیے اس دنیا کی تخلیق کر رہا ہے۔ کیا یہ سب کچھ ہم دونوں کے لیے نہیں بنایا ہے؟ کیا یہاں سے وہاں تک تجھے کوئی۔ خوب صورتی نظر نہیں آ رہی ہے؟“

ایمان علی نے آسمان کے کنارے چاند کا چہرہ دیکھا پھر اپنے کنارے سکینہ کا چہرہ دیکھا۔ وہاں سے یہاں تک کائنات کا حسن ایک نہ ٹوٹنے والے سلسلے کی طرح پھیلا ہوا تھا اور ایک حسن کو دوسرے حسن سے مربوط کر رہا تھا اور اسے سمجھا رہا تھا کہ صرف عبادت کرنے کے لیے فرشتے کافی ہیں۔ انسان کو تو اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ عبادت بھی کرے اور کائنات کے ذرے ذرے کے حسن کو بھی سمجھے اور اسے اپنے طور پر برتے۔ اگر نہیں برتے گا تو تخلیق کائنات کے مقاصد سے انکار کرے گا۔

وہ چلتے چلتے راستے کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور تھکے ہوئے لمبے میں بولا۔

”مجھے پیاس لگی ہے۔ کتنی دیر ہو گئی جب تو دلہن بن کر حجرے میں آئی تھی، میں اس

”یہی تو میں سوچتی ہوں کہ تو رہ کر اپنی پیاس کو کیوں بھول جاتا ہے۔“ ایمان علی نے

دماغ سوچتا جا رہا تھا۔ اکثر رٹا ہوا سبق زبان سے دہراتے وقت دماغ کچھ اور ہی سوچا ہے، کسی اور طرف ہٹکتا رہتا ہے۔ ایمان علی بہت دیر سے اندر رہی اندر ایک جنگ! مصروف تھا۔ وہ پوری توجہ سے پڑھنا چاہتا تھا مگر دماغ تھا کہ ساتھ چلنے والی کی طرف جا رہا تھا جو ایک نئی نویلی دلہن تھی، جو تازہ تازہ کھلے ہوئے پھول کی طرح خوشبو لٹا رہی تھی۔ ایسا نہ ہو کہ اس اندھیرے میں اور اس دیران راستے میں اس خوشبو کو بوٹے والا لیرا آجائے۔

کسی لوٹنے والے کا اتنا زیادہ ڈر نہیں تھا جتنا کہ وہ اپنے آپ سے ڈر رہا تھا اور اپنا سفر سے توجہ ہٹانے کے لیے اللہ کا کلام پڑھ رہا تھا تاکہ شیطان ہمکلام نہ ہو۔ مگر اللہ! شیطان بھی نہیں بولتا جہاں عورت بولتی ہے۔ وہ بولنے لگی۔

”مگر تو اس وقت تنہا نہیں ہے، میں تیرے ساتھ چل رہی ہوں۔ مجھ سے باتیں کر جا تو کیا یہ راستہ نہیں کٹے گا؟ میں تیری بیوی ہوں، بلا تو نہیں ہوں کہ پڑھ پڑھ کر جا رہا ہے۔“

وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس بات کو وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ جب شادی کر دنیا داری شروع کی ہے تو اسے اپنی بیوی کے جذبات اور احساسات کو بھی سمجھنا پڑے اس سے باتیں کرنا چاہیے، اس کی دلجوئی کرنا چاہیے تاکہ اس بے چاری کو تنہائی کا درد نہ ہو۔ وہ یہ سب کچھ سمجھتا تھا مگر اپنے آپ کو بٹکنے اور بھٹکنے سے بچانے کے لیے لہو سے کترانے کے لیے اس وقت یاد الہی میں مصروف رہنا چاہتا تھا۔ ہر کام کے لیے وقت مقرر ہوتا ہے۔ انسان وقت کو مختلف چیزوں اور مختلف عقیدوں میں تقسیم کرنے بعد خدا سے بھی محبت کرتا ہے اور خدا کی بندی سے بھی لہذا وہ خدا کی بندی کو نظر نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے تھک ہار کر کہا۔

”اچھی بات ہے، ہم باتیں کریں گے مگر اچھی اچھی باتیں کریں گے۔“

سکینہ نے دور آسمانوں کے کنارے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ دیکھ آسمان کا کنارہ سرخ ہو رہا ہے، اب چاند نکلنے والا ہے۔ ہر طرف چاندنیا! جائے گی اور ہمیں اندھیرے میں یہ ڈوبی دنیا نظر آنے لگے گی۔ میں تیرا چہرہ دیکھ سکوں گا وقت سے پاسا ہوں۔“

تو میری صورت دیکھ سکے گا۔ کیا یہ اچھی باتیں نہیں ہیں؟“

وہ بھی مطمئن ہو کر قریب آگیا اور تھراس کے پیالے میں پانی نکالنے لگا۔ ایمان علی نے اس کے ہاتھ سے پانی لیتے ہوئے پوچھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”امام دین۔ میں لاہور سے آ رہا ہوں اور اب جمال والا میں اپنے بھائی سے اپنے حصے کی جائیداد حاصل کرنے جا رہا ہوں۔ تمہارا نام کیا ہے؟“

”ایمان علی، میں ایسی جگہ کی تلاش میں سفر کر رہا ہوں جہاں ایمان کو سمجھنے والے مل جائیں۔ میں حافظ قرآن ہوں، کہیں عزت کی روٹی ملے گی تو میں لوگوں کو کلام پاک کی تعلیم دوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ پانی پینے لگا۔ سیکینہ نے ذد کو چادر میں چھپاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

”مجھے بھی پیاس لگ رہی ہے۔“ سی وقت ہوا کا ایک شریر جھونکا آیا اور اس کی چادر کو سر سے اڑا کر شانوں تک پہنچا دیا۔ امام دین کی نظریں اس پردے والی کے چہرے پر پہنچ کر جم گئیں۔ ایمان علی کو پانی پیتے پیتے ٹھنڈا لگا۔ اس نے گھور کر سیکینہ کو دیکھا۔ اس نے قریب پہنچتے ہی نفے کے درد کو نہیں پہنچی اور وہ ٹھنک کر رک گیا۔ اس نے سوچا، پتا نہیں جلدی سے چادر کو سر پر لا کر گھونگھٹ کی طرح چہرے پر کھینچ لیا لیکن اتنی سی دیر میں امام دو انسان کون ہیں؟ دو انسانوں نے سوچا، پتا نہیں وہ آنے والا کون ہے؟ انسان؟ دین کی نگاہوں کے سامنے بجلی سی کووند گئی تھی۔ ایک لمحے کا نظارہ ہزار جلووں پر بھاری ہوتا شیطان؟ آنے والے نے بھی سوچا کہ دونوں بے ضرر راہ گیر ہیں یا لٹیرے ہیں؟ جنگ ہے اور سات پردوں میں چھپنے کے باوجود چشم تصور کو پکارتا رہتا ہے۔ ایمان علی مطمئن جانور ایک دوسرے سے اتنا خوف نہیں کھاتے جتنا کہ تہذیب کے جنگل میں انسان اڑ ہو گیا کہ اس نے اپنی جائیداد کو اچھی طرح چھپا دیا ہے۔ اس نے تھراس کے پیالے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تھوڑا سا اور دو، تمہارے لیے پانی کم تو نہیں ہو گا۔“

”نہیں مجھے آگے جا کر اور پانی مل جائے گا۔“

اس نے دوسری بار پیالے کو بھر دیا۔ ایمان علی نے وہ پیالہ سیکینہ کی طرف بڑھادیا۔ تھی اس لیے میں کچے راستے پر آگیا ہوں۔ میرے تھراس میں برف کا ٹھنڈا پانی ہے سیکینہ پیالے کو لے کر دوسری طرف گھوم گئی اور گھونگھٹ کے اندر برف کی ٹھنڈک کو جلتے اٹھتی میں چار جوڑے کپڑے، شیونگ کا سامان اور دو ہزار روپے ہیں۔ تم مجھے تھوڑے سیٹے میں اتارنے لگی۔ امام دین نے کہا۔

”تم میرے ساتھ جمال والا چلو، وہاں میں تمہیں روزی روٹی سے لگا دوں گا۔ تم وہاں پہنچاؤ، یہ دو ہزار روپے لے لو اور مجھے یہاں سے گزر جانے دو۔“

ایمان علی پتھر سے لٹ کر آئے ہیں۔ ہمارے پاس ایمان کی دولت ہے اس لیے تمہاری بڑی مرانی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک بندے کے لیے دوسرے بندے کے ذریعے تمہاری دولت کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ تم میں پیاسا ہوں گیا تھوڑا سا پانی پلاؤ؟ ذق کا سامان کرنا ہے۔ تم آگے بڑھو، میں وہاں ضرور آؤں گا۔“

چونک کر اسے دیکھا۔ چادر اب شانے سے بھی ڈھلک گئی تھی۔ وہ پتہ کہیں چادر کے اندر گھنٹ ہو گیا تھا اور کوہ آتش فشاں کی طرح دھکتے اور بھڑکتے ہوئے سینے میں سانس لگتا ہو رہی تھیں۔ چاندنی کے سحرے جنگل میں جنگل گلاب کی گلابیاں گھر رہی تھیں۔ آ شب کی سبک ہوائیں اس کی زلفوں سے کھیل رہی تھیں اور محبوب کی تادیبہ انگلیوں کی طرح کھڑے کی چاندنی پر سائے بکھیر رہی تھی۔

وہ بے اختیار اپنی پھیلی سے اپنے سینے کو سسلانے لگا۔ اندر آگ لگی ہوئی تھی اور آگ پانی سے بجھ سکتی تھی۔ یہاں تو پانی نہیں ملے گا۔ اس کی نظریں چاروں طرف ہلنے کے کرپلا میں جھٹکتے لگیں۔ وہ دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے کے سامنے خاموش رہے ہوائیں سک رہی تھیں۔ اگر وہ اسے سمجھ لیتا تو وہی ہوائیں گنگنائی ہوئی ہوتیں۔ سوچ سے جذبہ بدلتے ہیں اور جذباتوں سے کائنات کی ہر چیز کا رنگ ڈھنگ بدلتا ہے۔ اچانک ہی ساری فضا گنگنائی لگی۔ دور سے کوئی راہ گیر کا تہا ہوا آ رہا تھا۔ قریب پہنچتے ہی نفے کے درد کو نہیں پہنچی اور وہ ٹھنک کر رک گیا۔ اس نے سوچا، پتا نہیں جلدی سے چادر کو سر پر لا کر گھونگھٹ کی طرح چہرے پر کھینچ لیا لیکن اتنی سی دیر میں امام دو انسان کون ہیں؟ دو انسانوں نے سوچا، پتا نہیں وہ آنے والا کون ہے؟ انسان؟ دین کی نگاہوں کے سامنے بجلی سی کووند گئی تھی۔ ایک لمحے کا نظارہ ہزار جلووں پر بھاری ہوتا شیطان؟ آنے والے نے بھی سوچا کہ دونوں بے ضرر راہ گیر ہیں یا لٹیرے ہیں؟ جنگ ہے اور سات پردوں میں چھپنے کے باوجود چشم تصور کو پکارتا رہتا ہے۔ ایمان علی مطمئن جانور ایک دوسرے سے اتنا خوف نہیں کھاتے جتنا کہ تہذیب کے جنگل میں انسان اڑ ہو گیا کہ اس نے اپنی جائیداد کو اچھی طرح چھپا دیا ہے۔ اس نے تھراس کے پیالے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

سے ڈرتا ہے۔ آنے والے نے مولوی ایمان علی سے پوچھا۔

”تم کون ہو؟“

جواب میں مولوی نے پوچھا، ”اور تم کون ہو؟“

”میں جمنالالا کے چوہدری دین محمد کا چھوٹا بھائی ہوں، راستے میں بس خراب تھی اس لیے میں کچے راستے پر آگیا ہوں۔ میرے تھراس میں برف کا ٹھنڈا پانی ہے سیکینہ پیالے کو لے کر دوسری طرف گھوم گئی اور گھونگھٹ کے اندر برف کی ٹھنڈک کو جلتے اٹھتی میں چار جوڑے کپڑے، شیونگ کا سامان اور دو ہزار روپے ہیں۔ تم مجھے تھوڑے سیٹے میں اتارنے لگی۔ امام دین نے کہا۔

ایمان علی پتھر سے لٹ کر آئے ہیں۔ ہمارے پاس ایمان کی دولت ہے اس لیے تمہاری بڑی مرانی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک بندے کے لیے دوسرے بندے کے ذریعے تمہاری دولت کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ تم میں پیاسا ہوں گیا تھوڑا سا پانی پلاؤ؟ ذق کا سامان کرنا ہے۔ تم آگے بڑھو، میں وہاں ضرور آؤں گا۔“

سیکنہ نے ہاتھ بڑھا کر خالی پیالہ واپس کر دیا۔ امام دین نے اس کے حنائی ہاتھ کو پکے ہوئے کہا۔

”اب ہماری منزل ایک ہو گئی ہے تو پھر ہم آگے پیچھے کیوں چلیں؟ ساتھ چلیں گے! ایمان علی نے اپنی دامن کو دیکھا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا ”میرے ساتھ میری گھبراہٹ ہے اور یہ بہت تھک گئی ہے۔ ابھی ہم یہاں سناٹا میں گم، تم اپنا راستہ کھوٹا کر دے، نہ بڑھ جاؤ۔ ہم تمہارے پیچھے وہاں پہنچ جائیں گے۔“

امام دین نے تھوڑا سا کومند کرتے ہوئے کہا۔

”سفر میں ایک سے دو ہوں تو راستے میں کسی کا خوف نہیں ہوتا۔ راستہ بھی آٹا سے کٹ جاتا ہے ویسے تمہاری مرضی۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنی اٹیچی اٹھائی اور وہاں سے آگے بڑھنے لگا۔ ایمان علی نے اپنی اشارے سے سیکنہ کو سمجھایا کہ وہ پھر بیٹھ کر زرا آرام کرے۔ وہ حکم کی بندی بیٹھ گئی۔ گھونگٹھ کے پیچھے سے جانے والے قدموں کی چاپ سنتی رہی۔ جانے والا تھوڑا جا کر رک گیا پھر چلتی کر کفن میں لپٹی ہوئی عورت کو دیکھا۔ ایک سرد آہ بھری پھر دھڑلہ راہ پر چلتے ہوئے اونچی آواز میں گانے لگا۔

”تو جنگل کا پھول ہے تجھے کھلتے ہوئے کس نے دیکھا ہے؟ تو رنگ ہے خوشبو جنگل کے جانور تیری خوشبو پہچانے بغیر تجھے دیکھے بغیر، سر جھکا کر اپنے چاروں گھاس کو سونگھتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اے جنگل کے پھول میرے پاس حسن نظر میرے سینے میں ایک عاشق کا دل ہے اور میرے منہ میں ایک شاعر کی زبان ہے، میں حسن کو شعروں کے ترنم سے سنوارتا ہوں۔ مگر حسن و شباب کے خزانے پر ایک ماہی کھڑی مارے بیٹھا ہے۔ میں تجھے دیکھ سکتا ہوں، تیری تمنا کر سکتا ہوں مگر تجھے چھو سکتا۔“

ایمان علی نے دور آگے جانے والے راستے کی طرف دیکھا۔ اس راستے کے افق میں

کی زبان کا محتاج ہوتا ہے۔ سیکنہ کو وہ گیت بہت اچھا لگا تھا مگر وہ گیت اب سنائی نہیں دے رہا تھا۔ دور جاتے جاتے فاصلے کی کھڑکی میں گر کر زخمی ہو گیا تھا۔

بہت دیر بعد جب گھونگٹھ کی کال کو ٹھری میں اس کا دم گھٹنے لگا تو وہ گھبرا کر بولی۔

”مجھے گرمی لگ رہی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے اتنی بڑی دنیا میں، میں اکیلی بیٹھی ہوں تو بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے سر پر سے چادر ہٹا دی۔ ایمان علی نے اعتراض نہیں کیا کیونکہ اسے دیکھنے والا چلا گیا تھا اور اب اسے دیکھنے کا حق صرف ایک مجازی خدا کو تھا۔ اگر مرد کے بس میں ہوتا تو دنیا کی ہر خوب صورت چیز کو وہ صرف اپنی جاگیر بنالیتا۔ ایمان علی جاگیر داری کے خلاف تھا۔ اسے زندگی میں جو کچھ ملا اس میں دوسروں کو برابر شریک بنایا۔ سب کے ساتھ مل کر دینی تعلیم حاصل کی۔ سب کے ساتھ مل کر عبادت کی حتیٰ کہ روٹی جیسی چیز جس کے لیے انسان کتوں کی طرح لڑتا ہے، اس روٹی میں بھی وہ دوسروں کو شریک کرتا رہا۔ اگر اس کے پاس بہت سی زمینیں ہوتیں تو وہ انہیں دوسروں کو تقسیم کر دیتا۔ دولت ہوتی تو دوسروں کی ضرورت سے بھی زیادہ گھر گھر پہنچا دیتا۔ مگر یہ کم بخت عورت ایسی چیز ہوتی ہے کہ تقسیم نہیں ہوتی۔ جب تک اسے اپنی جاگیر نہ بناؤ اس وقت تک اپنی نسل، اپنے نام سے نہیں بکارتی جاتی۔ اگر اس طرح دیکھا جائے تو مرد کبھی عورت سے محبت نہیں کرتا۔ صرف اپنے نام کی فصل اگانے والی زمین سے پیار کرتا ہے۔ یہ محض شاعر ہے جو عورت کو نت نئے روپ میں پیش کرتا ہے اور اس کے لیے دل کو دھڑکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ سیکنہ نے پھر پر

”تو بہت زیادہ تھکا ہوا ہے یہاں بیٹھ جا۔“

ایمان علی نے دور آگے جانے والے راستے کی طرف دیکھا۔ اس راستے کے افق میں

ایمان علی کو ایسا لگا جیسے وہ اسے گالیاں دیتا ہوا جا رہا ہے۔ اس نے سیکنہ کو بلایا مگر وہ غروب ہو گیا تھا مگر ایک پریشانی طلع ہو گئی تھی۔ وہ اس کی بیوی کے متعلق بڑی ہوئے کہا ”شاعر حسن کو بے نقاب کرتے ہیں اور الفاظ کی بازی مگرمی سے بڑھ کر چاہت سے ایک گیت گاتا ہوا گیا تھا۔ اس نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا وہاں چوہدری والوں کے جذبات کو بھڑکاتے ہیں۔ ان شاعروں کی گردن اڑا دینا چاہیے۔“

برکت علی اس کی بیوی کو چاہنے کے بعد چھوڑ چکا تھا۔ اسے پیچھے بھی پریشانیاں ملی تھیں اور وہ اپنے طور پر درست کہہ رہا تھا مگر حسن اپنی مکمل شخصیت کو پہچاننے کے لیے آگے بھی پریشانیاں مل رہی تھیں۔ وہ چلتے چلتے نہیں تھکا تھا، پریشانیوں نے اسے تھکا کر پتھر بنا دیا تھا۔ بیٹھنے کے بعد اس نے کہا۔

نہ رہا تھا۔

ایسی کھڑی ہوئی چاندنی میں دلوں کے اندر کتنا اندھیرا اور سناٹا تھا۔ نہ رنگ نہ روپ زندگی کے تمام سر کھو گئے تھے۔ سر کے بغیر یہ ساری دنیا گونگی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے تو قبروں پر نود خوانی ہوتی ہے مگر وہ مرد اپنی قبر میں خاموش پڑا تھا۔ ایک وفا شعار بیوی کے اندر جب سائے سپنوں کا شیش محل چکنا چور ہوتا ہے تو اوپر سے اس کی وفا نہیں جاتی۔ اندر سے کوئی ہونی کرچیوں کی طرح اس کی سوجھیں کھڑ جاتی ہیں۔ کم از کم ہماری مشرقی عورتوں کا یہی آدرش ہے کہ اندر سے ریزہ ریزہ ہو جائیں اور اوپر سے مکمل مجسم اور چمکی طرح مستحکم رہیں۔

آگے جا کر پھر انہیں رکنا پڑا کیونکہ فجر کی نماز کا وقت ہو چلا تھا۔ وہ سیکنہ کو لے کر کچی سڑک کو چھوڑا ہوا کھیتوں میں آگیا پھر اپنے کانڈھے پر بڑا بڑا سا رومال ایک جگہ بچھا کر نماز پڑھنے لگا۔ وہ کئی بار عشا کے وضو سے فجر کی نماز پڑھ چکا تھا۔ اسی وضو سے تہجد کی نماز بھی پڑھی تھی اور تسبیح خوانی کرتا رہا تھا۔ کسی ایسے خیال کو دماغ میں جگہ نہ دیتا تھا جس سے وضو مجروح ہوتا ہے۔ اس وقت بھی نماز پڑھنے کے دوران زبان آیتوں کا ورد کر رہی تھی مگر دماغ سوچ رہا تھا۔

وضو تو سلامت ہے۔ ایک دلہن کی آمد نے مجھے بھگایا تو نہیں تھا۔ نہیں میں نہیں بھگا تھا البتہ خیالات ابھی تک بھٹکتے آرہے ہیں مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ شیطان تو اکثر خیالوں میں چھپ کر آتا ہے۔ ہاں اگر سوچنے والا بھی شیطان بن جائے تب وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ نہیں میرا وضو سلامت ہے۔ ایسی ہی الجھی الجھی سوچوں کے دوران نماز ادا ہو گئی۔ وہ بھر سیکنے کے ساتھ اپنی راہ پر چل پڑا لیکن وہ اپنی عبادت سے مطمئن نہیں تھا۔ اندر سے بہت زیادہ پریشان تھا کہ اب یہ عورت اس کی عبادت میں بھی گھسی آ رہی ہے۔ ایسا کب تک ہوگا اس طرح زندگی کیسے گزرے گی؟ یہ تو اسی طرح ساری عمر چلتی رہے گی۔

مگر سوچ سوچ کر اسے اپنی زندگی سے نہیں بھگا سکتا تھا۔ وہ کوئی شیطان یا شیطان کی نالہ نہیں تھی کہ لا حول پڑنے سے بھاگ جاتی۔ باقاعدہ ایجاب و قبول کے بعد آئی تھی۔ واقعی یہ ایمان کی آزمائش تھی۔ اب اسے تاحیات ایک بہت ہی خوب صورت چاندنی کی طرح چمکتی ہوئی تلوار کی چھاؤں میں نماز پڑھتے رہنا تھا۔

”امام دین کو ذرا اور دور نکل جائے دو یہ آج کل کے نوجوان اس قابل نہیں کہ ان کے ساتھ شریف عورتیں سفر کر سکیں۔“

سیکنہ نے حیرانی سے پوچھا ”اس بے چارے نے ہمارا کیا لگاڑا ہے؟ اس نے تو پانی پلایا تھا پھر تجھے روزی روٹی سے لگانے کی بات کر رہا تھا۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ وہ اللہ ساتھ تخلص نہیں تھا۔“

”یہ بات بہت دیر سے سمجھ میں آئی ہے کہ کسی خلوص کے پیچھے کیا ہوتا ہے؟ اپنی میں دو ہزار روپے تھے۔ میں نے اس کی دولت کی طرف نہیں دیکھا مگر وہ میری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حالات نے مجھے وقت سے پہلے محتاط ہونا سکھا دیا ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تو جمال والا نہیں جائے گا۔“

”مجھے اپنی چیز کی حفاظت آپ کرنا ہے۔ میں کہیں بھی جاؤں مجھے تھک پرکھ رکھنی پڑے گی لہذا جمال والا جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہم وہاں ضرور گئے۔“

سیکنہ خوش ہو گئی مگر اس نے خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ مبادا ایمان علی ثبے ہو جائے۔ اس کی خوشی محض اس لیے تھی کہ آگے بڑھتے ہی ایک ٹھکانہ ملے والا تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ آگے دو درمیان وہی جانی پہچانی خاموشی تھی مگر سیکنہ کے احساسات اک ذرا سا بدل گئے۔ اگرچہ اس کی وفا محض ایمان علی کے لیے تھی مگر اس کی سوچ اس کے گیت کی طرف رہی تھی جو زخمی پرندے کی طرح پھر پھرتا ہوا کہیں گر پڑا تھا۔ اگر کسی گیت سے پا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ گیت والے سے بھی پیار ہو جاتا ہے۔ گیت تو ایک نوا پانی کی پٹی ہے جو حرارت سے چلتی ہوئی عورت کی پیشانی پر رکھی جاتی ہے۔ اس ختم نہیں ہوتا زار سا اتر جاتا ہے۔ وہ جانے والا جو تعریف کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نواز طور پر دے گیا تھا یہی خیرات وہ اپنے ایمان علی سے چاہتی تھی۔ سہاگ رات میں بہت کچھ نہیں دے سکا تھا مگر تعریف کے دو بول تو دے سکتا تھا۔ اگر اسے پالنے صرف خدا ہی کا شکر ادا کر لیتا تو اس بہانے ایک عورت کو اپنی اہمیت کا احساس ہو جاتا ہے تو اچھا چھٹا ہوا ڈھول ہوتا ہے کہ کبھی آواز میں ہی جیتا ہے لیکن وہ تو کہیں سے

جب وہ جمال والا پہنچے تو دن کا اجالا اچھی طرح پھیل چکا تھا۔ کسان کہتوں میں لڑا ہونٹوں کے بجائے مونچھوں سے پوچھ رہا ہو۔

رہے تھے۔ پنڈ کی عورتیں نہر کے کنارے کپڑے دھو رہی تھیں اور غسل کر رہی تھیں۔ ایمان علی نے جواب دیا ”میں حافظ قرآن ہوں، شاہ پور کی مسجد میں پیش امام تھا۔ اس ایک اجنبی مرد اور ایک عورت کو اس کے ساتھ دیکھ کر عورتیں باتیں کرتے کرتے بگڑنے سے پہلے بھی کتنی ہی مسجدوں میں نماز پڑھا چکا ہوں۔ یہاں اپنا ٹھکانہ بنانے آیا ہوں اگر خاموش ہو گئیں اور ایک دو سرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھ بٹھکے نماز پڑھانے اور پنڈ کے بچوں کو دینی تعلیم دینے کا موقع دیا جائے تو یہ آپ کے لیے میں پوچھنے لگیں کہ اس اجنبی کے پیچھے چلنے والی عورت کون ہو سکتی ہے؟ اگرچہ عورت، ثواب کا کام ہو گا اور اس طرح میرا بھی ٹھکانہ ہو جائے گا۔“

ایک عورت سے اتنی دلچسپی نہیں ہوتی جتنی کہ اس کے ساتھ والے مرد سے ہوتی ہے۔ چوہدری دین محمد نے دور حویلی کے سائے میں کھڑی ہوئی سیکنہ کی جانب دیکھا۔ وہ نظر عورت چادر میں سر سے پاؤں تک چھپی ہو تو صرف اس لیے دیکھنے کا شوق پیدا ہو جاتا نہیں آری تھی چادر میں لپٹی ہوئی تھی مگر یہ سمجھ میں آ جاتا تھا کہ وہ کوئی عورت ہی ہے۔ کہ وہ ہم عورتوں کے مقابلے میں کسی ہے؟ کیا سنگھار ہے؟ کیا پستا ہے؟ جیسی جگہ اس نے ایمان علی سے پوچھا۔

”وہ کون ہے؟“

رنگ روپ میں ہماری جیسی تو نہ ہوگی۔

ذرا دور جا کر ایمان علی نے ایک بوڑھے سے پوچھا کہ چوہدری دین محمد کی حویلی کا ”وہ میری بیوی ہے۔ اگر میں تھا ہوتا تو مگر مگر بھٹکنے کی اتنی فکر نہیں ہوتی۔ میں اس عورت کو ساتھ لے کر دور دور تک نہیں بھٹک سکتا اگر آپ میرا پی فرمائیں تو۔۔۔۔“

چوہدری نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”یہاں آئے دن مسافر آتے جاتے رہتے ہیں۔ میں کتنوں پر مہمانیاں کر سکتا ہوں۔ یہاں کی مسجد میں ایک مولوی صاحب نماز پڑھاتے ہیں اور پنڈ کے بچوں کو تعلیم بھی دیتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں یہاں بوڑھا انیس ساتھ لے کر حویلی کی طرف جانے لگا۔ بستی کے اندر سے گزرنے، نمازے مستقل ٹھکانے کا بندوبست نہ کر سکوں گا۔ تم مسافر ہو، تمہارے ساتھ ایک بعد آخری سرے پر چوہدری کی حویلی تھی۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ چوہدری حویلی کے پیچھے زوروت ہے اس لیے آج میرے مہمان خانے میں رہ جاؤ۔ یہاں تمہیں کسی قسم کی تکلیف ہے۔ بوڑھا انیس حویلی کے پیچھے لے گیا۔ چوہدری دین محمد قدم میں جھوٹا تھا گھڑیل ڈالہ ہوگی، کل جہاں چاہے چلے جانا۔“

میں بھینس کی طرح نظر آتا تھا۔ اور بھینس کی طرح کالا بھی تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی بڑی ایمان علی نے مابوس ہو کر دور کھڑی ہوئی سیکنہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس بوجھ کو اٹھانے موٹھیں اسے بڑی حد تک خطرناک بتا رہی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھ کر پر رکھے اپنے اوپر لہاں کہاں گھوم سکتا تھا۔ امام دین نے تو کہا تھا کہ اس پنڈ میں اسے ٹھکانہ مل جائے گا۔ سے کام کروا رہا تھا۔ دو آدمی ایک جگہ لکڑی کے چار کھجوں کو گاڑنے کے بعد اس پر بچوں نے چوہدری کو امام دین کا خالہ دیا ”چوہدری صاحب ابھی جب ہم یہاں آ رہے تھے تو ڈال رہے تھے اور چھپر کے نیچے جو زمین تھی اسے ہموار کرنے کے بعد ایک آدمی گلی لڑا سے تھے آپ کے چھوٹے بھائی امام دین سے ملاقات ہوئی تھی۔“

امام دین کا نام سننے ہی چوہدری کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ بے اختیار ایک قدم سے اسے لپ رہا تھا۔ ایمان علی سیکنہ کو حویلی کی دیوار کے سائے میں چھوڑ کر چوہدری کی طرف بڑھنے لپٹے چلا گیا اور ایمان علی کو ایسی دشت زدہ نظروں سے دیکھنے لگا جیسے ایمان علی نے امام چوہدری اسے آتے ہوئے غور سے دیکھ رہا تھا قریب آنے پر اس نے پوچھا۔

بن کا نام لے کر اسے پتھر مارا ہو۔ ایمان علی اسے بتا رہا تھا کہ کس طرح اس کے بھائی سے ”تم کون ہو؟“ یہ پوچھنے کے دوران اس کی گھپے دار مونچھیں یوں ہلنے لگیں جیسے ملاقات ہوئی تھی اور اس نے یقین دلایا تھا کہ اس پنڈ میں وہ اسے روزی روٹی سے لگا دے

گا۔ اس کی باتوں کے دوران چوہدری کسی حد تک سنبھل گیا۔ اس نے حیرانی سے پھر وہ غائب ہو گیا اور وہ دو ہزار روپے بھی غائب ہو گئے۔ اب یہ تم ہی جج جج بنا سکتے ہو کہ وہ دو ہزار روپے کہاں گئے؟ اور میرا بھائی کہاں گیا؟“

ایمان علی نے گھبرا کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

”وہ یہاں سے پانچ میل دور اسی کپے راستے پر ملا تھا جو شاہ پور سے ملتا ہے۔“ چوہدری نے اپنی مٹھیاں ہنپتے ہوئے کہا۔

”وہ راستہ یہاں آتا ہے مگر امام دین یہاں کیوں نہیں آیا؟ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟“ یہ کتنی دیر کی بات ہے؟“

”وہ تقریباً تین گھنٹے پہلے مجھ سے ملا تھا۔ اسے تو ہم سے بہت پہلے یہاں چاہیے تھا۔“

چوہدری نے حیرانی اور پریشانی سے کہا۔

”سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہاری باتوں پر کس طرح یقین کر لوں۔ وہ تمہارے پہلے چلا تھا مگر ابھی تک نہیں پہنچا۔ تین گھنٹے میں تو ایک بھینس بھی نہیں پہنچ جاتی پھر وہ اب تک یہاں کیوں نہیں پہنچا۔“

ایمان علی نے گڑبڑا کر کہا۔

”میں کیا جانوں؟ امام دین کو تو یہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں آپ سے اپنی جائداد کا حصہ مانگنے آ رہا ہے اور اسی کے ساتھ ہی اس نے دلایا تھا کہ وہ یہاں میرے بھی رہنے کا بندوبست کر دے گا۔“

چوہدری اس کی باتیں سن رہا تھا اور اسے گہری جھپٹی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس نے ایک بار پلٹ کر کام کرنے والے آدمیوں کی جانب دیکھا جو چھت ڈالنے کے نیچے والی زمین کو لینے میں مصروف تھے پھر اس نے پوچھا۔

”کیا میرے بھائی کے ساتھ کچھ سامان بھی تھا؟“

”جی ہاں۔ اس کے پاس ایک تھرماس اور ایک اٹیچی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس کے ساتھ دو ہزار روپے ہیں۔“

چوہدری نے غصا کر کہا۔

”ہوں۔ اس کے اٹیچی میں دو ہزار روپے تھے اور وہ تم سے دیران راستہ تلو کر رہے ہوں۔ باتوں کے دوران ان کے ہاتھ اوھر سے اوھر مل رہے تھے۔ ناپتے اور

”آپ کو یقین کرنا چاہیے۔ میں لالچی انسان نہیں ہوں جو کچھ مانگتا ہوتا ہے اپنے خدا سے مانگتا ہوں۔ اپنی محنت کے صلے میں دنیا والوں سے صرف تین وقت کی روٹیاں طلب کرتا ہوں۔ کوئی میری ضرورت سے ایک روٹی بھی زیادہ دے تو میں نہیں لیتا پھر دو ہزار روپے جیسی بڑی رقم کیسے لے سکتا ہوں؟“

”ہر شخص اپنی صفائی پیش کرتے وقت ایماندار بن جاتا ہے۔ ویسے تم اپنے چہرے سے اور آنکھوں کی معصومیت سے شریف آدمی نظر آتے ہو۔ تم یہاں ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ اپنے آدمیوں کی طرف چلا گیا۔ وہ لوگ ابھی تک چھپر ڈالنے کے کام میں مصروف تھے۔ اس کے نیچے کی زمین اچھی طرح لپ دی گئی تھی۔ چوہدری نے اپنے تین آدمیوں کو قریب بلایا۔ جب وہ آگئے تو اس نے پلٹ کر ایمان علی کی طرف یوں دیکھا جیسے اپنے اور اس کے درمیان فاصلے کو سمجھ رہا ہو۔ اتنا فاصلہ تھا کہ ایمان علی ان کی باتیں نہیں سن سکتا تھا۔ پھر بھی وہ احتیاطاً اپنے آدمیوں کے ساتھ ذرا دور چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے ان سے کچھ کہا۔ اس کی بات سنتے ہی وہ چونک کر ایمان علی کی طرف دیکھنے لگے۔ اتنے طویل فاصلے کے باوجود ایمان علی نے ان کے چہروں پر بہت زیادہ پریشانی اور گھبراہٹ دیکھی۔

لہراتے ہوئے ہاتھوں سے اس حد تک اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی بات  
 رہے ہیں اور چوہدری کے سامنے اپنی تجویز پیش کر رہے ہیں۔ اگر انسانوں کی دنیا میں  
 کے لیے زبان نہ ہوتی تو اشاروں کی زبان سے بھی غریب اور امیر طبقے کا فرق قائم  
 ہے۔ وہ تینوں ملازم باہتھ ہلا کر باتیں کر رہے تھے مگر عبد ان کے آقا نے نہیں ہنسے اس طرح مجھ پر کتنی مضحک نازل ہوئی گی۔  
 پاؤں چٹا تو پاؤں کی ایک ہی ٹھوک سے دوسرے طبقے کے ہاتھ کٹی ہوئی شاخوں کی طرح  
 گئے۔ پہلے ان کے سر انکار میں دائیں بائیں مل رہے تھے چوہدری کے پاؤں نے بھائی یہاں پہنچا ہی نہیں ہے تو کوئی یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ آپ نے اسے راستے سے ہٹایا  
 سے نیچے پٹنے لگے۔

جب وہ لوگ ایک فیصلے پر متفق ہو گئے تو چوہدری نے ایمان علی کے قریب سے  
 ”میرے ملازموں کا بھی یہی خیال ہے کہ تم شریف آدمی ہو میرے ساتھ حلیٰ ملنا نہیں پہنچا ہے مگر تم یہ کسی سے کہو گے کہ وہ یہاں سے پانچ میل دور تم سے ملا تھا اور تم سے  
 وہاں روٹی کھا کر تھوڑی دیر آرام کرلو۔ میرا خیال ہے کہ تم رات بھر کے جاگے تھیں کھٹے پہلے اُدھر آ رہا تھا تو کیا ایسی صورت میں میرے دشمن مجھ پر شبہ نہیں کریں گے  
 وہاں تم آرام سے سو سکو گے۔“

ایمان علی سیکٹہ کو ساتھ لے کر چوہدری کے پیچھے چلا ہوا حلیٰ کے سامنے  
 دروازے پر آکر رک گیا۔ چوہدری انہیں باہر چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ تقریباً پندرہ من  
 بعد ان دونوں کو اندر بلایا گیا اور حلیٰ کا سامنے والا کمرہ انہیں آرام کرنے کے لیے نہیں ہو سکتا۔  
 گیا۔ کھانے کے لیے روٹیاں بھی آگئیں۔ سیکٹہ کو کھانے کے لیے زمان خانے میں لے گئے؟  
 گیا۔ ایمان علی کھانا کھا تا رہا اور تشویش کا اظہار کرتا رہا کہ امام دین اپنے پنڈے کے قریب  
 ”میرے زبان بند رکھنے سے کیا ہو گا؟“

کر کہاں غائب ہو گیا؟ ایمان علی نے اس سے پوچھا۔  
 ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس پاس کے پنڈے میں آپ کے رشتے دار ہوں یا امام دین لاہور میں ہے۔ اگر وہ وہاں بھی نہ پایا گیا تو کوئی یہ نہ سمجھے گا کہ وہ پنڈے کی طرف آیا تھا  
 کوئی دوست ہو جس سے وہ ملنے چلا گیا ہو؟  
 ایسا کوئی نہیں ہے جس کے لیے وہ راستہ بدل دے۔ تم کہتے ہو کہ وہ مجھ سے ہائیں ہو گا یعنی وہ چشم دید گواہ اپنی زبان بند رکھے گا تو میری بہت سی مضحک نازل جائیں  
 حصہ مانگتے آ رہا تھا۔ دوسرے یہ باتیں سنیں گے تو یہی شبہ کریں گے کہ میں نے انہیں۔“

جاننا دھم کرنے کے لیے اسے راستے سے ہٹا دیا ہے۔ زر زن اور زمین الٹا چڑھا  
 جس کے لیے بیٹے باپ کو اور بھائی بھائی کو قتل کر دیتے ہیں۔ تمہاری زبان سے جاننا دھم لیتا ہے۔ یوں بھی میں غیر ضروری باتیں نہیں کرتا۔ میں کسی کے سامنے اس کی بات  
 ہزارے کی بات سن کر میرا سکون برباد ہو گیا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ میرے رشتے اندر  
 میں کہتے دشمن ہیں۔ وہ سب مجھے ایک ناکرہ جرم کا مجرم ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہے کہ امام دین ادھر آ رہا تھا۔ جب آپ نے کوئی جرم نہیں کیا ہے تو آپ کو دنیا الٹان علی سیکندہ کو وہ ساری باتیں بتانے لگا جو چوہدری اس سے کہہ رہا تھا۔ سیکندہ نے کہا ڈرنا نہیں چاہیے۔ صرف خدا سے ڈرنا چاہیے۔“

چوہدری نے ایک دم اسے گھور کر دیکھا لیکن جلد ہی سنبھل گیا کہ اس الزام زبان پر نہ لائے۔“

دکھانے سے کام نہیں چلے گا۔ اس کے سامنے جو مولوی بیٹھا ہوا ہے وہ بے ضرر۔ ”بچارے چوہدری کے بہت سے دشمن ہیں۔ وہ اس بات سے ڈرتا ہے کہ لوگوں کو اس سے ضد نہیں کر رہا ہے کہ اگر کوئی ایسا موقع آیا تو وہ سچ بولے گا۔ مگر اس باب پتا چلے گا کہ امام دین ادھر آیا تھا تو سارے دشمن خواہ مخواہ اسے الزام دیں گے کہ وہ ایمان اس کے لیے مصیبتیں پیدا کرنے والا ہے لہذا اس کے ایمان کو کمزور بنانا بند کرنا ہوگا۔ بھائیوں! اس نے راستے سے اپنے بھائی کو ہٹا دیا ہے۔ یہ دنیا ضروری ہو گیا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے کہا۔“

”مولوی صاحب! ہمارے یہاں مسجد میں پہلے ہی ایک مولوی صاحب ہیں۔ اس لیے میں چوہدری کی پریشانیوں کو سمجھتا ہوں۔ اس بچارے کو بھی خواہ مخواہ اس پر دھاتے ہیں۔ اس کے باوجود میں تمہارے یہاں رہنے کے لیے تمہاری روزی کاغذ دے دوں گا۔ دشمن پریشان کریں گے۔“

نکروں گا۔ حویلی کے پیچھے جو چھپر ڈالا جا رہا ہے میں وہاں بھیٹس باندھنا چاہتا ہوں۔ سیکندہ اس کا منہ ٹکٹے لگی۔ وہ اپنی شریک حیات کو بتا رہا تھا کہ شاہ پور آنے سے پہلے اس جگہ تمہارے لیے ایک مدرسہ کھولوں گا۔ تم وہاں چھوٹے بچوں کو پڑھایا کرو۔ انہیں کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا رہا ہے اور لوگ کس طرح اس کی ایمانداری کو حماقت سمجھ کر عمر کے لوگوں کو دین ایمان کی باتیں سکھایا کرتا۔“

ایمان علی نے خوش ہو کر کہا۔

”امام دین آپ کا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ آپ کی رحم دلی کو سمجھتا ہے اسی لیے آپ نے روپے میسے کی خاطر کس طرح خون کے رشتوں کو کاٹ کر چھینک دیتے ہیں۔ اسے یقین دلا یا تھا کہ میرے لیے یہاں روٹی کا بندوبست ہو جائے گا۔“

”مولوی صاحب! تم امام دین کی بات کر رہے ہو حالانکہ تم نے ابھی کہا تھا کہ بتا دیا ہے۔ لیکن اس نے ایمان علی کے سامنے اپنے شبے کا اظہار نہیں کیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر ایمان علی کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ دین محمد اپنے بے گناہ بھائی کا قاتل

”میں نے جان بوجھ کر اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں گے تو پھر وہ اس حویلی کی روٹی نہیں کھائے گا۔ یہاں سے بھی آگے بڑھ جائے گا اور پچھلی رزق حلال کا ذکر نہ کرنا تو میں ادھر کا رخ بھی نہ کرتا۔ اس نے مجھ پر بڑا احسان کلساری رات چلتے رہنے کے بعد سیکندہ میں اتنی سکت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ آگے بڑھ سکتی۔ آپ جیسے رحم دل انسان کے پاس مجھے پہنچا دیا ہے۔ دراصل میں اس کا احسان مند ہوں۔ آگے بڑھنے سے حاصل کیا ہوتا؟ کیا اسے آگے ایمانداری لوگ مل جاتے؟ اور ایمان علی کا ذکر کر رہا ہوں اور یہ نامناسب نہیں ہے۔“

چوہدری دین محمد اسے بڑی بے بسی سے دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا ہاموش رہنا چاہیے اور ایمان علی داپنے پر پر ایمانداری سے سوچنے کے لیے چھوڑ دینا اس مولوی کی زبان کو کیسے لگام دے۔ وہ چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا پھر کھائے لگا۔ وہ چوہدری دین محمد کو بے چارہ سمجھ رہا تھا تو بے چارہ ہی سمجھتا رہے۔

اٹھا کر وہاں سے جاتے ہوئے بولا ”میں تمہارے لیے دو سرا کرہ خالی کروا رہا ہوں۔“

”تھوڑی دیر بعد انہیں دوسرے کمرے میں بلایا گیا۔ وہاں دو چارابیوں پر بستر بچھے تھے آرام سے سو جانا۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد سیکندہ ایمان علی نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد چارابیوں کی طرف توجہ دی تو وہ



دونوں ایک دوسرے سے گلی ہوئی تھیں۔ اس تصور سے ہی اس کا دل نڈھال ہو گیا۔ اس نے فوراً ہی ایک چارپائی کو کھینچا۔ بٹائی کے کوشش کرتے ہیں۔ تو وقتی طور پر اپنی بے مگر ساری زندگی کے لیے میری اپنی ہے۔  
 سے الگ کیا اور اسے کمرے کے آخری سرے پر لے جا کر اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ کم از کم تو مجھے کمزور نہ بنا۔ مجھ پر رحم کر، مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔ یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔  
 ”تورات بھری جاگئی ہوئی ہے، تجھے نیند آرہی ہے، جاو دھر منہ پھیر کر سو جا۔“  
 وہ اپنی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔  
 ”منہ پھیر کر سونے سے نیند نہیں آئے گی اگر تجھے آسکتی ہے تو سو جا، میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر خود کو ندامت کی گہری پستی میں گرتے محسوس کیا۔ وہ رہوں گی۔ دیکھنا تو حرام نہیں ہے نا؟“  
 وہ بڑی بے بسی سے اپنی دامن کا منہ دیکھنے لگا۔ ساگ رات کی صبح ہو چکی تھی۔  
 ”مجھے معاف کر دے میں اتنی بری ہوں کہ اپنے ایمان کو بھی رلا دیا۔ میرے لیے اس چھوٹے جگہ قضا پڑھ لی جاتی ہے مگر وہ قضا کا مارا ساگ رات کا چھوٹا ہوا افزائش سے زیادہ شرم کی بات کیا ہوگی تو ٹھنکنا چاہتا ہے میں گرانا چاہتی ہوں۔ اب سمجھ میں آگیا کر سکتا تھا۔ اسے سر جھکائے سوچتے دیکھ کر سیکھ کر بہت ترس آیا۔ اس دلن لہا کہ تو کرنے والا نہیں ہے۔ ایمان کے سامنے تو مجھے منہ کے بل گرنا چاہیے اور میں گر چکی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اپنے مجازی خدا کو سمجھائے کہ کمرے کی چار دیواریں ہوں۔ اب میں اس طرح رہوں گی کہ تیرا دل اس طرح کبھی نہ روئے گا۔ مجھے معاف دے اگر اپنے اصولوں سے ہٹ جائے گا تو کیا فرق پڑے گا۔ دراصل شدید بھوک نہ کر دے۔“

انسان کے اصولوں میں ذرا سی لچک پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس حد تک فائدہ ہو کر نہ ہو تو برداشت ہو جائے تو حرام چیزیں بھی کھانے کے لیے حلال ہو جاتی ہیں لہذا اس کے لیے وہ کوئی ادا نہیں دکھا رہی تھی مگر ایک نوجوان عورت کا آنچل پیل بار اس کی ناقابل برداشت بنانے کے لیے وہ چارپائی پر سیدھی لیٹ گئی۔ حیا مانع تھی زبان۔ آنکھوں تک پہنچا تھا اس لیے وہ بھی ایک برکانے والی ادا بن گئی تھی۔ بڑی مشکل تھی پھول نہیں بول سکتی تھی خاموش اداؤں سے بہت کچھ سمجھا سکتی تھی۔ اداؤں سے لہجہ اپنی ہنکریوں میں اپنی خوشبو کو چھپا کر نہیں رکھ سکتا۔ پھول چھپ جائے گا مگر اس کی اس پنڈلی لڑکی نے کہیں سے سیکھا نہیں تھا، عمر اور حالات کے تقاضے عورتوں کی خوشبو آنکھوں کی ختم تک ضرور پہنچے گی۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ کر لیٹ گیا پھر دوسری آپ سب کچھ کرا لیتے ہیں۔ اس نے لیٹے ہی لیٹے بھرپور انداز میں انگریزی کی طرف کرٹ بدل کر سر کے نیچے تکیہ رکھنے کے بجائے اسے پیچھے کر اپنے بازوؤں میں لے کر طرف ڈھلک گیا۔ وہ ایک دم سے لرز گیا اور بری طرح ہلکاتے ہوئے کہنے لگا۔  
 ”نہیں یہ۔۔۔ کک۔ کیا بے حیائی ہے، تجھے چادر اوڑھ کر لیٹنا چاہیے۔“  
 بڑی جراتی سے دس دس اور پچاس پچاس کے نوٹوں کو دیکھنے لگا۔ سیکھنے نے بھی کبھی اتنے سارے روپے نہیں دیکھے تھے اس لیے اس کی سانس اوپر کی اوپر ہی رہ گئی۔ ایمان علی نے اپنے مرنے کے سامنے بے حیائی کیا ہوتی ہے! میں بازار میں تو نہیں بیٹھی ہوں پریشان ہو کر کہا۔  
 ”یہ چوہدری کے روپے ہیں۔ پچھلی رات شاید یہاں سوتے وقت اتنی بڑی رقم تکیہ کس لیے اوڑھوں کیا تجھ سے پردہ واجب ہے؟“  
 ایمان علی کا ایک ہاتھ تکیے پر رکھا ہوا تھا اور وہ بے خیالی میں اسے رورہ کر کے نیچے رکھ دی ہوگی۔ مجھے فوراً ہی واپس کر دینا چاہیے۔ وہ جلدی جلدی نوٹوں کو سمیٹ بیٹھ رہا تھا۔ پھر وہ روتے ہوئے لہجے میں بولا ”تیری بہت سی باتوں کا میرے پاس کر بستر سے اٹھ گیا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ سیکھنے اندر ہی اندر اس کی آواز

سختی رہی وہ چوہدری کو بلند آواز سے پکار رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چوہدری کی آواز سنا  
 ”کیا بات ہے؟ کسی چیز کی ضرورت ہے کیا؟“  
 ”جی نہیں“ ایمان علی نے کہا ”آپ یہ روپے اس کمرے میں بھول گئے ہیں۔“  
 ”گن لیجئے۔“

چوہدری نے حیرانی کا اظہار کیا ”یہ میرے روپے تو نہیں ہیں۔“  
 ”تو پھر آپ اپنے گھر کی عورتوں سے پوچھیں۔ شاید کسی نے رکھ دیے ہوں۔“  
 ”میں اپنے گھر کی عورتوں کو کھانا کھڑا دیتا ہوں، نقدی کبھی نہیں دیتا۔ بلا  
 کے پاس اتنے روپے نہیں ہو سکتے۔ ذرا اسے گن کر دیکھو یہ کتنے ہیں؟“  
 تھوڑی دیر تک خاموشی رہی، ایمان علی نوٹوں کو گن رہا تھا۔ گنتے کے بعد  
 ”کما۔“ ”پورے دو ہزار ہیں۔“

”ہوں“ چوہدری نے ایک لمبی سی معنی خیز ”ہوں“ کے بعد کہا ”تم بہت ایمان  
 ہو۔ تم نے سمجھ لیا تھا میں یہاں کسی وقت بھی تمہاری تلاش کی لے سکتا ہوں اور  
 کہ یہ دو ہزار روپے تمہاری جیب سے نکال سکتا ہوں۔“

”یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میری قمیص کی اندرونی جیب میں صرف ایک  
 کلام پاک ہوتا ہے۔ میں نے اتنے روپے آج پہلی بار دیکھے ہیں۔“

”ہاں۔ پہلی بار دیکھے ہیں اسی لیے حیران ایمان ڈگمگا گیا۔ اب سیدھی طرح  
 میرے معصوم بھائی کی لاش کہاں پھینک کر آیا ہے ورنہ ابھی جوتا ہاتھ میں لے کر  
 سے ایمان کی ساری گرد جھاڑ کر رکھ دوں گا۔“ ایمان علی ایک دم ٹوٹ کر فریاد  
 بیٹھ گیا۔ اس کے لیے اس سے زیادہ شرم اور توہین کی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

ایمان علی کا سر جکرا رہا تھا۔ وہ فرش پر اکڑوں بیٹھا ہوا سراٹھا کر اور دیدے پانچ  
 اپنے سامنے کھڑے ہوئے بیٹھیں غما چوہدری کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت چوہدری ایک  
 جوتا نظر آ رہا تھا جو اس کے سر پر بچنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اس گھڑی اسے دائیں  
 آگے پیچھے ”اوپر نیچے ہر سمت جوتے ہی جوتے نظر آ رہے تھے اور یہ گیان حاصل  
 اس کے چاروں طرف متحرک انسان اتنا زیادہ نہیں چلتے ہیں جتنے ان کے درمیان  
 چلتے ہیں۔

یہ دنیا کیا ہے؟ جوتوں کا بہت بڑا گھر ہے۔ جب وہ مدرسے میں ابتدائی تعلیم حاصل کرتا  
 تھا تو استادوں کے جوتے اٹھاتا تھا اور گھر میں سوتیلے باپ کے جوتے کھاتا تھا۔ پھر کچھ ہوش  
 سنبھالا تو تقسیم القرآن کے ادارے میں قرآن شریف کو پڑھنے کا فن سیکھتا رہا کہ حروف کو  
 ان کے صحیح مخارج سے کس طرح ادا کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ علمائے دین کے جوتے  
 سیدھے کرتا رہا۔ وہاں سے آگے چلا تو پتا چلا کہ مسجد ہو یا دینی ادارے، ہر جگہ بڑے بڑے  
 جوتے والوں کی اجارہ دار ہوتی ہے۔ وہ پیش امام جیسے معزز شخص کو ملازم سمجھ کر اپنے  
 جوتوں پر بٹھاتے ہیں اور اپنی جوتوں کے صدقے تین وقت کی روٹیاں کھلاتے ہیں۔ بہت  
 زیادہ خوش ہوتے تو اپنی جوتی کو دلوں کی طرح چپکا کر کسی کے گلے میں طوق کی طرح پہنا  
 دیتے ہیں۔ اس کے قدم جس زمین پر گئے ”اس نے یہی دیکھا کہ انسان بننے جوتے کی طرح  
 کاٹا ہے اور پرانے جوتے کی طرح ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ اقتصادی اور معاشرتی زندگی میں  
 جوتے سکہ رائج الوقت کی طرح چلتے ہیں۔ کسی کو مار کر کچھ دیتے ہیں اور کسی کو مار کر سب  
 کچھ جھین لیتے ہیں اور یہ سب کچھ محض اس لیے ہے کہ انسان ایمان کے سائے سے ہٹ  
 کر جوتوں کے سائے میں بڑی خوشی سے زندگی گزارتے ہیں۔

دروازے پر کھڑی سیکنہ نے اپنے ایمان پر الزام آتے دیکھ کر کہا ”چوہدری جی! ذرا  
 انصاف سے کام لو! ایک شریف آدمی کو چور اور قاتل نہ بناؤ۔ میرا خاندان ایسا ایمان والا ہے  
 اس نے کبھی کسی کی جیب سے ایک پھونٹی کوڑی بھی نہیں نکالی ہے، کبھی کسی سے دشمنی  
 نہیں کی ہے پھر کسی کو قتل کیسے کر سکتا ہے؟ تم سوچے سمجھے بغیر اسے جوتے مارنے کی دھمکی  
 دے رہے ہو اور ایک شریف آدمی کی توہین کر رہے ہو۔“ چوہدری نے دروازے کی طرف  
 دیکھا جس کے پیچھے سیکنہ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ نظر نہیں آ رہی تھی مگر ایک عورت کی سریلی  
 آواز سن کر وہ دروازہ پر بڑا گوارا مسکرا کر کہنے لگا۔

”اگر کوئی انسان کی زبان نہ سمجھے تو جوتے سمجھا دیتے ہیں۔ میں نے تیرے خاندان کو  
 زبان سے سمجھانے کی کوشش کی کہ مجھ پر کس طرح چھوٹے بھائی کے قتل کا الزام آ سکتا  
 ہے۔ اگر یہ اپنی زبان بند رکھے تو میں اس الزام سے بچ سکتا ہوں مگر یہ بات اس کی سمجھ میں  
 نہیں آئی۔ یہ اپنی ایمانداری جھاڑتا رہا کہ پوچھ کچھ ہوئی تو وہ جج بولے گا۔ اب میں پوچھتا  
 ہوں کہ اس سے دو ہزار روپے کے بارے میں پوچھ گچھ ہوئی تو اس کی سچائی کیا کام آئے

میں تجھے چوری اور قتل کے بہت بڑے الزام سے بچالوں گا اور یہ روپے بھی واپس لے لوں گا۔ چاہے اپنی گھروالی سے باتیں کر لے۔“ ایمان علی سر جھکا کر کمرے میں آگیا۔ سیکنہ نے دروازہ بند کرتے وقت دیکھا چوہدری دروازے کے باہر کرسی رکھ کر بیٹھ رہا تھا۔ یعنی وہ ایمان کی زبان سے اپنے حق میں فیصلہ سنے بغیر وہاں سے نکلنے والا نہ تھا۔ سیکنہ دروازے کو اندر سے بند کر کے ایمان علی کی طرف پلٹ گئی۔ وہ ہاتھوں میں دو ہزار کی گڈی پکڑے بستر کے سرے پر یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے اپنے ہاتھوں میں چوہدری کا دیا ہوا جوتا پکڑے ہو۔ سیکنہ نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔

”تجھے کب عقل آئے گی؟ تو ایماندار بنتا ہے، یہ اچھی بات ہے مگر تیرا ایمان صرف تیری ذات تک ہونا چاہیے۔ تو دوسروں کے معاملے میں ایمان اور سچائی کو لے کر آئے گا تو دوسرے اپنا نقصان کبھی برداشت نہیں کریں گے۔“

وہ روتے ہوئے لہجے میں بولا ”یہ کتنی شرم کی بات ہے سیکنہ کہ ایمان اور سچائی سے لوگوں کو نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔“

”ہاں اندیشہ ہوتا ہے۔ تیرے سامنے کی بات ہے کہ تو چوہدری کے معاملے میں سچ بولنا چاہتا ہے۔ تیری سچائی اسے تھامے پکڑی تک لے جائے گی جبکہ آج صبح اس بے چارے نے اپنے بھائی کی شکل تک نہیں دیکھی ہے مگر تو یہ کہے گا کہ تو نے امام دین کو یہاں آتے دیکھا ہے تو پھر اس بے چارے کے تمام دشمن اسے اپنے ہی بھائی کا قاتل ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔“

”انسان چاہے تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“

”تو بھی تو چاہے پھر یہ دو ہزار روپے تجھے کیسے نقصان پہنچانے والے ہیں۔“

”یہ چوہدری نے میرے ساتھ فریب کیا ہے۔“

”فریب نہیں کیا ہے بلکہ تجھے ایک اچھا سبق سکھایا ہے۔ اس بات سے تجھے سمجھ لینا چاہئے کہ کبھی ایمان والوں پر بھی ایسا وقت آتا ہے جب ان کی زبان کی سچائی کو کوئی تسلیم نہیں کرتا۔ اسی طرح وہ بے چارہ چوہدری بھی بے گناہ ہے۔ اگر تو نے یہ کہہ دیا کہ امام دین کو یہاں آتے دیکھا تھا تو ایسی صورت میں تو چشم دید گواہ بن جائے گا اور چوہدری پر جھوٹا الزام آجائے گا۔“

گی؟ اس کے بیان کی سچائی کے مطابق سب یہی سمجھیں گے کہ امام دین اسے راستہ ملا تھا اور اسے دو ہزار روپے دے کر اپنی جان بچا کر یہاں آنا چاہتا تھا مگر وہ یہاں تک نہ پہنچ سکا۔ اس کے دو ہزار روپے اس وقت اس کے ہاتھوں میں ہیں۔ وہ پولیس والوں سامنے ہزار قسمیں کھا کر یقین دلانے کہ یہ روپے اس نے امام دین سے نہیں چھپے ہیں چھیننے کے لیے اسے قتل نہیں کیا ہے تو توہی بتاؤں تیرے خاوند کی سچائی پر یقین کرے؟ دیکھ میں سمجھتا ہوں کہ تیرا خاوند مجرم نہیں ہے واقعی ایماندار ہے۔ اس طرح میں بھی نہیں ہوں لیکن میری اور تمہاری سچائی کو اس دنیا میں کون سمجھتا ہے؟ انہیں سمجھانے کے لیے تھوڑا سا جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے یا آنکھوں دیکھی باتوں سے انکار کرنا پڑتا ہے؟ انہوں نے کچھ نہیں دیکھا انہیں راستے میں کوئی نہیں ملا تھا۔ بس اتنا سا جھوٹ کہہ دینا تو اسے یہ دینا والے ہماری تمہاری سچائی پر یقین کر لیں گے۔“

سیکنہ نے پوچھا ”تم کہتے ہو میرا خاوند مجرم نہیں ہے تو پھر یہ روپے کس کے ہیں؟“

چوہدری نے جواب دیا۔

”تیرے خاوند کو ایک اچھا سبق سکھانے کے لیے میں نے یہ روپے نکلنے کے بجائے دیئے تھے۔ جس کے پاؤں میں جوتا کاٹنا ہے وہی تکلیف کو سمجھتا ہے۔ اب تیرے پاس والے شوہر کو جوتا کاٹ رہا ہے تو اسے بلا کر پوچھ کہ اب کسی تکلیف ہو رہی ہے؟ میرے دل میں بے ایمانی ہوتی تو میں کبھی یہ تسلیم نہ کرتا کہ یہ روپے میں نے نکلنے کے رکھے تھے۔ میں ابھی تھامے دار کو بلاتا اور اسے قانون کے حوالے کر دیتا۔ ایمان علی چلاتا رہتا کوئی اس کی سچائی کو تسلیم نہ کرتا۔ اس کے خلاف بہت سے ثبوت ماحول ہو جاتے کیونکہ خود اس کا بیان اسے مجرم ثابت کرتا ہے۔ تو ذرا سمجھدار معلوم ہوتی۔ ان باتوں کو اچھی طرح سمجھ لے گی۔ اس لیے میں تجھے موقع دیتا ہوں کہ اسے سمجھنا نہیں سمجھے گا تو پھر میں قانونی کارروائی کروں گا۔“

یہ کہہ کر اس نے ایمان علی کو کمرے کے اندر جانے کا حکم دیا۔ ایمان علی نے اپنی اسے اٹھتے ہوئے وہ دو ہزار روپے چوہدری کو واپس کرنے چاہے مگر چوہدری نے انکار کر دیا۔

”ابھی یہ روپے تیرے ہی پاس رہیں گے۔ جب ہم ایک فیصلے پر متفق ہو جائیں گے۔“

دنیاوی آندھیوں کے سامنے سینہ سپر رہتا ہے۔ آندھیاں تھک جاتی ہیں مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔

وہ اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گئی پھر اس کے گھٹنوں پر سر رکھ کر بولی۔  
 ”ایسا ایماندار آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا نہ کبھی سنا۔ خدا کی قسم تیرے ایمان کو دنیا کی کوئی طاقت کمزور نہیں بنا سکتی۔ تیرے ہی جیسے انسانوں کے لیے کہا گیا ہے کہ خدا کے علاوہ کسی کو سجدے کی اجازت ہوتی تو مجھ جیسی عورتیں تیرے جیسے شوہروں کو سجدہ کرتیں۔“

اپنے اصولوں کا جہاں تک تعلق تھا وہ سچ سچ چٹان تھا مگر انسان بھی تھا۔ اس لیے جب سیکڑے نے اس کے گھٹنوں پر سر رکھا تو وہ پھر اس کی قوت سے گھبرا گیا۔ ایک انسان اگرچہ فرشتہ سیرت ہو تو یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس کے دماغ میں دوسرے تقاضے نہیں چپختے ہوں گے۔ ہمارے سوچنے کا انداز عجیب ہے ہم کسی ایماندار مولوی کو دیکھ کر یہ سوچتے ہیں کہ وہ صرف مولوی ہو اس کے سینے میں جو دل ہے وہ کسی کی محبت کے لیے دھڑکتا نہ ہو۔ نہ جانے کیوں ہم اسے انسان کے بجائے فرشتہ سمجھنا چاہتے ہیں یا اگر فرشتہ نہ سمجھیں گے تو اسے ایسا احقر سمجھیں گے جو اپنی ہی عورت سے دور بھاگتا ہو۔ ایمان والوں کو نہ اس کوٹ جبین ہے نہ اس کوٹ۔ وہ بھی بے چین ہو گیا تھا اسی لیے سیکڑے سے دور ہونے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

میں ابھی جا کر چوہدری کو اپنا فیصلہ سنا تا ہوں۔ وہ سیکڑے سے کترا کر نکل گیا پھر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آیا اور سامنے کرسی پر بیٹھ ہوئے چوہدری سے کہنے لگا۔

”چوہدری! یہ بات میری سمجھ میں آگئی ہے کہ بعض اوقات انسان کتنا ہی سچا ہو دنیا والے اس کی سچائی کو تسلیم نہیں کرتے۔ صرف حالات اور واقعات کے پیش نظر اسے مجرم سمجھ لیتے ہیں۔ تمہاری باتوں سے پتا چلتا ہے کہ تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ لہذا اگر میں یہاں نہ رہوں اور یہاں سے دور چلا جاؤں گا تو پھر مجھ سے کوئی پوچھنے والا نہیں رہے گا۔

اس طرح میرا ایمان بھی سلامت رہے گا اور تمہاری پریشانی بھی ختم ہو جائے گی۔ اس لیے اب تم یہ دو ہزار روپے رکھو میں اپنی گھروالی کو لے کر ابھی یہاں سے چلا جاتا ہوں۔“  
 ”تم کہاں جاؤ گے؟“

اس نے جھنجھلا کر کہا۔

”پھر میں کیا کروں؟“

”اپنی زبان بند کر لے۔ کسی سے یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ امام دین سے تو ملاقات ہوئی تھی؟“

”اگر کوئی مجھ سے پوچھے گا تو؟“

”تو یہ کہہ دینا کہ تو کسی امام دین کو نہیں جانتا۔“

”تو مجھے جھوٹ بولنا سکھا رہی ہے۔“

”اقتنا سا جھوٹ نہیں بولے گا تو ان دو ہزار روپوں کے ساتھ تھانے پہنچ جائے گا۔“  
 تجھے جیل ہو جائے گی، تجھ پر مقدمہ چلے گا، تو مجھے کس کے حوالے کر کے جائے گا؟  
 اس دنیا میں اکیلا تو نہیں ہے کہ سچ بولنا ہو اگر تڑا جائے گا اور سزا میں پاتا جائے گا۔  
 مجھے بھی تیری سچائی کی سزا مل کرے گی۔ میں تیرے ایمان کی خاطر بڑی سے بڑی چیز برواشت کر سکتی ہوں مگر اتنا بتا دے کہ تیرے حوالات میں جانے کے بعد میرے سر پر کون رکھے گا۔ تو مجھے اپنی ملکیت بتانے کے لیے ایک چادر میں چھپاتا ہے کہ کوئی مجھے نہ سکے۔ تیرے بعد میں یہ پردہ کیسے رکھوں گی؟ کیا مجھے دو وقت کی روٹیوں کے لیے اس کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا پڑے گا؟ کیا میرا ہاتھ چادر سے باہر آکر ننگا نہیں ہوگا؟  
 بتا دے کہ میں تیرے بعد کیا کروں گی؟“

ایمان علی سر جھکائے اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا:  
 اب میں اکیلا نہیں ہوں۔ پہلے صرف ایمان کے لیے سوچتا تھا اب تیرے لیے بھی میرا اولین فرض ہے۔ اب مجھے ایسا قدم اٹھانا چاہیے کہ تو بھی سلامت رہے اور ایمان کو بھی نہیں نہ پہنچے۔ اس کا یہی ایک راستہ ہے کہ ہم اس پنڈ میں نہیں رہیں۔ ابھی یہاں سے چلے جائیں گے پھر کوئی مجھ سے امام دین کے متعلق سوال نہیں کرے گا نہ ہی خواہ مخواہ مجھے جھوٹ بولنا پڑے گا۔“

یہ بہت اچھی تدبیر تھی۔ آدمی ایمان دار بن کر رہتا چاہے تو سوچنے سمجھنے سے اسے سلامتی کے لیے ہزاروں تدبیریں کھل سکتی ہیں۔ سیکڑے اسے بڑی محبت سے اور عقیدت سے دیکھنے لگی۔ وہ اس بات پر غر محسوس کر رہی تھی کہ اس کا آدمی چٹان۔

چوہدری نے بے زار ہو کر کہا ”تمہاری باتیں میرے لیے قابل قبول نہیں ہیں اور میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ تمہاری گھروالی تم سے زیادہ سمجھ دار ہے تم پھر اس کے پاس جاؤ وہ تمہیں سمجھائے گی۔ اگر اس بار نہیں سمجھو گے تو میں تھانیدار کو بلواؤں گا۔“

وہ سر جھکائے اسی طرح کرنی فونوں کے جوتے پکڑے پھر سیکینہ کے پاس آ گیا۔ اس بار سیکینہ کا سر جھکا ہوا تھا۔ اپنے جس آدمی کو وہ چٹان کہہ رہی تھی اس چٹان کو باہر کھڑا ہوا چوہدری بڑے عجیب انداز سے توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے ایمان کو کس طرح بچائے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بہت دیر تک سر جھکائے کھڑے رہے۔ مرد کے سامنے عورت ہمیشہ کمزور سمجھی جاتی ہے اور ہمیشہ کم عقل لگاتی ہے مگر ڈبے وقت تنکے کی طرح سسار بھی بن جاتی ہے۔ ایمان علی سوچ رہا تھا کہ اس تنکے جیسی عورت کا سسار ایسا مل جائے تو وہ کسی طرح ڈوبنے سے بچ جائے۔ بہت دیر بعد سیکینہ نے اس سے کہا۔ اب میں تیرے ایمان کو ٹھیس پہنچانے والی کوئی بات نہیں کروں گی۔ میں یہ اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ اگر ایک طرف ایمان ہو اور دوسری طرف میں ہوں اور دونوں میں سے کسی کو انتخاب کرنے کے لیے کہا جائے تو تو ایمان کی طرف جائے گا۔ کیا تو ایمان کی سلامتی کے لیے مجھے چھوڑ سکتا ہے۔“

ایمان علی نے گھبرا کر پوچھا۔  
”تو کتنا کیا چاہتی ہے؟ ایسی باتیں نہ کر میں پہلے ہی پریشان ہوں۔“  
”تیری پریشانی دور کرنے کے لیے ایک ترکیب میری سمجھ میں آئی ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ چوہدری تجھ پر بھروسہ نہیں کر رہا ہے۔ اگر تو کوئی ضمانت دے کر یہاں سے چلا جائے گا تو وہ مطمئن ہو جائے گا۔“  
”میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے خدا کی قسم کھائی ہے۔ خدا کی قسم سے بڑھ کر اور کیا ضمانت ہو سکتی ہے۔“

”میرے ایمان! تیرے لیے خدا سے بڑھ کر اور کوئی نہیں ہے لیکن دنیا داروں کے لیے یوی سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے۔ تو ضمانت کے طور پر مجھے چھوڑ کر چلا جا۔ چوہدری ایک دم سے مطمئن ہو جائے گا۔“

”یہ دنیا بہت بڑی ہے میں کہیں دور چلا جاؤں گا۔“  
”مگر تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تمہیں جانے دوں گا۔ تم اس بات کے چشمہ زار ہو کہ تم نے امام دین کو یہاں آتے دیکھا ہے۔ اگر تم دوسرے پنڈ میں جا کر کہو گے تو یہاں میرے دشمنوں تک پہنچ جائے گی۔“  
”میں یہاں سے دور جا کر کسی سے نہیں کہوں گا۔“  
”جب کسی سے نہیں کہو گے تو تمہیں رہو۔ تم کیسے احمق ہو انا نہیں سمجھتے کہ زبان کو وہاں بند رکھو گے اسی زبان کو یہاں بھی بند رکھ سکتے ہو۔“  
”یہاں تو پوچھنے والے پیدا ہو سکتے ہیں۔“

”قانون ہر جگہ پوچھنے کے لیے پہنچ جاتا ہے۔ تم جوان ہو تم نے مجھ سے زیادہ دیکھا ہے۔ میں تمہیں صاف صاف اپنا فیصلہ سنادوں کہ جب تک امام دین کا پتا نہیں گا یہ دو ہزار تمہارے پاس رہیں گے اور تم میری نظروں کے سامنے رہو گے۔ اس پر روپے تمہیں سمجھاتے رہیں گے کہ مجھ بے گناہ کو الزام سے بچانے کے لیے تمہیں طرح اپنی زبان بند رکھنی چاہیے اور تم میری نگاہوں کے سامنے رہو گے تو مجھے اطمینان رہے گا کہ تم ایک سچ بول کر مجھ سے دشمنی نہیں کر رہے ہو۔“

ایمان علی پریشان ہو کر چوہدری کو دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ سامنے کھڑے ہوئے بھی نہیں نما انسان کو کیا سمجھے۔ کیونکہ وہ بیک وقت بے ایمان بھی نہ ایماندار بھی۔ ایماندار اس لیے نظر آ رہا تھا کہ اس نے اپنے بھائی کو قتل نہیں کیا تھا کے حصے کی جگہ اور ہضم نہیں کرنا چاہتا تھا اپنے گمشدہ بھائی کو تلاش کرنے تک اس نے نگاہوں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔ اور اس مقصد کے لیے وہ اس سے بے ایمانی کر رہا ہزار کی چوری اور اپنے بھائی کے قتل کے الزام لگانے کی دھمکی دے رہا تھا۔ واقعی حالات میں انسان بہت مجبور ہو جاتا ہے۔ دوسروں کو جب تک اپنی جوتیوں میں نہ اس وقت تک قانون کے جوتوں سے نہیں بچ سکتا۔

ایمان علی نے بڑی بے بسی سے کہا ”چوہدری تم میرے لیے مصیبتیں پیدا کر رہے ہیں ایک سیدھا سادا راستہ بتا رہا ہوں۔ خدا کی قسم کھا کر یقین دلاتا ہوں کہ یہاں سے جا کے بعد کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔“

”کیا یکتی ہے۔ میں نے خدا کو حاضر ناظر جان کر تجھے اس لیے نہیں اپنا یا تھا کہ کہ مکر م کر کے ثمرات پلاتے ہیں۔“  
تجھے چھوڑ کر چلا جاؤں۔“



”کسی ایک کو تو چھوڑنا ہی پڑے گا۔ اگر چھوڑنا نہیں چاہتا ہے تو اپنے ایمان مانا  
لچک پیدا کر۔ اتنی دیر کے لیے زبان بند کر لے جب تک کہ امام دین واپس نہ آجائے۔“  
دروازے کے باہر سے چوہدری کی آواز سنائی دی ”مولوی صاحب! زیادہ باند  
برہاؤ! اپنی گھروالی کی بات کو سمجھو میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم خود کسی کے سامنے  
امام دین کا ذکر نہ کرو۔ میری کوشش یہی ہوگی کہ تمہارے پاس آکر کوئی امام دین کہے  
میں نہ پوچھتے۔“

ایمان علی نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”یہ بات تو میں کہہ چکا ہوں کہ میں غیر ضروری باتیں نہیں کرتا۔ کسی کے سامنے  
امام دین کا ذکر نہیں کروں گا۔ ہاں اگر کوئی پوچھے گا تو جی بولنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔  
کوشش کرو کہ کوئی مجھ سے نہ پوچھے۔“

چوہدری نے کہا ”چلو منظور ہے تم اسی طرح مان جاؤ۔ اگر اس سلسلے میں تفتیش  
تو میں تھانیدار سے سخت لوں گا۔ اسے تمہارے قریب پھنکنے نہیں دوں گا۔“

ان کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا۔ چوہدری مطمئن ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ اب کی  
کی پریشانی نہیں تھی۔ ایمان علی جھوٹ بولنے سے بچ گیا تھا۔ چوہدری اس موقع سے  
بچانے والا تھا جہاں بچ بولنے کی نوبت آتی۔ اس کے باوجود ایمان علی کے دل میں  
سی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کے ایمان کو کس طرح الجھا دیا گیا ہے اور سب سے  
جو اس کے دل میں چھب رہا تھا وہ دو ہزار روپے کی صورت میں اس کی ہتھیلی پر رکھا ہوا  
نہ ان روپوں کو واپس کر سکتا تھا، نہ انہیں پھینک سکتا تھا کیونکہ وہ چوہدری کی امانت  
چوہدری کی ضمانت تھی۔

”دیکھیے مولوی صاحب! ہمارے ملک میں مسلمان بہت ہیں مگر صحیح معنوں میں ایمان  
والے مٹھی بھر ہیں۔ ایمان کو صحیح طور سے پیش کرنا میرا اور آپ کا فرض ہے۔ اگر ہم اپنی  
کمزور پوائی پر پروہ ڈال کر غلط پڑھیں گے تو یہ غلطیاں عام ہو جائیں گی اسی لیے میں آپ کا  
محاسبہ کر رہا ہوں۔ اگر مجھ سے اور مجھ سے بڑے عالم سے بھی آپ کے سامنے کوئی غلطی ہو  
تو آپ بھی محاسبہ کر سکتے ہیں۔ میں نے نماز کے دوران لقمہ دے کر آپ کی توہین نہیں کی  
ہے بلکہ بروقت غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ ایسے میں آپ کو اپنی توہین محسوس نہیں کرنی  
چاہیے۔ آپ کی کمزوریاں ایسی ہیں کہ آپ ذرا سی کوشش کے بعد انہیں دور کر سکتے ہیں۔  
آپ کچھ روز کلام پاک کھول کر بغور پڑھیں اور پھر سے حفظ کریں۔ پھر مجھ جیسا کوئی بھی

وہ نوٹوں کو مٹھی میں بھیج کر غصے سے تمل رہا تھا۔ اسی وقت چوہدری کا ملازم  
دودھ کا ٹھنڈا شربت لے کر وہاں آیا اور ان کے پاس میز پر رکھ کر چلا گیا۔ سیکھنے لگا  
گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”خواہ مخواہ گرمی دکھانے سے کیا فائدہ! لے لی لے۔ اس دنیا کا یہ دستور ہے کہ  
آپ کچھ روز کلام پاک کھول کر بغور پڑھیں اور پھر سے حفظ کریں۔ پھر مجھ جیسا کوئی بھی

شخص آپ کی نماز کے دوران رکاوٹ نہیں بنے گا۔  
ایمان علی نے پیش امام کو کئی بار اچھی طرح سمجھایا۔ لیکن بعض نیم ملائیے رہی تھی۔ لیکن کو وہ بھلا ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے حویلی کے پیچھے دو کمروں کا جو کچا سامکان ہیں جو اپنے آپ کو مکمل مولوی سمجھتے ہیں اور اپنے سامنے کسی کی برتری برداشت نہ کرنے کے لیے دیا گیا تھا اس کے ایک کمرے میں سیکڑ رات گزارتی تھی دوسرے کمرے کرتے۔ جب وہ سیدھی طرح راہ راست پر نہیں آیا تو ایمان علی نے یہ مسئلہ چوہدری جلال دہ بچوں کو تعلیم دیا کرتا تھا وہیں بستر پر رات بھر کوٹھیں بدلتا رہتا تھا۔ اگرچہ محمد تک پہنچایا۔ چوہدری حافظ قرآن نہیں تھا، وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ دونوں میں سے کون سا ایک اس کے سامنے بکائے والے انداز میں نہیں آتی تھی لیکن عورت کی جانی میں سے کون درست کہہ رہا ہے۔ آخر پچائیت میں یہ فیصلہ ہوا کہ شہر سے کسی بڑے ججی ادا میں نہ ہوں تب بھی اس کی موجودگی ہزار جلوں سے برکاتی ہے۔ پھولوں سے بلایا جائے۔ اس عالم کے سامنے دونوں مولوی کلام پاک کی تلاوت کریں گے حقیقت یہی ہوئی شاخ خود بخود نہیں چلکتی ہوا کی چھینر خانی اسے لچکتی ہے۔ سیکڑ بھی جان بوجھ کر جانے کی کہ تلاوت کے سلسلے میں کس مولوی کا حافظ کمزور ہے۔

چوہدری نے اپنے ایک خاص آدمی کو لاہور کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ وہاں ہاتھیں۔ اس عمر کی گدگدی محسوس نہ ہو تب بھی اپنا تماشا دکھا دیتی ہے۔ ہزار ضبط کے باوجود کے چھوٹے بھائی امام دین سے ملے اور اس سے کہے کہ وہ کسی بڑے عالم سے ملائت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایمان علی بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اس کی سمجھ کرے اور اس عالم کو پنڈ میں آنے کی دعوت دے۔ چوہدری نے امام دین کے نام نہیں آتا تھا کہ کس طرح اپنی آنکھیں بند کرے اور قدرت کے ایک حسین شاہکار کو اسے بھی پنڈ آنے کے لیے کہا تھا تاکہ وہ دونوں بھائی پوری دیانتداری سے جاندار ادا کھینچنے سے انکار کر دے۔

دوسرے دن ایک بہت بڑے عالم صاحب تشریف لائے تو ایمان علی نے ان کے کرلیں۔

پھر اس پنڈ میں بڑے عالم کا انتظار ہونے لگا۔ مسجد کے پیش امام کے دل میں گویا نے زانوے ادب تہ کیا۔ جس مسئلے کے پیش نظر انہیں بلایا گیا تھا، وہ تو پہلے ہی حل پیدا ہو گئی تھی کیونکہ وہ اپنی کمزوریوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ مگر اکثر لوگوں کی یہ بات چکا تھا۔ ایمان علی نے اپنی معلومات میں اضافے کے لیے ایک نیا مسئلہ پیش کیا۔  
ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے اپنی کمزوریوں کا اعتراف نہیں کرتے۔ اب پل کو ”جناب! ایک مسئلہ درپیش ہے۔ زید نے ایک مسلمان دوشیزہ سے شادی کی۔ شادی تھا اس لیے وہ بہت زیادہ پریشان ہو گیا تھا اور پریشانیوں کے باعث نماز کے دوران رات پتا چلا کہ زید کی منکوحہ پہلے سے حاملہ ہے۔ کیا ایسی صورت میں زید اپنی اس غلطیاں کرنے لگا۔ ایمان علی اسے معاف نہیں کرتا تھا۔ ہمیشہ اپنا فرض ادا کرنے کے لئے لودھ کے ساتھ رات بستر کر سکتا ہے؟“

نماز پڑھتے وقت اسے لقمہ دیا کرتا تھا۔ دونوں کے بعد چوہدری کے آدمی نے شہر سے آکر بتایا کہ شہر میں امام دین سے ملاقات نہیں ہوئی لیکن ایک عالم صاحب دوسرے ملحق جاری ہیں۔ شریف گھرانے کی ہوشیاری شادی سے پہلے ہی گمراہ ہو جاتی ہیں۔ بعض پنڈ میں پہنچنے والے ہیں۔ جس روز چوہدری کا آدمی یہ خبر لے کر آیا اسی رات پیش امام ہوئی ہیں جنہیں حالات مجبور کر دیتے ہیں بعض ایسی ہوتی ہیں جنہیں عیاش مرد بڑا جاہ دیتے ہیں۔ اگر زید کی منکوحہ پر ظلم کیا گیا ہے اور وہ مظلوم ہے تو ایسی صورت میں چھوڑ کر بھاگ گیا۔

ایک عالم دین کے اس پنڈ میں پہنچنے سے پہلے ہی ایمان علی کی چٹائی ثابت ہوئی۔ زید سے اس کا نکاح جائز ہے لیکن پرہیز لازمی ہے۔“  
والے اور زیادہ اس کی عزت کرنے لگے۔ اسے مسجد کا پیش امام بنادیا گیا۔ ایمان علی نے عزت ملی تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور پچھلی تنبیہوں کو بھلا دیا۔ وہ گزری ہوئی عزت

”توزید کو ہر ممکن طریقے سے گریز کرنا چاہیے۔ اگر بیوی کی موجودگی ورنہ غلطی و عن بیان کرے۔ اگر اس کے بیان سے بے گناہ مگر قانون کی زد میں آتا ہے تو زید اور بکر اسے اس کے میکے والوں کے پاس یا اپنے عزیزوں کے پاس چھوڑ دے اور ان دونوں پر واجب ہے کہ وہ قانون کے محافظوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کریں۔“

اخراجات پورے کرتا رہے۔“

”اگر زید کے اپنے رشتے دار نہ ہوں اور اس کی منکوحہ بھی اپنے میکے والوں سے ہے کہ زید اپنی زبان کھولے۔“

ہو۔ پھر یہ کہ زید کی اتنی آمدنی نہ ہو کہ وہ اپنی منکوحہ کو کسی دوسری جگہ رکھ کر ”قانون کا احترام ہر فرد پر لازم ہے۔ اگر پولیس والے اس واقعے سے لاعلم ہیں تو زید اخراجات برداشت کرے تو ایسی صورت میں کیا ہو سکتا ہے؟“ عالم دین تھوڑا اور بکروں کا فرض ہے کہ پولیس والوں کو معلومات فراہم کریں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے اپنی خوب صورت داڑھی کے بالوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے سوچتے رہے پھر ان کو ایک بات کو چھپانے سے اس کے پیچھے دوسرے دس گناہ چھپنے کے لیے سرابھارتے جواب دیا ”کبھی کبھی ایسے پیچیدہ مسائل بھی ایمان کے راستے میں آجاتے ہیں۔“

صورت میں دوسرے آئمہ کرام کے فتاویٰ سے سہارا لیا جاسکتا ہے۔ زید نے اب نکاح کیا ہے اور وہ نکاح جائز ہے تو بحالت اضطراب تھوڑی بہت تاویل بھی کی جاسکتی۔ حال ہو گیا۔ اس نے فوراً ہی اٹھتے ہوئے ایمان علی سے کہا ”مولوی صاحب آپ ذرا ان کی باتیں سن کر اچانک ہی ایمان علی کے کانوں میں شہنائیاں بجتے لگیں۔ گناہ میرے ساتھ آئیں مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔“

سانے آتش پاڑیاں جھٹنے لگیں اور سیکھ آتش رنگ لباس میں دھن بن کر سامنے ایمان علی کو اپنی نادانی کا پتا چلا۔ اگر وہ پہلے ہی کسی بڑے عالم سے رجوع کرتا تو اب ایمان علی کو اپنی نادانی کا پتا چلا۔ اگر وہ پہلے ہی کسی بڑے عالم سے رجوع کرتا تو اب دریا پیا سانہ بھٹکتا۔ اب اس کا جی چاربا تھا کہ وہاں سے اٹھ کر تیر کی طرح سیکھ پہنچ جائے۔ لیکن مسجد کے صحن میں دینی نشست جاری تھی۔ چوہدری دین محمد کے کے دوسرے بڑے بوڑھے بھی عالم دین کے سامنے باادب بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ وہ مسجد کا پیش امام ہو کر دینی مجلس کو چھوڑ اس وقت سے میرا سکون برباد ہو گیا ہے۔ میں بظاہر خاموش رہتا ہوں مگر اندر سے سچائی کا جاسکتا تھا لہذا اسے دل پر برا بھلا کہتا تھا۔ وہ مجلس کے اختتام تک وہاں رکے پر مجھ جذبہ مجھے اضطراب میں مبتلا رکھتا ہے۔ میں کروں کیا؟ چوہدری صاحب خدا کے لیے تم لیے اس نے دوسرے مسائل پر بحث شروع کر دی۔

”جناب زید اپنے دوست بکر کے بارے میں ایسی بات جانتا ہے کہ اگر وہ زندہ نہ کرادو۔ میں نے بھی جو کچھ دیکھا ہے اسے صحیح طور پر بیان کروں گا اور تمہارا سے تو قانون کی گرفت میں آجائے بلکہ پھانسی کے پھندے تک پہنچ جائے گا جبکہ بکر تمہاری بے گناہی کی قسمیں بھی کھاؤں گا۔ دیکھو خدا پر بھروسہ کرو تم سچے ہو بے گناہ ہو“

قاتل نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اگر قانون کے محافظ زید سے پوچھ گچھ کریں ارب العزت تمہاری عزت رکھے گا اور تمہیں ہر مصیبت سے بچائے گا۔“

اپنے دوست کو بچانے کے لیے صحیح بات یا صحیح واقعے سے چشم پوشی کر سکتا ہے؟ وہ کہتا رہا اور چوہدری سر جھکائے اتنی عقیدت سے سنتا رہا جیسے اس کی سچائی سے متاثر ہوتا جا رہا ہو۔ کون گدھا متاثر ہوتا ہے؟ اپنے گلے میں پھانسی کا پھندہ ڈالنے کے لیے چوہدری دین محمد اسے گھور کر دیکھنے لگا۔ عالم صاحب نے کہا۔

”جب واقعہ صحیح ہے تو زید کا فرض ہے کہ وہ قانون کے محافظوں کے سامنے کون ایمان کی باتوں کو گلے لگاتا ہے؟ وہ تو سر جھکائے اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔“



جب اس نے سراٹھایا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ اس نے آنسو سے بھرے لمبے مٹکے میں ”مولوی تمہارے ایمان کی چٹنگی دیکھ کر میرا سر زامت سے اُڑ گیا ہے۔“ عالم صاحب کی باتوں نے بھی مجھے متاثر کیا ہے۔ میں ابھی تمہارے ساتھ فوجیوں کا اور وہاں وہی کموں کا جو تم کو گئے۔ میرے دل میں ایمان کا نور پیدا ہو گیا مگر تم نے اپنے ساتھ اپنے گھروالی کو بھی ساتھ لے چلو کیونکہ وہ بھی اس بات کی چشم دید گواہ ہے کہ امام دین میاں سے پانچ میل دور نظر آیا تھا۔ تھانے میں اس کا بیان بھی ضروری ہے۔“ ایک بات مان لو۔“

میں تمہاری ایک نہیں ایک ہزار باتیں مانوں گا۔ اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی میرے ساتھ تھانے چلو گے اور ہم دونوں پوری سچائی سے قانون کا ساتھ دیں گے۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اس مجلس میں امام دین کا ذکر نہ اٹھاؤ اس کے بارے دھماکے داغ میں گونج رہے تھے۔ اب وہ ایسی عورت کے پاس نہیں جا رہا تھا جو پرانی کردی کوئی مسئلہ نہ چھیڑو۔ مجلس برخواست ہوتے ہی ہم دونوں میاں سے اٹھ کر تھانے کا مٹھی تھی، اب وہ سر سے پاؤں تک اس کی اپنی تھی۔ اس خیال سے ہی اس کے قدم چلے جائیں گے۔“

ایمان علی نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”ٹھیک ہے، جب ہم اس مسئلہ کو میں جا کر حل کر رہے ہیں تو میاں یہ باتیں چھیڑنا فضول ہیں۔“ چوہدری نے خوش ہو کر کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا ”مولوی تم بہت اچھے ہو۔ اب تم عالم صاحب کے پاس سے اٹھ کر تھانے کی طرف اپنا دوپٹہ اٹھانے کے لیے بڑھنے لگی کیونکہ ایمان علی نے میں تم لوگوں کے لیے شربت وغیرہ بھجواتا ہوں۔“

ایمان علی مسجد کے صحن میں واپس آگیا اور چوہدری حویلی کی طرف چلا گیا۔ اگلا چارپائی کے درمیان ایمان علی کھڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے سینے پر دونوں ہاتھوں کو قہنجی بناتی ہوئی پتہ والوں کے ساتھ عالم صاحب کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ اس وقت اس کے دل میں کہی۔

”ذرا ایک طرف ہو جا میں دوپٹہ اٹھاؤں گی۔“ سر میں بھر گئی تھیں۔ ایک تو اس بات کی خوشی تھی کہ چوہدری کے دو ہزار روپے کی طرح اس کے سینے میں چھ رہے تھے اب انہیں چوہدری واپس لے لے گا۔ جھوٹے الزام سے محفوظ رہے گا۔ دوسری خوشی یہ تھی کہ چوہدری اس کا ساتھ دے گا۔ ایمان علی نے اپنی ایمانداری سے چوہدری کو بھی ایمانداری کے بجائے چپ چاپ کھڑا سوچنا ہی رہ گیا۔ عورت سے زیادہ مرد کے بدلے ہوئے جو رو کو اور سب سے بڑی خوشی وہ تھی جو شروع جوانی سے انسان کا چھپا کرتی ہے اس کا بچا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن کے دل میں فوراً ہی یہ بات آئی کہ مولوی کی نیت بدل گئی ہے۔ کرتے ساگ کی بچ پر پہنچاتی ہے یعنی اب اس کی لیکن اسے ملنے والی تھی۔ اس خیال سے اس نے دل ہی دل میں کہا۔

یہ اس کے داغ پر ایسا نشہ چھا رہا تھا کہ اس پاس کی دنیا سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ لیکن ہی لیکن سمجھ میں آ رہی تھی۔

دوپٹے کو اٹھالیا پھر بے خیالی سے دوپٹے کو ملا مت سے مٹھی میں بھینچنے لگا۔ اس کے ہونے  
مشکل سے ہنچکتے ہوئے کہنے لگا۔

”وہ جو عالم صاحب آئے ہیں نا انہوں نے کہا ہے کہ۔۔۔“

”کیا کہا ہے؟“

”یہی کہ تو بالکل میری ہے اگر میں چاہوں تو تجھ سے دور نہیں رہ سکتا۔ اور میں  
دور رہنا چاہتا ہوں۔“

مگر اب میرا دل گھبرا رہا ہے۔“

یہ کہتے ہی اس نے ایک ہاتھ سے سر کو تھام لیا جیسے جذلوں کے جھوم میں چکرا رہا  
سیکنہ نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اسے سہارا دینے کے لیے تھام لیا۔ بس اتنا ہی سہارا کافی  
ایمان علی نے اپنا سہارا بوجھ اس پر ڈال کر اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔

چند لمحوں تک اسے ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے اور کس دنیا میں ہے؟ اس کے پتے ہو جاؤں گا۔“

دیوار سے کسی کے نازک دل کی دھڑکنیں کس طرح ٹکراتی ہیں۔ وہ ان کندلوں کو  
تھا اور سنبھل رہا تھا مگر اس کی قسمت میں پھسلنا نہیں تھا۔ چوہدری نے اسے باہر سے  
دی۔

”مولوی کیا کر رہے ہو باہر آؤ۔“

ایمان علی یک بیک ہڑبڑا کر سیکنہ سے یوں الگ ہوا جیسے گناہ کرتے رنگے ہاتھوں  
سے گزرنے لگے۔ دو میل کے بعد کھیتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا، گھٹے درختوں کا سلسلہ شروع  
ہو گیا۔

سیکنہ نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

”یہ چوہدری کہاں سے مرنے آگیا۔“

ایمان علی چارپائی پر بیٹھا بانپ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہت دور سے  
آ رہا ہو۔ زندگی کی دھوپ میں دوڑتے دوڑتے کبھی ایسی حالت نہ ہوئی تھی۔

”تجربے نے سخت لمبے میں کہا۔“

زندگی کی دھوپ میں کچھ نہ ہوا زلفوں کی چھاؤں میں بانپ گیا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”ابھی چوہدری ہمارے ساتھ تھے جانے گئے گا تو ابھی ساتھ چلے گی۔“

”ہم تھانے کیوں جائیں گے؟“

ایمان علی اسے بتانے لگا کہ کس طرح چوہدری اپنے دو ہزار روپے واپس لے لے

پھر ان پر چوری اور قتل کا الزام نہیں آئے گا اور وہ لوگ تھانے میں جا کر کس طرح بیان  
دیں گے۔ سیکنہ نے ناپوسی سے پوچھا۔

”کیا ابھی جانا ضروری ہے؟ چوہدری سے کہہ دے تھوڑی دیر بعد جائیں گے۔“

”اے!“ ایمان علی نے اس کی باتوں کو سمجھتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ بھری ہوئی  
بندوق کی طرح کھڑی ہوئی تھی مگر وہاں سے پھر چوہدری نے آواز دی۔ وہ جلدی سے اٹھتے

ہوئے بولا ”جی ابھی آ رہا ہوں۔“ پھر اس نے وحشی آواز میں سیکنہ سے کہا ”مگر ہم ابھی

نہیں جائیں گے تو ہو سکتا ہے کہ چوہدری کا ارادہ بدل جائے۔ ہم ابھی ایک دو گھنٹے میں

واپس آجائیں گے۔ اس وقت ہمارے دل و دماغ سے بہت سے بوجھ اتر جائیں گے۔

چوہدری اپنے دو ہزار روپے واپس لے لے گا اور میں چوری اور قتل کے الزام سے بری

ہو جاؤں گا۔“

یہ بات سیکنہ کی سمجھ میں آگئی۔ وہ نیک بخت بھی یہی چاہتی تھی کہ کس طرح اس کا  
ایمان ان مصیبتوں سے نجات حاصل کرے۔ اس نے اپنے من کو مار کر چادر اٹھائی پھر اس

میں خود کو اچھی طرح چھپاتی ہوئی ایمان علی کے پیچھے چلنے لگی۔ جب دونوں مکان سے باہر

آئے تو چوہدری کے ساتھ اس کا ایک اور ملازم کھڑا ہوا تھا۔ وہ چاروں تھانے کی طرف

جانب سے گئے۔ تھانہ وہاں سے چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ چنڈ سے نکل کر کھیتوں کے درمیان

سے گزرنے لگے۔ دو میل کے بعد کھیتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا، گھٹے درختوں کا سلسلہ شروع

ہو گیا۔ ایک میل کا فاصلہ اور طے کرنے کے بعد چوہدری نے رک کر چاروں طرف دیکھا۔

دور دور تک ویرانی تھی۔ وہاں سے کسی اور آدم زاد کے گزرنے کی توقع نہ تھی۔ جب

ایمان علی چارپائی پر بیٹھا بانپ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہت دور سے

آ رہا ہو۔ زندگی کی دھوپ میں دوڑتے دوڑتے کبھی ایسی حالت نہ ہوئی تھی۔

”تجربے نے سخت لمبے میں کہا۔“

زندگی کی دھوپ میں کچھ نہ ہوا زلفوں کی چھاؤں میں بانپ گیا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”ابھی چوہدری ہمارے ساتھ تھے جانے گئے گا تو ابھی ساتھ چلے گی۔“

”ہم تھانے کیوں جائیں گے؟“

ایمان علی اسے بتانے لگا کہ کس طرح چوہدری اپنے دو ہزار روپے واپس لے لے

”یہ۔۔۔ یہ کیا؟ کیا تم مجھے مار ڈالنا چاہتے ہو؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“

چوہدری نے غصے سے کہا۔

چھر پھینک کر فوراً ہی چھرا اٹھالیا مگر وہ دشمنوں پر حملہ نہ کر سکی۔ چوہدری اسے پکڑنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ چھرا لے کر بھاگتی ہوئی چپخنی لگی۔

”بچاؤ بچاؤ“ میرے ایمان کو بچاؤ۔ کوئی خدا کا بندہ ہے، میرے سہاگ کو بچاؤ۔“ وہ چیختی ہوئی بھاگ رہی تھی۔ چوہدری اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ ملازم کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ سر پر ایسی زبردست چوٹ پڑی تھی، وہ سنبھل نہ سکا لیکن مگر تے مگر تے بھی اس نے ایمان علی کی گردن دو بوج لی تھی۔ ایمان علی کا شانہ اور ایک ہاتھ بیکار ہو چکا تھا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے اسے پرے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دونوں ہی زخمی تھے، دونوں ہی کمزور تھے۔ کمزوری کے باوجود ملازم نے سکیٹھ کے ہاتھ سے مگر ابھرا چھرا اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔

اسی وقت سکیٹھ چوہدری کو اپنے پیچھے دوڑاتی ہوئی واپس آ رہی تھی۔ اس نے ایمان علی پر دوبارہ حملہ ہوتے دیکھ کر اسی چھرے سے ملازم پر حملہ کر دیا۔ چھرے کا پھل دسٹے تک ملازم کی پشت میں اتر گیا پھر وہ فوراً ہی چھرے کو پشت سے نکال کر پلٹ گئی اور چوہدری کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ چوہدری اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سامنے دسٹے کے ماحول میں پٹی ہوئی ایک شیرنی کھڑی تھی۔ کساہو بدن تھا، مضبوط کلائیائیں تھیں، زمین کھودنے والی فولادی انگلیوں میں خون آلود چھرا چوہدری کو چیلنج کر رہا تھا۔

”میں ایمان کے قاتلوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ وہ چیختی ہوئی چوہدری کی طرف لگی۔ چوہدری ایک بیک پلٹ کر بھاگنے لگا مگر وہ ہانپتی ہوئی پیچھا کرتی رہی۔ چوہدری کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، وہ تیزی سے بھاگتا ہوا اس سے بہت دور نکل گیا تھا۔ پھر جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو سکیٹھ ٹھٹک کر گر پڑی۔ ایمان علی کو ہتا نہیں تھا کہ وہ خود کہاں گم ہو گیا ہے۔ وہ اس دنیا میں تھوڑی دیر کے لیے مر چکا تھا۔ کبھی کبھی انسان اسی طرح حقیقی طور پر مرجاتا ہے۔ ساری دنیا کے مصائب سے تھوڑی دیر کے لیے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ پھر یہ دنیا اسے اپنی طرف بلا لیتی ہے۔ جب اسے دوبارہ زندگی ملی تو وہ آہستہ آہستہ میں تارے ناچ گئے۔ وہ لوگ سکیٹھ کو ایک کمزور عورت سمجھ کر بھول گئے تھے۔ مگر آنکھیں کھول کر اپنے آپ پاس کے ماحول کو دیکھنے لگا۔ وہ ایک اسپتال کے بستر پر پڑا ہوا تھا ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا تھا۔ ملازم کے ہاتھ سے چھرا گر پڑا۔ مگر

”تو جب سے یہاں آیا ہے، میرا کام بگڑتا ہی جا رہا ہے۔ ابے او ایماندار کے بچے تجھے میرے ہی پنڈ میں آتا تھا۔ جب تک تو زندہ رہے گا اس وقت تک میرے سامنے ہوا کا پھندا لٹکتا رہے گا۔“

”جب تم نے اپنے بھائی کو قتل نہیں کیا ہے تو تمہیں کون پھانسی پر چڑھائے تمہیں خدا پر بھروسہ۔“

”خدا پر بھروسہ کرنے سے میں سزا سے نہیں بچ سکتوں گا۔ تیری سچائی مجھے لے گی پولیس والے تیرے بیان ہی سے یہ سمجھ لیں گے کہ میں امام دین کا قاتل ہوں اور اب بھی نہیں ہے۔ میں نے اسے قتل کر ڈالا ہے۔“

ایمان علی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ چوہدری نے حقارت سے کہا ”وے“ والے بے وقوف تو بے ایمانی کی دنیا میں اگر ایمان کی بات کرتا ہے؟ بے وقوف تو زمین پر بیٹھ کر پنڈ کے بچوں کو کلامِ پاک کی تعلیم دیتا ہے، اسی زمین کے نیچے امام دین ہو گیا ہے۔ تو جب پہلی بار حویلی کے پیچھے آیا تھا تو اس سے ایک گھنٹہ پہلے ہی اسی زہر نیچے امام دین کو دفن کر کے اس زمین کو لپ پوت کر برابر کر رہے تھے۔ پہلے میرا ارادہ وہاں بھینس باندھوں گا پھر میرے ذہن میں یہ تدبیر آئی کہ وہاں تجھے باندھ کر کھول پولیس والے کبھی شبہ نہیں کریں گے۔ جہاں کلامِ پاک کی تعلیم دی جاتی ہے اس کے میرے بھائی کی لاش پڑی ہوئی ہے۔“

کامیاب منصوبہ بندی کے تصور سے قاتل چوہدری کا چہرہ دمک رہا تھا کیونکہ وہ دیدگاہ ایمان علی اور سکیٹھ کو ہمیشہ کے لیے اس جگہ دفن کرنے والا تھا۔ اس نے اپنے سے کہا ”وے دیکھتا کیا ہے ختم کر دے اس ایمان کے بچے کو۔“ اس کا حکم سننے پر اس نے ایمان علی پر چھرے سے حملہ کیا۔ ایمان علی سسم کر بھاگ نہ سکا صرف ذرا سا ایک طرف ہو گیا جس کے باعث چھرا اپنے کی طرف آنے کے بجائے شانے کو زخمی کر گزر گیا۔ بے ایمان کے ہاتھوں ایمان کا لہوا اچھل پڑا، وہ زخم کی تاب نہ لا کر زمین پر ملازم نے چھرے کو دوبارہ ہتھیلی میں تول کر اس پر حملہ کرنا چاہا مگر اسی وقت اس کی آنکھیں تارے ناچ گئے۔ وہ لوگ سکیٹھ کو ایک کمزور عورت سمجھ کر بھول گئے تھے۔ مگر ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا تھا۔ ملازم کے ہاتھ سے چھرا گر پڑا۔ مگر

بھاگ گیا۔ میں نے تجھے ہوش میں لانے کی بہت کوشش کی مگر تو بالکل مردہ پڑا ہوا تھا۔ میں گھبرا گئی میری سمجھ میں یہی آیا کہ میں فوراً ہی کسی کی مدد حاصل کروں۔ اس خیال سے میں اندھا دھند ایک طرف دوڑتی چلی گئی۔ پتا نہیں کتنی دیر تک دوڑتی رہی اور لوگوں کو مدد کے لیے پکارتی رہی۔ آخر ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچ کر گر پڑی۔ وہاں کی عورتوں نے مجھے سارا دوا بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ میں نے ہانپتے کانپتے ساری بات بتائی۔ کچھ لوگ رپڑا لے کر اس دیرانے میں گئے پھر تجھے اور اس بے ہوش ملازم کو اس پر لا کر تھانے پہنچایا۔ جب تک میں تھانے دار کو تمام واقعہ سناتی رہی، دوسرے پولیس والے تیری اور اس ملازم کی مرہم پٹی کرتے رہے۔ جب تجھے ہوش میں لانے میں ناکامی ہوئی تو تجھے گاڑی میں ڈال کر شہر کے اس بڑے اسپتال میں پہنچایا۔ ایمان علی بڑی محبت اور عقیدت سے اپنی شریک حیات کو دیکھ رہا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں شریک حیات کا مفہوم ادا کر رہی تھی اور اسے تیار ہی تھی۔

”دوسری طرف تھانے دار مجھے لے کر جمال والا گیا۔ ہم عین وقت پر وہاں پہنچے، اگر ذرا بھی دیر ہو جاتی تو چوہدری اپنے بھائی کی لاش کو غائب کر دیتا۔ تو جس کمرے میں بیٹھ کر دینی تعلیم دیا کرتا تھا وہ اس کمرے کے فرش کو کھود کر امام دین کی گلی سڑی لاش کو نکالنا چاہتا تھا۔ اس کے دروازدار ملازم ایک بڑا سا صندوق لے کر آئے تھے تاکہ اس میں لاش کو چھپا کر دوسری جگہ لے جائیں مگر وہ عین وقت پر پکڑے گئے۔

تھانیدار بہت ہی ایماندار آدمی نکلا، چوہدری نے قانون سے بچنے کے لیے اسے ہزاروں روپے کالا لچکوا لیکن اس نے رشوت قبول نہیں کی۔ اس کو دونوں ملازموں سمیت جھٹکوا کر پتھر تھانے لے گیا۔ اب وہ جیل میں ہے اس پر مقدمہ چلنے والا ہے۔ میں نے اس کے ایک ملازم پر چھڑے سے حملہ کیا تھا اس لیے مجھے بھی حوالات میں بند کر دیا گیا۔ ایمان علی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”کیا تو حوالات میں رہ کر آئی ہے؟“

”ہاں وہاں بھی چادر اوڑھ کر رہتی تھی۔ میں نے ہر حال میں پردے کو قائم رکھا ہے۔“

”میں جانتا ہوں تو کتنی وفادار ہے۔ میرے ہر حکم کی تعمیل کرتی ہے مگر تو حوالات سے

آنکھوں کے سامنے دھندلے سے منظر تھے۔ سفید دیواریں اور کچھ دھندلے سے نظر آرہے تھے جو اس پر جھکے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھ کھلتے ہی ایک چہرہ اور قریب کسی کو پہچان نہیں رہا تھا بس کچھ کچھ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ایک ملازم بستر پر ہے اور کلا کی نبض ٹٹول رہا ہے۔ ایک خوب صورت سا چہرہ اس پر جھکا ہوا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں پھر کسی نے کہا۔

”دور ہٹ جاؤ، ابھی مریض کے قریب نہ جاؤ۔ جب یہ پوری طرح ہوش میں آگاتو میں آپ لوگوں کو باتیں کرنے کی اجازت دے دوں گا۔“

وہ رونا ہوا حسین چہرہ سیکنہ کا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی کیونکہ ایمان علی اسے پہچان رہا تھا اور ڈاکٹر بھی کہہ رہا تھا کہ مریض کو ابھی مخاطب نہ کیا جائے۔ اس کے بعد دوسری طرف پولیس انسپکٹر بھی کھڑا تھا لیکن ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر اس کا بیان نہیں سکتا تھا۔ پھر وہ بیان دینے کے قابل بھی نہیں تھا، اس پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ اسی طرح کبھی سو نہا کبھی جاگتا رہا۔ رات اور دن گزرتے رہے اسے اس بات کا نہ تھا کہ اس نے کتنی بار آنکھیں کھولیں اور کتنی بار بے ہوشی کی نیند سوتا رہا۔ وہ اپنے اس کی طبیعت کسی حد تک سنبھل گئی۔ آنکھیں کھول کر پوری طرح ہوش میں آئے بعد اس نے سیکنہ کو دیکھا۔ اپنے مجازی خدا کو ہوش میں آتے دیکھ کر اس کا چہرہ خوش کھل اٹھا تھا۔ وہ بے اختیار خدا کا شکر ادا کر رہی تھی اور اس کے ہاتھ کو تمام کر خوں کانپ رہی تھی۔ ایمان علی نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تو اسپتال ہے میں یہاں کیسے پہنچ گیا؟“

سیکنہ ذرا اس کے قریب اور کھٹک آئی اور اسے بتانے لگی۔

”پولیس والے تجھے یہاں لے کر آئے ہیں۔ میں نے چوہدری دین محمد کے چہرے سے زخمی کر کے بے ہوش کر دیا تھا ورنہ وہ تجھے زندہ نہ چھوڑتا۔“

ایمان علی نے شدید جراتی سے پوچھا ”تو نے ایک عورت کو کراتے ہوئے کئے کیسے زخمی کر دیا؟ کیا چوہدری نے تجھے نہیں پکڑا؟“

”چوہدری تو بڑا بزدل نکلا۔ اپنے ملازم کو بے ہوش ہوتے دیکھ کر یہ سمجھا کہ اسے۔“

اس وقت میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ وہ میرے ہاتھ میں خون آلود جھانپا کر کے آئی؟ کس نے تیری ضمانت لی ہے؟“

”مگر وہ میرے پاس تو نہیں آئی۔ میں دوسرے کو ڈیوٹی پر نہیں تھا۔ اپنے گھر پر تھا۔ اسے فوراً ہی میرے پاس آنا چاہیے تھا۔“

”تو پھر وہ تھانیدار کے پاس گئی ہوگی۔“

”تھانیدار اس شہر سے بیس میل دور رہتا ہے۔ میں نے سیکینہ کی ضمانت لی ہے اسے۔ تمہا کہیں جانے نہیں دیتا تھا۔ پھر وہ اتنی دور کیسے جانے کی وہ اتنی نادان نہیں ہے کہ مجھ سے ملے بغیر چلی جائے۔“

ڈاکٹر پریشانی سے بڑھتا ہوا کمرے سے باہر جانے لگا۔ ایمان علی نے باہر جانے تک اس کی آواز سنی وہ کہہ رہا تھا ”تین گھنٹے گزر گئے، وہ کہاں جاسکتی ہے؟ اگر کہیں چلی گئی تو میں مصیبت میں پڑ جاؤں گا۔“ اس کی بیڑا ہٹنے لگا۔ ایمان علی کو پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ اس نے اپنے دل کو تسلی دی بھلا وہ کہاں جائے گی۔ ایسی وفادار شریک حیات مجھے ایسی حالت میں چھوڑ کر بھی تھوڑی دیر کے لیے بھی کہیں نہیں جانے کی مگر بہت دیر ہو گئی ہے۔

اس نے بڑے اضطراب سے کمرے کی چابی مگریدن سے اٹھنے والی میسوں نے اسے سمجھایا کہ اس کا ایک شانہ بری طرح زخمی ہے۔ وہ صرف چاروں شانہ جیت لیتا رہ سکتا ہے۔ پہلو ان جیسی زندگی نے اسے بچھا ڈیا۔ وہ شکست خوردہ انداز میں پھر گردش کرتے ہوئے غصے کو دیکھنے لگا۔

شام کے بعد رات آئی تو پریشانی اور بڑھ گئی کیونکہ سیکینہ واپس نہیں آئی تھی۔ تھانیدار آگیا تھا، وہ بھی سیکینہ کی گمشدگی سے پریشان ہو گیا۔ وہ جلدی جلدی ایمان علی کا بیان لے کر سیکینہ کی تلاش میں چلا گیا۔ ایمان علی اور ڈاکٹر کا سکون برباد ہو گیا تھا۔ سچائی کی وہ تھوڑی دیر تک اس کی ہتھیلی کو محبت سے ہولے ہولے سلاتی رہی پھر بیت ہو رہی تھی مگر بچوں کو عذاب میں مبتلا کر رہی تھی۔

رات سے صبح ہو گئی، صبح سے پھر شام ہو گئی۔ دن اور رات اپنے دستور کے مطابق چھت کے غصے کو دیکھتا رہا اور گردش حالات پر غور کرتا رہا۔ سیکینہ جلد ہی واپس آئے گی۔ گزرتے رہے۔ سیکینہ کہاں چلی گئی تھی کچھ پتہ نہ تھا۔ تھانیدار ڈاکٹر کو روز تسلیاں دیتا تھا کہ گئی تھی لیکن وعدے کے مطابق نہیں آئی۔ شام کو ڈاکٹر نے آکر اس کا معائنہ کیا کیونکہ وہ سیکینہ کا ضامن تھا لیکن ایمان علی اس کی ساری زندگی کا ضامن تھا۔ اس کی تسلی سیکینہ کے بارے میں دریافت کیا ”تمہاری گھر والی کہاں ہے؟ وہ دوسرے کو مجھ سے نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ وہ کسی کا لے کر یہاں تم سے ملنے آئی تھی۔“

”وہ تو دوسرے کو ہی یہ کہہ کر گئی تھی کہ آپ کو اور تھانیدار کو بلا کر لائے گی۔“

نہیں اٹکتا تھا۔ جو چھوٹی چھوٹی سی سیدھی سادی سی سرتیں اس کی زندگی میں آئی تھیں،

”ہم دونوں کا اس دنیا میں کون ہے؟ کوئی ایسا نہیں ہے جو آڑے وقت نکالے۔“

تھانیدار مجھ سے بہت متاثر ہے لیکن اس کی ضمانت قبول نہیں ہو سکتی تھی۔ نے ڈاکٹر کو ساری داستان سنا لی کہ تو ایمان کی خاطر کتنی کڑی آزمائشوں سے گزر رہا ہے۔ میں کس طرح ساتھ دے رہی ہوں۔ اس رحم دل ڈاکٹر نے کہا کہ میں سچائی کا ماننا کرتا ہوں۔ جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے مگر دوسرے ہندو کو بھی کچھ اپنا فرض چاہیے۔ اس نے اپنا فرض نبھایا اور کمرے سے میری ضمانت لے لی۔ اب میں ایمان علی میں ہوں، وہ مجھے بیٹا کہتا ہے اور اس کے بیوی بچوں کے ساتھ رہتی ہوں۔ اس کی سنانے کے بعد ایمان علی نے ایک گہری سانس لے کر کہا ”ایمان کے سفر پر نکلے تو کہیں شریک سفر مل ہی جاتے ہیں۔ پہلے تو لی، اب تھانیدار اور ڈاکٹر مل گئے۔ انسان نہیں ہارنی چاہیے۔ کیونکہ سچائی کبھی ضائع نہیں جاتی۔ اس کا انعام ضرور ملتا ہے۔“

اس نے آخر چوہدری ثبوت کے ساتھ پکڑا لیا۔

سیکینہ نے اس کے ہتھیلی کو محبت سے سلاتے ہوئے کہا ”تیرے جیسے مسلمان ایمان کے لیے قربان ہو سکتے ہیں۔ ایمان کی سلامتی کے لیے ایک پرہیزگار عورت حالات میں چلی گئی اور تیری حالت یہ ہو گئی تھی کہ تیرے بدن میں خون کا قطرہ نہ تھا۔ تجھے تین بار خون دیا گیا تب کہیں جا کر تو نے آنکھ کھولی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ باتیں کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ میں تھانیدار کو بلا کر لاتی ہوں، وہ تیرا بیان لے لے گا۔ کئی بار یہاں آیا اور تجھے بے ہوش دیکھ کر واپس چلا گیا۔ میں ڈاکٹر صاحب کو جا کر کہی کہ تو ہوش میں آگیا ہے۔“

وہ تھوڑی دیر تک اس کی ہتھیلی کو محبت سے ہولے ہولے سلاتی رہی پھر بیت ہو رہی تھی مگر بچوں کو عذاب میں مبتلا کر رہی تھی۔

رات سے صبح ہو گئی، صبح سے پھر شام ہو گئی۔ دن اور رات اپنے دستور کے مطابق چھت کے غصے کو دیکھتا رہا اور گردش حالات پر غور کرتا رہا۔ سیکینہ جلد ہی واپس آئے گی۔ گزرتے رہے۔ سیکینہ کہاں چلی گئی تھی کچھ پتہ نہ تھا۔ تھانیدار ڈاکٹر کو روز تسلیاں دیتا تھا کہ گئی تھی لیکن وعدے کے مطابق نہیں آئی۔ شام کو ڈاکٹر نے آکر اس کا معائنہ کیا کیونکہ وہ سیکینہ کا ضامن تھا لیکن ایمان علی اس کی ساری زندگی کا ضامن تھا۔ اس کی تسلی سیکینہ کے بارے میں دریافت کیا ”تمہاری گھر والی کہاں ہے؟ وہ دوسرے کو مجھ سے نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ وہ کسی کا لے کر یہاں تم سے ملنے آئی تھی۔“

”وہ تو دوسرے کو ہی یہ کہہ کر گئی تھی کہ آپ کو اور تھانیدار کو بلا کر لائے گی۔“

نہیں اٹکتا تھا۔ جو چھوٹی چھوٹی سی سیدھی سادی سی سرتیں اس کی زندگی میں آئی تھیں،

لوگ وہ بھی چھین رہے تھے۔ کئی دن بیت گئے۔ وہ بستر پر لیٹا ہوا بڑی بے بسی سے بڑبڑاتا رہتا تھا، میں کہا: یہاں سے کیسے اٹھ کر جاؤں؟ اٹھ کر بیٹھتا ہوں تو زخموں سے بیسیں اٹھنے لگی ہیں۔ چلنے کی ہمت نہیں، نہ جانے کیلئے قدم آگے نکل گئی ہے؟ ڈاکٹر الگ پریشانی میں مبتلا تھا اس کے پاس اُنکر کہتا تھا ”لوگ اسی لیے جی بولے پرانی عورت کو نہیں دیکھتا تھا، وہ چادر والیوں کو بے اختیار دیکھنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ لیکن گھبراتے ہیں۔ کیلئے جی بول کر اور ایک قابل کو گرفتار کرانے کے بعد کسی مہینہ دیکھتے وقت نیت میں کھوٹ نہیں ہوتا تھا۔

پھنس گئی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ دشمن کے آدمیوں نے اسے اغوا کر لیا ہے۔ کئی دنوں کے بعد اسے ایک مسجد میں ٹھکانہ مل گیا۔ وہ مسجد ایک چھوٹے سے علاقے ضیانت لینے کے لیے میں نے اپنے مکان کے کاندھات جمع کرائے تھے اگر وہ لڑاؤ میں تھی۔ وہاں بکے مکانات کم تھے، جگلیاں زیادہ تھیں۔ وہاں کی مسجد کمیٹی نے اسے مسجد کا مکان ضبط ہو جائے گا۔ یعنی میں تقریباً اسی ہزار روپے کا نقصان اٹھانے والا ہوں۔ پیش امام بنادیا تھا۔ مسجد کے لیے جو چندہ جمع ہوتا تھا، وہ کمیٹی کے صدر محمد رکن الدین کے ہاتھ میں کر ایمان علی کا سر جھک جاتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بڑی آواز اٹھا کر پاس امانت کے طور پر رکھا جاتا تھا۔ رکن الدین ایماندار آدمی تھے، ان کے پاس دولت کی جگہ کر رہا تھا مگر وہ کیا کر سکتا تھا؟ کیسا برا وقت آگیا تھا کہ جو لوگ بھی ایمان کا سہارا نہ تھی یہی وجہ تھی کہ وہ مسجد کی امانت میں خیانت کرنے کے بجائے وہاں کی رقم میں رکھیں گے، انہیں اسی طرح ذلیل کیا جائے گا اور نقصان پہنچایا جائے گا۔ اپنی طرف سے اضافہ کیا کرتے تھے۔ اسی رقم سے ایمان علی کو تین وقت کی روٹیاں ملتی ایک ماہ کے بعد وہ چلے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ لیکن سیکرٹ کی تلاش میں وہاں تھیں۔

جاسکا کیونکہ چوہدری دین محمد پر مقدمہ چل رہا تھا لہذا فیصلہ ہونے تک اسے ایک ایمان علی کا یہ دستور ہو گیا تھا کہ وہ صبح کی نماز پڑھانے کے بعد اس بڑے شریک گناہ کی حیثیت سے وہاں موجود رہتا تھا۔ تھاندار نے اسے یقین دلایا کہ دو چار پڑھا رہا ہوں اور گلیوں میں گھومنے کے لیے نکل جاتا تھا۔ لوگ روزگار کے لیے یا تفریح کے فیصلہ ہو جائے گا پھر وہ جہاں چاہے جاسکتا ہے مگر وہ کئی ماہ تک پیشیاں بھگتتے پر مجبور رہے گھومنے نکلتے ہیں، وہ سیکین کی تلاش میں نکلتا تھا۔ جدائی اور انتظار میں ایسا ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ دوسرے سال چوہدری دین محمد کو مزائے موت سنائی اس ٹوٹی ہے پھر بندھتی ہے اور پھر ٹوٹی ہے۔ سوچ کے ایک ساحل سے دوسرے ساحل ایمان علی تو بڑھ سال کے عرصے میں بے موت مر گیا تھا۔ عبادت کے بعد کوئی ایسا تک دوڑاتی رہتی ہے۔ جس کا انتظار ہو اس کے مرنے کا یقین کر لیا جائے تو وہ یقین پائیدار تھا جب وہ سیکین کو یاد نہ کرتا ہو۔ اکثر عورتیں اپنے حسن کا جاودہ گکارا اپنے جسم کی ہر نہیں ہوتا۔ انتظار کرنے والے کو کروت کروت ہر آہٹ پر چونکا تا ہے کہ وہ آگئی میری چادر پیش کر کے مرو کے ذہن میں نقش ہو جاتی ہیں۔ لیکن سیکین نے کچھ نہیں دیا تھا۔ حوالی ”آہ سیکین تو کہاں ہے ملتی کیوں نہیں؟ اگر تو دنیا میں نہیں ہے تو مجھے اس زمین کا پتہ ہی کا حسن و وفا تھا جو ایمان علی کے ذہن سے مٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ معلوم ہو جائے جہاں تو مری خیزد سوری ہے۔“

وہ امام دین کے قتل کے کیس میں اپنا ہمت کچھ بار کر پھر انجانی منزل کی طرف بڑھا۔ ”میرے معبود! میں نے تجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگا کیونکہ تو مجھے مانگے بغیر میری اگرچہ ذاکر نے وہاں کی ایک مسجد میں اس کا ٹھکانہ بنادیا تھا مگر اب اس کی زندگی بڑی ضرورت کے مطابق دیتا رہا ہے مگر تو نے اب میرے دل میں سیکنہ کی محبت اور اس کی عبادت میں تھی، اپنی گمشدہ محبت کی جستجو بھی تھی۔ وہ آگے بڑھتا ہوا خدا کی ضرورت پیدا کی ہے تو اب میں گڑبگڑا کر آگتا ہوں کہ میری سیکنہ مجھے واپس کر دے۔ واپس سجدے کرنا گیا اور اپنی محبت کو تلاش کرنا رہا۔ اسی طرح حالات کی ٹھوکریں کھا لیں کرتا تو اس کی موت کا یقین دلا دے۔“ دعا اور دعا کبھی دیر سے اثر کرتی ہے، کبھی

جلدی اثر کرتی ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ صبر کا پھل ملتا ہے۔ آج نہیں تو کل اس کی نماز کے لیے میں کسی گھڑی کا محتاج نہیں ہوں۔ مجھے دن کے وقت دھوپ اور چھاؤں سے قبول ہوگی۔ بندے کو خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ وہ خود کو اور فجر کے وقت صبح کلاب کی ہلکی سی جھلک سے نماز کا صحیح وقت معلوم ہو جاتا ہے۔ ہماری تسلیاں دیتا ہوا اس کا انتظار کیے جا رہا تھا۔

رمضان کا مہینہ آیا تو تراویح کے باعث اس کی مصروفیت بڑھ گئی۔ صبح کی نماز جاتی ہے۔ کبھی صحیح وقت نہیں بتاتی۔

وہ اس قدر تھک جاتا تھا کہ سیکڑے کی تلاش میں نہیں نکل سکتا تھا۔ مایوسی سے بڑھ کر اس کا سایہ نظر نہیں آیا۔ چلے پھر گئے۔

دو جوتیاں پھٹ گئی ہیں پاؤں کے تلووں میں راستے کے کنکر اور کانٹے جیسے لے پڑے۔ ”تم مسجد کی گھڑی کا رونا رو رہے ہو حالانکہ میں نے اپنی گھڑی سے تمہیں صحیح وقت روزے رکھ کر چلنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ کیا میں تھک ہار کر بیٹھ جاؤں؟ اس کی کیا کیا تھا۔“

نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ ایک رات وہ سحری کے وقت کھانا کھا کر مسجد میں اذان اذان کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ اس چھوٹی سی مسجد کا پیش امام بھی تھا اور مؤذن بھی۔ اپنی پائیں کلائی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ چھ سو روپے کی واٹر پروف اور شاک پروف گھڑی ہے یہ صحیح وقت بتاتی ہے۔“

”آپ گھڑی کا مول نہ بتائیں۔ خریدنے اور بیچنے والی چیزوں میں کبھی کبھی ”مولوی صاحب! ذرا ٹھہر جائیے آپ ابھی اذان نہ دیں۔ صاحب ابھی کھٹکھٹ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ نماز کبھی خریدی نہیں جاتی ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان ہیں۔“

ایمان علی نے چوتھے پر چڑھتے ہوئے کہا۔

”سحری کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اب نماز کا وقت ہے۔ اگر کوئی دیر سے سحری کھاتا ہے۔“

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نماز بھی دیر سے پڑھی جائے۔ ”یہ کہتے ہی اس نے اذان نہ دے سکا۔ میں صرف آپ کو سمجھا سکتا ہوں کہ روزہ اور نماز وقت کی پابندی

لیے بلند آواز سے ”اللہ اکبر“ کہہ دیا۔ ملازم کو مزید کچھ کہنے کا موقع نہ ملا تو وہ اسے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ فجر کی نماز کے بعد جب دن نکل آیا تو کمیٹی کے صدر صاحب نے اسے

کو اپنے مکان میں طلب کیا۔ ایمان علی وہاں پہنچا تو رکن الدین اپنے کمرے میں بیٹھ رہا تھا۔ اس نے ایمان علی کے سوال کا جواب ایک جھٹکے سے دیتے ہوئے کہا۔

صاحب! مسجد کی گھڑی پندرہ منٹ آگے ہے۔ میں نے اپنے ملازم سے کھانا بھیجنا غایت میں جمل کرنے والی ہے۔ اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ سیکڑے کی گمشدگی نے

پندرہ منٹ کے بعد اذان دیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کی وجہ سے کتنے پہلے ہی تو ذکر رکھ دیا تھا؟ رکن الدین کی ناراضگی اسے اور بھی توڑ رہی تھی۔

کر سکا۔ صرف ایک گلاس پانی پی کر روزہ رکھا ہے۔

ایمان علی نے جواب دیا ”جب میں برسوں سے پانچوں وقت کی نماز پڑھتا آ رہا ہوں تو فوراً ہی اس لقمے کو قبول کیا پھر صحیح طور سے پڑھتا

ہوا آگے بڑھ گیا۔ غلطی کس انسان سے نہیں ہوتی آخر وہ بھی ایک انسان تھا۔  
 انجھنوں کے باعث ایک غلطی کر بیٹھا لیکن رکن الدین، موقع مل گیا۔ اس نے کچھ  
 دوسرے ممبروں کو اپنا فیصلہ سنایا کہ پیش امام بدلا جائے۔ پتا نہیں ایمان علی نے اس  
 پہلے کتنی بار غلط پڑھا ہے، وہ تو اتفاق سے ایک قابل شخص اس کے پیچھے نماز پڑھ رہا  
 نے غلطی پکڑ لی۔ اس طرح تو وہ ہمیں الٹی سیدھی نمازیں پڑھاتا رہے گا۔  
 کمیٹی کے کچھ ممبروں نے دبی زبان سے ایمان علی کی حمایت کی لیکن صدر کے پاس  
 کے حامی زیادہ تھے لہذا اس کا فیصلہ مان کر ایمان کو چھٹی دے دی گئی۔ وہ پھر ٹھوکر  
 کے لیے مسجد سے باہر آگیا۔

وہ تمام دن سڑکوں پر گھومتا رہا۔ دوسرے محلوں کی مسجدوں میں جا کر نماز پڑھتا رہا۔

”جناب آپ کون ہیں مجھے صاف صاف بتا دیجئے۔“

روزی کا ذریعہ تلاش کرتا رہا۔ ایک شخص نے کہا۔

”میں آپ ہی کی طرح انسان ہوں۔“ ایمان علی نے جواب دیا۔

”میں اب تک کتنی ہی مسجدوں میں نماز پڑھا چکا ہوں لیکن اپنی سچائی اور ایمان داری  
 باعث جم کر نہ رہ سکا۔“

بڑے صاحب نے خوشامدانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

”دیکھیے آپ مجھ سے چھپنے کی کوشش نہ کریں۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ پولیس  
 میں ہیں اور مجھیں بدل کر آئے ہیں۔ آپ کی یہ داڑھی فعلی ہے۔“

ایمان علی نے کہا ”آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ آپ روشنی میں چل کر دیکھ لیں۔ یہ  
 داڑھی نہیں ہے اور میں فعلی مولوی نہیں ہوں۔“

بڑا صاحب تھوڑی دیر کے لیے ہچکچایا پھر اس نے اچانک ہی ایمان علی کی داڑھی  
 کی داڑھی سمجھنے ہی ایمان علی لڑکھڑاتے ہوئے کراہنے لگا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی  
 بڑا صاحب نے اسے تڑا تڑا مارنا شروع کر دیا ”اے نہ تو تو پولیس والا ہے، نہ مولوی۔ کم  
 بھگتا ملتا ہے اور خودداری یہ ہے کہ حلال کی روٹیاں تلاش کرتا ہے۔ تیرے باپ  
 کے زمانے میں حلال کی روٹیاں ہوں گی۔ اب تو لاتیں اور جوتیں ہیں۔“

وہ اسے مارتے ہوئے احاطے کے پیچھے گیٹ پر لایا اور اسے باہر دھکیل دیا۔ وہ کوٹھی  
 پر پہنچے جھوٹی سی گلی میں گر کر ہانپ رہا تھا اور تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ اس کی  
 بڑی بڑی کھٹیاں ہیں، چار بڑی بڑی کاریں ہیں اور چار بڑی بڑی حسین بیگمات ہیں۔



ناک اور باجھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ اسی جگہ بے ہوش ہو گیا۔ وہ رات بھر اسی  
 رہا، صبح ہوئی تو اس پاس کی کوٹھیوں والے اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ کر اپنی کار  
 مصروفیات کے لیے روانہ ہو گئے۔ کسی نے پچھلی گلی میں جھانک کر نہیں دیکھا۔  
 کی آخری تاریخ تھی، شام کو عید کا چاند نظر آنے والا تھا۔ تمام لوگ آنے والے  
 خوشیاں منانے کے لیے منگلی شاپنگ میں مصروف تھے اور جو عید کی خوشی کا سبب  
 حق دار تھا وہ گلی میں پڑا ہوا تھا۔ کسی کو بھی کی ایک بیگم نے پچھلی گلی سے جھانک  
 دیکھ لیا۔ اس نے فوراً ہی میونسپل کمیٹی کے دفتر میں فون کیا کہ کوٹھی کے پیچھے  
 کی لاش پڑی ہے، اسے فوراً اٹھوایا جائے ورنہ اس صاف ستھرے علاقے میں  
 پھیل جائیں گی۔

شام کو ایک میونسپل کمیٹی کی گاڑی اسے اٹھانے کے لیے آئی تو اسے پا کے  
 بھٹکے اس کے پاس آکر بیٹھ گئے اور اسے اچھی طرح منٹول کر دیکھنے کے بعد یہ  
 کہ وہ مرچکا ہے۔ وہ دونوں بھٹکے منگے خاموش ایمان کے پاس بیٹھے کچھ دیر تک  
 کرتے رہے پھر ان میں سے ایک چارپائی لانے کے لیے چلا گیا۔ کمیٹی والے آپ ایک  
 بھٹکے نے کہا کہ مرنے والا اس کا رشتہ دار ہے، وہ دونوں سے بیمار تھا، آج  
 مانگتے نکلا تو یہاں آکر مر گیا۔ یہ سن کر مردہ اٹھانے والے مترنے اسے دوبارہ منگے  
 تھے۔ دس پیسے، پچیس پیسے اور کچھ لوگ ایک ایک روپے کے نوٹ بھی بھیج رہے تھے۔  
 ”مسروں کو مرنے کے لیے سڑک ہی ملتی ہے۔ اب اسے لے کر سناں کیل چاروں بھٹکے مانگنے والوں کے دل خوشی سے دھڑک رہے تھے لیکن وہ منافع حاصل کرنے کی  
 چلو اسے اٹھا کر لے جاؤ۔“ بھٹکے منگے نے عاجزی سے کہا۔

”جما دار صاحب مرنے والے کا بھائی چارپائی لانے گیا ہے۔ وہ مرنے والے کے پاس بیٹھا اس سے آہستگی سے کہہ رہا تھا۔  
 بھی بلا کر لائے گا، ہم ابھی اسے اٹھا کر لے جائیں گے۔“ کمیٹی والے وہاں پہنچے۔  
 دیر انتظار کرتے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ مگر اگر لاش اٹھا کر لے جائیں تو وہ منہ۔“ چارو والے کے دل کی گمرانی سے آہ نکلی، آنکھوں سے آنسو پھینکنے لگے۔ پھر وہ چین کرتی  
 جائیں گے۔ بیس منٹ کے بعد تین بھٹکے ایک چارپائی اٹھا کر لے آئے اور وہی سوچنے لگی۔  
 ایمان علی کے بے حس جسم کو ڈال کر کلہر شہادت پڑھتے ہوئے صدر کی طرف ہلے۔ بوڑھے منگو تیرا منہ جلتے میرا خصم کبھی نہیں مر سکتا کیونکہ وہ ایمان والا ہے اور ایمان  
 ایمان کی لاش چار کاندھوں پر جاری تھی۔ دیکھا جائے تو کتنے ہی لوگ اس کو لہو بھی موت نہیں آتی۔ میں جو رو رہی ہوں تو بے ایمانوں کی لمبی حیات پر رو رہی ہوں کہ  
 ایمان کو مار کر اپنے کندھے پر اٹھائے پھرتے ہیں اور انہیں احساس تک نہیں ہو ایمان کے سڑے گلے دشمن کیوں نہیں مرتے۔ آہ کبھی میں بھی ایمان والی تھی، میرے

خاوند نے مجھے ایمان کا راستہ دکھایا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ ایمان کے راستے پر چلتے پاس ظالم چوہدری کو جلد سے جلد سزائے موت سنادی جائے پھر وہ بوڑھا بھی ایسا تھا کہ ایمان والے کے قدموں میں جان دے دوں۔ مگر ہماری اس دنیا میں بے ایمانی کے چہرے سے مکار نظر نہیں آتا تھا۔ اگر ہر انسان کے چہرے سے مکاری ظاہر ہو جائے تو بہت مضبوط ہیں۔ میں نے چوہدری دین کو گرفتار کرانے کے بعد یہ سمجھ لیا تھا کہ مجھ پر معصوم عورتیں بھی دھوکہ نہ کھائیں۔

پھانسی ہو جائے گی۔ شاید پھانسی ہو چکی ہوگی مگر ایک جھوٹ اپنے پیچھے دوسرے مجھ۔ جب میں اس بوڑھے کے ساتھ تھانیدار کی بن کے گھر پہنچی تو اس گھر میں داخل چھوڑ کر مرنا ہے تاکہ دنیا میں اس کا سکھ بھی چلتا رہے اور بچوں کو یہ سوچنے پر مجبورتی آجائے کہ ایک مضبوط ہاتھ پیچھے سے آخر میرے منہ پر جم گیا۔ پھر دوپٹے کے جوان رہے کہ اتنی بڑی دنیا میں جھوٹ کے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ جھوٹ بولو گے تو بھائی انہوں نے میرے منہ پر کپڑا ٹھوس کر ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ دیئے۔ میں تڑپتی گئی۔ نہیں بولو گے تو فٹ پاتھ پر مر جاؤ گے یا صرف مرنے والے کی لاش پر رونے لگتی رہی مگر ان کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکی۔ وہ مکان بالکل ویران تھا۔ اس کے پیچھے آؤ گے اور میں کسی اجنبی کی لاش پر رونے لگاؤں گی۔ وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ مال بردار ٹرک کھڑا تھا۔ انہوں نے مجھے اس ٹرک کے پچھلے حصے میں ڈال دیا۔ باقی حصے یا باخوش ہو گیا۔ اس کے آنسوؤں کی ایک ایک بوند منافع کی شرح بڑھاتی جاری کس مال بھریا گیا تھا تاکہ میں نظر نہ آسکوں۔ میرے پاس ایک جوان ننگا چاقولے کر بیٹھ گیا دنیا کے بازار میں کبھی کبھی آنسو بھی فروخت ہوتے ہیں۔ ان کے عوض کسی کو دلالتا کہ کسی قسم کا خطرہ ہو تو مجھے فوراً ہی ہلاک کر دے۔

ہے کسی کو کفن ملتا ہے۔ وہ روتے روتے بدستور سوچ رہی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ ایک رات اور ایک دن تک وہ میں یہاں تک کیسے پہنچی؟ مجھے یہاں تک پہنچانے والا چوہدری دین محمد کلاں چلتا رہا۔ اس دوران کھانا کھانے کے لیے دو بار ویران جگہوں پر رکا۔ انہوں نے مجھے میں نے اس سالے کی بن کا ساگ اجاڑ دیا۔ سالے کا یہ رشتہ اس پر خوب چٹائی کھانا کھانا چاہا میں نے انکار کیا تو وہ مجھے مارنے لگے۔ میں پھر بھی کھانے کے لیے تیار نہ چوہدری دین محمد کے لیے ایک رشتہ اور میرے لیے گالی بن گیا ہے۔ اس واقعہ کوئی تو انہوں نے میرے بدن کے ایسے حصوں سے لباس کو پھاڑ دیا کہ میں گھبرا کر کھانے پر گزر گئے۔ میں وہ دن نہیں بھول سکتی جب ایمان علی ہوش میں آیا تھا۔ میں اس زیر ہو گئی۔

آنے کا وعدہ کر کے ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دینے گئی تھی۔ اسپتال سے نکلتے ہی ایک دوسری رات وہ مجھے ایک ایسے کچے مکان میں لے آئے جس کے چاروں طرف دور آویہ سامنے آ گیا۔ اس نے پوچھا۔

”بیٹی کیا نام ہے تمہارا سیکھتے ہو؟“

میں نے سر ہلا کر ”ہاں“ کہا۔ وہ کہنے لگا۔

”میں تھانیدار کا ملازم ہوں۔ تھانیدار صاحب یہاں اپنی بن کے گھر آئے اس طرح قتل کرتے کہ اس کی بونی بونی کاٹ کر جانوروں کے آگے ڈال دیتے۔ ایک ہیں۔ انہوں نے مجھے یہاں بھیجا ہے اور تمہارا ایک ڈاکٹر صاحب کے سے چوہدری دین محمد کا انتقام اسی طرح لیا جاسکتا تھا مگر عورت کو قتل کرنے کی ضرورت سیکھنا نام کی ایک عورت رہتی ہے اس کا خاوند اسپتال میں علاج کے لیے پڑا ہوا۔ بڑی اس کی عزت کو ختم کر دو وہ خود ہی مر جاتی ہے۔“

ہوا تم جلد ہی مل گئیں۔ انہوں نے تمہیں اسی وقت بلایا ہے۔ چوہدری دین وہ جو کہتے تھے وہی کرتے تھے۔ چوہدری کے سالے اور اس کے دوپٹے کے ساتھ ہوں مقدمے کی کوئی بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

اس نے مقدمے کا حوالہ دیا تو میں فوراً ہی اس کے ساتھ چل پڑی۔ میں کھانے بدن سے اتنا خون بہ گیا تھا کہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ مجھے دوا اور

اچھی خوراک کی ضرورت تھی لیکن وہ مجھے اسی طرح پیاری میں جتلا کر کے آہٹا ملال کی۔ ایمان علی کو میں کبھی بھلا نہیں سکتی تھی مگر اس کے اصول میرے دماغ سے مارنا چاہتے تھے۔ میں روتی تھی، کبھی خدا کو یاد کرتی تھی اور کبھی اپنے ایمان علی بٹ رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔

”میں اپنے خاوند کے ساتھ کراچی شہر کی طرف جاری تھی۔ میرا خاوند بہت ایمان کے لیے تڑپتی تھی۔ ایسے ہی وقت انسان بھٹکتا ہے اور سوچتا ہے کہ چٹائی بیٹھ کر جتلا کرتی ہے۔ میں بھی چٹائی سے توبہ کرتی تھی مگر ایمان علی کے چٹائی حوصلے والا ہے وہ بیدل سفر کرتا ہے اور لوگوں کو دین ایمان کی باتیں سمجھاتا جاتا ہے۔ کل رات تھے۔ وہ بھی تو آخر انسان تھا وہ کس کس طرح بدی قوتوں سے لڑ رہا تھا۔ ایک دیرانے میں چند ڈاکوؤں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ میرے خاوند کے پاس صرف ایمان کی میرے پاس ایمان علی نہیں تھا مگر اس کا وہاں ایمان موجود تھا۔ گھڑالت ہے جو لوئی نہیں جاسکتی لیکن مجھ جیسی جوان عورت لٹیروں کے لیے ایک بہت بڑی محبوب کی کوئی نشانی تو ہوتی ہے، میں نے نشانی کے طور پر اس کے ایمان کو بڑالت ہوتی ہے۔ وہ مجھے اٹھا کر لے جانا چاہتے تھے، میں کسی طرح بھاگ کر یہاں آگئی مستحکم کر لیا۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ جس بچے کی خاطر میرا ایمان علی مجھ سے ہٹا نہیں میرا خاوند کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟“ ایسا کہتے وقت مجھے اپنا ایمان رہتا تھا انہوں نے اس بچے کو قتل کر دیا۔ نہ میں اوھر کی رہی نہ اوھر کی۔ کاش یاد آگیا۔ میں بچ بچ نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ اسے دیکھنے کے لیے اس سے ملنے کے لیے دل تڑپ رہا تھا۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ وہ میرے لیے اس مجھے اپنے ایمان کے بازو پر سونے کا موقع مل جاتا۔

اس کے مکان میں سسک سسک کر مرتے مرتے میں پھر زندہ ہو گئی۔ میرا نہیں تڑپ رہا ہو گا۔ اپنے اصولوں کے مطابق اپنی عبادت میں مصروف ہو گیا ہو گا سنبھلے گئی۔ وہ مجھے مار کر پھینک دینا چاہتے تھے مگر دوبارہ مجھ پر رنگ روپ چڑھ گیا کہ اسے دنیا کی ہر خوب صورتی سے زیادہ خدا کی خوشنودی عزیز ہے۔

کارا وہ بدل گیا۔ پورے ڈیڑھ برس تک ان تینوں کی داشتہ بنی رہی۔ پھر ایک میں اتنی دور آکر اب یہی سوچ رہی تھی کہ وہ مجھے بھول ہی جائے تو بہتر ہے۔ میں وہاں سے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ اس رات صرف ایک جوان پرے پر رہنے اس بے حیا وجود کو لے کر اس کے سامنے نہیں جاسکتی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ ذہنی طور پر بھی مجھ سے وابستہ ہو گیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ مجھ پر عاشق، ایمان والا اب بھی مجھے قبول کر لے گا کیونکہ وہ میری بے گناہی کو سمجھے گا۔ مگر دنیا والوں نے کسی حد تک مجھ پر بھروسہ کرنا تھا۔

اس رات میں نے بڑی محبت سے پیش آکر اسے سلا دیا۔ جب وہ فرار ہو گا اس دنیا کے شیطانوں سے جھٹلائے گا۔ اس طرح اس کی عبادت میں خلل میں وہاں سے نکل بھاگی۔ میں نہیں جانتی کہ وہ ڈیڑھ سال میں نے کس جگہ کبھے گا۔ میں ایمان والی نہ رہی مگر ایک ایمان والے کو صدمات سے بچا کر کسی حد تک کس جنگل بیابان میں مجھے رکھا گیا تھا۔ میں اندھیرے میں کہاں جاری تھی اسے پر سکون عبادت کا موقع تو دے سکتی ہوں۔

میں معلوم تھا۔ جب صبح ہوئی اور دھوپ نکل آئی تو ایک چھوٹی سی بستی میں۔ میں نے اپنے ایمان سے دور رہنے کا فیصلہ کر کے اپنے کلیجے پر پتھر رکھ لیا۔ وہاں مزار کے ٹھنڈے کے قریب ہوں۔ کسی بزرگ کے مزار کے پاس کچھ لوگ نظر آئے، اب پاس منگو بابا ایک ننھے سے بچے کو گود میں لیے بیٹھا تھا۔ اس نے کہا ”میری بیٹی اس بچے ماتنے والی عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی پٹی حالت ختم دیتے ہی مر گئی۔ یہ جو میرے پاس بیٹھی ہے میری بہن ہے۔ میں اس بچے کو بہن کے پوچھا کہ میں کون ہوں اور کہاں جاری ہوں؟ میں ایک عورت ہو کر زبان سے لے کر نے آیا ہوں پھر میں کراچی واپس چلا جاؤں گا۔ بچہ اس عورت کی گود میں بھوک کہہ سکتی تھی کہ ڈیڑھ برس تک اپنی عزت لٹا کر آ رہی ہوں۔ میں بچ بات نہ کہہ بلکہ رہا تھا۔ اگر میرا بچہ زندہ ہوتا تو اس کا ہم عمر ہوتا۔ میری متا بھری چھاتیوں میں اب دور ان مجھے پھر جھوٹ کہنا آگیا تھا اور روٹی کھاتے وقت یہ نہیں سوچتی تھی کہ وہ موجود تھا۔ میں نے اس بچے کو گود میں لے کر اور ان لوگوں سے منہ پھیر کر اپنی

نفع حاصل کرنے کا لالچ سرمایہ دار میں ہوا فقیروں میں 'منافع بڑھتا رہے تو ایمان کی باتیں انہیں مشکلہ خیر معلوم ہوتی ہیں۔ رات کے ایک بجے چار فقیروں نے کفن کی آمدنی کا حساب کیا تو ہر ایک کے حصے میں ایک ہزار دو سو سات روپے آئے۔ یعنی مجموعی آمدنی چار ہزار آٹھ سو اٹھائیس روپے تھی۔ انہوں نے مزید منافع حاصل کرنے کے لیے سوچا کہ ایمان کی لاش کو ابھی محفوظ رکھا جائے۔ دوسری صبح عید گاہ کے پاس اسے رکھ کر سیکنہ کو پھر دلایا جائے گا۔ ہائے ری عورت! تو منافع کے کس بازار میں کام نہیں آتی؟

سیکنہ کو شام کے وقت اچھی طرح کھلایا پلایا گیا تاکہ رونے کی سکت رہے اور بچے کے لیے چھاتیوں میں دودھ بھی اترتا رہے۔ اسی رات کو وہ ایمان علی کی لاش چارپائی پر رکھ کر اپنی جگہوں کی طرف لے گئے۔ منگو بابا کی جھکی میں وہ لاش رکھی گئی۔ پھر وہ لوگ سیکنہ کو بچے کے ساتھ وہاں بٹھا کر باہر چلے گئے اور دروازے کو باہر سے اچھی طرح بند کر دیا کیونکہ ایمان علی روپے پیدا کرنے والا ایک مردہ مشین تھا اس کی حفاظت لازمی تھی۔

جھکی کے اندر چراغ کی ہلکی ہلکی سی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں سیکنہ کا گفتہ چہرہ زردی مائل بن گیا۔ سانس بڑھ گیا تھا۔ روتے روتے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ وہ شام سے لاش کے پاس بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی اس لیے بچے کو فرش پر لٹا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ایسی غمزہ نظروں سے چادر میں چھپے ہوئے انسان کو دیکھنے لگی جیسے بچہ کچھ بیوہ ہو گئی ہو اور اب تک اپنے خاندان کی موت پر روتی رہی ہو۔ اس پر مٹکی چادر بڑی ہوئی تھی۔ چادر مٹکی ہونے سے کیا ہوتا ہے اس کے پیچھے جو ایمان تھا وہ کہیں سے بھی میلانا تھا۔ اگر کوئی آنکھوں پر پڑا ہوا میلا پردہ اٹھا دے تو اسے ایمان کا روشن چہرہ نظر آجائے گا۔

کوئی اٹھا دے۔ ایمان کب تک چھپا رہے گا؟ ایک فراق کی ماری اپنی آنکھوں میں انتشار کے الاؤ روشن کیے زندگی کے ایک موڑ پر کھڑی ہوئی ہے۔ اس کی تھکی تھکی سی نگاہیں پوچھ رہی ہیں کہاں ہے میرا ایمان؟ کوئی پردہ اٹھا دے، کوئی جلوہ دکھا دے۔

باہر آسمان پر بدلی چھاتی ہوئی تھی ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ہوائیں تیز ہو گئی تھیں۔ اسی وقت بچہ دودھ کے لیے رونے لگا۔ پچھلی شام سے سیکنہ کو اچھی خوراک مل رہی تھی۔ اس نے ایک گلاس دودھ بھی پیا تھا اسی لیے اس کے سینے میں دودھ کا سمندر موجزن تھا۔ وہ بچے کو دودھ پلانے کے لیے بڑھی تو اچانک ہی ٹھنک گئی۔

چھاتی سے لگا لیا۔ منگو بابا نے خوش ہو کر کہا "تو میرے ساتھ کراچی چل اگر تیرا لالچ ہو گا تو وہاں پہنچ جائے گا۔ ہم بھی اسے تلاش کریں گے، وہ کبھی نہ کبھی مل جائے گا۔ تک تو میرے پاس رہنا اور اس بچے کو دودھ پلاتی رہنا۔"

میں منگو بابا کے ساتھ اس شہر میں آگئی اور اس کے ساتھ فقیروں کی ٹولہ بھیک مانگنے لگی۔ کتنی ہی سڑکوں کے کنارے بیٹھ کر رادر چادر میں چھپ کر بھیک مانگنے میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھتی تھی۔ میں ایمان علی کے سامنے نہیں جانا چاہتی میری نگاہیں اسے تلاش کرتی رہیں۔ یہ دل میرے قابو میں نہیں ہے مجھے سمجھاؤ میں اس سے نہ ملوں مگر اسے دیکھ لوں کہ وہ ایمان کے سفر میں کتنی دور نکل گیا ہے ایمان اس کے سامنے بڑا ہوا تھا۔ سفر کے دوران وہ تھک کر نہیں گرا تھا بلکہ تھا۔ اس پر چادر ڈال کر اس کی پچان مٹا دی گئی تھی اور سیکنہ سے کہا جا رہا تھا کہ اسے روٹی رہے۔ اس طرح روٹی رہے جیسے اس کا قصم مر گیا ہو۔ کسی رشتے آجائے تو کوئی رونا بھی ہے مگر ایمان مرجائے تو کوئی نہیں روتا۔ جس کی لاش حاصل ہو اس کی موت سے خوشی ہوتی ہے۔

لاش کے سامنے سفید چادر پر پیسوں کا ڈھیر لگ رہا تھا۔ چھوٹے بڑے کے ہاتھوں سے گر گر کر کھٹکتی ہوئی ہنسی کی طرح بچ رہے تھے۔ چاند رات کی خوشی ہی فراخ دل ہو گئے تھے۔ اس طرح ڈھیر سارے پیسے چھینکتے جا رہے تھے جیسے ایمان کا کفن پینا کر کوئی تاریخی کارنامہ انجام دینا چاہتے ہوں کہ دیکھو تیرہ سو سال سے ہمیں مذہب بتانے کی کوشش کرتا آ رہا ہے۔ آج ہم اس کی کوششوں کو سونے سے رہے ہیں تاکہ آئندہ نسلوں کے ماہر آثار قدیمہ جب زمین کی تہ سے اسے کوئی سونے کا کفن اس بات کی سند رہے کہ ایمان کو اس کے شایان شان دفن کیا گیا ہو کر بھی کیا سکتے ہیں؟ ہم سچ نہیں بول سکتے اور سچ نہیں سن سکتے لیکن زبان سے یہ یقین دلاتے ہیں۔ شریف نہیں ہیں، شرافت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اندر سے سلا ہیں، اوپر سے اسلام کے نعرے لگاتے ہیں۔ ہم آج جتنے دھغلے ہیں کل نہیں تھے بھی ہمیں اپنے کردار پر شرم نہ آئی تو آئندہ کل بھی ہم اپنی جیسی دغلی فطرت پیدا کریں گے۔

”میرے ایمان! میری جان آنکھیں کھول، تو نہیں مر سکتا ایمان کو کوئی نہیں مار سکتا۔  
تو ایک سانس کے بعد دوسری سانس لے گا اور ہر آزمائش کے بعد زندہ رہے گا۔“  
اس نے آنکھ نہیں کھولی، صرف لب ذرا سے کھولے ”پانی۔۔۔“

تب اس کے چہرے کی مروئی سیکند کی سمجھ میں آئی۔ وہ صرف پیاسا ہی نہیں بلکہ بھوکا  
بھی تھا۔ وہ اپنے خاوند کے فائدہ زدہ چہرے کو پہچانتی تھی اس لیے پھر دوڑتی ہوئی دروازے  
تک گئی اور اسے پیٹ پیٹ کر کہنے لگی۔

”منگو بابا میرا خاوند زندہ ہے، وہ بھوکا ہے۔ اس کے لیے دودھ اور روٹی لے آ۔ خدا  
کے لیے اسے بچالے۔“

”اری کیوں باؤلی ہو رہی ہے۔ کیا میں نہیں جانتا کہ تو راتوں کو بھی نیند میں اسی طرح  
بڑھاتی ہے۔ میرے ایمان کو بچاؤ میرے ایمان کو بچاؤ۔“

”ارے اسے چلانے دے منگو، سالہا کھد، کھد کھاموس ہو جائے گی۔“  
کوئی اس کی نہیں سن رہا تھا، سب اپنی گارہے تھے۔ وہ جھگی کے اندر بچہ کے پنجھی  
کی طرح پھر پھر زاری تھی۔ ایمان کی سلاستی کے لیے خدا کا واسطہ دے رہی تھی۔ ادھر  
آ رہی تھی ادھر جارہی تھی۔ پروانے کی طرح شمع ایمان کا طواف کر رہی تھی۔ ایک طرف  
پڑ بھوک سے بلک رہا تھا، دوسری طرف ایمان علی کا منہ بھوک سے کھلا ہوا تھا۔ وہ کس کی  
بھوک مٹائے؟ کس طرح مٹائے؟ بچہ مسلسل رو رہا تھا، چپ ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔  
باہر بیٹھے ہوئے منگو بابا کا دل تڑپنے لگا کیونکہ وہ اس کی اپنی بیٹی کا بچہ تھا۔ تو اسے کا روٹا  
برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ غصے میں بڑھتا ہوا جھگی کا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

”اری کیا پاگل ہو گئی ہے؟ کیا بچے کو دودھ نہیں پلائے گی؟“

منگو بابا کے ساتھ دوسرے فقیر بھی بڑھاتے ہوئے اندر آئے مگر سیکند کو دیکھتے ہی  
بچے ضد میں آکر سانس روک لیتے ہیں تو دوسرات کی عورتیں کیا عمل کرتی ہیں۔ وہ فوراً  
ایمان علی کے چہرے پر جھک گئی۔ نیم مردے کا منہ ذرا سا کھلا ہوا تھا، وہ اپنا منہ اس کے  
میں ڈال کر زور زور سے پھونکنے لگی۔ اس کے ہنسنے میں سانس بھرنے لگی۔ وہ خوش  
یہ عمل کرتے ہی ایمان علی کی بہت ہی ہولے سے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ وہ خوش  
جائی سے دوسرے کو زندگی مل رہی تھی۔

ہوا کی تیزی نے پردہ اٹھا دیا تھا۔ ایمان علی کے چہرے پر سے چادر کا کنارہ اڑ کر رہ  
آ گیا تھا۔ سیکند پر جیسے ایک ساعت کے لیے سکتہ طاری ہو گیا، اوپر کی سانس ادھر ہی رہ  
پھر وہ چپچسپ مارتی ہوئی قریب آئی اور ایمان علی سے پلٹ کر روئے لگی ”میرا ایمان  
جان! ہائے میں کیسی ہوں، اب تک تجھ پر جھوٹے آنسو بہاتی رہی۔ ہائے! مجھے  
آجائے، تجھ سے پہلے میں کیوں نہ مر گئی۔“ وہ چیخ رہی تھی، تڑپ تڑپ کر چین کر رہی  
اس کی آنکھوں سے سچے آنسو رواں تھے۔ باہر سے منگو بابا نے ڈانٹ کر کہا۔

”اری کیا گل ہو گئی ہے، تجھے اب عید گاہ پر چل کر دونا ہے۔ ابھی چپ ہو جا۔“  
وہ ایک دم سے چپ ہو گئی اور حیرانی سے ایمان علی کی صورت دیکھنے لگی۔ اس

پلٹ کر روئے دقت محسوس ہو رہا تھا کہ وہ لاش کی طرح سرد نہیں ہے، اس کے بدن میں  
ہلکی سی غیر محسوس سی حرارت ہے۔ ایک مرد کا جسم ہوا اور چھپی چھپی سی حرارت ہونا  
عورت کا بدن ہی محسوس کرتا ہے۔ کیا میرا ایمان زندہ ہے؟ وہ دل کی جگہ کان لگا کر  
لگی۔ وہاں بہت ہولے ہوئے کمزور سی دھڑکنیں اپنی زندگی کی گواہی دے رہی تھیں  
تڑپ کر چیخ مارتی ہوئی اٹھ گئی اور جھگی کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔  
ایمان زندہ ہے، میرا خاوند زندہ ہے، خدا کے لیے اسے بچاؤ۔“

باہر سے ایک فقیر نے دوسرے فقیر سے کہا ”بے چاری شام سے اسے خاوند  
رہی ہے۔ ایک تو پہلے ہی خاوند سے بچھڑ کر آدھی پاگل ہو گئی تھی، اب روئے روئے  
اسے اپنا خاوند سمجھ رہی ہے۔“

دوسرے فقیر نے کہا ”چھا ہے، عید گاہ میں پاگلوں کی طرح روئے گی تو زیادہ پیے  
گے۔“

انہوں نے دروازہ نہیں کھولا تو وہ پھر ایمان علی کی طرف پلٹ گئی۔ اسے یاد آیا کہ  
بچے ضد میں آکر سانس روک لیتے ہیں تو دوسرات کی عورتیں کیا عمل کرتی ہیں۔ وہ فوراً  
ایمان علی کے چہرے پر جھک گئی۔ نیم مردے کا منہ ذرا سا کھلا ہوا تھا، وہ اپنا منہ اس کے  
میں ڈال کر زور زور سے پھونکنے لگی۔ اس کے ہنسنے میں سانس بھرنے لگی۔ وہ خوش  
یہ عمل کرتے ہی ایمان علی کی بہت ہی ہولے سے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ وہ خوش  
جائی سے دوسرے کو زندگی مل رہی تھی۔

سب ہی سمجھ میں آگیا کہ وہ نیند کی حالت میں ایمان کو بچانے کے لیے نہیں کرتی تھی، نہ ہی اس پر خواہ مخواہ رونے کا جنون سوار ہوا تھا بلکہ یہی اس کا ایمان علی ہے تلاش کر رہی تھی۔ منگو بابا چیخ چیخ کر دوسروں سے کہہ رہا تھا۔  
 ”ارے دیکھتے کیا ہو، دوڑ کے جاؤ۔ اس کے لیے دودھ روٹی لاؤ۔ یہ میرے لڑکے دودھ پلاتی ہے۔ کیا میں اس کے سناگ کو نہیں بچاؤں گا؟ جاؤ جلدی کرو۔“  
 اس کی چیخ و پکار اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ ایمان کو زندہ رکھا جائے گا۔ اپنے ایمان علی پر جھکی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہا تھا اور سیکڑ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھللا رہے تھے۔ عید کی صبح ہو رہی تھی۔



## چور رشتہ

ہماری مذہب سوسائٹی میں جب  
 وہ رشتہ قائم کرنے کی اجازت  
 نہیں ملتی۔ تب آدمی تہذیب کے  
 چور دروازے سے ایک چور کی طرح  
 اسی رشتے تک پہنچتا ہے۔

ہر وقت چشم تصور میں کوئی البیلی سی سینہ مجھے اپنی طرف بلاتی رہتی ہے اور میں اس کے ساتھ ذرا بے نیازی سے پیش آتا ہوں۔ سنا ہے کہ عورت کے سامنے ذرا بے نیازی برتو تو وہ نیاز مند بن کر پیچھے چلی آتی ہے مگر یہ سب میری جاگتی آنکھوں کا خواب ہے اگرچہ جج کوئی سینہ میری طرف مائل ہو تو میں اسے مایوس نہیں کروں گا۔ ”دوسروں کو مایوس کرنا گناہ عظیم ہے۔“ شاید یہ بات حسین لڑکیوں کے سلسلے میں ہی کمی گئی ہے۔

پہلے تو میں اس انتظار میں رہا کہ کوئی ضرورت مند خود ہی چل کر میرے پاس آئے گی کیونکہ آئینہ مجھے سمجھاتا تھا کہ میں ایک خوبصورت اور اسماٹ فوجوان ہوں۔ مگر آئینے تو بد صورت بوڑھوں کو بھی یہی سمجھاتے ہیں۔ میں شیوہ کرنے کے بعد اور بہتر سن سوٹ پہننے کے بعد اپنی بیوی سے پوچھتا تھا کہ میں کیسا لگتا ہوں وہ نیک بخت جواب دیتی۔

”اللہ بہت اسماٹ لگ رہے ہیں۔ دیکھ دیکھ کر ہی نہیں بھرتا۔ میں تو خاموش نظروں سے آپ کی نظر اتار دیتی ہوں۔“

کچھ عرصے بعد پتہ چلا کہ ہر فرما تیرہ وار بیوی اسی طرح اپنی شوہروں کی نظریں اتارتی ہے۔ ان کی نظروں میں خوب صورتی یہ ہے کہ دنیا کا سب سے خوب صورت مرد مجازی خدا ہوتا ہے۔ میرے پاس ایک ایئر کنڈیشنڈ امپالا ہے۔ وقتاً فوقتاً سر راہ جب کوئی لڑکی لفٹ مانگتی تھی تو مجھے اپنی خوبصورتی کا یقین ہو جاتا تھا۔ آخر عورتوں کو اپنی طرف مائل کرنے والی مجھ میں کوئی خاص بات ہے۔ مگر لفٹ مانگنے والیاں دوبارہ نظر نہیں آتی تھیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ مجھ سے زیادہ میری ایئر کنڈیشنڈ امپالا خوب صورت ہے۔ پھر بھی میں احساس کمتری کا شکار نہیں ہوں۔ یہ خیال تقویت پہنچاتا ہے کہ لڑکیاں بد ذوق ہیں جو مجھ جیسے باذوق انسان کی قدر کرنا نہیں جانتیں۔

اس طرح اپنے دل کو سمجھاتے سمجھاتے کئی برس گزر گئے۔ آخر پے در پے ناکامیوں نے مجھے سمجھایا کہ مانگنے سے کچھ نہ ملے تو مذہب انداز میں بڑے سلیقے سے جھین لینا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں نے اخبار میں اشتہار دیا۔ اشتہار کا مضمون کچھ یوں تھا۔

”پشاور صادق علی اینڈ سنز کے ادارے میں ناولوں کی پروف ریڈنگ کے لیے ایک فوجوان تعلیم یافتہ لڑکی کی ضرورت ہے۔ تعلیمی صلاحیت کچھ بھی ہو مگر رومانی ناول پڑھنے سے دلچسپی رکھتی ہو۔“

## چور رشتہ

انسان کی خواہش ہر لمحہ جتنے بچے دیتی ہے ان کا شمار کوئی نہیں کر سکتا۔ ایک خواہش کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری، خواہشات سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں فوارہ سیدہ کیڑوں کی طرح کلبلائی ہوئی دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہو جاتی ہیں اس نکتے کے پیش نظر لکھا جاتا ہے کہ ”ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔“

میرا بھی دم نکل رہا تھا کہ ایک حسین و جمیل محبوبہ کو حاصل کرنے کی خواہش پور نہیں ہو رہی تھی حالانکہ گھر میں ایک بیوی موجود تھی وہ بیوی پہلے محبوب کی حیثیت سے میری زندگی میں آئی تھی۔ لیکن نادان محبواں یہ نہیں سمجھتی ہیں کہ وہ بیوی بن کر ایک رات گزارنے کے بعد سیکڑ ہینڈ ہو جاتی ہیں۔ مرد کے لیے پھر ان میں وہ چارم اور پلے پلے کشش نہیں رہتی۔ میں ایک عام سی حقیقت بیان کر رہا ہوں، ویسے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بیوی بتالینے کے بعد اپنی آخری سانس تک یا بیوی کی آخری سانس تک اس سے بڑھ کر کئی پڑتی ہے اور ہر سانس کے ساتھ یہ خواہش سر ابھارتی ہے کہ بیوی کی سانسیں جلا پوری ہو جائیں۔

میری ایک بیمار بیوی ہے۔ وہ شادی سے پہلے بھی بیمار رہتی تھی۔ دلہن بن کر آئی کھانسی اور بخار اپنے جینز میں لے کر آئی۔ اس کے باوجود میں اس سے محبت کرتا ہوں کیونکہ وہ میرے چار بعد پچارے پچارے پھول جیسے بچوں کی ماں ہے۔ میرا بڑا لڑکا پندرہ برس کا ہے اس حساب سے میں تقریباً سولہ برس سے اپنی بیوی کے ساتھ شرعی محبت کر رہا ہوں لیکن میری داستان کا موضوع تقریباً محبت ہے۔

میں ایک بہت بڑا ناشر ہوں۔ رومانی ناولیں شائع کرتا ہوں۔ اب تک سیکڑوں ناول شائع کر چکا ہوں اور ان رومانی ناولوں کو پڑھتے پڑھتے خود رومانس کی طرف مائل ہو گیا ہوں

سو کی سڑی بھی تھیں۔ ان کی بیرونی ساخت اور ان کے چہرے یہ بتا رہے تھے کہ کون میرے کام کی لڑکی ہو سکتی ہے۔ میں اپنے دفتر کے پرائیویٹ کمرے میں انہیں یکے بعد دیگرے بلا کر باتیں کرتا تھا پھر انہیں رخصت کر دیتا تھا۔ آخر میں وہ آئی جسے میں دیکھتے ہی دیکھتا کانٹا نکھار گیا۔

دو مہینہ نہ، چوتھی رگت، امداس کی سیاہ راتوں کا اندھرا سیٹھ لمبی لمبی ریشمی زلفیں جو زنجیری صورت میں گندھی ہوئی تھیں اور جو شانوں پر سے آگے سانسوں کی اٹھان پر لرز رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی میری سانسیں گزربا گئیں۔ گلابی رنگ کا فلیپر اور شرٹ اس کے بھرے بھرے بدن سے یوں چپکا ہوا تھا جیسے وہ لباس اس کے جسم کے خفیہ و فراز پر دھک کر تراشا گیا ہو۔ مجھے یوں لگا کہ وہ ذرا زور سے سانس لے گی تو لباس کی گلابیاں جگہ جگہ سے چٹ جائیں گی۔ سیاہ کاہل نے اس کی آنکھوں کو بادام کی صورت میں تراشا تھا۔ ایسی بڑی بڑی پھیلی پھیلی سی آنکھیں تھیں کہ میرے حواس پر پھیل گئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی ذہین آنکھوں سے چپ چاپ میرا انٹرویو لے رہی ہے اور مجھے سمجھ رہی ہے۔ یقیناً وہ سمجھ رہی تھی کہ میرے دفتر کے ملازموں کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی اسی لیے تو ملازمت کرنے کے لیے آنکھوں میں کاہل لگا کر آئی تھی۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ مرد کو سب سے پہلے عورت کی ایک چنگلی بھر نگاہ مارتی ہے۔ تیر بھی ایک چنگلی سے جھوٹ کر چٹا ہے اسی لیے وہ تیری طرح میرے دل میں ترازو ہو گئی۔

”کیا میں بیٹھ سکتی ہوں؟“

”اے۔ ہاں، ضرور“ میں ایک دم سے بوکھلا گیا جیسے وہ مجھے کوئی حکم دے رہی ہو۔ حالانکہ میں حاکم تھا ہر ماہ چند سو روپے دے کر اس پر حکومت کرنے والا تھا مگر میں کیا ہوتا تھا؟ اس سوال پر بس تک صرف ایک ہی بیوی کا چہرہ دیکھتے رہنے کے بعد پہلی بار آزادی سے ایک حسین و شیرازہ کو قریب سے دیکھ رہا تھا اس لیے ذرا گڑبڑا سا گیا تھا۔ میں نے جلدی سے نہیں۔ اک ذرا فاصلے سے پھول کا حسن نظروں کو گرانا ہے۔ اپنی خوشبو سے آٹا کر گیا۔

”بیٹھو ہمارا نام؟“

”شہناز رانی“

”یہ رانی صاحب کون ہیں؟“

”نظریں جھپکا کر ذرا شرمانا، ذرا مسکراتی ہوئی بولی۔“

اشہار میں یہ آخری فقرہ میں نے اس لیے نکھوایا تھا کہ رومانی ناول پڑھنے والی لڑکی ناول کے اوراق سے بھٹکتی ہوئی خیالوں ہی خیالوں میں کسی ہیرو کا سر اپنا تراشنے لگتی ہو سکتا ہے کہ ناول کی کتابت کی تصحیح کرنے والی لڑکی میری خواہشات کی بھی تصحیح کرنا شروع کر دے۔ میرے ادارے میں ناول نگاری، کتابت، پروف ریڈنگ اور کاروباری تعلقات قائم رکھنے کے کئی شعبے ہیں۔ ہر شعبے میں مرد کام کرتے ہیں لیکن جب یہ خبر پھیلی کہ بالکل اس ادارے میں ایک لڑکی ملازم رکھی جائے گی تو سبھی کے چہرے کھل اٹھے۔ اس دن گلستان میں پہلی بار ہمارا ایک جھوٹا کارہا تھا۔ جس روز درجنوں لڑکیاں انٹرویو کے آئیں اس روز ادارے کے سبھی لوگوں کے چہروں پر جھانڈ پھرتی تھی یعنی سب کھینچے تھے۔ جن کی مونچھوں کے بال کہیں کہیں سے سفید ہو رہے تھے انہوں نے خضاب کا استعمال کیا تھا یا پھر اپنی مونچھیں منڈوا دی تھیں کیونکہ لوگی مستقل طور سے آنے والی تھی ہمارا خضاب لگانے کی زحمت کون گوارا کرتا۔

عورت بڑی ظالم شے ہے جہاں پہنچتی ہے وہاں کا نقشہ ہی بدل دیتی ہے۔ بلکہ وہ لوگوں کے سوچنے کا انداز بھی بدل دیتی ہے میں اپنے دفتر کے ملازموں کو اچھی طرح جانتا ہوں ایک لباس کی حیثیت سے ان کے مسائل کو بھی سمجھتا ہوں۔ محدود تنخواہ والے ملازموں کو موجودہ منگائی اتنی اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی دل پسند لڑکی کو اپنی بیٹا سکیں۔ کسی لڑکی کی دوستی سے زیادہ روٹی کپڑے اور مکان کی دوستی عزیز ہوتی ہے۔ میرے دفتر میں جو لڑکی آنے والی تھی اس کی قیمت مفت حاصل ہو سکتی تھی۔ اتنے کمزور کے سچ ایک پھول کھلے اور اس کے بعد وہ کسی کے حصے میں آئے یا نہ آئے مگر نظروں پر اس بھجرتی رہتی ہے۔ گھر میں ایک ہی بیوی کی آواز سنتے سنتے کان دکھتے گتے ہیں۔ دفتر میں ایک ہی بیوی کا چہرہ دیکھتے رہنے کے بعد پہلی بار آزادی سے ایک رس بھری آواز تو سنائی دے سکتی ہے، پھول کے قریب جا کر اسے چھو لینا تو ایک نہیں۔ اک ذرا فاصلے سے پھول کا حسن نظروں کو گرانا ہے۔ اپنی خوشبو سے آٹا کر گیا۔

اپنے رنگین تیرہن سے مصحفائی ہوئی آنکھوں میں رنگ برنگے خواب جتانے آپ اسے تسلیم کریں یا نہ کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ ہم جیسے بھوکے پیاسے جانوروں کے سامنے وہ اپنے حسن کا چارہ ڈالنے آرہی تھی۔

انٹرویو کے لیے آنے والی لڑکیاں کالی بھی تھیں گوری بھی۔ صحت مند بھی تھیں



”میری کوٹھی میں بہت سے غیر مطبوعہ ناولوں کے مسودے پڑے رہتے ہیں۔ تم وہاں آکر انہیں پڑھو گی اور ان مسودوں پر اپنی رائے دینے کے لیے نوٹس لکھو گی۔“  
 ”کیا مسودے پڑھنے کے لیے آپ کی کوٹھی میں آنا ضروری ہے؟ وہ تو دفتر میں بھی پڑھے جاسکتے ہیں۔“

”کبھی اشارہ نہیں سمجھ رہی تھی۔ یہ لڑکیوں کی بہت بری عادت ہے۔ سمجھتی بھی ہیں تو تجاہل عارفانہ سے کام لیتی ہیں۔ پہلی ملاقات میں اسے سمجھنا مشکل تھا۔ میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔“

”ہاں غیر مطبوعہ مسودے راز میں رکھے جاتے ہیں تاکہ دوسرے پبلشروں تک ان کی تک نہ پہنچے اسی لیے میں انہیں دفتر میں نہیں لاتا ہوں اگر تم کوٹھی میں آکر انہیں پڑھو گی تو پڑھنے کے تین سو روپے الگ سے ملیں گے۔ اس طرح تم ہا ہا آٹھ سو روپے حاصل کر سکو گی۔“

”وہ ہولے سے مسکرائی جیسے آٹھ سو روپے بھی کچھ یوں ہی سے ہوں لیکن آنکھوں کی سرت آئینہ چمک کو نہ چھپا سکی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ آٹھ سو روپے اس کی توقع سے زیادہ ہیں۔ اس نے ذرا بے نیازی سے کہا۔“

”میں یہ ملازمت کروں گی مگر کوٹھی میں جانے والی بات ایسی ہے کہ ذرا سوچ کر جواب دے گی۔“

”یہ تمہاری مرضی ہے میں نے تو تمہاری پریشانیوں دور کرنے کے لیے اضافی آمدنی کا راستہ دکھایا ہے۔ بہر حال کل سے تم ڈیوٹی پر آ جاؤ۔“

”وہ اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی پولیس ”آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ بہت مخلص اور مہربان ہیں میں آپ کی پیشکش پر غور کروں گی۔“ وہ مسکراتی ہوئی وہاں سے محو کر میرے کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میری آنکھوں کے سامنے پھولوں سے لدی ہوئی شاخ چمکتی رہی۔ ہر نئی چیز سونے کی طرح چمکتی ہے۔ اس سنہری چمک کے سامنے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ جو سامنے سے چلی گئی تھی بس وہی بار بار نگاہوں کے سامنے چمکتی رہی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اسے کس طرح موم کیا جاسکتا ہے۔ میں ایک مدت سے ایسی ہی کسی حینہ کا خنجر تھا۔ بڑے مہر سے انتظار کر رہا تھا اب وہ آگئی تھی تو مہر نہیں ہو رہا

”میرے ڈیڈی ہیں“

میں نے اسے تعجب سے دیکھا۔ بھلا ڈیڈی کا ذکر کرتے وقت اسے شرمائے ضرورت تھی۔ یہ لڑکیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ نہ شرمائے والی بات پر شرماتی ہیں نہ شرمائے والی بات پر کھلکھلا کر ہنس دیتی ہیں۔ میں نے اس سے کہا۔

”ہمارے میاں جب ناول چھپنے کے لیے پریس میں جاتے ہیں تو دفتر میں رات تک کام ہوتا ہے۔ کیا ایسے وقت تمہارے ڈیڈی تمہیں اور ٹائم کی اجازت دیں گے؟“

”جی ہاں! مجھے گھر والوں کی طرف سے پوری آزادی ہے۔ میری ہی محنت سے انہی اخراجات پورے ہوتے ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو ہاتھ پیسے دیتے ہیں ان ہاتھ کوئی نہیں پکڑتا، کوئی نہیں پوچھتا کہ ایک نوجوان لڑکی کے ہاتھ کتنی دیر تک اور کتنے تک کہاں جاتے ہیں؟“

”معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے چھوٹی سی عمر میں بہت سے عجیب تجربات کیے ہیں۔“ میں نے چھوٹی سی عمر اس لیے کہا کہ وہ خوش ہو جائے حالانکہ وہ ایسی کم عمر نہیں ایک دم بیکے ہوئے پھل کی طرح تھی۔ عورت کو خوش کرنے کا موقع آئے تو وہ ہرگز سے جانے نہیں دینا چاہیے۔ وہ مسکراتے ہوئی بولی۔

”ہاں اب بھی زندگی میں تنگیاں ہیں اسی لیے تو ملازمت کرنے نکلی ہوں۔ یہاں وقت ذہن الجھا ہوا تھا کہ نہ جانے یہ ملازمت ملے گی بھی یا نہیں؟ اگر ملے گی تو تنگی ملے گی؟“

میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اسے خوش خبری سنائی۔  
 ”تمہاری ملازمت یہی ہے تنخواہ پانچ سو روپے ماہانہ ملا کرے گی۔“

اس کام کے لیے پانچ سو روپے بہت زیادہ ہوتے ہیں مگر اس نے کچھ زیادہ اظہار نہیں کیا، مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ ہاتھ سے نکل جائے گی۔ میں نے جلدی سے ”دور ٹائم کرو گی تو زیادہ پیسے ملیں گے۔“

اس نے پوچھا۔

”یعنی فاضل وقت میں کیا کام کرنا ہو گا؟“

میں نے جواب دیا۔

بیگم کی کیا ضرورت تھی؟

آپ کہیں گے میں انسان نہیں شیطان ہوں۔ ایک وفادار اور خدمت گزار بیوی کی موت کی تمنا کر رہا ہوں۔ بظاہر آپ کی بات درست ہوگی مگر ایمان سے کہیں کہ کرنی نوٹ کے عزیز نہیں ہوتے؟ ریمسہ بیگم مجھے اسی طرح عزیز ہے۔ مگر انگلیوں نے اس نوٹ کو جھوٹے جھوٹے میلا کر دیا تھا اور وہ جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ کیا آپ کسی بینک کے کاؤنٹر پر جا کر ایک پرانا نوٹ پھینک کر اس کی جگہ نیا نوٹ حاصل نہیں کرتے؟ یہ کون نہیں چاہتا کہ پرانی چیز کے بدلے نئی چیز مل جائے۔ اگر میں چاہ رہا تھا تو کون سا گناہ کر رہا تھا۔

میٹرنٹی ہوم تک پہنچتے پہنچتے میرے داغ میں مثبت اور منفی سوچیں آپس میں لڑتی رہیں۔ مثبت سوچ مجھے اخلاق اور مروت سکھاتی رہی کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جو بڑی شرافت سے ایک ہی بیوی پر اکتفا کرتے ہیں لیکن میں نے ایسے لوگوں کو نہیں دیکھا۔ اگر دیکھا بھی ہے تو وہ لوگ اپنے حالات سے مجبور ہوتے ہیں یا اپنی شرافت کا بھرم قائم رکھنے کے لیے اپنے من کو مارتے ہیں ورنہ یہ بڑی تلخ حقیقت ہے کہ آج بھی اگر کوئی حوا زادی مسکرا کر ایک نجیب الافین آدم زاد کو دیکھ لے تو وہ خوف خدا کے باوجود اس کا ہاتھ تھام کر مذہب کی جنت سے نکل جاتا ہے۔

اہستہ اہستہ بیگم مرتے مرتے چمک رہی ہیں۔ زچہ اور بچہ دونوں فیوت سے ہیں۔ میں نے ریمسہ کے بیڈ پر پہنچ کر اسے دیکھا وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آ رہی تھی۔ اس ڈھانچے پر جو کھال منڈھی ہوئی تھی وہ مادہ ورق کی طرح بالکل سفید تھی مارا خون پینے سے نچوڑ لیا تھا لیکن لیڈی ڈاکٹر کہہ رہی تھی کہ میں نے اس کا خون نچوڑ لیا ہے۔ آج سے پہلے شہناز میری زندگی میں نہیں آئی تھی۔ اس کے باوجود میں نادانستگی میں بغیر شعوری طور پر ریمسہ بیگم کو آہستہ آہستہ قتل کرتا آ رہا تھا۔

لیڈی ڈاکٹر مجھے اپنے کمرے میں بلا کر ڈانٹنے لگی۔

”دیکھیے صادق آپ آپ جیسے پڑھے لکھے ذہین لوگ خاندانی منصوبہ بندی پر عمل نہ کریں تو یہ بڑے افسوس کا مقام ہے۔ میں نے ریمسہ بیگم کی پچھلی زچگی میں ہی آپ سے کہہ دیا تھا کہ اس عورت میں اب جان نہیں رہی۔ خدا کے لیے اسے بخش دیجئے لیکن پتہ نہیں آپ کتنے بچوں کے باپ بن کر زانیہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔“

تھا۔ میں نت نئے جھکندے سوچ رہا تھا کہ کسی بھی ترکیب سے وہ میرے عشق میں ہو جائے۔

اسی وقت فون کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔ اس کی آواز ایسی کرخت تھی کہ شہناز چلتا چور ہو گئی۔ میں نے بڑی ناگواری سے لیڈی فون کی طرف دیکھا۔ کوئی کارڈ کال ہو سکتی تھی۔ وہ ایک کال ہزاروں روپے کا منافع پیش کر سکتی تھی مگر اس وقت منافع کا بھی لالچ نہیں تھا۔ صرف شہناز کی تمنا تھی لیکن میں دفتر میں بیٹھ کر کتنے فائدے سے منہ موڑ سکتا تھا۔ مجبوراً مجھے ریسیور اٹھانا پڑا۔ دوسری طرف سے ایک لیڈی ڈاکٹر کی آواز آئی۔

”ہیلو۔ میں ڈاکٹر شازیہ بول رہی ہوں۔ کیا صادق صاحب موجود ہیں؟“

”میں صادق ہوں۔ میری بیگم کا کیا حال ہے؟“

”بہت سیریس کیس ہے۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ زچگی کے وقت زچہ کی باخاطر خطرہ ہے۔ آپ فوراً یہاں آجائیں۔“

دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔ میں نے بھی جھنجھلا کر ریسیور کو کیڑیل پرٹ کر کسی خوابوں کی محفل گنجی ہوئی تھی اور کہیے یہ زندگی مجھے پھر مار رہی تھی۔ کہاں شہناز کہاں میری ریمسہ بیگم۔ ایک آمد بہار تھی تو دوسری رخصت بہار۔ اب شوہر کا نبھانے کے لیے میٹرنٹی ہوم تک جانا ضروری تھا لہذا میں اسی وقت دفتر سے اٹھ گیا۔

میٹرنٹی ہوم کی طرف جاتے وقت میری آنکھیں کار کی دند اسکرین کے پار دیکھ رہی تھیں اور داغ دیوار گھڑی کی طرح ٹک ٹک کرتا ہوا کبھی شہناز کی طرف اور کبھی ریمسہ کی طرف ہو رہا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ریمسہ بیگم کی جان کو خطرہ ہے۔ یہ جانے کیوں میں ذرا بھی پریشان نہ ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ایک رنگ چراغ بچھ رہا تھا اور ایک نئی جگہ لگاتی ہوئی شمع روشن ہو رہی تھی۔ میں بے ایمانی کی بناؤں میں چھپا کر نہیں رکھتا۔ صاف کہتا ہوں کہ ریمسہ بیگم کو رخصت ہو ہی جانا چاہیے۔ پرانا لباس کب تک پہن سکتا ہے اگر وہ لباس کسی پرانے رشتے کی یاد دلاتا ہو تو اس سے زیادہ اسٹور میں رکھا جاسکتا ہے۔ کبھی کبھی پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے اسٹور جھانک کر دیکھا جاسکتا ہے گھر میں ریمسہ بیگم کی یاد دلانے کی بہت سی چیزیں تھیں۔

طور سے غصہ آتا ہے۔ وہ کبخت لیڈی ڈاکٹر مجھے قاتل کہہ رہی تھی مگر قاتل کسے کہتے ہیں؟ کسی کو چمرا گھونپ کر کسی کا گلہ دیا کر کسی کو شدید زخم پہنچا کر ڈالنا قاتل ہے لیکن میں نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی۔ اگر میں اپنی بیوی کو محبت سے آغوش میں لیتا ہوں اور اس کی سچ کا کام سنبھالتا ہوں اور ایسے میں وہ موت کی طرف جاتی ہے تو میں کیسے قاتل کہلاؤں گا؟ اگر ہم سب کی ازدواجی زندگی میں اور سماجی زندگی میں کوئی محبت سے دھیرے دھیرے مرنے یا مرنے سے بچنے کا واقعہ قتل کے ذمے میں نہیں آتا۔ قانون کے کسی ذمے میں نہیں آتا۔ اگر آتا ہو تو کوئی مجھے گرفتار کر لے۔

میں نے رئیسہ کے پاس پہنچ کر اسے بتایا کہ وہ نیک چڑھی لیڈی ڈاکٹر کس طرح ہماری پاکیزہ محبت کو بھرانہ قرار دے رہی ہے اور کہتی ہے کہ ہم آئندہ بچے پیدا نہ کریں۔ میں اس معاملے میں خوش نصیب ہوں کہ میری بیوی کثرت بطنی قسم کی عورت ہے۔ وہ بھی عام عورتوں کی طرح بچوں کو خدا کی دین سمجھتی ہے اور شوہر کے کروت بھول جاتی ہے وہ بھی آنے والے بچے سے دشمنی نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اپنی کمزوری اور بیماری کے پیش نظر دوسرا راستہ اختیار کرتی تھی یعنی مجھ سے دوسری دور رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”آپ ناراض نہ ہوں۔ لیڈی ڈاکٹر میری بھلائی کے لیے کہتی ہے اس بار آپ میری ایک بات مان لیں۔“

”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ سال چھ ماہ کے لیے مجھے میرے میکے میں چھوڑ دیں۔ میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی ہوں۔ میکے میں رہوں گی تو شاید کچھ صحت یں جائے۔“

وہ خود ہی میرے راستے سے ہٹا چاہتی تھی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ شہناز اپنی ماہانہ آمدنی پڑھانے کی خاطر مسودے پڑھنے کے لیے میری کونٹھ میں آئے گی۔ اگر رئیسہ کچھ عرصے کے لیے چلی جاتی تو اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی تھی لیکن میں فوراً ہی راضی نہ ہوا۔ بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر جذباتی انداز میں کہنے لگا۔

”تم نے مجھے اپنا عادی بنا دیا ہے۔ تمہارے بغیر میں کیسے وقت گزاروں گا۔ جانے سے پہلے ایک اور قصور پر اتروالینا۔ میں رات کو اسے سرہانے رکھ کر دیکھا کروں گا۔“

میں نے اسے جواب دیا۔

”بچے خدا کی دین ہیں۔ اگر ہم انہیں وجود میں آنے سے روکتے ہیں تو دوسرے لمحے میں ان بچوں کے قاتل بن جاتے ہیں۔“

”اسی لیے آپ اپنی بیوی کے قاتل بن رہے ہیں۔“ لیڈی ڈاکٹر نے تلخ لہجے میں ”ایک عورت جو آپ کے گھر کو جنت بناتی ہے جو آپ کی آئندہ نسل کو اپنی گود میں پالتی آپ اس عورت سے محبت کیوں نہیں کرتے؟ جو آپ کی اولاد کو دودھ پلاتی ہے آپ قطرہ قطرہ زہر دیتے ہیں کیا یہ شرم کی بات نہیں ہے؟“

میں نے غصے سے کہا۔

”ڈاکٹر میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں کہ آپ اس انداز میں گفتگو کر رہی ہیں۔ اپنا رویہ درست کریں۔“

لیڈی ڈاکٹر کو ہوش آگیا کہ وہ جوش میں باتیں کر رہی ہے۔ وہ ایک گہری سانس بڑھائی بولی ”سوری مجھے آپ کے ذاتی معاملات میں نہیں بولنا چاہیے صرف ایک اذیت سے سمجھانا چاہیے مگر آپ سمجھنا نہیں چاہتے۔ ہر حال آئندہ آپ اپنی زبان نہ لائیں۔ اس شہر میں اور بھی سیکڑوں میٹرنٹی ہوم ہیں۔“

”آپ کی اطلاع کا شکریہ۔“

میں اٹھ کر جانے لگا لیڈی ڈاکٹر نے آواز دے کر کہا۔

”ایک بات سننے جائیں۔ بچے کی ولادت ہمارے لیے براہم بن گئی تھی۔ میرا کے ذریعے آپ کا یہ بچہ وجود میں آیا ہے۔ زچہ کے اندر اور کیا خرابی پیدا ہو گئی ہے آپ کو نہیں بتا سکتی۔ یہ آپ اپنی بیگم سے پوچھ سکتے ہیں۔ میری طرف سے یہ وارنٹ کہ اگر اب رئیسہ بیگم حاملہ ہوں گی تو انہیں کوئی ڈاکٹر نہیں سچا سکے گا۔ اب آپ لیں کہ کسے قتل کرنا چاہتے ہیں بیوی کو یا اس بچے کو جو وجود میں نہیں آیا ہے۔ میں آگے نہ بڑھتا ہوں کہ قتل اسی کا ہوتا ہے جس کا کوئی وجود ہوتا ہے اس کے سمجھنے کے لیے کپاس عقل ہے۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی میں کوئی جواب دیے بغیر دروازے کو ایک جھٹکے۔ اس کو اس کمرے سے نکل آیا۔ مجھے بہت غصہ آ رہا تھا۔ چہرے سے نقاب اتر جائے

کایہ فقر و تنہائی سمجھ میں آجائے گا۔

وہ جلدی سے مسودہ اٹھا کر اپنی میز پر چلی گئی۔ مگر کتنی دور جا سکتی تھی، میز تو میرے ہی کمرے میں تھی اور ذرا فاصلے پر آنے سے سامنے تھی لہذا وہ شرعاً تو ہوئے خود کو مجھ سے نہیں چھپا سکتی تھی۔ وہ اپنی میز پر پہنچ کر مسودے پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اپنے جذبات کو چھپانے میں عورتوں کو کمال حاصل ہوتا ہے۔ میں اتنے فاصلے سے اس کے چہرے کو اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔ عینک لگانے کی ضرورت تھی لیکن میں عینک لگا کر اپنی عمر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دوسرے دن اس نے اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ پارٹ ٹائم کام کرے گی کیونکہ دفتر آنے جانے اور یہاں لچک کرنے میں کافی پیسے خرچ ہو جاتے تھے ان اخراجات کو سنبھالنے کے لیے مزید آمدنی کی ضرورت تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

”میری کو بھی سوسائٹی میں ہے وہاں آنے جانے سے مزید اخراجات بڑھیں گے اگر تم چاہو تو میں شام کو دفتر سے جاتے وقت تمہیں اپنی کار میں لے جاؤں گا۔ کوٹھی میں تم جتنی دیر چاہو پڑھتی رہنا وہاں سے میں تمہیں گھر پہنچا دوں گا۔“

میں اس کے لیے آنے جانے کی سہولتیں فراہم کر رہا تھا۔ کراچی شہر میں جسے یہ سہولت مل جائیں وہ بہت خوش نصیب سمجھا جاتا ہے شہناز نے پہلے تو مجھے احسان مندی سے دیکھا۔ پھر مجھ سے فطری ملین تو سر جھکا کر بولی۔

”آپ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ مگر میں آپ کی گاڑی میں جاؤں گی تو لوگ کیا کہیں گے؟“

”یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ لوگ پٹ پٹہ پیچھے کیا کہیں گے۔ اتنا جانتا ہوں کہ منہ پر کوئی کچھ نہیں کہہ سکے گا کیونکہ یہاں سب میرے دست مگر ہیں۔ اونچی آواز میں کوئی بول نہیں سکتا اور نیچی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اس ادارے سے باہر جو کتنے والے لوگ ہیں ان کی فکر نہ کرو۔ انہیں کچھ کہنے کے لیے جتنی دیر لگے گی اتنی دیر میں ہماری کار کئی فلائنگ آگے نکل جائے گی۔ بدنامی کے پاؤں آج تک کسی دولت مند کا چھپا نہیں کر سکے۔“

میں نے سمجھایا۔ وہ سمجھ گئی۔ اپنی اس دنیا کو سمجھنے کے لیے غیر معمولی بصیرت اور داناہی کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ عقل اتنا نہیں سمجھاتی جتنا کہ دل کے ذہن سمجھا دیتے ہیں۔ شاید وہ بھی کہیں سے ذہنی تھی اسی لیے اچھی طرح سمجھ کر شام کو میری کار میں آکر

میری باتوں سے وہ پکھل پکھل جاتی تھی میں کچھ دیر تک اسے اس کی اہمیت کا اندازہ دلاتا رہا پھر اس کے ہاتھ چوم کر اس سے رخصت ہو گیا۔ چوتھے وقت میرے ہونٹوں کے ہاتھ کی ہڈیوں سے ٹکرائے تھے۔ بیچاری!

دوسرے دن سے شہناز ڈیوٹی پر آنے لگی۔ کچھ روز تک میں اچھی طرح اس صورت نہ دیکھ سکا۔ اس کے چہنچے کے لیے دوسرے کمرے میں ایک میز اور کرسی ختم کر دی گئی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ دفتر کے سبھی لوگ اسے پروف ریڈنگ سکھانے کے اس طرح اس کا طواف کرتے رہتے ہیں کہ صبح سے شام ہو جاتی ہے۔ پہلے تو وہ ادارے کے فیچر نے انہیں کھیلوں کی طرح ہنکایا پھر شہناز کی میز اپنی میز کے قریب آگیا کہ اسے کوئی دوسرا ٹیبل نہ کرے۔

جب مجھے پتہ چلا کہ فیچر صاحب اپنا کام چھوڑ کر خود ہی اس کے حصے کی پروف پڑھتے ہیں تو میں نے شہناز کی میز اور کرسی اپنے کمرے میں منگوائی۔ شہناز میرے کمرے میں آئی تو میرا کام رک گئے لگاہے کتابت شدہ مسودہ اٹھا کر میرے پاس آکر کھڑی ہو جاتی۔

”پلیز ذرا یہ بتا دیں۔ یہاں مسودے میں لکھا ہے کہ سلیم انارکلی سے محبت کر رہا ہے محبت تو کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے کیا مصنف نے یہاں غلط نہیں لکھا ہے؟“

میں نے اسے سمجھایا۔

”بعض حالات میں محبت نہ ہو تو کوشش کرنے کے بعد محبت ہو جاتی ہے اس لیے یہ درست ہے محبت کی بھی جاتی ہے۔ بے تکلفی معاف کیا تم نے اپنی زندگی میں یہ تجربہ نہیں کیا؟“

وہ ذرا جھجکتے لگی۔ پھر ہنسی مچاتی ہوئی بولی۔

”تجربہ تو نہیں مشاہدہ کیا ہے۔ آپ کے سمجھانے سے مجھے یاد آیا بہت سی عورتیں شادی کے بعد اپنے شوہر سے محبت کرتی ہیں۔ اس طرح انہیں محبت ہو جاتی ہے۔“

”تم بتانا عورتوں کی باتیں کر رہی ہو لیکن انارکلی بیاہتا نہیں تھی، سلیم بھی نکاح نہ کرتے تھے تو تم کہتی ہو کہ کوئی تجربہ ہی نہیں ہوا۔“

وہ میری باتوں سے جھینپ رہی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میرا مشورہ ہے کہ تم کسی سے محبت نہ کرو جب کرنے کے بعد محبت ہو جائے گی تو“

ہے کوٹھی ہے اور پوچھا گزارنے والا بیک بیلنس ہے اور میرا پرس ابھی خالی ہے۔  
 ”ویری انٹرٹنگ“ میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں نے پوچھا ”تمہارے ساتھ کی لڑکیاں کیا کرتی ہیں؟“

شما نے ایک حسرت بھری سانس لینے کے بعد کہا۔  
 ”ان لڑکیوں کے موجودہ شوہر شادی سے پہلے دفتروں میں ان کے پاس تھے اور ان کی پرورش کرتے تھے۔ اب شادی کے بعد وہ اپنے دولت مند شوہروں کی پرورش کرتی ہیں۔“  
 اس کی باتوں سے مجھ میں کافی حوصلہ پیدا ہو گیا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔  
 ”میں نہیں چاہتا کہ تمہارا پرس خالی رہے لاؤ اپنا پرس مجھے دو۔“

اس نے جلدی سے اپنے پرس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔  
 ”یہ میری عزت ہے میں سستی خواہشات کے عوض اسے بھرتا نہیں چاہتی۔ اس سے تو ہنر ہے کہ یہ خالی رہے۔ میں نے اپنی جن سیلیوں کی مثال دی ہے وہ بازاری نہیں تھیں۔ نہ ہی میں ایسی ہوں۔ ہم عورتیں ایک سہانے مستقبل کے خواب دیکھ کر ملازمت کرنے لگتے ہیں۔ میرا پرس صرف ایک شخص کے آگے کھلے گا۔“

”وہ خوش نصیب کون ہے؟“  
 ”وہ ہے جو مجھے ایک خوشگوار مستقبل کی ضمانت دے گا۔“  
 میں سمجھ رہا تھا کہ وہ آسانی سے ہاتھ آجائے گی مگر اس کی باتوں نے سمجھا دیا کہ وہ سستی لڑکی نہیں ہے ایک باعزت اور معیاری زندگی کی تلاش ہے۔ بہر حال وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ یہ تو وقت رفتہ رفتہ سمجھانے والا تھا مگر یہ انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز ہاتھ آئے آئے ذرا اور سرک جاتی ہے وہ اسی کے حصول کا دیوانہ بن جاتا ہے۔ اس طرح میرے دل میں بھی شما کی تمنا اور بڑھ گئی۔

”میں تمہیں ایک خوشگوار مستقبل کی ضمانت دوں گا۔ بولو کیا چاہتی ہو؟“  
 ”کچھ چاہنے سے پہلے آپ کو سمجھنا چاہتی ہوں کہ آپ کتنی سنجیدگی سے میرا مستقبل سوار ناچا ہے۔“

”مجھے سمجھنے کے لیے کتنا وقت لگے گا؟“  
 ”کچھ آپ سمجھاتے رہیں گے کچھ میں اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتی رہوں گی۔“

بیٹھ گئی۔

ہم اگلی سیٹ پر پہلی بار ایک دوسرے کے قریب بیٹھے تھے۔ میں سمجھ نہیں سکتا کہ اس پر اس قربت کا رد عمل کیا ہو رہا ہے کیونکہ وہ دوسری طرف کھڑکی کے باہر گرنا ہوئے مناظر کو دیکھ رہی تھی لیکن میں اس سے بے نیاز نہیں تھا۔ وہ پالشت کے قافلے اس کے بدن کی آج مجھ تک پہنچ رہی تھی اور معلومات میں اضافہ ہو رہا تھا کہ ایسے آتش دان بھی ہوتے ہیں جہاں سے آج آتی ہے۔ آگ نظر نہیں آتی۔ میں نے ہلکا ہلکا ایک نظر ڈالی۔ خاموشی بوجھ بن گئی تھی۔ آخر مجھے ہی بولنا پڑا۔

”باہر کیا دیکھ رہی ہو یا کچھ سوچ رہی ہو؟“  
 وہ کھڑکی سے نظریں پھیر کر وڈا سکرین پر دیکھنے لگی پھر سیٹ کی پشت سے لگا کر کہنے لگی۔

”دیکھ بھی رہی ہوں اور سوچتی بھی جا رہی ہوں۔ جب میں فٹ پاتھ پر چلتی ہوں والے بہت اونچے اور بہت ظالم نظر آتے ہیں۔ ہم پر کچھ زاحمال کر گزار جاتے ہیں۔ احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے انسان کا مذاق اڑاتے ہوئے گئے ہیں۔ اب کچھ بیٹھ کر دیکھ رہی ہوں تو یہ فٹ پاتھ پر چلنے والے بہت چھوٹے اور حقیر نظر آ رہے ہیں۔ کیرے کو ٹوں کی طرح ریگنے والی زندگی کیسے گزار لیتے ہیں؟ پیدل چلتے ہیں اور دب چلتے ہیں اور گھٹنوں بس اور منی بسوں کا انتظار کرتے ہیں۔ میں نے حساب لگایا ہے کہ وہ پچاس برس زندہ رہتے ہیں تو زندگی کے ساڑھے بارہ برس کراچی کے بس اسٹینڈ پر ہو کر گزار دیتے ہیں۔“

”تم ایک اچھی اکاؤنٹنٹ بن سکتی ہو لیکن فٹ پاتھ پر چلنے والوں کی تقدیر بدل سکتیں۔“

”میں صرف اپنی تقدیر بدلنے لگی ہوں۔ حالات نے مجھے سکھایا ہے کہ ایک دن چڑھنے کا موقع آئے تو گھبرا کر نیچے نہیں اترنا چاہیے۔ آپ نے پانچ سو کے بعد مزدور کی آفر دی تو میں نے قبول کر لی۔ آپ مجھے فٹ پاتھ کی دھوپ سے بچا کر ایئر کنڈیشنڈ لے آئے تو میں نہیں گھبرا لی۔ اب سے پہلے میں کئی بار گھبرا کر پیچھے رہ گئی۔ اب لگتا نہیں کرنا چاہتی۔ میرے ساتھ کی لڑکیاں مجھ سے بہت آگے نکل چکی ہیں۔ ان کے

سے چلتی ہوئی میرے بیڈروم سے باہر آگئی۔  
 ”آپ۔ آپ کی بیگم اور بچے کہاں ہیں؟“ اس کے منہ سے الفاظ نکلے وقت ہانپ رہے تھے۔

”وہ بچوں کے ساتھ اپنے میکے میں رہتی ہیں۔“  
 میرے حلق میں گوازا نکلنے لگی۔ اس نے بڑی سادگی سے ریسمہ بیگم کو پوچھا تھا مگر مجھے اس کا سوال طنز آمیز محسوس ہوا کہ آپ کے پاس تو بیگم ہے پھر دہلی کی کیا ضرورت ہے؟ ”بیگم کی موجودگی کے باوجود میں ایک مجرور کی زندگی گزار رہا ہوں۔“ میں وضاحت کرنے لگا کہ ریسمہ سدا کی بیمار ہے اور بیشہ مجھ سے دور رہتی ہے شہناز کو متاثر کرنے کے لیے میں نے ایک رومانی ناول کا مکالمہ ادا کیا۔

”شہناز میں وہ نصیب ہوں جس کی زندگی میں کبھی بیمار کا ایک جھوٹا نہیں آیا۔ میں اس شاندار کوٹھی کے کھنڈر میں ایک زندہ لاش کی طرح رہتا تھا۔ تمہیں پہلی بار دیکھتے ہی مجھ میں اس زمرہ جینے کی لگن پیدا ہو گئی۔ کیا تم مجھے ایک نئی زندگی دو گی؟ کیا تم میرے دل کی دیر سے گھڑی کے گھنٹے کی طرح تپنا چاہتی ہو؟“

مکالمے کی اٹھان پر میں نے ڈرامائی انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے اپنا ہاتھ اٹھانے کے لیے رسمی طور پر کمزور سی جدوجہد کی۔ میں نے نہیں چھوڑا۔ اس نے جلد ہی ہاتھ لی کیونکہ میں صرف دل کی ملکہ نہیں بلکہ اسے شاندار کوٹھی کی ملکہ بنانے کی بات کر رہا تھا۔ مناسب وقت پر مناسب بات کی جائے تو اس کا اثر ہوتا ہے۔ وہ متاثر ہو کر قالین ملائم اور دبیز تھا۔ چلتے وقت اس میں پاؤں اتنے پیار سے دھنتے تھے جیسے ایک دوسرے جذبے میں دھنتا ہے اور ہولے ہولے گدگداتا ہے ویسے ہی پاؤں کے لیے۔  
 ”میں نہیں جانتی تھی کہ آپ اندر سے اتنے دکھی ہیں۔ میں آپ کے تمام دکھ سمیٹ لی۔“

میں نے آگے بڑھ کر اسے دونوں بازوؤں میں سمٹ لیا۔  
 ”پیارے“ وہ منت سماجت کرنے لگی ”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ابھی یہ مناسب نہیں اگر آپ مد سے بڑھیں گے تو میں اپنی ہی نظروں میں گر جاؤں گی۔ پلیز مجھے چھوڑ دینا۔“  
 زبردستی کا سودا اچھا نہیں ہوتا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ مگر بعضی دیر وہ میرے بازوؤں

جب ہمارے درمیان چاہت کے جذبات ہوں گے تو وقت گزرنے کا احساس نہیں آپ وقت کا حساب نہ کریں۔“

وہ میری توقع سے زیادہ سمجھ دار نکلی۔ اس معاملے میں لڑکیاں قدرتی طور پر زیادہ ذہین ہوتی ہیں جو ان ہوتے ہی نجانے کس طرح اپنے بچاؤ کے چھکڑے بچاؤ ہیں۔ یہ بات اس طرح سمجھ میں آتی ہے کہ بہت زیادہ دولت ہو اور وہ تو کوئی نیا جائے تو دولت مند پر اس کا خاص اثر نہیں پڑتا لیکن جس کے پاس شباب کی عمر ایک عزت کی ہی پونجی ہو اور وہ لٹ جائے تو سانسے مستقبل کا جوا کھیلنے کے لیے نہیں بچتا۔ اسی لیے ذہین لڑکیاں ابتدا ہی میں سمجھ لیتی ہیں کہ آج کل عشق کے نور میں دور ہی دور سے پونجی دکھا کر چالیں چلی جاتی ہیں۔

میری کوٹھی خالی تھی۔ میں نے دو دن پہلے ہی ریسمہ کو بچوں کے ساتھ اسے بھیج دیا تھا۔ شہناز میری شاندار کوٹھی میں داخل ہوئی۔۔۔ تو وہاں کی شاندار کوٹھی تک دیکھتی رہ گئی۔ وہاں ایک عورت کے کون سے خواب کی تعبیر نہیں تھی۔ کمرے تھے اتنے ہی کھڑکی ویں ریڈیو گرام، ریکارڈ پلیئر اور کیسٹ ریکارڈر۔ جدید چیزوں کو ابھارنے کے لیے رنگین نظاروں اور سرگیت کا مکمل اہتمام تھا۔ جدید صوفے تھے جن پر بیٹھنے والے اٹھنا بھول جاتے تھے۔ سہ طرفہ آئینوں کی سنگھار و شباب کی سلامتی اور شگفتگی کے لیے میکس فیکٹری کی تمام مصنوعات موجود تھیں۔ میری پیار بوی اب استعمال نہیں کر سکتی تھی۔ ایئر کنڈیشنڈ بیڈروم کے فرش پر قالین ملائم اور دبیز تھا۔ چلتے وقت اس میں پاؤں اتنے پیار سے دھنتے تھے جیسے ایک دوسرے جذبے میں دھنتا ہے اور ہولے ہولے گدگداتا ہے ویسے ہی پاؤں کے لیے۔  
 میں نے صاف طور سے شہناز کو سنبھل سنبھل کر چلنے دیکھا۔ وہ دھننا

تھی اور نہ مجھ پر اپنی کوئی کمزوری ظاہر کرنا چاہتی تھی مگر اس کی کٹورا جیسی کان آکھیں خواب ٹانگ ہو گئی تھیں۔ اس کی نگاہوں کے سامنے بہت ہی خوب تھا۔  
 تھا۔ فوم کی پچیلی بیج پر ہفت رنگ فانوس کے کتے ہی رنگ پھسل رہے تھے۔  
 خواب پیچھے رہ جاتے ہیں اور تعبیریں پھسل کر سامنے آجاتی ہیں۔ وہ فوراً ہی

میں سنی رہی (وہ لمحات بہت مختصر تھے) اتنی ہی دیر میں اس کے بدن نے اور ادا  
سمجھا دیا کہ یہ عورت ریسہ بیگم کی طرح ہڈیوں کا مجسمہ نہیں ہے۔ گوشت پر  
بلوری بدن میں چمکتا ہوا جام ہے۔ سر سے پاؤں تک سانس لیتے ہوئے گل بو  
زدوزی کا کام ہے۔ ایسا روشنی کا دار بدن مختصر سے لمحات میں اپنا ذائقہ بتا کر رہا  
میں اسے حسرت سے دیکھنے لگا۔ میری آغوش خالی ہو گئی تھی۔ اس کا پرس بھی غافل  
ہم دونوں تھوڑی دیر تک خالی خالی سے کھڑے رہے پھر میں نے اسے اپنی  
احساس دلایا۔

تم مجھے سمجھنا چاہتی ہو اب سمجھ لو میں تمہارے سامنے ہوں۔ ایک شریف  
طرح میں نے خنائی سے اور تمہاری کسی کمزوری سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ کیا اب  
مجھنے کے لیے کچھ رہ گیا ہے؟  
”ہاں ابھی کچھ باقی ہے کیا آپ میرے گھر تک چلنے کی زحمت گوارا کریں گے؟“  
”مذہب چلوں گا۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟“  
”جی ہاں۔ آپ نے مجھے اپنا گھر دکھایا ہے اب میں اپنا گھر دکھانا چاہتی ہوں۔“  
گھر والے سمجھ میں آجاتے ہیں۔

”تو پھر نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ابھی چلو مسوے کل سے  
کوٹھی سے باہر جانے لگی تو میں نے کہا ”ہم بالکل ہی اجنبی نہیں ہیں۔ میں کوٹھی  
تک تمہارا ہاتھ پکڑ کر چل سکتا ہوں۔ اتنی آس تو دلاؤ کہ یہ ہاتھ ہمیشہ کے لیے  
میں آنے والا ہے؟“

میں نے چلتے چلتے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ چلتے چلتے ذرا ایل کھائی ڈرا شرابی  
اپنا ہاتھ میرے پاس چھوڑ دیا۔ میں نے کوٹھی سے باہر جانے کا راستہ بدل دیا۔

وانت میں میں ٹھوم ٹھوم کر تمام مقتول دروازوں کو چیک کر رہا تھا اور میں اپنی  
اس کے گورے گورے بھلتے ہوئے ہاتھ کو دیر تک اپنے ہاتھوں میں مقفل رکھ رہا  
نہیں ایسا موقع بار بار ملتا یا نہیں جو موقع مل گیا تھا اسی کو غنیمت جان کر گزارا ہے؟

وقت صرف کر رہا تھا۔  
شاید وہ میری نیت کو سمجھ رہی تھی چونکہ میں صرف ایک ہاتھ کو تھام کر اپنی ٹانگوں پر فٹا ہوا تھا۔

”میرے پاؤں آپ کی طرف نہیں جاسکتے مگر آپ کے پاؤں مجھ غریب کی طرف آگئے ہیں میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ باہر کی دنیا سے کوئی تو ایسا ہے جو میری عبادت کے لیے آیا ہے۔“

میں نے اس سے متاثر ہو کر کہا۔

”آپ مایوس نہ ہوں مجھے جب بھی فرصت ملے گی میں آپ سے ملنے آیا کروں گا۔“

”صالح صاحب!“ اس نے کہا ”دنیا والے صرف ایسے ہی لوگوں سے ملتے ہیں جن سے ان کی کوئی ضرورت پوری ہوتی ہے۔ آپ پہلے شخص ہیں جو میری دلجوئی کے لیے آئے ہیں۔“

اسے کیا معلوم تھا کہ میں بھی اپنی ضرورت پوری کرنے یعنی اس کی بیوی کو حاصل کرنے کے لالچ میں دہاں گیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں شہناز کو کسی کی بیوی کی حیثیت سے نہیں جانتا تھا۔ اب جان کر غصہ آ رہا تھا ایسے ہی غصے کے وقت وہ چائے لے کر آگئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ پیالی اٹھا کر گرم چائے کو پھونک کر جلدی جلدی پینے لگا۔ چائے کی گرمی سے زبان جل رہی تھی۔ شہناز کی موجودگی سے دل چاہتا تھا کہ میرا سینہ پھنسا جا رہا تھا۔ میں نے پیالی خالی کر کے ٹرے میں رکھ دی پھر اس کی لیے اٹھ گیا۔ شہناز نے مجھے نہیں روکا۔ وہ کس منہ سے مجھے روکتی؟ اس کے فوراً مجھے دوبارہ آنے کے لیے کہا۔ میں جھوٹا وعدہ کر کے اس دم گھٹنے والے ماحول سے الگ گیا۔

اپنی کوٹھی پر پہنچا تو وہ ایسی خالی خالی سی تھی کہ وہاں کا ہر کمرہ منہ کھولے مجھے ننگے کوٹھا۔ ایک گھنٹے پہلے وہ اسی جگہ آئی تھی اور اپنے منگتے ہوئے وجود سے ایک رومانوی فضا برپا تھی۔ میں اسے اچھوتی دھیرہ سمجھ کر اس کے متعلق کتنی دور تک سوچتا چلا گیا تھا۔ ہاں ہر وقت میری بیوی کی کھانسیاں کسی بدروح کی طرح بھینکتی رہتی تھیں۔ وہاں میں نے کی کوٹھاری ماسنوں کی سرگوشی سنی تھی۔ اب وہ لٹائی جنت پھر جنم میں بدل گئی تھی۔

رات کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ میں ہر کمرہ پر اسے کوستارہ اسے بازاری رات کو سوسائٹی گرل سمجھ کر اپنے ذہن سے دور جھٹک رہا۔ ایسی عورت کا کیا بھروسہ جو اپنے خاندان کے اعتماد کو نہیں پہنچا کر میرے پاس ایک سمنے مستقبل کا خواب دیکھتی ہوئی

میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ شہناز سے فہم درانی کی شادی؟ کس میں نہیں سن رہا ہوں۔ میں نظریں اٹھا کر شہناز کو دیکھا تو وہ نظریں جھٹکا کر یہ کہتی ہوئی ہنسی اٹھتی چائے لے کر آ رہی ہوں۔ اس کی جھکی ہوئی نظروں نے اور کترا کر دہاں سے جانے کی انداز نے یقین دلایا کہ وہ اچھوتی دھیرہ نہیں ہے شادی شدہ ہے اور اس کے ساتھ جو درانی آتا ہے وہ اس کے شوہر کا نام ہے۔

اس کا شوہر فہم درانی کچھ کہہ رہا تھا۔ میرے کان سن رہے تھے مگر دماغ نہیں تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے کس قدر اپنی توہین کا احساس ہو رہا تھا یوں لگ رہا تھا کہ شہناز مجھے اپنے گھر میں ایک طمانچہ مارنے لائی تھی۔ یہ بات تو وہ مجھے میری کوٹھی میں بتا سکتی تھی۔ اترو پلو کے دن بھی بتا سکتی تھی۔ یہ کسی ذلت تھی کہ شوہر کا نام استعمال تھی اور باپ کا رشتہ بتاتی تھی۔ یہ ہماری دنیا میں کیسے کیسے تماشے ہوتے ہیں؟ جانور سماجی اور خونی رشتے سمجھ میں نہیں آتے۔ فریب کا پردہ چاک کیا جائے تو انسانی رشتے سمجھ میں آتے ہیں؟

اس وقت میری سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ کسی بہانے وہاں سے جاؤں۔ اس ماحول میں دم گھٹ رہا تھا۔ فالج زدہ فہم کو دیکھ کر یہ بھی خیال آ رہا تھا کہ کسی بھی بہانے سے فوراً واپس جانے کا ارادہ ظاہر کر دوں تو وہ نہ جانے کیا سہ میرے کچھ بچھنے سے پہلے اس نے بڑے دکھ سے کہا۔

”آری کے دونوں پاؤں بے کار ہو جائیں تو اس کا باقی جسم بھی بیکار ہو جائے۔“

فالج زدہ بیروں پر جسم کا باقی بوجھ اٹھا کر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔ چلنا تو دور کی بات ہے سامنے اس دنیا کے تمام راستے بند ہو گئے ہیں صرف ایک ہی راستہ ہے زندگی کی لڑائی کرنے کے بعد اس بستر سے اٹھ کر قبرستان کے راستے پر جاؤں گا۔ چار کاغذوں پر جانے اس کوٹھری سے نکل کر اس راستے پر جانے کے لیے اور کتنا انتظار کرنا ہو گا؟

وہ ایک لاش کی طرح بستر پر پڑا ہوا تھا مگر اس کے اندر زندگی کی جواہنگ خورشید بیٹھنے اور دوڑ کر بھاگ کر اپنی محبوبہ یا بیوی کو بازوؤں میں اٹھالینے کی جو خواہشات سب اس کی جھٹکوں کے الفاظ میں ”آواز کے درد میں بین کرتی ہوئی محسوس ہو رہی“ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔



دوسرے کو لچ کے بعد وہ میرے پاس میز کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ اس سے یہ طویل خاموشی برداشت نہیں ہو سکی تھی۔ وہ مسودہ لے کر کچھ پوچھنے کے بہانے سے چلی آئی۔ اس طرح بے اعتنائی برتی جائے تو عورت پیچھے پیچھے چلی آئی ہے۔ میں نے پھر بڑی بے نیازی سے کہا۔

”مسودہ منبر کے پاس لے جاؤ اور جو کچھ پوچھنا ہے اس سے پوچھ لو۔“  
وہ جانے کے لیے میرے قریب نہیں آئی تھی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی پھر آہستگی سے بول۔

”میرے والد کا نام شہاب درانی ہے۔ اپنے باپ کے نام کی مناسبت سے میرا نام شہناز درانی ہے۔ جب سے میں پیدا ہوئی باپ کا یہ نام میرے نام کے ساتھ چلا آ رہا ہے اسی لیے انڈیو کے دن میں نے صرف اپنے باپ کا ہی ذکر کیا تھا۔“  
میں نے نفرت سے منہ بنا کر کہا۔

”آپ باتیں بنا کر اپنی غلطی کو نہ چھپاؤ۔ شادی کے بعد عورت باپ کا نہیں مشورہ کا نام لیتی ہے۔“

”آپ درست کہتے ہیں مگر میں شادی شدہ ہونے کے باوجود خود کو کسی کی بیوی نہیں سمجھتی۔ کیا انیم نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ شادی کے چھ ماہ بعد ہی اس کی دونوں ٹانگوں پر فائج لڑا تھا۔ دنیا والوں کی نظروں میں میری شادی ہو چکی ہے لیکن میرے اندر کوئی جھانک کر نہیں دیکھ سکتا کہ کس طرح میں اپنی سسک کا سوگ منا رہی ہوں۔ میں خود کو کیا کہوں؟ بد نصیب کواری یا ساگن بیوہ؟“

میری ساری نفرت دھل گئی۔ میں اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ واقعی اسے کیا کہا جاسکتا ہے۔ میں نے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا کہ فیم فائج زہد ہے اور شہناز پر کیا ہیبت رہی ہوگی اور وہ اپنی عمر کے سامنے شب و روز کیسے گزار رہی ہوگی۔ میں نے اس سے کہا۔

”ایسی بات ہے تو ہمیں فیم سے قطع تعلق کر لینا چاہیے۔“

”کھانا باسی ہوا خراب ہو جائے تو اسے پھینک دیا جاسکتا ہے۔ انسان کو نہ پھینکا جاسکتا ہے نہ اس کے برے وقت میں اس کا ساتھ چھوڑا جاسکتا ہے۔ آخر محبت اور مروت بھی تو کوئی چیز ہے۔ آپ کی بیگم دائمی مریضہ ہیں۔ کیا آپ ان کا ساتھ چھوڑ سکتے ہیں۔“

آئی تھی۔ کبھی وہ میرے برے وقت میں مجھے بھی دھوکہ دے سکتی ہے۔ عورت زان بھروسہ کرنا ہی نہیں چاہیے۔ عورت کو گالیاں دے کر اسے کتے اور ذلیل بنا کر رکھا گیا ہے۔ جب یہ سوچ کر میرے دل کو اطمینان ہوا کہ بحیثیت ایک مرد ایسی عورتوں سے ہوں تو مجھے نیند آگئی۔ یہ غور کرنے اور سمجھنے کے لیے اہم نکتہ ہے کہ ہم اپنی کینگی باوجود جب تک ایک کمپنی عورت سے خود کو برتر نہ سمجھیں اس وقت تک نہ ٹوٹا ہوتا ہے اور نہ ہی سکون سے نیند آتی ہے۔

دوسرے دن میں دیر تک سوٹا رہا۔ اس لیے دیر سے دفتر پہنچا۔ مجھے یقین تھا کہ منہ نہ دکھائے گی مگر وہ اپنی میز پر سر جھکائے پروف ریڈنگ میں مصروف تھی۔ میرے میں آیا اسی وقت اسے ملازمت سے الگ کر دوں۔ مگر ذاتی کشیدگی کے باعث کسی کے پر لٹ مارنا اچھی بات نہیں ہے اس لیے میں نے اسے برداشت کر لیا۔ تمام دن غور کام نہ ہو سکا کیونکہ وہ سامنے میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بار بار میری نگاہیں اس طرف جاتی تھیں۔ الٹی چٹھی ایسی جاذبِ نظر تھی کہ نظروں کو جذب کر لیتی تھی۔ اس کی جھکی ہوئی تھیں مگر اٹھی ہوئی نگاہوں کی حشر سامانی مجھے یاد آ رہی تھی۔ وہ مجھے نہیں دیکھتی لیکن جب دیکھا کرتی تھی اس وقت خواہ مخواہ اس بات کا یقین ہو جاتا تھا کہ صورت آنکھیں صرف مجھے دیکھنے کے لیے بنائی گئی ہیں۔

میں غصہ غصہ کر اسے دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے کا ایک ایک نقش مجھے ہمارے میں حسین عورت کسی نصیب والے کے حصے میں ہی آتی ہے۔ پہلے اسے آپ لے میں اپنا نا چاہتا تھا اب یہ کوئی ضروری نہیں تھا۔ ایسی حسین اور دلکش عورت ساتھ صرف رنگین لمحات گزارے جاسکتے ہیں۔ سنجیدگی سے محبت کرنا محنت ہے اپنے آپ کو ٹٹولا تو یہ بات بھی سمجھ آگئی کہ گھر میں بیوی تو موجود ہے ایک محبوبہ دراصل میں ایک محبوبہ یا دوسرے لفظوں میں ایک داشتہ کا خواہش مند تھا۔ ایک بار نظریں اٹھا کر شہناز کو دیکھا تو اس کے لیے میرے خیالات یکسر بدل گئے ایسا کھلونا نظر آ رہی تھی جو اپنی عمر کی چالی سے جوانی کی مدت تک چلتا ہے پھر وہ بیکار ہو جاتی ہے۔ میری بیوی بیکار ہونے کے باوجود بیکار نہیں ہوئی کیونکہ وہ تھی۔

کر میرا ساتھ چھوڑ سکتا تھا کہ میں کسی فالج زدہ کو نہیں پہنچا کر آئی ہوں۔ کئی برس کے بعد کل میرے دل میں آپ کے لیے جگہ پیدا ہوئی۔ یہ سوچ کر کہ آپ مجھے طعنہ نہیں دیں گے کیونکہ آپ بھی کسی مریضہ کے دل کو نہیں پہنچا کر میری طرف بڑھ رہے ہیں اور اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اتنے لمبے لمبے راستوں پر نہ کوئی اکیلا چل سکتا ہے نہ کوئی اکیلی چل سکتی ہے۔ ان حالات میں کیا ہوتا ہے گیا آپ بتا سکتے ہیں؟

”ہاں ان حالات میں چور رشتے قائم ہوتے ہیں۔ اوپر سے تہذیب اور شرافت کا خول چڑھا رہتا ہے اندر سے خواہشات کی آگ سلگتی رہتی ہے۔ آج تک اس دنیا کا کوئی تہذیبی اصول اس بارود کو نہیں بجھا سکا۔ ہم اپنے جیسے انسانوں کے اندر جھانک کر دیکھیں تو کتنی ہی جگہ اس بارود کے دھماکے سے تہذیب کی دیواریاں ڈھکیں نظر آئیں گی۔ مشکل یہ ہے کہ ہم سے کوئی مکمل کر اس چور رشتے کا اظہار نہیں کرنا چاہتا۔ پہلے تالیاں زمین کی سطح پر بہتی تھیں اب زمین کی تہ میں بہتی ہیں اور اوپر سے ابلے لباس کا ڈھکنا چڑھا دیتے ہیں۔“

شہناز نے بالوسی سے کہا۔

”یہ تو تقریر ہو گئی۔ ایسی تقریریں سماج کے مصالین اور لذتوں تک یا مصنفین کے قلم تک اچھی لگتی ہیں۔ اگر یہ باتیں قلم کی نوک سے باہر آجائیں تو اپنے اندر تھوڑا ذخیروں کے والے دوسروں پر تھو تھو کرتے ہیں، غرہ نہم لیا کریں گے؟“

”وہی کریں گے جو حالات کا تقاضا ہے اگر نہیں کر سکیں گے تو تسبیح لے کر ایک گوشے میں بیٹھ جائیں گے کیونکہ ایک گوشے میں بیٹھ کر دنیا بھر کی ضروریات اور خواہشات سے بچنا چھڑایا جاسکتا ہے۔“

وہ جھنجھٹے ہوئی بولی۔

”مگر یہ چور رشتہ مجھے بدنام کر دے گا، دستور کے مطابق آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ کبھی سمجھتی ہوں کہ ہم جیسی عورتوں کے لیے سماجی رشتوں میں لپک کیوں نہیں پیدا ہوئی۔ یہ درست ہے کہ مذہبی اور قانونی اصولوں کے تحت عورت ایک فالج زدہ شوہر سے قطع تعلق کر سکتی ہے لیکن انسانی ہمدردی کا تقاضہ ہے کہ ان حالات میں ایسے مجبور خاندان کا ساتھ نہ چھوڑا جائے۔ وفا بھی تو کوئی چیز ہے۔ پیار بھی تو کسی جذبے کا نام ہے۔ آپ یقین کریں جب میں فحیم کو بستر پر بے یار و مددگار پڑا دیکھتی ہوں تو میرا دل محبت اور ہمدردی کے

میں نے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھا تو پتہ چلا کہ پچھلی محبتوں سے قطع تعلق نہیں کیا جاسکتا۔ اگر میں اپنی بیوی کو چھوڑ دوں تو انسانوں کی دنیا میں انسان کیسے لکھائے گا اور شہناز جیسی عورتیں تو ہمیشہ بدنامی کے گڑھے کے پاس کھڑی رہتی ہیں۔ جہاں ان سے دور بھول چوک ہوئی، جہاں انہوں نے مجازی خدا کی ذرا سی برائی کی وہاں ان پر نفرت کے پتھر برسے لگتے ہیں۔ وہ دوسری شادی کرنے کے باوجود بدنامی کے گڑھے سے نہیں نکل سکتیں۔ ان کا دوسرا شوہر بھی بے وفائی کے طعنے ضرور دیتا ہے۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ دم لہجے میں بولی۔

”میں دن رات اپنی ذہنی الجھنوں میں گرفتار رہتی ہوں۔ فحیم بہت مجبور ہے۔ ہم اس مجبور کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ اس کے باوجود سوچتی ہوں کہ زندگی کی تمام خواہشیں اسی طرح خاموشی سے دم توڑتی رہیں گی۔ کوئی تو ایسا راستہ ملے گا کوئی تو ایسی صورت نکلا میں بے وفا اور بے مروت نہ لکھاؤں اور زندگی کی ساری سرشتیں میرے دامن میں سنہ آجائیں۔“

”ہاں میں بھی کچھ ایسا ہی سوچتا ہوں کہ بیوی گھر کی چار دیواری میں قید رہے اور اسے باہر زندگی کی ساری سرشتیں اور خواہشیں ہمارے روپ میں مل جائیں۔ انا قناعت پسند نہیں ہوں۔ ہم جس محرومی کی آگ میں جل رہے ہیں وہاں قناعت پسندی ہم پہلے جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔“

میں اپنی بات کہہ کر اس کا منہ تنکے لگا۔ جو بات میں نے کسی وی بات اس کے دل پہ تھی۔ شرافت سے اور تہذیبی اصولوں سے کوئی صورت نہیں نکلتی کہ محرومی کی آگ کس طرح بجھائے، جب کوئی راستہ نہیں ملتا تو بہت سے میزھے میزھے راستے نکل آتے ہیں اور انسان سم سم کر ان راستوں پر قدم رکھنا شروع کر دیتا ہے۔ میں نے ہچکچاہٹ ہوئے کہا۔

”مگر ہم اسی طرح ملتے رہیں تو یہ کوئی بری بات تو نہ ہوگی؟“

”ہاں! مرد کے لیے کوئی بات بری نہیں ہوتی۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ گھر کی دیواری سے باہر کوئی ساتھی ہو۔ اتنی بڑی دنیا کے اتنے لمبے لمبے راستوں پر کوئی کب اکیلا چل سکتا ہے اگر میں کسی نوجوان کا ساتھ تلاش کرتی تو راستے کے کسی موڑ پر

محدود ہوتا اور ایسی محبت کا اجازت نامہ حاصل ہوتا جس کے تحت میں آپ کی دنیا کو جنت بنا رہی۔“

”ایسا کبھی نہیں ہو گا شہناز! ایسا اسی وقت ہو گا جب قیامت سے پہلے اولاد ماؤں کے نام سے پکاری جاتی گی۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا صرف دیسا ہی ہو گا جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یعنی چور رشتے۔“

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ میرے بیڈ روم میں ایک صوفے پر میرے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ ہماری ملاقات کو چھ ماہ گزر چکے تھے۔ اتنی مدت میں میں صرف اس کے ہاتھ کو پکڑنا آیا تھا۔ اس روز میں نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کی پشت پر سے لے لیا۔ اس کے شانے پر رکھا۔ وہ ذرا کسمائی مگر جدوجہد نہیں کی۔ میں نے حوصلہ پا کر اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ تب اس نے اعتراض کیا۔

”نہیں ہم کوئی غلطی نہیں کریں گے۔“

”ہاں غلطی نہیں کریں گے۔“ میں نے اس کے کان کے قریب جذبات سے ہانپتی ہوئی سرگوشی کی ”لیکن پیار کرنا تو کوئی غلطی نہیں ہے۔“

اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے، لبوں کی کلیاں کھلیں پھر کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے اپنے ہونٹ ان پیاسی کلیوں پر رکھ دیئے۔ مدت سے ہمارا کاجھونکا نہیں آیا تھا۔ رات کی کوکھ سے صبح ہمارا ان کی جبین نہیں چٹکتی تھی پہلی بار میرے ہونٹوں کی نمی نے پھول کی ہتکڑیوں کو تر کر دیا تو اس کے حلق سے ایک لطیف سی کراہ نکلی۔ وہ جدوجہد کرنا بھول گئی۔ جب سانس لینا دوبارہ ہو گیا تو میں نے ذرا الگ ہو کر دیکھا۔ ہتکڑیوں کی گلابی رنگت سرخ ہو گئی تھی۔ رخسار آج دسے رہے تھے اور آنکھیں بھیگ رہی تھیں وہ میرے سینے پر سر رکھ کر سسکیاں لینے لگی۔

”میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں نہیں آتا مجھے ڈر لگتا ہے بہت ڈر لگتا ہے۔“

میں نے تسلیاں دینے کے بجائے اپنا ہاتھ ادھر سے ادھر پھیرتے ہوئے اسے سمجھایا۔

”ایک ڈر کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا ڈر پیدا ہوتا چلا جاتا ہے تم ڈرتی

رہو گی تو ایک دن اپنی جوانی کا ماتم کرنے کے لیے بوڑھی ہو جاؤ گی۔ کوئی اس الٹا

حادثے کو نہیں سمجھ سکے گا کہ تمہاری جوانی کو خوف اور شرم کی دھنوں نے کس طرح

جذبے سے بھر جاتا ہے اور جب میں اپنے بستر پر تھالیٹی رہتی ہوں تو میرے اپنے جذبات اور خواہشات میری انسانی ہمدردی کے باوجود بغاوت کرنے لگتے ہیں میرے اندر پلٹنے والے دکھ سے کوئی واقف نہیں۔ میں فیصلہ نہیں کر سکتی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“

”اتنی جلدی فیصلہ نہ کرو۔ ہم اسی طرح ملتے رہیں گے اور کوئی مناسب راستہ تلاش کرتے رہیں گے۔“

”تو پھر آپ وعدہ کریں کہ کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے ہم اس نئے راستے پر کوئی غلطی نہیں کریں گے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں۔“

میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اس نے میرے ہاتھ پر اپنا نازک سا ہاتھ رکھ دیا۔ جب کہ بات کا عہد کیا جاتا ہے تو اس عہد کو مستحکم بنانے کے لیے ہم آپس میں ہاتھ ملاتے ہیں۔ اب بھی ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا کہ کوئی غلطی نہیں کریں گے مگر اس کا ہاتھ تو میرا ہاتھ میں آئی گیا تھا اس کے ہاتھ آنے میں کتنی دیر لگتی؟ غلطی کی ابتدا ہو چکی تھی ہاں دیکھ جائے تو ہم نے ہاتھ ملا کر ایک دوسرے کو غیر شعوری طور پر چھونے کا بہانہ تلاش کر لیا تھا اکثر غلطی کا آغاز شعوری طور پر نہیں ہوتا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہماری دنیا بدل گئی۔ شہناز سے پہلے یہ دنیا بلیک اینڈ وائٹ نظر آتی تھی اب وہ میرے قریب آئی تو رنگوں کا جہنم لے کر آئی۔ اب میں جہاں سے گزرتا تھا عمارتوں کے باغیچوں کے پھولوں کے اور گزرتے والی کاروں کے رنگ الگ الگ واضح ہونے لگے نظر آتے اگر عورت کا وجود نہ ہوتا تو مرد کو رنگوں کی پہچان نہ ہوتی۔ شہناز احساسات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ وہ اکثر کہتی تھی۔

”اب میری زندگی میں درد و رنج تک مایوسی کے سائے نہیں ہیں۔ آپ کو پارہا پارہ مضبوط سارے کا یقین ہوتا ہے کیونکہ عورت کسی قابل اعتماد سارے کے بغیر رشتوں جہنم میں بھی تنہا رہتی ہے اب میں نعیم کے پاس جاتی ہوں تو یہ خیال مجھے پریشان نہیں کہ میں ایک لڑکی ہوئی عورت ہوں بلکہ اب میں پہلے سے زیادہ نعیم کی خدمت کرتی ہوں آپ میری محبت ہیں لیکن وہ میرا فرض ہے اور کوئی عورت بھی فرض کو بھول کر سچائی محبت نہیں کرتی۔ کاش کہ ایسا نکاح بھی پڑھایا جاسکتا جو نعیم جیسے شوہر کے لیے فرض

مرد کا بڑھ ہوا عورت کا پرس۔ وہ ہماری سماجی زندگی کی عکاسی کرتا ہے وہ ایک دولت مند کی طرح کالا مال ہوتا ہے یا پھر غریب کی جب کی طرح خالی رہتا ہے۔ وہ حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح پھولا ہوتا ہے یا ریسیہ بیگم کی طرح چمک بھی جاتا ہے اور شہناز کے وجود کی طرح ملائم اور چمک دار بھی ہوتا ہے۔ میں نے اس ملائم پرس کی زپ کھول دی اور اس کی ضروریات اور خواہشات کے ایک ایک سیکے سے پہلی بار اس کے پرس کی گود بھردی۔

پہلے ہم ایک دوسرے کی آرزو تھے۔ اب ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے تھے اب وہ شام کو کوٹھی میں آکر مسودے نہیں پڑھتی تھی کیونکہ میں اس کی زندگی کے مسودے پڑھتا رہتا تھا۔ اس کی تنخواہ اتنی ہی تھی محبت کا کیشن بڑھ گیا تھا۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن اسے ہزاروں روپے کی شاپنگ کراتا تھا۔ اس کے نام سے ایک بینک میں اکاؤنٹ بھی کھول دیا تھا اور وہ اکاؤنٹ بھرتا جا رہا تھا۔ اگر سطحی طور پر دیکھا جائے تو یہ ایک کاروباری رشتہ تھا میں شاپنگ اور بینک اکاؤنٹ کے ذریعے اس کی جوانی کے لمحات خرید رہا تھا لیکن مجھ سے پوچھا جائے تو میں اپنے دل کی بات کہوں گا کہ وہ دن بدن میرے دل میں سما جاتی جا رہی تھی۔ میں اسے خرید نہیں رہا تھا بلکہ محبت اور خلوص سے اس کے کام آ رہا تھا۔ جیسے جیسے دن گزرتے جاتے تھے وہ میرے لیے زیادہ سے زیادہ پرکشش بنتی جا رہی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ جو چیز ضرورت کے وقت فوراً ہی آسانی سے حاصل ہو جائے اس کے لیے اتنی کشش نہیں رہتی اور جو چیز دنیا والوں کے خوف سے چوری چوری حاصل ہو اس کی جاذبیت اور کشش ہمیشہ قائم رہتی ہے اسی لیے یوی سے زیادہ محبوبہ حسین نظر آتی ہے۔

مگر اس حسین زندگی کو بھر کن تکتے گا۔ میری ریسیہ بیگم سیکے سے واپس آگئی تھی۔ آٹھ ماہ کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ اس دوران میں کتنے ہی بہانوں سے اپنی بیگم کو اس کے سیکے میں روک رہا تھا۔ کبھی مینے میں دو چار دن کے لیے لاہور چلا جاتا تھا اور اسے سمجھاتا تھا کہ لاہور کی آب و ہوا اسے صحت مند اور شگفتہ بنا رہی ہے کراچی کی آب و ہوا پھر اسے بیمار کر دے گی۔ میں اسے آغوش میں لے کر اس خوش فہمی میں جلا کر تارتا تھا کہ اب وہ میرے لیے صحت مند اور پرکشش ہو گئی ہے اور میں کراچی جا کر اس کی قربت کے لمحات کو نہیں بھولتا ہوں (قربت کے لمحات میں میں خاندانی منصوبہ بندی کو برا کہتا تھا) نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ ماہ کے بعد وہ اپنے ہماری پاؤں لے کر کراچی پہنچ گئی۔

کھالیا ہے۔ تمہارے بڑھاپے کو دیکھ کر کوئی یہ سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں کرے گا کہ بڑھاپا ایک لعنت ہے اور سمجھنے کے لیے ہمارے اطراف جوان عورتوں کا میلہ لگا رہا ہے۔ ایسے میں کسے فرصت ملے گی کہ وہ تمہارے بارے میں سوچے اگر تم صحیح معنوں میں زندگی گزارنا چاہتی ہو تو دوسروں کو اپنے متعلق سوچنے پر مجبور کرو۔“

ایسے مرحلے پر زیادہ سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ وہ سامنے ہر سماج کی خوشیوں کی تلاش میں بھٹکتی ہوئی اس مقام تک پہنچ گئی تھی لہذا میں اسے ان مقام سے آگے لے جانے لگا تو وہ گھبرا کر بولی۔

”میں بدنام ہو جاؤں گی۔“

میں نے اسے سمجھادیا کہ بدنامی کا اندیشہ نہیں ہے خاندانی منصوبہ بندی بڑی اچھی چیز ہے (ہاں میں وہی ہوں جو اپنی بیگم کے معاملے میں خاندانی منصوبہ بندی کو برا سمجھتا ہوں) وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ ایک وقت میں جو چیز نقصان دہ ہوتی ہے دوسرے کی وقت میں فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ پہلے چھپا کر ایک ایسے مقصد کے لیے اپنی حفاظت کے لیے بنائے گئے تھے پھر ہم اپنے مفاد کے لیے اس ہتھیار سے اپنی برائیوں کو قتل کرنے لگے خاندانی منصوبہ بندی ایک صحت مند معاشرے کے لیے عمل میں آئی ہے مگر ہمارے ہاں تو ایک گھناؤنے معاشرے کے مفاد کے لیے بھی کام آتی ہے۔ اس دنیا میں یہی ہوتا ہے کہ کوئی ایک راستے کے روشن کنارے پر چلا ہے کوئی تاریک کنارے پر۔

خواب گاہ خاموش تھی ہم خاموش تھے تنہائی سانس لیتی ہوئی بول رہی تھی۔ ہر سہانے والی میز پر شہناز کا پرس رکھا ہوا تھا۔ پہلی بار جب وہ میرے ساتھ میری کارڈ بیٹھ کر میری کوٹھی میں آ رہی تھی اور اس نے اپنی سیلیوں کی باتیں کرتے ہوئے کہا تھا اس کا پرس خالی ہے تو میں نے اس کے پرس کے خلا کو پر کرنا چاہا تھا۔ وہ منظر مجھے اچھے طرح یاد ہے۔ اس نے فوراً ہی انکار کرتے ہوئے پرس کو سینے سے لگایا تھا جیسے وہ اپنی زانو کو کلیجے سے لگا کر رکھ رہی ہو۔ وہ عزت نما پرس میری خواب گاہ میں پڑا ہوا تھا۔ وہ بہت خوب صورت پرس تھا اس کے بدن پر رنگ برنگے موتی جڑے ہوئے تھے۔

وہ قیمتی موتی کہیں سے ابھرے ہوئے کہیں سے ڈوبے ہوئے تھے میں ایک ایک کو چھو کر اس کے حسن کو سمجھ رہا تھا۔

موم جانے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔

”ہاں آپ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ آپ خواہ خواہ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔“

اس کے سمجھانے سے میں سمجھ گیا کہ مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے مگر میرے اندر غریب نام کی کوئی چیز کلکتی رہتی تھی جو مجھ سے چور سرگوشیوں میں کہتی تھی کہ تم غیر شعوری طور پر ریسہ کو بنا کر اس کی جگہ شہناز کو لانا چاہتے ہو۔ نہیں یہ جھوٹ ہے۔ میں جھلا کر اپنے اندر چیخنے لگتا تھا۔ اچھے خاصے چھپے ہوئے جرم کا اقرار کوئی مجرم نہیں کرتا۔ میں عترف نہیں کرتا تھا مگر پریشان رہتا تھا۔ شہناز کے سمجھانے سے بھی پریشانی کم نہیں ہوتی تھی اور ریسہ نہ سلیقے سے جیتی نہ مرنے تھی کہ مجھے اندر سے سکون حاصل ہوتا۔ ایک روز میں نے شہناز کے سامنے اعتراف کیا۔

”شہناز! میرے اور تمہارے درمیان اب کوئی پرہ نہیں ہے جب ہم دونوں ایک دوسرے سے ہر بات کہتے ہیں تو میں یہ بات بھی چھپانا نہیں چاہتا کہ ریسہ میری وجہ سے ہوتے منہ میں جاری ہے۔“

شہناز نے مجھے چونک کر دیکھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ میں اس حقیقت کا اعتراف کر لوں گا۔ میں نے کہا۔

”تم میری رازدار ہو اس لیے کہہ رہا ہوں میں دنیا والوں کے سامنے اور تمہارے سامنے بھی خود کو ایک فرض شناس شوہر ثابت کرتا ہوں کیونکہ ہزار محرومیوں کے باوجود یہ امکان ہوتا ہے کہ مجھے اپنی بیوی سے بے حد محبت ہے مگر تمہارے وجود سے زندگی کی سرشتیں حاصل کرتے وقت ریسہ داغ کا پھوڑا بن جاتی ہے چپکے چپکے یہ بات دل میں آتی ہے کہ کسی طرح اس سے پیچھا چھوٹ جائے نہ وہ ہمیشہ کے لیے میکے میں بیٹھتی ہے اور نہ ہی مطابق ریسہ مجھ سے دور رہنے لگی مگر ہم ازدواجی زندگی کی دور کے دوسروں پر جلدی سے مرنے سے تو ایسے میں جھلا ہٹ طاری ہو جاتی ہے۔“

”ہاں ایسے میں جھلا ہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ بس یہی تمنا ہوتی ہے کہ راستے کی دیوار پر چپکلے برس لگ جائے۔“

یہ کہتے ہی وہ کانپ سی گئی۔ بے خیالی میں وہ ایسی بات کہہ گئی جو مرد کو ذہن دیتی ہے مگر عورت کو بے جا اور بے وفائی دیتی ہے۔ وہ جلدی سے سنبھل کر بولی۔

”مہم میں فہم کو بہت چاہتی ہوں۔ میں آپ کی طرح نہیں سوچ سکتی کبھی نہیں سوچ

لیڈی ڈاکٹر نے پورے یقین کے ساتھ فیصلہ سنا دیا تھا کہ اس بار وہ زوجگی کے دوران زندہ نہیں بچے گی۔ میں اس کا منکا سا پیٹ دیکھ کر فکر مند ہو گیا۔ شہناز کے لیے میں نے بیڈ روم کا ایک مکان اور لے لیا تھا وہاں ہماری ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں اس نے مجھے گرا دیکھ کر پوچھا۔

”کیا بات ہے آپ اس نظر آرہے ہیں؟“

”ہاں! ریسہ بھرنا بننے والی ہے اس بار وہ نہیں بچے گی۔“

شہناز کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی پھر وہ جلدی سے نظریں جھکا کر یا نظریں ہاتھوں کی بولی۔

”خداوند کریم آپ کی بیگم کو سلامت رکھے۔ آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں؟“

”یہ باتیں میں نہیں کہتا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں۔ تین سال پہلے ریسہ کی زوجگی کے

ایک ڈاکٹر نے صاف طور سے کہہ دیا تھا کہ اپنی بیوی کا پیچھا چھوڑ دو نہیں تو یہ مر جائے گا

ہمارے خاندان میں خاندانی منصوبہ بندی کو کبھی برا سمجھتے ہیں اور یہ درست بھی ہے

میں آنے والے بچے کو قتل کرنا ایک بہت بڑا گناہ ہے۔“

شہناز نے بڑے کمزور لہجے میں تائید کی۔

”ہاں یہ گناہ ہے۔ اللہ کی دین سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔“

”خاندانی منصوبہ بندی کے ادوارے میں فیڈ ورک کرنے والی عورتیں ہر

تیسرے ماہ ریسہ کے پاس آتی ہیں اور منصوبہ بندی کے لیے پی سی ٹیبلٹ وغیرہ

جلی جاتی ہیں۔ ریسہ پہلے وہ چیزیں پیچھنک دیا کرتی تھیں اب میں وہ تمہیں لا کر دیتا ہوں

ہر چیز اپنے صحیح مقام پر اچھی لگتی ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر کے مشورے

مطابق ریسہ مجھ سے دور رہنے لگی مگر ہم ازدواجی زندگی کی دور کے دوسروں پر جلدی سے مرنے سے تو ایسے میں جھلا ہٹ طاری ہو جاتی ہے۔“

”ہاں ایسے میں جھلا ہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ بس یہی تمنا ہوتی ہے کہ راستے کی دیوار

پر چپکلے برس لگ جائے۔“

یہ کہتے ہی وہ کانپ سی گئی۔ بے خیالی میں وہ ایسی بات کہہ گئی جو مرد کو ذہن دیتی ہے مگر عورت کو بے جا اور بے وفائی دیتی ہے۔ وہ جلدی سے سنبھل کر بولی۔

”مہم میں فہم کو بہت چاہتی ہوں۔ میں آپ کی طرح نہیں سوچ سکتی کبھی نہیں سوچ

لیڈی ڈاکٹر نے پورے یقین کے ساتھ فیصلہ سنا دیا تھا کہ اس بار وہ زوجگی کے دوران زندہ نہیں بچے گی۔ میں اس کا منکا سا پیٹ دیکھ کر فکر مند ہو گیا۔ شہناز کے لیے میں نے بیڈ روم کا ایک مکان اور لے لیا تھا وہاں ہماری ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں اس نے مجھے گرا دیکھ کر پوچھا۔

”کیا بات ہے آپ اس نظر آرہے ہیں؟“

”ہاں! ریسہ بھرنا بننے والی ہے اس بار وہ نہیں بچے گی۔“

شہناز کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی پھر وہ جلدی سے نظریں جھکا کر یا نظریں ہاتھوں کی بولی۔

”خداوند کریم آپ کی بیگم کو سلامت رکھے۔ آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں؟“

”یہ باتیں میں نہیں کہتا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں۔ تین سال پہلے ریسہ کی زوجگی کے

ایک ڈاکٹر نے صاف طور سے کہہ دیا تھا کہ اپنی بیوی کا پیچھا چھوڑ دو نہیں تو یہ مر جائے گا

ہمارے خاندان میں خاندانی منصوبہ بندی کو کبھی برا سمجھتے ہیں اور یہ درست بھی ہے

میں آنے والے بچے کو قتل کرنا ایک بہت بڑا گناہ ہے۔“

شہناز نے بڑے کمزور لہجے میں تائید کی۔

”ہاں یہ گناہ ہے۔ اللہ کی دین سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔“

”خاندانی منصوبہ بندی کے ادوارے میں فیڈ ورک کرنے والی عورتیں ہر

تیسرے ماہ ریسہ کے پاس آتی ہیں اور منصوبہ بندی کے لیے پی سی ٹیبلٹ وغیرہ

جلی جاتی ہیں۔ ریسہ پہلے وہ چیزیں پیچھنک دیا کرتی تھیں اب میں وہ تمہیں لا کر دیتا ہوں

ہر چیز اپنے صحیح مقام پر اچھی لگتی ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر کے مشورے

مطابق ریسہ مجھ سے دور رہنے لگی مگر ہم ازدواجی زندگی کی دور کے دوسروں پر جلدی سے مرنے سے تو ایسے میں جھلا ہٹ طاری ہو جاتی ہے۔“

”ہاں ایسے میں جھلا ہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ بس یہی تمنا ہوتی ہے کہ راستے کی دیوار

پر چپکلے برس لگ جائے۔“

یہ کہتے ہی وہ کانپ سی گئی۔ بے خیالی میں وہ ایسی بات کہہ گئی جو مرد کو ذہن دیتی ہے مگر عورت کو بے جا اور بے وفائی دیتی ہے۔ وہ جلدی سے سنبھل کر بولی۔

”مہم میں فہم کو بہت چاہتی ہوں۔ میں آپ کی طرح نہیں سوچ سکتی کبھی نہیں سوچ

کے سوئے کا انداز رہا تو وہ میری بیوی کے مرنے کے بعد اپنے شوہر کو نہیں چھوڑے

کتی۔

اچانک ہی وہ دونوں تھیلیوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ ہائے ری گور  
چھپانے سے کیا خواہشات چھپ جاتی ہیں؟ اس انسانی نفسیات سے کون انکار کرے  
کہ مرد ہو یا عورت ہر ایک کے دماغ میں مثبت اور منفی دو سوچیں ہوتی ہیں۔ غور  
فعل کرنے کے لیے منفی انداز میں کبھی نہیں سوچتی مگر حالات کے تحت وہ منفی  
مرضی کے خلاف ضرور کبھی کبھی سراٹھاتی ہے۔ جب وہ سراٹھاتی ہے اور جب  
ذلیل سوچ کو روک نہیں سکتی تو وہ اپنے ہی اندر مرتی ہے اور بے بسی سے منہ چھپا  
گئی ہے۔ اور وہ رورور ہی کھنکھاتی مگر میں مرد ہوں میرے پاس آنسو نہیں تھے۔

”میں مر جاؤں گی“ وہ سسکیوں کی نال پر کہنے لگی ”ایسا کیوں ہوتا ہے  
بس میں کیوں نہیں رہتا؟ ایسی بات دماغ میں کیوں آتی ہے جو عورت کو زہر  
فیہم نے میرا کیا بگاڑا ہے وہ تو اپنی آنکھوں میں سامنے خواب سجا کر مجھے اپنی دل  
تھا۔ بد قسمتی نے اسے توڑ کر رکھ دیا۔ وہ مجبور ہے، معذور ہے میرے سارے  
وہ مجھے ازدواجی سرٹیس نہیں دے سکتا مگر میں تو اسے اپنی محبت اور اپنی توجہ  
ہوں۔ عورت ہر جگہ کاروبار تو نہیں کرتی کہ مرد سے کچھ ملے تو معاوضے میں اپنی  
گزاراری پیش کرے ورنہ منہ پھیر لے۔ مگر میں منہ نہیں پھیروں گی۔ میں اپنے  
جو کچھ بھی ہوں لیکن اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر فیہم کی آخری سانس تک  
فانچ لڑوہ وجود سے لپٹی رہوں گی۔ اس کے لیے کھانا پکاتی رہوں گی، اس کے بلے  
اس کے پینے کی بوتلوں کو کرا نہیں دھوتی رہوں گی۔ میں اس کے نصیب کو اجالا  
اس کے لباس کو دھو کر تو اجالا کر سکتی ہوں۔ انسان ایسا بے مروت تو نہ ہو کہ مرنا  
کر ظلم کرے یہ مجھ سے کبھی نہیں ہو سکے گا۔ اب اگر فیہم کے خلاف میرے دل  
بات آئی تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔“

میں بڑی خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور دل ہی دل میں اس کی  
کڑھ رہا تھا۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ محبت تقسیم ہوتی ہے میں اپنی بیوی کی محبت  
کر کے اس کا زیادہ حصہ شہناز کو دے رہا تھا۔ شہناز بھی میری طرح کی کوری  
اعتراض کی بات یہ تھی کہ میں بیوی پرست نہیں تھا۔ وہ شوہر پرست بن رہی

ملکت بنانے کی خواہش نے عورت کو بیوی بنایا۔ یہ بد ذات ایسی ہوتی ہے کہ بیوی  
بغیر قابو میں نہیں آتی۔ شہناز کو صرف اپنے نام سے وابستہ کرنے کے لیے یا صرف  
پنے لیے ہی ضرور رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ میں اسے بیوی بناؤں۔ تو یہ تو بے کسی بری بات  
کہ کوئی دوسرا بھی اسی پلیٹ میں کھانے بیٹھے۔ بے شک میں گناہ گار ہوں لیکن جب  
موت کی بات آتی ہے تو مرد کسی دوسرے کو اس گناہ میں شریک نہیں کرتا۔

میں بعض اوقات جھنجھلا جاتا۔ ایک تو ریسہ اسپتال پہنچ گئی تھی اور وہاں کے ڈاکٹر اور  
ڈاکٹر مجھے کھاجانے والی نظروں سے دیکھتے تھے کیونکہ میں اپنی بیوی کی زندگی کو تقریباً  
پانچ سالہ مری طرف شہناز نے الجھا رکھا تھا۔ ایک دن میں نے اسے صاف طور سے  
دیا۔

”ریشہ اب چند دنوں کی مہمان ہے جس روز زچگی ہوگی اس روز میرے راستے کی  
گر جائے گی۔ مگر تمہارا راستہ رکا ہوا ہے۔“

”دھر جاکر بولی۔“

”میں فہم کو رکلاؤ نہیں سمجھتی۔ میں نے کوٹھی، کار اور بھاری بینک بیلنس کے  
پہننے چھوڑ دیئے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم مجھ سے شادی نہیں کرو گی۔ تم جھوٹی محبت کا فریب دے کر  
مجھے بے وقوف بنارہی تھیں۔“

میرے غمے اور نفرت کو اس نے محسوس کیا تو ایک دم سے پریشان ہو گئی اور لرزتی  
تواڑیں بولی ”آپ۔ آپ۔ آپ۔“ مجھ سے بدگمان نہ ہوں میں آپ کو اتنی شدت سے چاہتی  
تھی کہ کبھی دھوکہ دینے کا تصور نہیں کر سکتی۔“

میں نے بھڑک کر کہا۔

”جو اس وقت کرو۔ یہ کیسی چاہت ہے کہ بیک وقت دو مردوں کو چاہتی ہو۔ یہ محبت  
نہیں ہے۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ جو عورت اپنے شوہر کو دھوکہ دے سکتی  
اس کی دوسرے مرد سے بھی وفا نہیں کر سکتی۔“

ایک دم سے سکتے میں آ گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اسے یہ توقع نہیں تھی  
اسے بے وفائی کا طعنہ دوں گا۔ اس نے بڑے کرب سے پوچھا۔

”جی ہاں اور بے وفائی کی بات صرف عورت کے لیے کیوں کی جاتی ہے آپ جیسے  
مرد بیویوں کو دھوکہ دیتے ہیں اور مجھ جیسی کتنی ہی شہنازوں کو اپنی وفا کا لٹین دلاتے  
ہیں۔ میں نے تو آپ سے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ آپ اپنی ایک مجبور بیوی کو دھوکہ دے کر  
اپنی زوجہ سے کب تک وفا کریں گے؟“

میں نے غمے میں اٹھتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں وفا نہیں کروں گا اور تمہاری جیسی عورت سے وفاداری کی بات  
کروں گا۔ تم جاؤ اپنے اپناج شوہر کے پاس۔ تمہارے بعد مجھے تم سے کچھ  
لڑکیاں مل جائیں گی۔ میں ریشہ کے سانس لینے تک تمہارا انتظار کروں گا۔  
شریک حیات بننے کے لیے نہیں آؤ گی تو ہمیشہ کے لیے جو رشتہ ٹوٹ جائے گا۔“

وہ بالکل ہی بے محال ہو کر صوفے کی پشت سے نکل گئی۔ میرے اس لڑنے  
اچانک ہی تو ذکر رکھ دیا تھا۔ اس وقت مجھے اس کی ذہنی اذیتوں کا ذرا بھی احساس

اس وقت وہ دو بلندیوں کے درمیان پستی میں مگر رہی تھی۔ ایک طرف کیل  
تھا جو اسے ایک روشن مستقبل کی طرف بلا رہا تھا۔ دوسری طرف کی بلندی  
اسے شوہر کی خدمت گزاری اور ایک مشرقی عورت کی نیک نائی کی طرف بلا رہی  
میں مگر کروڑے لگی۔ میں نے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔

”تم اپنے من کو مار کر زندہ نہیں رہ سکتی ہو، جھوٹی شوہر پرستی کو اپنے دل  
دو۔ وہ جو تمہارے دماغ میں ایک منفی سوچ ابھرتی رہتی ہے کہ تمہیں فہم  
حاصل کر لیتا چاہیے، دراصل وہ منفی نہیں بلکہ مثبت اور صحت مند سوچ ہے۔  
عورت ایسے حالات میں بھی اپنے راستے کا پتھر مٹا دیتی ہے اگر تم نہیں مٹاؤ  
کے لیے کھودو گی۔ میں جا رہا ہوں تم اچھی طرح سوچ لو۔“

میں اسے سوچتے رہنے کے لیے چھوڑ کر چلا گیا۔ اس دن کے بعد سے  
گئی۔ دوسرے دن آفس آئی تو اجڑی اجڑی سی تھی۔ دیران سے چہرے پر  
نظر آ رہا تھا جیسے کسی کھنڈر کی شکستہ دیوار پر رنگ و روغن چڑھانے کی کوشش کی  
شام میں اس کے ساتھ اس پرائیویٹ کوٹھی میں نہیں گیا تھا جو میں نے اس  
خریدی تھی۔ اس سے دور رہنا ہی مناسب تھا تاکہ وہ میری کمی محسوس کرے۔  
کے وقت فہم اس کے دماغ کا بوجھ بنا رہے۔ جب ہاتھ آئی ہوئی مسرتیں اٹھیں  
گتی ہیں اور زندگی کا معذور اپناج اور ہیما تک چہرہ سامنے آتا ہے تب اس  
احساس ہوتا ہے جو مسرتیں مہیا کرتا ہے۔ شہناز کو بھی اسی طرح میں ابھی  
ہو سکتا ہے۔

میں روزانہ اسپتال جاتا تھا ریشہ کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ اسے دکان

”کہ نہیں اپنے لیے مخصوص کرنا چاہتا ہوں ورنہ یہ چور رشتہ کب تک قائم رہے گا؟“  
 ”میرے مرتے دم تک چلتا رہے گا۔ اس چور رشتے کی جڑیں بہت گہرائی تک اتر گئی  
 ایک عورت کے لیے اس رشتے کو توڑنا ممکن نہیں۔“

”میں خود بھی توڑنا نہیں چاہتا۔ تم میری خواہش کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میری یہ  
 درخواست ہے کہ تم صرف میری بن کر رہو گیارہ اس بات سے میرے والدین کا اظہار  
 ہوتا ہے؟“

”میں آپ کی اس دیوانگی کو سمجھتی ہوں جو صرف میرے لیے ہے جب میں سوچتی  
 کہ آپ مجھے اپنانے کے لیے مجھے اپنا سمجھ کر غصہ دکھاتے ہیں تو دل میں ایک عجیب  
 کی خوشی ہوتی ہے بڑی اپنائیت کا احساس ہوتا ہے عورت یہ چاہتی ہے کہ کوئی اسے  
 رکھنے والا اور کوئی اسے ڈانٹنے والا بھی ہو جب میں آپ کی طرف سوچتی چلی جاتی  
 تو بار بار غیم کی طرف سے کمزور پڑ جاتی ہوں۔ میں بیان نہیں کر سکتی کہ ان دونوں کے  
 میرے دماغ میں کتنے برے برے خیالات آتے رہے ہیں۔ خدا کے لیے میرے  
 نے ایسی کوئی شرط پیش نہ کریں کہ میرا دماغ غیم کو بوجھ سمجھنے لگے۔ یہ اچھی بات نہیں  
 خدا کے لیے ایک عورت کا مان رکھ لیجئے۔“

میں فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں اس کے حسب فضا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیتا  
 اتفاقاً میں نے رسٹ وایج کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے ریسٹ کی فکر ہے میں اسپتال جا رہا ہوں اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمہاری فکری  
 لاپرواہی پر عمل کرو۔ اس کے بغیر تم مجھ سے دور ہوتی چلی جاؤ گی۔“

میں وہاں سے جانے لگا تو اس نے میرا بازو تھام کر پوچھا۔

”کیا یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟“

”ہاں! اس کے فیصلے نہیں بدلتے۔“

”اچھی بات ہے آپ شام کو کوٹھی میں آئیں میں بھی اپنا آخری فیصلہ سناؤ گی۔“  
 اس نے میرا بازو چھوڑ دیا میں اس کی طرف دیکھے بغیر تھری طرح دفتر سے نکل گیا۔  
 مگر طرف جاتے وقت مجھے کسی حد تک یقین تھا کہ وہ میرے حق میں فیصلہ کرے گی۔  
 ”جس کی کوئی بھی حسین اور نوجوان عورت ایک اپناج کے ساتھ ساری زندگی نہیں گزار

نہیں سکتا تھا اسے خون دیا گیا تھا اور دوسری مرگئی دو اؤں کے ذریعے اس کی جان  
 کو شش کی جابری تھی مگر اس کا معدہ اچھی دوا اور اچھی خوراک کو قبول نہیں کر  
 اسے کس طرح بچا سکتا تھا وہ ایسی کھنڈ رہن گئی تھی کہ اس کے قریب بیٹھے ہوئے  
 ہوتی تھی۔ میں یہی کوشش کرتا تھا کہ کھڑے کھڑے اسے تسلیاں دے کر  
 ڈاکٹروں کا بھی سامنا نہ ہو کیونکہ وہ مجھے نفرت سے دیکھتے ہیں اور سیدھے مزہ  
 کرتے تھے۔

دوسری طرف شہناز کے سامنے اب میں اپنی بیوی کا ذکر زیادہ کرنے لگا:  
 شوہر پرستی دکھا چکی تھی اب میں ریسٹ کے ساتھ اپنی وفاداری ظاہر کرتا تھا۔  
 میں اس کے ساتھ پرائیویٹ کوٹھی میں نہیں گیا تھا۔ دفتر میں کبھی وہ کوئی بات ج  
 میں فوراً ہی کہہ دیتا۔

”میں بہت پریشان ہوں۔ میری ریسٹ بڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی ہے کبھی  
 سانسیں رکنے لگتی ہیں ابھی سے یہ حالت ہے تو زوجگی کے وقت کیا ہو گا میں تم  
 کے لیے دعا نہیں کرتا رہتا ہوں۔“  
 ”جینے کیا مرنے کی؟“

شہناز نے میری آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔ میں گڑبڑا سا گیا پھر جلدی  
 ”میں اس کی درازی عمر کے لیے دعا کرتا ہوں وہ میری بیوی ہے وہی آؤ  
 ساتھ دے گی۔ تمہاری طرح اس کے راتے میں کوئی دیوار نہیں ہے۔“  
 وہ بڑے دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

”کیا آپ مجھے اسی طرح طعنے دیتے رہیں گے جب آپ پہلی بار میری  
 آپ کو علم ہو چکا تھا کہ میرے راستے میں دیوار ہے مگر اس وقت آپ نے  
 نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ اس وقت میں ایک انمول خزانہ تھی آپ کے دل میں  
 کہ یہ خزانہ حاصل ہو سکے گا یا نہیں؟ اب وہ بے چینی دور ہو چکی ہے۔  
 حصول کا موقع دے کر اپنی اہمیت کھودی ہے۔ اب میں بے شرم تو بن چکی ہوں  
 غیم کی طرف سے بھی بے وفائیتا چاہتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟“  
 ”اس دنیا کا ہر شخص صرف اپنے حق میں انصاف کرتا ہے اسی لیے میں



کی تعداد بہت زیادہ ہے جو ساج کے شریف مگر چھوٹی کی آنکھوں سے نکلتے ہیں۔

پھر مجھے اچانک خیال آیا کہ اگر وہ مرگئی ہے تو اسے کمرے میں لے جایا گیا ہے؟ میں تیزی سے چلا ہوا اس کمرے میں پہنچا۔ وہاں رئیسہ کو آکسیجن پہنچانے کے انتظامات کیے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر نے مجھے دیکھتے ہی بڑی ناگواری سے ہاتھ جھٹک کر باہر کی طرف اشارہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ میں باہر چلا جاؤں۔ میں نے ایسی توہین کبھی برداشت نہیں کی تھی مگر اسپتال کا وہ کمرہ ایک عدالت تھا۔ ڈاکٹر منصف تھا وہ مجبور تھا کہ مجھے پھانسی کی سزا نہیں دے سکتا تھا مگر اس کمرے سے نکال سکتا تھا۔

میں باہر گیا اس وقت میں بری طرح جھنجھلیا ہوا تھا۔ کیونکہ رئیسہ زندہ تھی اور یہ لوگ خواہ مخواہ مجھ سے نفرت کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ نرس باہر آئی تو میں نے اس کا راستہ روک کر پوچھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ میری بیگم مر گئی ہے؟“

نرس نے حیرانی سے کھورتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے کب کہا تھا کہ وہ بے چاری مر گئی ہے۔ میں تو یہ بیڑی لاتی جا رہی تھی کہ بچی بہت خوب صورت تھی مگر پیدا ہوتے ہی مر گئی۔ آپ کے دماغ میں تو آپ کی بیگم کی موت ہائی ہوئی ہے آپ اور کیا سوچیں گے؟“

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی پھر زدارک کر بولی۔

”صبح تک زچہ سے کوئی نہیں مل سکتا۔ آپ اب یہاں سے چلے جائیں۔ ہمیں اس پر زب نہ کریں۔“

وہ اونچی ایزی کی سینڈل کھٹکھٹاتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے دروازے کے شیشوں سے جانکاب کر دیکھا۔ رئیسہ ایک زندہ لاش کی طرح بستر پر پڑی تھی۔ وہ بڑی سخت جان تھی۔ وہ میرے لیے نہ سہی اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے لیے جینے کا عزم کر چکی تھی۔ خدا اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ آکسیجن پہنچانے کے لیے اس کے چہرے پر شیشے کا ایک ماسک رکھا ہوا تھا۔ پورا اور پچکا ہوا زبر۔ تھنک بیک اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اس کی سانسیں احتلال پر آ رہی ہیں۔

میں نادم ہو کر شہناز کے پاس آیا تو بازی پلٹ گئی تھی وہ بستر پر پڑی آخری سانسیں لے

سکتی۔ اس کی اپنی عمر کے کچھ تھاغے ہیں، جسم کی کچھ مانگ ہے اس کی اپنی کچھ خواہشات ہیں جو اسے میری طرف آنے پر مجبور کر رہی ہیں اگر وہ ایک مثالی طرح نادانی سے فیصلہ کرے گی تو میں نے اس شہر میں ایک ایسی عورت کو بھی نہ دیکھا ہے جسے پرانے پرنے پہن کر اپنے لاپرواہ شوہر کو دوسروں کی ایک ٹوٹی پھوٹی گاڑی میں بٹھانے کی کوشش کی رہتی ہے اور اللہ کے نام پر بھیک مانگتی رہتی ہے۔ شہناز کا انجام کچھ عبرت ناک ہو گا۔

میں اسپتال پہنچا تو وہاں رئیسہ کو اسٹینڈ کرنے والی ایک نرس کو بہت پریشان ایک بار کسی کام سے زچہ خانے سے باہر آئی تو میں نے اس سے رئیسہ کی خبر پتہ پانے لے مجھے گھور کر نفرت سے دیکھا اور یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔

”اگر وہ عورت مر جائے گی تو آپ کے لیے کیا فرق پڑے گا اور وہ مری ہے تجربات اسے بچا نہیں سکتے۔“

اس کی باتیں سن کر مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے اس وقت اپنے دل کو ٹھنڈا سمجھ میں آنے کی میں نفرت کے قابل ہوں۔ جو میرے رحم و کرم پر زندگی گزارنے دلسن بن کر آئی تھی۔ اب میں اسے تقریباً قتل کر چکا ہوں مگر یہ بھی اطمینان تھا کہ کوئی قانون مجھے قاتل ثابت نہیں کر سکے گا کیونکہ محبت سے قتل کرنا کوئی جرم نہیں جرم ہوتا تو مجھ جیسے شوہر کم از کم سوسائٹی میں شریف زادے نہ کہلاتے۔

دوسری بار وہ نرس زچہ خانے سے باہر نکلی تو اس نے میری طرف دیکھا بھی کیا۔ خود ہی بیڑی لاتی ہوئی چلی گئی۔

”اور کیا ہو گا۔ اسے تو مرنا ہی تھا مر گئی بچاری۔“

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ مر گئی۔ میں اسے مارنا چاہتا تھا۔ غاد بندی کے خلاف تقریریں کرتا تھا لیکن جب وہ مر گئی تو مجھے یوں لگا کہ سڑکا ہوں۔ میری کمر جھک گئی ہے۔ میرے گھٹنے کانپ رہے ہیں۔ کھڑانہ وہ سا تیرہ کی ایک شیخ پر بیٹھ گیا۔ اب نادم ہونے اور بچھٹانے کا وقت تھا۔ جب اسے زچہ اسٹریچر پر ڈال کر زنا نہ دارڈ کے ایک کمرے میں لے جانے لگے تو میری آنکھوں آگئے۔ ایسے وقت ہر شریف مرد کو روٹا چلائیے۔ ہماری اور آپ کی دنیا میں اب

رہی تھی اس کے سرانے خواب اور گولیوں کی ایک شیشی رکھی ہوئی تھی جو خالی ہو گئی تھی میں نے گھبرا کر ایسوپینس کو فون کرنا چاہا تو اس نے میری آستین پکڑ لی اور اکھڑی اکھڑی سانسوں کے ساتھ کہنے لگی۔

”بہت دیر ہو چکی ہے میں نے ایک خط لکھ کر میز پر رکھ دیا ہے کہ میں اپنی خوشی مر رہی ہوں۔ اپنی خوشی سے جی نہیں سکتی، مر تو سکتی ہوں۔ میں نے بہت سوچا۔ بہت کیا۔ یہی بات سمجھ میں آئی کہ نعیم سے ہی میری نیک نامی قائم رہ سکتی ہے۔ کیونکہ جیسی عورتیں تمہاری اس مطلبی دنیا میں۔ نیک نامی کے بغیر۔ زندہ۔ نہیں رہ سکتی نعیم میری زندگی ہے اور تم صرف۔ ایک سلاوہ ہو۔ تم میری خالی خواہشات کے پیچھے پوچھنے والا۔ صرف ایک رومال تھے۔ صرف ایک ایسے۔ کپڑے کا ٹکڑا تھے۔“

سے ساج کی گندگی۔۔۔ پونچھ کر۔۔۔ نالی میں پھینکا جاسکتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اس کپڑے کو بھی ساج کے ڈر سے۔۔۔ اپنے پرس میں چھپا کر۔۔۔ رکھنا پڑتا ہے۔ میں تم پرس سے نکال کر پھینک نہیں سکتی تھی جب میرے ضمیر نے مجھے سمجھا دیا۔ کہ۔۔۔ نے اپنے اعتماد کرنے والے شوہر کو دھوکہ دیا ہے نہ میں یا حیا رہی نہ میں باوقار رہی۔ کی رہی نہ ادھر کی رہی۔۔۔ تو اب اپنی حیثیت معلوم کرنے کے لیے۔۔۔ اس کے جاری۔۔۔ جس نے مجھے۔۔۔ جس نے مجھے خواہشات کا روگ۔۔۔ دے کر اس دنیا میں۔۔۔ خواہشات کا روگ۔۔۔ خواہشات کا۔۔۔ دے۔۔۔ دے۔۔۔

وہ خواہشات کی بات کرتے کرتے چپ ہو گئی ہزاروں خواہشیں تھیں اور ہر خواہش دم نکلتے نکلتے آخر نکل ہی گیا۔



## سدا سہاگن

میں نے اسے دیکھا۔ وہ شیشہ تھی۔

میں نے ہاتھ لگایا۔ وہ پتھر تھا۔

وہ تھی اور وہ تھا۔

ایک متعفن ماحول میں ایک نازک جذبے کی کہانی جو نازک دلوں میں اتر کر لہو کی طرح کھل جاتی ہے۔

حضور سجدہ کیا۔ حالانکہ سجدہ صرف خدا کے سامنے کیا جاتا ہے مگر وہاں میری طرح اکثر لوگ سجدے کرتے ہیں۔ اس پر بحث نہیں کر سکتا کہ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں بس عقیدت سے سر جھٹکا ہے اور سجدے تک پہنچ جاتا ہے اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔

میں سجدے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھادیئے۔ اٹھے ہوئے دونوں ہاتھوں کے درمیان فاصلے سے میں نے مزار کے دوسری جانب دیکھا جہاں عورتیں کھڑی ہوئی تھیں۔ پرانی عورتوں کو دیکھنا مقصود نہ تھا میں جسے دانا صاحب سے مانگتے آیا تھا اسے تلاش کر رہا تھا۔

میں اس جگہ تھا جہاں لوگ دنیا کی دولت بھی مانگتے آتے ہیں اور دل کی دولت بھی اس مقدس مزار کو چھو کر ایک غریب ماں اپنی بیٹی کو سماگن بنانے کی آرزو کرتی ہے، وہیں ایک ٹائیکہ اپنی بیٹی کے پاؤں میں تھکڑو باندھنے سے پہلے یہ منت لے کر آتی ہے کہ کا دربار چل نکلا تو وہاں کے نگر خانے میں چارو ٹکیں پہنچا دے گی۔ وہاں ایک مجبور اور بیمار شخص بھی آتا ہے اور ایک صحت مند اسٹمپر بھی۔ میں نے ایسے فلم پروڈیوسر بھی دیکھے ہیں جو ریلیز سے پہلے فلم کے ڈبے لے کر وہاں آتے ہیں۔ آومی اگر تیاں مزار پر رکھتے ہیں آومی اگر تیاں فلم کے ڈبوں پر۔ پھر اس فلم کے سپر ہٹ ہونے تک پانچویں وقت کی نمازیں پڑھتے ہیں۔ دراصل بے ایمانی اتنی عام ہو گئی ہے کہ اب لوگ اسے ایمان کی طرح برتنے لگے ہیں۔ میں نے کتنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے طور پر کس حد تک ایماندار تھا اور ایک پرانی لڑکی کی آرزو کرنا کہاں تک درست تھا میں یہ نہیں جانتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ محبت کرنے والے بھی مرادیں مانگتے آتے ہیں لہذا میں بھی آگیا تھا۔

میں نے اسے دیکھا وہ عورتوں کی بھیڑ سے گزرتی ہوئی مزار کی جالی کے پاس آکر کھڑی ہو گئی تھی اور دعا مانگنے سے پہلے اپنے سر پر آئینل کو درست کر رہی تھی۔ وہ سرخ لباس میں تھی لباس کی سرخی اس کے گورے مکھڑے پر جھلک رہی تھی۔ عجیب سحر انگیز حسن تھا میرا دل دماغ اس کی طرف کھینچا جا رہا تھا۔ میں دل سے دیکھ رہا تھا اور آنکھوں سے دعا مانگ رہا تھا کہ "اے دانا اے مظہر نور خدا! خدا سے میرے لیے اس لڑکی کو مانگ لے۔ میں اور کچھ نہیں چاہتا۔"

اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ہاتھوں کے ساتھ اس کی نگاہیں بھی اٹھ گئیں۔

## سدا ساگن

یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب جوانی اٹھان پر تھی اور مجھے ہر چمکتی ہوئی چیز سہاگلہ آتی تھی۔ میں ادھ کھلی کھلی اور ایک شاداب پھول کی شفتی کے فرق کو سمجھنے لگا تھا۔ ایسے ہی وقت میں نے زلیخا کو دیکھا تو یوں لگا کہ جاڑے کی ہلکی سنہری دھوپ آنکھوں کے دریاں سے اتر کر دل کو آجھوے رہی ہے۔

زندگی میں پہلی بار ایسا چندن سا روپ دیکھا تھا اس لیے بڑی محبت سے اسے دیکھا گیا۔ وہ دانا دربار کے اس دروازے پر کھڑی ہوئی تھی جو خواتین کی آمد و رفت کے لیے مخصوص تھا۔ اس کے قریب ایک خسر اپنے زانوں پر ڈھولک رکھے بیٹھے بیٹھا ہوا آنے جانے والی خواتین کی بھیڑ میں وہ کبھی نگاہوں سے اوچھل ہو رہی تھی اور کبھی اوچھل ہو رہی تھی۔ حسن چھپتا رہے اور جھٹکتا رہے، پردہ کرتا رہے اور اٹھتا رہے تو میرا جلوے کی تابناکی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ وہ چاند سا کھڑا عورتوں کے سیلاب میں ابرو بٹا رہا تھا۔ میں دانا صاحب سے کچھ مانگنے آیا تھا۔ کیا مانگنے آیا تھا؟ اس وقت بھول گیا تھا۔ اس سخی دانا سے مانگنا ضرور تھا مگر دعا بدل گئی تھی۔ پہلے زبان سے مانگنے آیا تھا اب مانگ رہا تھا اور اس یقین کے ساتھ کہ وہ دینے والا میرے حسن طلب کو خرب سمجھتا ہے تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھی عورت شیرینی اور اگر تیاں لے کر اس کے پاس خسرانے پر بیٹھا رہا اور وہ بوڑھی عورت کے ساتھ دربار میں داخل ہو گئی۔ میں بھی اسے پلٹ کر دوسرے دروازے پر آیا جو مردوں کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں میں نے لے کر جوتیاں جمع کیں اور زبان سے دانا صاحب کو پکارا ہوا تصور کی آنکھوں سے زلیخا دیکھا ہوا اور دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالا ہوا مزار مقدس تک پہنچ گیا۔ مزار کے ایک مرد مکھڑے ہوئے دعا میں مانگ رہے تھے اور کلام پاک کی تلاوت کر رہے تھے طرف عورتیں نذر نیاز میں مصروف تھیں۔ میں نے وہاں پہنچتے ہی پہلے دانا صاحب

ہو جاتا۔ نہ اقرار تھا نہ ہی انکار۔ وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو پہلے ہی مرٹے میں آنکھیں لڑا کر حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ اس کی معصومیت میرے لیے ایک معمہ بن گئی تھی۔

بچہ مردہ سر جھکا کر میری جانب دیکھے بغیر واپس جانے لگی۔ میں بھی اٹنے پاؤں واپس ہو گیا۔ میں اور کہاں جاتا؟ ایک عرصے سے تنہا تنہا رہا تھا۔ بچہ ہی میں ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ ایک ظالم چچا نے مار پیٹ کر میری پرورش کی۔ انور کشہ کے ریپرنگ ورکشاپ میں ایک روپیہ روز پر کام کرتا تھا۔ جوان ہوتے ہوتے اچھا خاصا کارگری بن گیا ہوں جنازہ گاہ کے قریب رکشوں کی مرمت کا ایک چھوٹا سا کارخانہ کھول لیا ہے۔ ہر ماہ ہزار روپے کی بچت ہوتی ہے۔ چچا بھی مرچکا ہے۔ میں بالکل تنہا ہوں مجھ اکیلے کے لیے ہزار روپے کی بچت بہت زیادہ ہے۔ ان دنوں یاد دوست ہیرامنڈی کا راستہ دکھاتے تھے میرے بچنے کا وقت آپکا تھا نہ کوئی نصیحت کرنے والا تھا اور نہ ہی میں کسی کے رعب اور دبے میں قائم رہنا لازمی تھا۔ ایسے ہی وقت وہ میری نگاہوں کے سامنے آگئی اور میرے دل میں ساکنی۔

میں تو سمجھ رہا تھا کہ تقدیر مجھے غلط راستے سے بچا کر اس اجنبی لڑکی کے راستے پر لے جا رہی تھی۔ دربار سے نکل کر وہ باہر آئی اور دروازے کے قریب مجھے دیکھ کر ٹھنک گئی۔ بوڑھی عورت نے اس سے کچھ کہا، شاید اس کی گھبراہٹ کی وجہ پوچھ رہی تھی اور وہ فی میں سرلا کر اس کے سوال کو ٹال رہی تھی۔ بوڑھی عورت نے بڑی محبت سے اس کی بلا میں لپٹ لپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر جانے لگی۔ خسران کے ساتھ چل رہا تھا۔ میں پیچھے دس قدم کے فاصلے پر تھا۔ آگے جا کر وہ رک گئی مین روڈ پر ٹریفک زیادہ تھی۔ سڑک پار کرنے سے پہلے وہ ذرا گردن گھما کر دیکھنے لگی کہ کس میں پیچھا تو نہیں کر رہا ہوں؟ مجھے دیکھتے ہی اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا اور سڑک کی جانب نکلنے لگی۔

بچہ مردہ سڑک پار کر کے بھالی گیٹ کی طرف جانے لگیں۔ میں سوچتا ہوا اس کے پیچھے چل رہا تھا اور یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ درکشاپ میں نہیں رہوں گا، اس محلے میں ایک مکان کرانے پر حاصل کروں گا جہاں وہ رہتی ہے۔ مجھے محبت کا جواب محبت سے ملے نہ ملے مگر اب اس کے قریب رہ کر ہی دل کو قرار آ سکتا تھا۔

چند لمحوں تک اس کی نگاہیں مجھ پر ٹھہر گئیں۔ میں خود کو یوسف ثانی نہیں سمجھتا۔ مگر میں کوئی بات تھی یا میرے دعائے کا انداز ایسا تھا کہ وہ متوجہ ہو گئی تھی۔ شاید وہ کچھ چاہتی تھی کہ میں دعاؤں میں گم ہو گیا ہوں یا اس بہانے سے اسے دیکھ رہا ہوں۔ میں لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی اور وہ سمجھ گئی کہ میری نگاہیں اس پر مرکوز ہیں اس کی ہلکی فوراً ہی جھک گئیں۔ اس کے سر کا انجیل اپنی جگہ موجود تھا پھر بھی وہ ہاتھ اٹھا کر اسے نہ ٹخواہ ادھر ادھر سے درست کرنے لگی۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ وہ کچھ بد خواں؟ ہو گئی ہے۔ میری نگاہوں سے چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی اس لیے اپنے دوپٹے سے بدلا ڈھانپ رہی تھی۔

اس کے بعد دوبارہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے وقت اس نے دیکھا کہ کس میں اسے؟ تو نہیں رہا ہوں۔ میں اسے برابر دیکھے جا رہا تھا اس لیے اس کی آنکھیں فوراً ہی جھک گئیں دونوں ہاتھ اٹھے رہ گئے تھے۔ ہمارے درمیان زیادہ سے زیادہ آٹھ دس فٹ کا فاصلہ تھا مجھے صاف طور سے اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ نظر آرہے تھے۔ وہ دعا کے لیے کھڑی تھی دعا سے خالی تھی مجھے یقین تھا کہ وہ میری نگاہوں کو اپنے چہرے پر محسوس کر رہی ہے۔ بڑی دیر تک ہم دو بروکھڑے رہے۔ بڑی دیر کے بعد اس نے پھر جھکتے ہوئے نظر اٹھا میں شاید اس نے سمجھا تھا کہ میں چلا گیا ہوں یا جواباً نظرس نہ ملانے سے بالوں اب اسے نہیں دیکھ رہا ہوں مگر میں بھی دھن کا پکا تھا۔ اسے دیکھتا ہی جا رہا تھا۔ اس جلدی سے سر کے انجیل کو کھینچ کر گھونٹ بٹالیا۔

نصف چہرہ چھپ گیا۔ شرافت کا تقاضہ یہ ہے کہ جو چھپ رہا ہو اسے جزا نہیں چاہیے لیکن اس کے چھپنے کی ادا اتنی پیاری تھی کہ میری نگاہیں اس کے سوا دنیا کے نظارے کو دیکھنا نہیں چاہتی تھیں۔ میں اس کی اوڑھن سے یہ سمجھتا چاہتا تھا کہ وہ متعلق کیا سوچ رہی ہے۔

چھپنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھے نہ دیکھو۔ ایک مطلب یہ ہوتا ہے کہ ابھی رہو، چاند پھر کبھی گھونٹ سے نکلے ہو گا یہ ایک محبوبانہ انداز ہے۔ لیکن نہیں، محبوبانہ انداز اس وقت سمجھا جاتا جب وہ جواباً مسکرا کر دیکھتی میر کوئی ہلکا سا، نازک سا اشارہ چھوڑ دیتی یا پھر ناگواری سے منہ پھیر لیتی تو یہ تعذیب

سماں کو کچھ کر بڑی محبت سے مخاطب کیا ”زلیخا بیٹی! داتا کے دربار سے آئی ہو۔ شیرنی کے دوائے میری بیٹی کو بھی دو۔ تمہارے ہاتھوں میں کتنی برکت ہے۔ اے بیٹی! مجھے بھی۔“  
 دوسرے مکان کی کھڑکی سے کسی عورت نے آواز دی۔ پھر تو اس پاس کے مکانوں کی کھڑکیاں اور دروازے کھلنے لگے۔ کبھی سے عورتیں اور کہیں سے مرد تو ازیں دے رہے تھے اور اسے اپنے ہاں بلا رہے تھے۔ وہ اپنے لبوں پر سنجیدہ سی مسکراہٹ لیے باری باری سب ہی کے دروازوں پر جاری تھی کسی کے ہاتھ میں شیرنی کے دانے رکھ رہی تھی تو کوئی ہاتھ کر کے اسے اپنے گھر کے اندر آنے کے لیے کہہ رہا تھا ذرا سی دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ کھلے کے تمام لوگ اس کی بے انتہا عزت کرتے ہیں وہ کسی کے دروازے پر چلی جائے تو اس کے لیے آنکھیں بچھادی جاتی ہیں۔

میں ایک پان والے کی دکان کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی شاید اس لیے کہ دکان کے سامنے کچھ نوجوان کھڑے ہوئے تھے وہ اپنے چہرے اور لباس سے چھپے ہوئے بد معاش معلوم ہوتے تھے مگر وہ بھی زلیخا کو بڑی عزت اور عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

”خدا کی قدرت بھی عجیب ہے کیسی کیسی مخلوق پیدا کرتا ہے زلیخا کو دنیا جہاں کا حسن واپے مگر کسی کی کیا مجال کہ کوئی اسے میلی نظر سے دیکھ لے۔ دیکھے گا تو ساری عمر بچھتا ہے۔“

”ہاں یار! دوسرے نے کہا ”اس پر فرشتوں کا سایہ ہے انسان اسے چھو نہیں سکتا۔“ میں جراتی سے ان کی باتیں سن رہا تھا وہ لنگے جو عورت کو کھلونا سمجھتے ہیں۔ بد معاشی پر از آئیں تو کسی بھی جوان لڑکی کو کاندھوں پر اٹھا کر لے جاسکتے ہیں وہ زلیخا کے متعلق ایسی باتیں کر رہے تھے جیسے اس لڑکی کو کوئی مادرائی ہستی سمجھ رہے ہوں۔ جو فرشتوں کی دنیا سے آئی ہے اور جسے انسان چھونا چاہے تو کسی عذاب میں مبتلا ہو جائے۔ اس لڑکی میں کوئی بات تھی جب ہی محلے کے بچے بوڑھے جوان عورت اور مرد سب کے سب اس کی ایسی عزت کر رہے تھے جیسے وہ آسمان سے اتر آئی ہے۔ کوئی نوجوان اسے ایک عاشق کی نظر سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ مجھے بھی مخاطب ہو جانا چاہیے تھا مگر اس کی ذات سے میری دلچسپی اور بڑھ گئی ایک شخص پیدا ہو گیا آخر وہ کون ہے؟ اس میں کیا بات ہے سب ہی اسے عزت و احترام

وہ بھائی گیٹ سے گزر کر آگے بڑھتی جا رہی تھی تنگ راستے کے اطراف مرد پول یا کی بوسیدہ عمارتیں تھیں۔ دو منزلہ اور تین منزلہ عمارتیں جن کی شکستہ دیواریں اس لڑکی جھکی ہوئی تھیں جیسے اب تب میں گرنے ہی والی ہوں۔ وہ آگے اور آگے بڑھتی جا رہی تھی اور آگے ہیرا منڈی کی سرحد قریب آتی جا رہی تھی۔ میرا دل ڈوبنے لگا کیا وہ بدنام علاقے کی رہنے والی ہے؟ دل نہیں مانتا تھا۔ وہ ایسی شرمیلی تھی کہ مجھ جیسے اجنبی سے نظریں نہ ملا سکتی تھی اس کے چہرے پر ایسی معصومیت تھی جو بازار حسن کی لڑکیوں میں بھولنے بھی نظر نہیں آتی پھر میں کیسے مان لیتا کہ وہ اس بازار کی رہنے والی ہے۔

آؤٹ آف بوئے کا بوڑا دور سے نظر آ رہا تھا اس کے قدم بڑھتے ہی جا رہے تھے اس کے چلنے کے انداز سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ اپنے پیچھے میری موجودگی کو محسوس کرتی جا رہی ہے۔ پھر وہ منہ منہ علاقے تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک گلی میں مڑ گئی۔ میرا خیال صحیح نکلا۔ ایک شریف زادی تھی جس بوسیدہ عمارت کی طرف وہ جا رہی تھی وہاں شریف لوگ رہتے تھے۔

مکان کے قریب پہنچ کر وہ رک گئی۔ محلے کے بچے اس کے اس پاس اچھلے کودنے لگے۔  
 ”سماں باجی آگئی سماں باجی آگئی۔ باجی ہمیں تھوڑی سی شیرنی دو۔“

چاروں طرف گھومتے ہوئے بچوں کو دیکھنے کے بہانے اس نے گھوم کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے حیرانی ظاہر ہو رہی تھی اس کے دیکھنے کے انداز میں ایک بے چارہ تھی جیسے پوچھ رہی ہو کہ میں کیوں اس کے پیچھے اتنی دور تک چلا آیا ہوں۔ اس بارگاہ اور توجہ سے اسے دیکھا بچوں نے اسے سماں باجی کہا تھا لیکن وہ دلی چسکی یا ناز کا لڑکی مجھے سماں نظر نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ اس نے سرخ جوڑا پین رکھا تھا۔ ایسا جوڑے تو کتوریاں بھی پہنتی ہیں۔ اس کی جسمانی ساخت ایسی تھی کہ چندہ یا سولہ سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ آدھ کھلی کلی کا چہرہ بتا رہا تھا کہ ابھی اس نے سماں کا سونہ نہیں کیا ہے۔

میں سوچ رہا تھا اور خود کو مایوسی سے بچانے کے لیے ہر ممکن طریقے سے دل آ رہا تھا۔ اسی وقت ایک مکان کا دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے اس

میں نے محسوس کیا کہ زلیخا نے اطمینان کی سانس لی ہے۔ وہ نکلے پان والے سے بولی  
 اپنی باتیں کر لے میں ماں جی کو بھیج دیتی ہوں۔“  
 یہ کہہ کر وہ اپنے مکان کی طرف واپس جانے لگی۔ نکلے نے مجھ سے پوچھا۔  
 ”تمہارا نام کیا ہے؟“

میں تفصیل سے اسے بتانے لگا۔ میرا نام اقبال ہے، بچپن میں والدین اقبالے کہتے  
 مجھے ہم گتے گتے بالے بن گیا۔ جتنا زہ گاہ کے پاس آئو رکشہ کی مرمت کرتا ہوں۔  
 دل آملی ہے۔ مکان کا کرایہ باقاعدگی سے ادا کرتا رہوں گا۔ جہاں میرا در کشا ہے  
 اسے معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں، نشہ تو دور کی بات  
 میں پان سگریٹ کو بھی ہاتھ نہیں لگتا۔ یہاں رہوں گا تو کبھی مالک مکان کو شکایت کا  
 نہ نہیں دوں گا۔“

نکلے ہاتھ کے اشارے سے بتایا ”دیکھو وہاں سے یہاں تک جتنے مکانات ہیں۔ یہ  
 کے سب زلیخا کے نام پر ہیں۔ یہاں اس کے پانچ کرایہ دار ہیں، وہ سب ہمیشہ پاک  
 رہتے ہیں۔ زلیخا انہیں پہلے ہی سختی سے تاکید کر دیتی ہے۔ ایک کرایہ دار اس کے  
 نام کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ ایک رات وہ شراب پی کر مکان میں آیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ زلیخا  
 پاک درج اسے نہیں دیکھ رہی ہے جیسے ہی اس نے دلیز کے اندر قدم رکھا، اسے ابکائی  
 تو وہ لوٹ کر گرا اور خون کی تہ کرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہو گیا۔

مرنے والے کی بیوی کا بیان ہے کہ وہ مرنے کے بعد اس دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا  
 کے پیچھے زلیخا رہتی ہے۔ وہ تڑپ رہا تھا اور ہکلاتے ہوئے معافی مانگ رہا تھا مگر بہت  
 ہو چکی تھی۔ اسے اچانک خون کی ایک تہ ہوئی اور وہ مر گیا۔

دیکھو بالے بھائی! راتوں کو ہم بھی نشہ کرتے ہیں اپنی عادت سے مجبور ہیں مگر ہم  
 نکلے کے قریب یا اس کے مکان کے دروازے پر نہیں جاتے۔ وہی کبھی میراں ہو کر ہمارے  
 باب آتا ہے اور ہمیں نیا کی شیرینی دے کر چلی جاتی ہے، وہ بڑی کرموں والی ہے جس روز  
 وہاں پر آجاتی ہے میری آمدنی بڑھ جاتی ہے وہ سدا سا گن ہے جس کنواری کے سر پر  
 نور کھڑی ہے وہ کچھ ہی دنوں میں سسگن بن جاتی ہے۔

زلیخا کہ گئی ہے تمام باتیں تمہیں سمجھا دوں۔ سمجھانے کے بعد بھی تم نے جھوٹ کہا

سے دیکھتے ہیں۔ وہ ایک مکان سے نکل کر اپنے مکان کی طرف جارہی تھی۔ ایک  
 نے اسے آواز دی۔

”زلیخا! مجھے بھی دو دانے دیتی جا۔۔۔!“  
 اس کے قدم رک گئے۔ اس نے نوجوان کی طرف دیکھا۔ پھر مجھے دیکھ کر زرا  
 لگی۔ دوسرے نوجوان نے کہا۔ تیرے انچل میں بڑی برکت ہے۔ شیرینی بھی ختم  
 لا ہمیں بھی دے دے۔ وہ ان کی جانب آہستہ آہستہ سر جھکا کر بڑھنے لگی۔ مجھے بول  
 میری طرف آ رہی ہے۔ یہ اچھا موقع تھا میں اسے سناٹا چاہتا تھا کہ میں اس کے قریب  
 چاہتا ہوں میرا ارادہ وہاں سے واپس جانے کا نہیں ہے۔ جب وہ قریب آکر ان  
 میں شیرینی تقسیم کرنے لگی تو میں نے پان والے سے کہا۔

”بھائی صاحب! میں کرائے پر ایک مکان تلاش کر رہا ہوں۔ کیا اس محلے میں  
 ہے؟“

”تمہارے ماں باپ اور بیوی بچے ہیں؟“ دکاندار نے پوچھا ”نہیں میں اس  
 بالکل تنہا ہوں۔“ زلیخا کی نظریں میری جانب اٹھ گئیں۔ دکاندار نے جواب دیا  
 مشکل ہے اکیلے آدمی کو بڑی مشکل سے کوئی مکان دیتا ہے۔ کیوں زلیخا! میں ٹھیک کر  
 تا۔“

یہ بات بھی عجیب سی تھی کہ مکان کے سلسلے میں بھی اس لڑکی کی رائے پوچھی  
 تھی۔ مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ حقیقتاً ایک محترم ہستی ہے۔  
 وہ سر جھکا کر مجھ سے نظریں چراتی ہوئی پان والے کے پاس آئی اور شیرینی  
 دانے اس کی طرف برسھاتے ہوئے بولی۔

”نکلے! اس سے پوچھ گیا یہ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتا ہے؟“  
 پان والے نے مجھ سے پوچھا۔ میں ذرا جھجکے لگا۔ مجھے بچپن سے کسی نے نماز  
 کی تعلیم نہیں دی تھی۔ وہاں زلیخا کے ذریعے مذہبی احکامات پر عمل کرنے والے  
 مل سکتا تھا۔ اگر انکار کر دیتا تو اس کے قریب رہنے کا موقعہ ہاتھ سے نکل جاتا۔  
 جھوٹ کا سارا لیا۔

”جی ہاں! میں نماز پڑھتا ہوں۔“

اور اسے دھوکا دینے کی کوشش کی تو حمیس توبہ کی مسلت بھی نہیں ملے گی اور ناک انجام کو پہنچ جاوے۔

نکے پان والا سمجھا رہا تھا اور میں سمجھ رہا تھا مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ اس روحانی پہلو سے زیادہ میں اس کے روحانی پہلو کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ مجبور تھا۔

میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے اتنی آسانی سے وہاں مکان مل جائے گا۔ سمجھتا ہوں کہ تقدیر مجھے ایک بڑے اور بہت اہم تجربے سے دوچار کرنا چاہتی تھی مجھے وہاں لایا گیا تھا۔ ہر حال اس وقت میں اپنے آپ کو بہت ہی خوش نصیب سمجھ رہا تھا۔ آنگن میں دو دروازے تھے ایک دروازہ باہر کی طرف جو فی الحال بند تھا اور میری سب سے پہلی کوشش یہی تھی کہ وہ میرے دل کی نگاہوں کے سامنے کھل جائے۔ کچھ اور بھی کوششیں تھیں ایک تو پاک منہ کوشش دوسرے نماز کی پابندی۔ کوئی دنیاوی دولت حاصل کرنے کے لیے جنت حاصل کرنے کے لیے نماز پڑھتا ہے، میں زلیخا کو خدا سے مانگنے کے لیے تھا اس کی ابتدا ایک جھوٹ سے ہوئی تھی مگر رفتہ رفتہ مجھے نماز میں ایک بار سرور سامعوس ہونے لگا جس سے پہلے میں نا آشنا تھا۔

جب میں مسجد کے دوران اس کون و مکان کی عظمت کا اعتراف کرنا میرے دل اور دماغ کے کسی گوشے میں دنیاوی لالچ کی ہلکی سی رمت بھی نہ ہوتی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا تو اس دینے والے سے ایک ہی چیز مانگتا۔ زلیخا زلیخا اور زلیخا اور زلیخا کے آنگن میں وہ دروازہ کھلنے لگا کبھی اس کی بوڑھی ماں مذہب شیرینی لے کر آتی کبھی میں ایسے ہی چیزیں لے کر ان کے ہاں پہنچ جاتا۔ کبھی پاس نظر آتی اور کبھی کمرے میں بیٹھی کپڑے سلائی کرتی رہتی۔ اپنے ہوں باپ سے باتیں کرتی تھی ایک مجھ سے ہی ذرا کتراتا تھی۔ دو ماہ کا عرصہ گزرنے کے اسی طرح چور نظروں سے مجھے دیکھتی تھی کہ کہیں میں اسے دیکھ تو نہیں رہا ہوں اب تک ناراضگی ظاہر نہیں کی تھی اور نہ میری بیٹھی نظروں کا خاطر خواہ جواب اس دوران مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ سہاگن نہیں ہے۔ اس روز

میں نے ان والے نے نہ جانے کیوں اسے سہاگن کہہ دیا تھا میں نے کوئی ایسا مرد یا اپنا بی نہیں دیکھا جو وہاں خاندان کے رشتے سے زلیخا کے ساتھ رہتا ہو۔ وہاں عورتوں کے دو قانون تھے مرد آتے تھے مگر کوئی منہ بولا چچا تھا کوئی ماموں اور کوئی چھوچھا تھا۔ سب اس سامنے سر جھکا کر بیٹھے تھے رفتہ رفتہ میں سمجھنے لگا کہ وہ کیوں آتے ہیں؟ وہاں آنے والے بوڑھے عقیدے کے لوگ تھے۔ زلیخا کو کوئی آسانی ہستی سمجھتے تھے انسان کے روپ میں آئی ہے ان کا عقیدہ تھا کہ وہ ایک پاک روح ہے اس دنیا کا کوئی بھید ماحے چھاپا ہوا نہیں ہے اس لیے ایک صاحب اس سے نمبر پوچھتے آتے تھے (نئے کا نمبر) بڑے صاحب محلے کا چیرمین بننے کے لیے انکیشن لڑنے والے تھے انہیں یقین تھا کہ زلیخا ایک اشارے پر تمام محلے کے لوگ انہیں ووٹ دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ ایک اور ان زمینوں کے مقدمے میں تین سال سے الجھے ہوئے تھے اور اب زلیخا کی دعاؤں کے مندرجہ ذیل کے آثار پیدا ہو گئے تھے کوئی اولاد کے لیے آتایا آتی تھی کوئی شادی بیاہ لے لے کوئی خاندان کی شکایت لے کر اور کوئی بیوی کی شکایت لے کر آتا تھا غرضیکہ سب ہی کوئی بڑی ضرورتوں کے لیے زلیخا کے سامنے زانو تہ کرتے تھے۔

مجھے اس روحان پان سی معصوم صورت لڑکی میں کوئی روحانی قوت یا خاصیت نظر نہیں آتی تھی البتہ یہ خاصیت تھی کہ وہ حد درجہ حسین تھی لوگ دنیا جہاں کی آرزوئیں لے کر لے پاس آتے تھے اور میں اس کی آرزو میں بیٹھا ہوا تھا۔

بچہ میرا بار میری چاہت کچھ اثر دکھانے لگی ایک شام میں گھر واپس آیا تو میرے کمرے کے دروازے کے بعد آنگن کی رسی پر سوکھ رہے تھے۔ اس کی بوڑھی ماں نے بتایا کہ وہ زلیخا کے زانو تہ دھوئے ہیں۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔

”مجھے آج معلوم ہوا کہ زلیخا میرا انتہا خیال رکھتی ہے۔“

بوڑھی مائی نے مسکرا کر کہا۔

”میری بیٹی کو مصافی کا بڑا خیال رہتا ہے۔ پہلے تو میں تمہارے کمرے کی مصافی کیا کرتی تھی اب مجھ سے بار بار اٹھنا بیٹھنا نہیں ہوتا۔ وہی جھاڑو دیتی ہے، فرش کو دھوتی ہے اور تمہارے کمرے کو جھانکا کر رکھتی ہے۔“

میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ میں بوڑھی مائی سے باتیں کرتا ہوا اس کے آنگن میں

آیا تاکہ شکریہ ادا کرنے کے بہانے اس سے باتیں کرنے کا سلسلہ بھی شروع کر دے۔  
آنگن میں جتنا نہیں تھی اس کے پاس دو خسرے بیٹھے ہوئے اپنا دکھڑا رو رہے تھے۔  
رہا تھا۔

”اے بی بی! ہم بھی انسان ہیں ہم بھی مسلمان ہیں۔ مزاروں پر جاتے ہیں بیاہ کے موقعوں پر ہاتھ دیتے ہیں دوسروں کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں دیکھو میں کوئی شریک نہیں ہوتا۔ مذہبی معاملات میں کوئی ہمیں مسلمان نہیں اگر ہم مر جائیں تو۔۔۔“

وہ کہتے کہتے مجھے دیکھ کر رک گیا پھر مسکرا کر ہاتھ چماتے ہوئے بولا ”اے بڑے نصیب والے ہو۔ سدا سہاگن کے سامنے میں رہتے ہو۔ تم سے ہزاروں بار زیادہ ہیں۔“

سدا سہاگن کے الفاظ سن کر میں پھر الجھ گیا۔ میں اس سلسلے میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا واقعی سہاگن نکلی تو میری چاہت کا کیا بنے گا؟ میں خود کو قریب دینا چاہتا تھا کہ ہے۔ اس لیے میں نے کچھ پوچھنے کے بجائے مسکرا کر کہا۔

”زلیخا! میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔ آج مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم کپڑے دھوئے ہیں اور ہمیشہ میرے کمرے کی صفائی کیا کرتی ہو۔“

وہ جواب دینے کے بجائے اپنے سینے پر دوپٹے کی تہہ بٹانے لگی۔ اس اوڑھنے کا انداز دوسری لڑکیوں سے قدرے مختلف تھا۔ دوپٹے بھی تقریباً عین گرد ہوتا تھا۔ ایک بڑی سی چادر کی طرح اسے اوڑھ رہی تھی۔ گردن کے نیچے تھیں ہوتیں کہ سینے کی شادابیاں اس میں چھپ کر رہ جاتی تھیں۔

اگر یہ گناہ ہے تو میں اس گناہ کا اعتراف کرتا ہوں کہ اس کے حسن سے میری نگاہیں چوری چوری دور دور سے اس کے جسم کو ٹٹولتی تھیں یہ مقصود ہلچلنے کا ایک عام قاعدہ ہے کہ پہلے نگاہیں وہاں تک پہنچتی ہیں اسے چھوتی ہیں اور اسے اچھی طرح سمجھ کر اس شاہکار پر عاشق ہوتی ہیں۔ اگر میں ایسا کرنا عجیب، انوکھی اور نئی بات نہیں تھی۔ ویسے یہ میری ناکامی تھی کہ میں نے اس سے باہر سانسوں کی ابھرتی ہوئی شادابیوں کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہ میری نگاہوں سے

لے آئے تھے مگر اور جلدی سے کمرے کے اندر جانے لگی۔  
میں نے غلط موقع پر شکریہ ادا کیا تھا۔ مجھے اس کے لیے تنہائی کا موقع تلاش کرنا پڑا تھا۔ ہر حال غلطی ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ وہ میرے کمرے سے دلچسپی لے کر راجدھانی بھاری ہے لہذا اب اگر تنہائی نصیب ہوئی تو میں اسے باتیں کرنے پر مجبور کر دوں گا۔

یہ سوچ کر رہا رہا نہ لگا۔ اسی وقت اس کی رس بھری آواز سنائی دی ”سنئے!“  
میرے قدم رک گئے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا وہ اپنے کمرے کے دروازے سے لگی تھی۔ مجھ سے نظریں ملتے ہی سر جھکا کر بولی۔

”آپ میری ایک بات مانیں گے؟“  
ہائے! پہلی بار وہ مجھے مخاطب کر رہی تھی، التجا کر رہی تھی، میں نے خوش ہو کر آگے بڑھے۔ ”کیا؟“

میرے کہنے کے انداز میں ایسی اپناہیت تھی کہ وہ ذرا سمٹ گئی۔ دروازے سے کچھ اور لگتی پھر نکلتے ہوئے بولی۔

”ممدو چاچا کی ایک عزیزہ فوت ہو گئی ہے۔ کیا آپ کا نندا دینے جاسکتے ہیں؟“  
میں ایک نئی امید ایک نئی زندگی کی آس میں آگے بڑھا تھا اور وہ مجھے کسی کی موت کی رناری تھی۔ جو کچھ بھی تھا اس نے پہلی بار التجا کی تھی میں اس کی التجا پر ایک نہیں ہزار اذول کا نندا دے سکتا تھا اس لیے ممدو چاچا کا پتہ پوچھ کر محل پورے کی طرف چلا آیا۔

مجھے کسی ممدو چاچا سے دلچسپی نہیں تھی لیکن زلیخا کی اس التجا کا میری کمائی سے گہرا تعلق ہے لہذا وہاں میں نے جو کچھ دیکھا وہ مختصر طور سے بیان کرتا ہوں۔ میں اپنے محلے کے والے والے جیڑمین کا ذکر کر چکا ہوں وہاں اس جیڑمین کے دو ملازم نظر آئے اور وہ صاحب کی نو زلیخا سے ملے گا نمبر پوچھنے آتے تھے۔ ان کے علاوہ زلیخا کے پاس آنے والے دو چار قیدت مند اور بھی نظر آئے۔ ممدو چاچا کے متعلق اتنا معلوم ہوا کہ انہوں نے پچھلے ہی بول محل پورہ کے اس محلے میں وہ چھوٹا سا مکان کرائے پر لیا تھا۔ ان کی بیوی اسپتال میں باہر تھی۔ پچھلی رات انتقال ہو گیا تھا اور وہ اسپتال سے اس مکان میں لائی گئی تھی۔ ممدو



جائے کاراستہ نہ ملا تو وہ منہ پھیر کر اپنے آپ کو دوپٹے میں چھپانے لگی۔  
میں نے آگے بڑھ کر ذرا نرمی سے پوچھا ”نہ لٹھا! کیا تم مجھ سے ڈرتی ہو؟“

وہ خاموش رہی۔ میں ذرا اور قریب چلا گیا۔

”ایک عرصہ گزر گیا ہے نہ لٹھا! میں خاموشی سے تمہیں دیکھ چکا ہوں۔ میں نے آج تک زبان نہیں ہلائی۔ کیا اب تک تمہیں میری شرافت کا یقین نہیں ہوا ہے؟ تمہارے اس طرح منہ پھیر لینے کو میں کیا سمجھوں۔ خوف یا نفرت؟“

وہ سر ہٹا کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

”تم کیوں رو رہی ہو؟ مجھے بتاؤ، مجھے اپنا کچھ کرناؤ، میں۔ میں تمہیں دل و جان سے پہچانتا ہوں۔ میں تمہارے لیے یہاں آیا ہوں۔ تمہارے لیے یہاں رہتا ہوں۔ جب تک یہی سانس چلتی رہے گی، میں تمہاری آس لگائے یہاں بیٹھا رہوں گا مجھے اپنی محبت کا مارا دو نہ لٹھا!“

وہ فرش پر ایسے بیٹھ گئی جیسے نہ بیٹھتی تو گر پڑتی۔ پھر منہ کے پائے سے لگ کر نفی میں ہلاتی ہوئی بولی۔

”نہیں، نہیں۔ آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میں۔ میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔“  
”کیسی باتیں کرتی ہو۔ تم کس قابل ہو۔ یہ میرا دل جانتا ہے کیا تم میری محبت، میری پرانی کو نہیں سمجھتی ہو؟“

میں نے اس کے قریب دو زانو ہو کر اس کے بازوؤں کو بڑی محبت سے تھام لیا۔ وہ بولے کسمانے لگی۔

”مجھے چھوڑ دیجئے، مجھے ہاتھ مت لگائیے۔ میں ساکن ہوں۔“

میری امیدیں مرجھانے لگیں۔ میں نے دل برداشتہ ہو کر پوچھا ”کون ہے تمہارا خاوند؟ میں نے تو کبھی اسے نہیں دیکھا۔“

اس نے ایک سرد آہ بھری۔ میں نے سمجھا کہ وہ جواب دینے والی ہے مگر وہ دل سے نکلنے والی آہ کے بعد خاموش ہو گئی اور ڈوپٹے سے اپنے چہرے کو چھپانے لگی۔

جس ہاتھ سے دوپٹے کو تھام کر وہ پردہ کر رہی تھی میں نے اس ہاتھ کو تھام لیا، التجا کی ٹھٹھ سے منہ نہ چھپاؤ نہ لٹھا! میرے سوال کا جواب دو۔ کون ہے تمہارا خاوند؟“

چاچا محلے والوں سے کہہ رہے تھے کہ وہ مکان ان کے لیے منحوس ثابت ہوا ہے لہذا کی تجیزو بھگتین کے بعد وہ اس مکان کو چھوڑ دیں گے۔

میں نے ان سے ہمدردی ظاہر کی۔ جنازے کے ساتھ قبرستان تک گیا اس جنازہ ادا کی اور اسے دفنانے کے بعد جب اپنے محلے میں واپس آیا تو رات کے گیارہ بجے تھے۔ آس پاس کے تمام مکانوں پر فینڈ کی خاموشی مسلط ہو گئی تھی۔ مگلی کاراستہ بھی ہو گیا تھا۔ محلے پان والے کی دکان بھی بظاہر بند ہو چکی تھی مگر دکان کا پچھلا دروازہ کھلا تھا۔ تین ماہ کے عرصے میں مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ نکلے غیر قانونی طور سے جس دن دن ہو یا رات نشہ کرنے والے دکان کی پچھلی طرف سے آتے تھے اور کھرے دام چرس کی گولیاں لے جاتے تھے۔

ایک نکلے ہی اکیلا مجرم نہیں تھا۔ دن کی روشنی میں جائز کاروبار کرنے والے لوگ منافع کی شرح بڑھانے کے لیے ناجائز کاروبار کا ایک پچھلا دروازہ ضرور بناتے ہیں اس دکان سے کتھر اکرائے دروازے پر آگیا۔ آلا کھول کر میں نے دروازے کے پٹوں کو آہستگی سے داکیا۔ آنگن سے پرے میرے کمرے میں روشنی نظر آئی کمرے کی ایک دیوار پر اس کا سایہ سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔

اس کا سایہ جسے میں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میں نے دروازے کو آہستگی سے بند کیا۔ پاؤں آنگن سے گزرتا ہوا اپنے دروازے پر آگیا۔

وہ میری منہ کی سرے پر میرے نکیلے کو دونوں بانسوں میں لیے اے بنے۔ ہوئے سر جھکائے بیٹھی تھی اور رو رہی تھی۔

مجھے اس کی آمد سے جتنی خوشی ہوئی تھی اس کے آنسو دیکھ کر اتنی ہی حیران کہ وہ کیوں رو رہی ہے؟

”نہ لٹھا!“

میری ہلکی سی میٹھی آواز اس کے لیے دھماکہ ثابت ہوئی۔ وہ یکبارگی اچھل ہو گئی، اس کے چہرے پر ایسی پریشانی اور گھبراہٹ تھی جیسے چوری کرتی ہوئی پکڑا فرار ہونے کے راستے پر میں کھڑا ہوا تھا ورنہ وہ پلک جھپکتے ہی وہاں سے بھاگ جا

رہا بچلا ہوا تھا۔ اس اندھیرے میں اس کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اپنی فتنی پروردی تھی کہ وہ عورت ہو کر بھی عورت نہیں تھی۔ وہ کسی کی بسن، بیٹی بھانجی اور بیٹی بن سکتی تھی لیکن قدرت نے اسے ان خزانوں سے محروم رکھا تھا جنہیں پاکر عورت کی فتنی ہے اور پھر اس فتنی ہے۔

میں قسمت کی آڑھی ترچھی لکیروں پر چلا ہوا اس عجیب مخلوق تک پہنچ گیا تھا اور اب اس کے حسن اور اس کے سبب بدن کی فزاکتوں سے متاثر ہو رہا تھا بلکہ یوں کہتا ہے کہ اس سے محبت کرنے اور اس کے تمام دکھوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لینے کی لذت سے زیادہ شدید ہو گئی تھی۔

میں بڑی آہستگی سے ذرا اس کے قریب کھسک آیا اور اپنی دونوں ہتھیلیوں میں اس حسین کھڑے کو سجا کر بولا۔

”لیٹا! میں یہ سوچتا نہیں چاہتا کہ تم کون ہو؟ اور کیسی ہو؟ میں تم سے محبت کرتا ہوں کر کرتا ہوں گا۔ مجھ سے تمہارے آنسو نہیں دیکھے جاتے۔ چپ ہو جاؤ میری جان۔ لی آرزو۔ میری زندگی۔“

میں نے محبت کے جذلوں سے مغلوب ہو کر اسے سینے سے لگالیا۔ وہ میرے بازوؤں کے حصار میں ایک سہمے ہوئے پنچھی کی طرح کانپنے لگی اور بڑی کمزوری سے احتجاج کرنے لگا۔

”چھوڑ دیجئے! اللہ! مجھے چھوڑ دیجئے! یہ اچھی بات نہیں ہے میں میرا دل گھبرا رہا ہے سدا ساگن ہوں مجھے چھوڑ دیجئے۔“

”تم پہلے سداگن نہیں تھیں مگر اب میرے نام سے سداگن ہو گئی۔ کیا تمہارا جی نہیں جاتا کہ کوئی تمہیں چاہے تم سے بے انتہا محبت کرے۔“

میرے بازوؤں کی قید میں اس کی سرد آہ سرسرائی، اس کے دونوں ہاتھ آہستگی سے رزے ہوئے میری پشت پر آئے۔ وہ میرے سینے سے لگی ہوئی تھی کچھ اور لگ گئی۔ میری غرض میں جذب ہو جانے کی خاموش آواز اس نے ظاہر کر دیا کہ اسے چاہے جانے کی رز ہے۔ انسان کوئی بھی ہو۔ مرد ہو، عورت ہو یا زلیخا ہو۔ سب کی یہی آرزو ہوتی ہے کہ ایک ایسی ہستی کی منفرد محبت اسے ملے ایسی محبت کہ کوئی دوسرا اس میں شریک نہ ہو۔ اس

وہ نفی میں سرملانے لگی ”کوئی نہیں، کوئی نہیں۔ میں کسی خاندان کے حلقہ سے سوچ بھی نہیں سکتی۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں؟ میں سدا ساگن ہوں۔“

”عجب ہے۔ یہ بھی کمتی ہو خاندان نہیں ہے۔ یہ بھی کمتی ہو کہ سداگن ہو۔ کیا یہ اپنی باتیں نہیں ہیں؟“

اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ وہ تھر تھراتے ہوئے لمبے میں بولی ”اللہ! آپ کو کیسے سمجھاؤں۔ آپ سدا ساگن کا مطلب نہیں سمجھتے ہیں۔ میں آپ کو سمجھاؤں؟“

اس نے اپنا ہاتھ میری گرفت سے چھڑالیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرہ ڈھانپ کر اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”میں پیدا انٹی سداگن ہوں۔“ اس کی آواز آنسوؤں اور ہچکیوں میں ڈوبنے لگی۔ خدا کی ایک عجیب تخلیق ہوں۔ جب میں پیدا ہوئی تو میرے ماں باپ بھی مجھے نہ پہچان کہ میں مرد ہوں یا عورت۔ بعد میں انہیں پتہ چلا کہ اس دنیا میں کبھی مجھ جیسی نہ بھی پیدا ہوتی ہیں جن کی صحیح تشخیص نہیں ہوتی چونکہ ان میں عورتوں کی خصوصیات ہوتی ہیں اس لیے انہیں واضح طور سے عورت کہنے کی بجائے سدا ساگن کہا ہے۔“

میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس وقت میں کتنی حیرانی سے اور کیسی بے فہمی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنا حیرت انگیز انکشاف تھا کہ کچھ دیر کے لیے میری قوت گفتار ختم تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہا تھا وہ عورت نہیں تھی مگر عورت تھی۔ اور جتنے خسروں سے بالکل مختلف تھی جو اس دنیا میں آنے کے بعد مرد سے عورت بننے، مرد کی تبدیل کرتے ہیں اور عورت کی ایک نقل بن کر نہ ادھر کے رہتے ہیں نہ ادھر زلیخا ان سے مختلف تھیں اس کی جسمانی ساخت، شاعرانہ نزاکت، بدن کی ریشمی ملامت، حیران حیران سی سیاہ آنکھیں، ستواں ناک اور پتلے خمیدہ رُس بھرے ہونٹ۔ یہ زبان بے زبانی سے کہہ رہے تھے کہ قدرت نے اسے ایک حسین سانچے میں ڈھالا۔ عورت کے درمیان رکھ کر ایک ادھوری تخلیق کے طور پر اس دنیا میں بھیج دیا تھا۔ میرے کمرے میں سو کیٹنڈل پادر کا بلب روشن تھا لیکن آنکھوں کے سامنے

ہو رہی دل میرا بھلا نہ سکے گی۔

ایسی صورت میں یہ بڑی سخت آزمائش تھی کہ میرا پیار کتنا پائیدار ہے اور میں کب ل کی غرض یا لالچ کے بغیر اس کی قربت کے کشن مرحلوں سے گزر رہوں گا؟

اسے پاک روح اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہ انسانی ہوس کی غلاظتوں سے وابستہ نہیں کی سکتی تھی کہ کسی کنواری کی سر پر ہاتھ رکھتی تو ساگن بن جاتی۔ حقیقت کچھ اور تھی کہ وہ اس دنیا کی آلودگیوں سے پاک تھی اس لیے اسے جاننے والے ایک جبرک اور نرم ہستی مانتے تھے۔

وہ سدا سناگن لڑکی اور لڑکے والوں کے ہاں جا کر کہہ دیتی کہ میرے دل میں یہ بات نہی ہے یا میں نے خواب دیکھا ہے کہ فلاں لڑکی اور فلاں لڑکے کا رشتہ ہو جانا چاہیے تو یوں خاندانوں کے بزرگ اس کی بات تسلیم کر لیتے تھے۔

دلگانے مجھے بتایا کہ ایک آٹھ بار اسے ناگامی ہوئی ورنہ عقیدت مند ایسے تھے کہ اس بات نہیں مانتے تھے یہی وجہ تھی کہ صرف بوڑھے ہی نہیں جوان لڑکیاں اور لڑکے بھی ان کے احسان مند تھے۔ اسے دعائیں دیتے تھے اور ہمیشہ اس کی عزت کرتے تھے۔ اسی نے شورے پر لوگوں نے حاجی خدابخش کو دوٹوے کر محلے کا چتر بن بنادیا تھا۔ ایک بار ان نے موسیٰ بھائی سے پانچ وقت کی نمازیں پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ اتفاق سے شے کے لیل میں وہ پانچ نمبر لگ گیا، اس دن سے موسیٰ بھائی پانچ وقت کی نماز پڑھنے لگا تھا۔ اشرہ انسان مطلب کا بندہ ہے مطلب برابری کے لیے ہی بندگی پر مائل ہوتا ہے اور وہ جو شرب پینے کے بعد خون کی تے کر کے اس جہاں سے رخصت ہو گیا تھا تو بے چاری دلگانے نے اسے بدعنائیں دی تھیں۔ شراب میں ملاوٹ کرنے والوں سے کوئی غلطی ہو گئی تھی۔ وہ ایک بدعمری سادی سی لڑکی تھی۔ اس کی معصومیت اور خدمت خلق کے جذبے نے اسے لوگوں کی نظروں میں محترم پاک روح پر اسرار ہستی اور نہ جانے کیا کچھ بنادیا تھا۔ میری غلوں میں صرف اس محبت کی اہمیت تھی جو صرف میرے لیے تھی۔

تقریباً چار ماہ کا عرصہ گزر گیا تو وہ محبت آہستہ آہستہ ٹھنڈے لگی اگر مجھوں اور فرہاد بھی اتنے بڑے اپنی لالی اور شیریں کے ساتھ راتیں گزارتے اور صبح اپنی محبوبوں کو بغیر پڑھے ایک کوئی کتاب کی طرح بند رکھتے تو میری طرح ذہنی غلبان اور اعصابی بے چینی میں مبتلا

کے محبوب کا تمام پیار اور تمام توجہ اسے حاصل ہو۔ خصوصاً عورت اپنی فطرت بنا ہوتی ہے محبت کو بھی ایک جائیداد بنا کر اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہتی ہے۔

وہ بھی ایک جائیداد تھی جسے میں نے بڑے انتظار کے بعد پایا تھا۔ ہم دونوں دوسرے کے مطلوب اور مقصود تھے میں اسے ادھر ادھر سے سمیٹ رہا تھا وہ بھی خاموشی سے مجھ میں جذب ہوتی جا رہی تھی۔ میں اس کی خاموشی کو توڑنا چاہتا تھا اور جبکہ اور بے نام سے خوف کو دور کرنا چاہتا تھا اس لیے پیار بھری سرگوشیوں میں یقین دل رہا تھا۔

میں تمہارا ہوں دل کی گمراہیوں سے تمہیں چاہتا ہوں، تم اپنی زندگی کی آخری تک مجھے محسوس کرو اور سوچو اور یقین کرو کہ میں ہی تمہارا محافظ ہوں۔ میرا ادھوری ہو، بے سارا ہو تم میرا سارا لے کر ہی مجھے اپنا کر ہی اپنی تکمیل کو پہنچاؤ۔

میں اسے سمجھا رہا تھا میری سانسوں کی سرگوشیاں اس کے لبوں پر چلتی بن کے رخساروں پر تر پڑتی رہیں، اس کے کانوں میں گنگنائی رہیں اور صبح گروں کے پھل پھسلتی رہیں اس پر ایک سحر سا طاری ہو رہا تھا۔ اسے ایسی محبت اور ایسی آغوش ہو رہی تھی جس کی وہ توقع نہیں کر سکتی تھی لہذا وہ بڑی اپنائیت سے اپنے آپ کو میرے حوالے کر رہی تھی۔

ایک عورت جب تنہائی میں خود کو اپنے محبوب کے حوالے کرتی ہے تو اسے بد مقاصد بڑی دور تک جاتے ہیں۔ میں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ دلگانے جہاں خود کو میرے حوالے کر رہی تھی اس میں کسی بڑے ارادے کا دخل نہیں تھا۔ وہ ایسی ادھوری تخلیق تھی کہ اس کے وجود کے کسی حصے میں گناہ کا کوئی دروازہ نہیں تھا اسے دیکھ سکتا تھا، اس سے محبت کر سکتا تھا، اسے آغوش میں لے کر دھڑکنوں سے لگا سکتا تھا اور اسے چوم سکتا تھا اور بس اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ وہ سدا سناگن تھی۔ اس دنیا کا کوئی مرد اس کے ساتھ ساگ کا سفر نہیں کر سکتا۔ میرے نصیب سے مجھے ایسی محبوب ملی تھی جسے میں صرف ایک تصویر کی رکھ سکتا تھا اسے ہانہوں کے ہار پنا سکتا تھا لیکن کبھی یہ شکایت زبان پر نہیں

اس رات میں اپنے کمرے میں آیا تو مجھے لگا لگا سا بخار تھا ایسے بخار کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ یہ تو پھر بھی چڑھتا اترتا رہتا ہے مگر میں اندر ہی اندر جس بخار میں جھنک رہا ہوں اب ناقابل برداشت ہو چلا تھا۔ تمام دن اس انتظار میں گزارا کہ رات آئے گی تو وہ برے کمرے میں آئے گی۔ جب رات آئی تو مجھ پر ایک عجیب سی گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ اب آنکاش کا وقت آ رہا ہے، صبح تک مجھے بے لوث محبت کا مظاہرہ کرنا ہو گا۔ وہ اپنے خوں سے تیار کیا ہوا سالن لے کر آئے گی، میرے ساتھ بیٹھ کر کھائے گی، میں بستر لیٹ اٹوں گا تو وہ میرے ہاتھ پاؤں دباے گی۔ مجھ سے ٹھنڈے ٹھنڈے موضوعات پر گفتگو کرے گی میں اسے آغوش میں لوں گا، وہ انکار نہیں کرے گی میں اسے پیار کروں گا، وہ ٹرائے گی، میں اپنے جذبات کا اظہار کروں گا، وہ گھبرائے گی میں ضد کروں گا، وہ دامن ہار کر نکل جائے گی۔

بسی ہی روز کا معمول تھا۔ میں محبت کی اس محدود یکسانیت سے بے زار ہو گیا تھا۔ وہ جی تھی کہ اسے دیکھ کر بغیر قرار بھی نہیں آتا تھا۔ اس سے دور رہ کر سکون نہیں ملتا تھا لہذا میں اپنے صبر کو آزما رہا تھا۔ کبھی ایسا ہو کہ میں نیند کا بہانہ کر کے آنکھیں بند کر لیتا تاکہ وقت مختصر ہو جائے۔ کبھی اس سے ناراض ہو کر کوٹ بدل لیتا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح ناپیار بھری اداؤں سے میری ناراضگی دور کر دیتی تھی۔

اس رات وہ آئی تو میں ان پر اسرار جنازوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ میں نے اس سے چھا "یہ تمہارے کیسے رشتے دار ہیں جن کی گھر والیاں کہیں باہر سے وفات پا کر آتی ہیں ران کا جنازہ اٹھانے کے لیے مخصوص لوگ آتے ہیں؟"

وہ میری جانب چند لمحوں تک حیرانی سے دیکھتی رہی پھر اس نے پوچھا "کیا ممانی کی گھر میں نہیں تھی؟"

"گھر میں تھی، ہو سکتا ہے کہ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے کہیں سے لائی گئی ہو۔ پچھلی رات ہو چکا ہے اس لیے مجھے یقین ہے کہ احمد دین کی بیوی کی لاش بھی کہیں سے لائی گئی ہے۔"

ممانی اسے صدمہ چاچا اور موسیٰ بھائی کے ہاں ہونے والی میت کے متعلق بتانے لگا۔ یہی باتیں سن کر وہ پریشان ہو گئی تھی کسی قدر گھبرا گئی تھی۔ وہ سر جھکا کر کچھ دیر سوچتی رہی

ہو جاتے یا پھر بہت مجبور ہو کر ان کو ری کتابوں میں اپنی ہوس کی داستان لکھ کر دیتا لیکن وہ اس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ انہوں نے وصال سے زیادہ بھری گھبراہٹ نہیں اور میں وصال میں بھر کے صدمے سے رہا تھا۔

اب تک میں حوصلے اور ضبط سے کام لے رہا تھا اور خود کو سمجھا رہا تھا کہ بڑا لوث اور بغیر کسی لالچ کے بھی کی جاسکتی ہے یا پھر میں دوسرے مسائل میں اپنی الجھا کر بسلا رہا تھا۔ اس دوران میں پھر لڑکھا کی التجا پر دوبارہ ایسے جنازوں کا کوڑا مارا جن سے میں واقف نہیں تھا۔ صدمہ چاچا کا ذکر میں کر چکا ہوں، دوسری بار موسیٰ بھائی ہاں میت رکھی تھی۔ وہ کراچی کے رہنے والے تھے۔ سال بھر میں لاہور کے کی پاب تھے، "اچھرے میں ایک چھوٹا سا مکان خرید رکھا تھا۔ اس بار انہوں نے اپنے بڑے بتایا تھا کہ ان کی بیوی آج رات کی ٹرین سے لاہور آ رہی ہے لیکن آدھی رات کی بیوی اپنے پیروں سے چل کر نہیں آئی چار آدمی اس کی لاش لے کر آئے۔

اس لاش کو وہی لوگ لے کر آئے جو صدمہ چاچا کی مرحومہ کو اسپتال سے لے کر آئے تھے۔ اس لاش کو اسی بوڑھی عورت نے غسل دیا جو صدمہ چاچا کی بیوی کو غسل دے چکی تھی۔ اگر وہ غسل پورے کی غسل تھی تو تقریباً آٹھ میل دور اچھرے میں آنے والی لاش دینے کیوں آئی تھی؟ لاشوں کو لانے والے وہ مخصوص لوگ کون تھے؟

یہ سوالات میرے ذہن میں اس وقت پیدا ہوئے جب تیسری بار لڑکھا کے اس کے منہ بولے ماموں احمد دین کے ہاں جنازہ اٹھانے گیا۔ اس بار لاش کھانا نہیں آئی تھی۔

احمد دین کرشن مگر میں پچھلے دو سال سے اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا اور انہیں سخت پردے میں رکھتا تھا پردوں کی چند عورتوں نے ایک آدھ بار اس بیگم صاحبہ دیکھی تھی۔ بیگم بڑی تک چڑھی اور مغرور تھی اس لیے محلے کی عورتوں سے دور ہو سکی۔ احمد دین کا مزاج بھی کچھ ایسا ہی تھا وہ محلے پردوں والوں سے خود بھی دور رہتی اپنی بیگم کو بھی کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا اسی لیے بیگم کے جنازے کے دو چار آدمی ہی نظر آئے۔ باقی وہی لوگ تھے جنہیں میں صدمہ چاچا اور موسیٰ بھائی دیکھ چکا تھا اور وہ غسلہ بھی میری جانی پہچانی تھی۔

برتنے ہیں مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ میں نے آپ سے کہہ دیا۔

”نہیں زلیخا! میں سمجھتا ہوں کہ کوئی اور بات ہے تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔“

”میں کچھ نہیں چھپا رہی ہوں۔“

”میں جانتا ہوں۔“

”کیا؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ”کیا وہ عورتیں بھی تمہاری طرح سدا ساگن تھیں؟“

وہ ہنسنے لگی۔ بڑی مترنم ہنسی تھی۔ وہ رس بھری گنگنائی ہوئی ہنسی خستہ جذبات کو چھیڑتی تھی۔ پھر وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی پر قابو پاتی ہوئی بولی۔

”آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مجھ جیسی عورتیں ہر دوسرے نمبر کے گھر میں پیدا ہوتی ہیں؟ میں تو ایک تجویہ ہوں اور عجائب الحلو قات ہر جگہ نہیں پائی جاتی۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں لاکھوں کی آبادی میں مجھ جیسی دوچار اور موجود ہوں مگر میں انہیں نہیں جانتی۔ آپ خود ہی سوچئے اگر وہ سدا ساگن ہوتیں تو صدو چار چاکا کی شریک حیات یا داشتائیں نہ بنتیں۔ ہمارے مطلق ایسا سوچنا بھی گناہ ہے۔“

وہ درست کہہ رہی تھی یہ میرا ذاتی تجربہ تھا۔ اگر میں زلیخا کو شریک حیات بنانا چاہتا تو اس کی ماں اور محلے والے کبھی اجازت نہیں دیتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ پاک روح ہے اور پاک روح کسی انسان کی نفسانی خواہشات کا شکار نہیں ہو سکتی۔ میں نے اسے نظر بھر کر دیکھا تو حسن سراپا میرے جذبات کو پکار رہا تھا۔ میں نے مومن بدل کر کہا۔

”تمہارے مطلق سوچنا بھی گناہ نہیں ہے۔ میں تمہیں شریک حیات بنانا چاہتا ہوں مگر تم مجھ سے اس لیے کتراتے ہو کہ ابھی تک ہمارے درمیان وہ گمراہ اور انوثہ رشتہ قائم نہیں ہوا ہے جس کے بعد ہم ایک دوسرے کی ضرورت بن جاتے۔“

”آپ نے پھر وہی باتیں چھیڑ دی۔“ اس نے شکایت کی۔ میں نے اسے بازوؤں میں لپک کر پوچھا ”کیا صرف باتوں سے زندگی گزر جائے گی؟“

اس نے میرے شانے پر سر رکھ کر کہا ”جو میرے اختیار میں ہے اس سے میں انکار

پھر آہستگی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

”میں نہیں کہہ سکتی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے لیکن جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کا بڑے کو سمجھنے والا خدا ہے۔ ہم کسی کو سمجھ کر یا سمجھا کر کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کو اگر کوئی خوشی یا غمی میں بلائے تو ضرور جانا چاہیے۔ مرنے والی چاری کوئی بھی ہو اس نے زندگی اچھی طرح گزار دی ہو یا بری طرح۔ بڑے انسان کا آخری وقت پرانے کاںدھوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ آپ انہیں کاںدھو لے کر لٹکا دیں ہیں اگر آپ کی نیکیاں صرف اچھوں کے لیے ہیں اور بروں کے لیے اتنی نفرت ہے کہ آخری وقت کاںدھ دینا بھی گوارا نہیں ہے تو آئندہ ایسی جگہ نہ جائیں۔ میں لگتی ہوں کہ آپ سے التجا نہیں کروں گی۔“

وہ منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے ناراض ہو گئی ہو۔ میں نے کہا۔

”میں نے تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کیا ہے۔ تم جہاں کوئی میں دانا ہوں مگر میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ تمہارے یہ نام نہاد رشتے دار کوئی سنگین جرم کر رہے ہیں۔“

”نہیں۔ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں وہ مجرم نہیں ہیں۔“

”پھر وہ لاشیں کس کی ہوتی ہیں؟“

”چند گناہ گاروں کی جن کا بوجھ اٹھا کر قبرستان تک جانا کوئی گوارا نہیں کرتا۔“

میں نے تجب سے اسے دیکھا پھر اپنی سمجھ کے مطابق کہا ”اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دھچاچا، موسیٰ بھائی اور احمد دین کی داشتائیں تھیں۔“

”ہاں۔“

زور اور کے لیے اطمینان ہو گیا کہ میں..... سچائی تک پہنچ گیا ہوں۔ پھر میری بات آئی کہ بھلا داشتائوں کے لیے ایسی رازداری کی کیا ضرورت ہے؟ کتنی مند داشتائیں رکھتے ہیں اور اس سانچ میں معزز کھلاتے ہیں ان کی داشتائوں کو آخری کاںدھ دینے والے بھی سیکوں مل جاتے ہیں ان کے جنازے کبھی ایسی رازدار اٹھائے نہیں جاتے۔

میری یہ باتیں سن کر اس نے جواب دیا ”میں نہیں جانتی کہ وہ ایسی رازدار

آپ ہی کو یاد کرتی ہوں اور آپ کے متعلق سوچتی رہتی ہوں آپ کے سوا میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے جسے میں اپنا کہ سکوں آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

میں اس کے ہاتھوں کو اپنی گردن کے اطراف سے ہٹا کر ذرا دور ہو گیا "میں تمہیں فوب سمجھتا ہوں۔ سمجھنے کے لیے چھ ماہ کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔ آج تک میں تم سے قریب رہ کر تمہارا ہاں تم مجھ سے دور رہ کر ترختی رہو۔ میں تم سے دور چلا جاؤں گا تب ہی تمہیں معلوم ہو گا کہ ترپ اور بے چینی کیا ہوتی ہے۔" یہ کہہ کر میں اپنی چھیل پھینٹنے لگا۔ وہ مجھ سے بھڑکت گئی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے الگ کیا اور دھکا دے کر منجی پر گرادیا پھر تیزی سے چلا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

"بالے۔ بالے!" وہ مجھے پکار رہی تھی۔

میں آنگن میں آیا تو وہ کمرے کے دروازے پر آئی۔

"رک جائیے خدا کے لیے رک جائیے۔ مجھے چھوڑ کر نہ جائیے میں مر جاؤں گی۔"

وہ صبی آواز میں التجا کر رہی تھی تاکہ اس کی آواز دوسرے آنگن میں نہ پہنچے جہاں اس کی ماں کمری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

پھر وہ تیزی سے چلتی ہوئی آنگن میں آئی اس وقت تک میں دروازے کے باہر چلا آیا تھا۔ اس کے قریب آنے سے پہلے میں نے دروازے کو باہر سے بند کر کے تالا لگا دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس کے آنسوؤں اور التجاؤں سے پھر پھل جاؤں گا۔ وہ بند دروازے کے پیچھے سے ہولے ہولے مجھے پکار رہی تھی اور مجھے واپس آنے کے لیے کہہ رہی تھی مگر میں وہاں سے پلٹ کر اس کی آواز سے دور ہوتا چلا گیا۔

میں چاہتا تھا کہ وہ بھی جدائی کی ترپ اور جلن کی اذیتوں کو سمجھ لے تب ہی اسے میرے جذبات کا شدت سے احساس ہو گا۔ میں در کشاپ میں آکر سو گیا۔

رات میں نے بڑی بے چینی سے گزاری۔ کبھی سوتا رہا۔ کبھی جاگتا رہا میں اسے رلا کر اپنا قاس لیے اس کی آنسو بھری آنکھیں بار بار نگاہوں کے سامنے محوم رہی تھیں۔ "مری مائیں کام میں مصروف ہو گیا۔ دوسرے کو تھوڑی دیر کے لیے گھر میں آیا۔ میں اسے بتا رہا تھا کہ صرف لباس بدلنے آیا ہوں اور آج رات کو بھی واپس نہیں آؤں گا۔

وہ اپنی ماں کے ساتھ میرے کمرے میں آگئی۔ میں نے اسے صرف ایک نظر دیکھا پھر

نہیں کرتی۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں آپ کے لیے جان بھی دے سکتی ہوں بھئی۔  
گار نہیں بن سکتی۔"

"تم چاہتی ہو میں ہمیشہ ترپا رہوں؟"

"گناہ کے لیے ترپنا ناوانی ہے۔"

"انسان ایسی ناوانی نہ کرے تو فرشتہ بن جائے گا۔" میں نے اسے چوم لیا۔

اس نے کسما کر میری گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔ میری گرفت ہمیشہ مضبوط تھی لیکن میں جان بوجھ کر ڈھیل دیا کرتا تھا اس لیے کہ وہ میری آغوش سے لٹکنا نہیں چاہتی تھی صرف میری دست درازی پر مجھے روکتی اور سمجھاتی رہتی تھی۔

وہ ایک ایسی آگ تھی جس میں حرارت نہیں تھی۔ اس کی پہلی اور آخری ڈانسی یہی تھی کہ میں اس سے ٹوٹ کر پیار کروں۔ وہ ایک شمع کی طرح دالمانہ محبت کی آغوش تھی کہ پروانہ آئے، دیوانہ دار اس کا طواف کرے۔ اس سے کچھ نہ مانگے اس کے ترپتا رہے اور ترپنے کی سکت باقی نہ رہے تو خاموشی سے جل کر مرجائے۔ اس کے بعد بھی وہ جلتی رہے گی۔ اس دنیا میں کچھ ایسی چیزیں ہیں جو جلتی ہیں، جلاتی ہیں اور آگ سے ذرا بھی واقف نہیں ہوتیں۔

میں اس کی بے حسی سے جھنجھلا گیا تھا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق بار بار کبھی اٹھ اور کبھی سنبھلنے کرنے لگی تو میں نے اسے پرے دھکیل دیا اور منجی سے اٹھ کر کمرے میں پہلے بھی اس سے ایسا سلوک کر چکا تھا۔ اسے پرے ہٹا کر اور گروت بدل کر اسے منہ پھیر لیتا تھا مگر اس رات اسے بستر پر تنہا چھوڑ کر اٹھ گیا تو یوں گھبرا کر دیکھنے میں اسے چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔

میرا ارادہ بھی یہی تھا۔ میں نے جھلا کر کہا "میں سمجھ گیا ہوں کہ تم صرف اپنی سے مجبور ہو کر یہاں آتی ہو۔ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے اگر ہوتی تو تم میرے ہاتھ سمجھتیں اور میری خوشیوں کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے دریغ نہ کرتیں مگر تو دور کی باتیں ہیں، تم میری ایک چھوٹی سی خوشی بھی پوری نہیں کر سکتیں۔"

وہ ترپ کر بستر سے اٹھی اور میری گردن میں بائیں ڈال کر لپٹ گئی "میں آ محبت کرتی ہوں۔ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ جب آپ سامنے نہیں ہوتے ہیں تب

”میں مدتے“ میں واری، تہمارا چہرہ بھی پیلا پڑ گیا ہے۔ زلفا کی بھی یہی حالت ہے۔  
میں سب جانتی ہوں، زلفا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔“

میں نے اس سے نہیں پوچھا کہ اس نے کیا بتایا ہے۔ میں اس کی زبان سے سنتا چاہتا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

”میں زلفا کو دل و جان سے چاہتی ہوں۔ وہ میری وریاقت ہے۔“

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور پوچھا ”وریاقت کا مطلب کیا ہوا؟“

”اس کا مطلب ہے اپنے جنس کی تلاش کرنا۔ جن گھروں میں ولادت ہوتی ہے وہاں جنس کی رسم میں ہم بچنے والے ضرور جاتی ہیں۔ کوئی بلائے یا نہ بلائے مگر ہم وہاں پہنچ کر مذکر کرتی ہیں کہ ہمیں بھی خوشی منانے کا موقع دیا جائے۔ پڑھے لکھے گھرانوں میں ہمیں اجازت نہیں ملتی۔ مگر پڑھے لکھے ہیں کتنے؟ ہم ان کی طرف نہیں جاتیں اگر جانے کا موقع دیا جائے تو میرا دعویٰ ہے کہ میں دولت مند گھرانوں میں بھی زرخوں کو ڈھونڈ نکالوں گی۔ شاید اسی ڈر سے وہ ایسی خوشی کے موقعوں پر ہمیں نہیں بلاتے۔ ہماری بجائے رنڈیوں کو نہلاتے ہیں اور نہ!“

اس نے اس طرح منہ بنا کر اونٹنہ کیا جیسے وہ رنڈیوں سے افضل ہو اور محض ناقدری کا درجے انہیں اونچے طبقے میں جانے کا چانس نہیں ملتا ہے۔

”مگر ہم اپنی قدر کرنا جانتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی کے ہاں ایک سدا سا گن پیدا ہوتی ہے۔ ہم وہاں پھنسی کی رسم میں بچنے والے پڑھ لکھتی ہیں کہ کوئی ایسی مخلوق پیدا ہوئی ہے جس کا شمار نہ مردوں میں ہے نہ عورتوں میں۔ وہاں ہم یہ ثابت کرتی ہیں کہ اس دنیا میں آخر اگر ہم خسرے بن گئی ہیں تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے قدرتی طور سے بھی ہماری جیسی تیسری جنس پیدا ہوتی ہے۔ اگر وہ قابل نفرت نہیں ہے تو پھر ہم سے کیوں نفرت کی جاتی ہے۔ کوئی مرد کے نقش قدم پر چلتا ہے کوئی عورت کے نقش قدم پر۔ ہم سدا سا گن کے نقش قدم پر چلتی ہیں کیا میں غلط سمجھتی ہوں؟“

میں نے آگے کر جواب دیا ”میں تمہارے مسائل پر بحث نہیں کر سکتا۔ تم زلفا کے حلقہ کچھ کہہ رہی تھیں؟“

”ہاں میں زلفا کے بارے میں کہہ رہی ہوں، تم اسے حاصل کرنا چاہتے ہو تو ہماری

اس طرح منہ پھیر لیا جیسے اس کی پروا نہ ہو۔ اس ایک نظر میں میں نے اس کے چہرہ اڑی ہوئی رنگت، بکھری ہوئی زلفوں اور سوچی ہوئی آنکھوں سے اندازہ لگایا کہ کچھ رات جاگتی رہی ہے۔ اس کی ماں نے پوچھا۔

”کیا بات ہے بیٹا! پچھلی رات تم گھر نہیں آئے تھے؟ میں نے صبح اٹھ کر دیکھا تھا۔“

”جی ہاں“ میں نے جواب دیا ”آج کل کام بہت زیادہ ہے“ میں درکشاپ میں کردوں گا۔“

وہ میرے جھوٹ کو سمجھ گئی۔ میری بات کے جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اسے موقع نہیں دیا۔ اتنی تیزی سے کمرے کے باہر چلا آیا جیسے واقعی کام بہت زیادہ ہے وہاں ٹھہر کر اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے باہر دوڑا زبے پر نالا لگا کر درکشاپ میں وقت گزارنے چلا آیا۔ یہ میں خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ مجھے ملنے سے چاہتی ہے۔ اس کی موجودہ حالت دیکھ کر یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ دور رہ کر اسے نہ والا نسخہ کا سیاب ثابت ہو رہا ہے۔

رات کے آٹھ بجے ایک بوڑھا خسر میرے پاس آیا۔ مجھے خسرول سے خنہ ہے۔ وہ اپنے بے ڈھنگے جسموں پر عورتوں کے لباس پہن کر اتنے بھدے اور رپ ہیں کہ میں انہیں دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا لیکن وہ زلفا کا ہم جلس تھا وہ گھنٹوں اور پاس بیٹھا باتیں کرتا رہتا تھا لیکن میں نے کبھی اس خسرے سے بات نہیں کی تھی اچانک ہی پہلی بار میرے پاس آیا تو میں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی بات ہے۔ زلفا کے پار والا یقیناً اس کا کوئی پیغام لایا ہے۔

میں ملازموں سے ذرا دور درکشاپ کے ایک گوشے میں آکر بیٹھ گیا۔ ایک میں نے چائے لانے کے لیے کہا۔ وہ خسر میرے سامنے ایک لکڑی کی چوکی پر بیٹھ بولا۔

”تم تو مجھے جانتے ہو میرا نام آخری ہے میں ابھی زلفا کے پاس سے آ رہی ہوں کہہ کر اس نے میری آنکھوں کو گھری نظروں سے دیکھا۔ میں نے نظریں جھٹک لیں تو بلائیں لیتا ہوا بولا۔

نے اس کا دل نہیں توڑا اور اسے اپنا بنا کر رکھا تو میں جنہیں سب کچھ بتا دوں گی کہ میرے اور زلیخا کے درمیان کتنا اہم رشتہ ہے اتنا اہم کہ میں کسی موقع پر بھی اسے بدنام نہیں کرنا چاہتی۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ تم اسے دیوانگی کی حد تک چاہتے ہو۔ کسی بات پر ناراض ہو کر کچل رات سے گھر نہیں جا رہے ہو۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں تمہارے پاس جاؤں اور تم سے منت اور ساجت کروں کہ راتوں کو گھر سے باہر نہ رہا کرو۔ ایک محبت کی ماری تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ جاؤ بالے! اس کا دل نہ توڑو۔ وہ بہت کمزور دل کی لڑکی ہے۔ اسے بہت ہی محبت ملی ہے کسی کی ناراضگی کبھی نہیں ملی۔ یہ تم ہو کہ اس سے ناراض ہو کر آئے ہو۔ تمہاری بے رخی برداشت نہیں کر سکتی گی۔ اپنی جان کو روگ لگالے گی۔ ابھی یہاں سے بیدھر گھر چلے جاؤ، وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“

اس کی باتیں سن کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ میری توقع کے مطابق برے لیے تپ رہی تھی۔ میری ضرورت محسوس کر رہی تھی اور میں یہی چاہتا تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد میں درکشاپ بند کر کے گھر واپس آیا تو تمام محلے میں رات کی آہٹی چھائی ہوئی تھی۔ گلی سنسان تھی اور نکلے پان والا والا کان کے پچھلے دروازے سے اڑا رہا تھا۔

میں تالا کھول کر اندر آیا اور دروازے کو بند کر کے جب کمرے میں پہنچا تو وہ میرے غلام بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دوڑتی ہوئی آئی اور میرے قدموں سے لپٹ کر رٹ پڑ بیٹھ گئی پھر میں نے اس کی سسکیاں سنیں۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا اور وہ رورہی تھی اس کی محبت اور دیوانگی نے اتنا متاثر کیا کہ میری آنکھیں بھی بھگ گئیں۔ کسی کو ثابت کرنے والی ہستی مل جائے تو وہ کتنا خوش نصیب ہوتا ہے یہ میں اس رات سمجھ گیا تھا۔

میں نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ وہ میری ٹوٹی میں ایک ننھی بچی کی طرح ہنسنے اور شکایتیں کرنے لگی میں اسے پکارتے لگا اور کہنے لگا۔

”اب مجھے جھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے کیوں چلے گئے تھے؟“

زندگی کو بھی سمجھو۔ نہیں سمجھو گے تو کسی دن زلیخا بدنام ہو جائے گی۔“

اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا ہے کہ بدنام ہو جائے۔“ میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگا پھر رازدارانہ لہجے میں بولا ”زلیخا مجھے رازدار سہیلی سمجھ کر سب کچھ بتا رہی ہے۔ نہ بھی بتاتی تو میں کچھ کم نہیں ہوں، اڑتی چڑیا کے پر گھن لیتی ہوں۔ بھلا یہ کیا کہنا ہے کہ راتوں کو تمہارے ساتھ سوئے اور صبح پاک باز عورت کی لڑا اٹھے۔ وہ اپنی پاک بازی بتاتی ہے مگر میں نہیں مانتی۔ اگر میں یہ بات پھیلا دوں تو زلیخا پاک روح سمجھ کر اس کی عزت کرتے ہیں وہ عزت مٹی میں مل جائے گی اور لوگ۔“

تمہاری طرح پیٹھ پر غصہ سمجھنے لگیں گے۔“

میں نے غصے سے اسے دیکھا، میرے جی میں آیا کہ مارا کر اس کا بچہ مر نکال دلا۔ ایک سیدھی سا دی شریف عورت کو بدنام کرنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ میں اسے غصے نفرت سے دیکھتا رہا اور ضبط کرتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ اس پر ہاتھ اٹھانا دانشمندی نہیں۔ یہ خسرے اول درجے کے بے شرم اور ذہیت ہوتے ہیں۔ وہ مار کھا کر سامنے ٹوک جائے گا اور ہاتھ ہلا کر مجھے اور زلیخا کو کو سے گانے میرے عشق کی داستان عام ہو کر بدنام ہوگی۔ جس لڑکی کو تمام محلے میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا، آنکھوں میں بٹھایا جاتا تھا اسے رسوا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے میرے گڑھے ہوئے تیور دیکھ کر کہا ”میں زلیخا کی دشمن نہیں ہوں مگر ہوتی تو بچپن ہی سے اسے اپنی ٹولی میں اٹھا کر لے جاتی کیونکہ جہاں کوئی سدا سدا کرتی ہے اس دروازے پر ہماری ٹولی دھرتا ہے کہ بیٹھ جاتی ہے کہ اس سدا سدا ہمارے حوالے کرو کیونکہ وہ ہماری جنس سے تعلق رکھتی ہے۔“

ہو تائیوں ہے کہ جس گھر میں وہ پیدا ہوتی ہے اس کے والدین اس کی اصلیت پر ہیں۔ باپ شرم سے کسی کو جتا نہیں سکتا کہ بیٹا ہے یا بیٹی۔ اکثر بیٹی ہی مشہور کرتی۔ زلیخا کی اصلیت کو میں نے پہچان لیا تھا پھر میں اپنی ٹولی کے ساتھ وہاں جا کر شور مچانا سارے محلے والوں کو خبر ہو گئی۔ زلیخا بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد پیدا ہوئی تھی باپ جاہل تھا مگر بہت پیسے والا تھا۔ میں نے اس سے سمجھو کیا۔ ایک ایسا سمجھ کے متعلق ابھی میں تمہیں نہیں جاسکتی کیونکہ تم زلیخا سے ناراض ہو کر آئے ہو۔“



آبا اور اس کے پہلو میں لیٹ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ پھر اس کے کان میں سرگوشی کی  
”تم صرف کل سے تڑپ رہی تھیں، میں چھ ماہ سے تڑپ رہا ہوں۔ اب تمہیں میری  
تکلیف کا احساس ہو گیا ہو گا۔“

وہ خاموش رہی۔ شاید اس لیے نہیں بول رہی تھی کہ کوئی بات میرے مزاج کے  
خلاف ہوگی تو پھر میں روٹھ کر چلا جاؤں گا۔ اس کی خاموشی میرے لیے سودمند تھی۔ میں  
اس خاموشی مجھ سے کھینے لگا۔

چاند کی چاندنی آنگن میں اتر رہی تھی اور اس کی دھندلی سی روشنی کمرے کی تاریکی سے  
کھیل رہی تھی۔ اس دھندلکے میں زلیخا کا وجود کچھ چھپ رہا تھا اور کچھ جھلک رہا تھا میرے  
ہاتھ پر جنبش پر چھپنے اور سننے والی کو در یافت کر رہے تھے۔ وہ کبھی کبھی میرے بے باک  
ہاتھوں کو پکڑ لیتی تو میں اپنے ہونٹوں سے اس کے ہونٹوں میں ڈوبتا ابھرتا اور اسے سمجھاتا۔  
مجھ سے نہ شرمناؤں تمہارا ہوں اور تم میری ہو۔ گناہ کے تصور کو ذہن سے نکال دو۔  
میں تمہیں صدق دل سے اپنا رہا ہوں اگر تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے تو اس قہر کو پیش  
کے لیے ختم کرو۔ مجھے کیسے دور چلے جانے دو۔“

دور ہونے کے ذکر پر وہ گھبرا کر مجھ سے لپٹ جاتی تھی۔ میں نے اسے اچھی طرح خوف  
لہا کر دیا تھا اس لیے وہ میری بے باکیوں پر برائے نام احتجاج کر کے ہار جاتی تھی۔ میرے  
جوشے بڑھتے گئے، میں حجاب کے پردے ہٹا آ گیا۔ اس کے نازک بدن کی ملامت سے آشنا  
ہو گیا کچھ دیر بعد مجھے جھٹکنے کا احساس ہوا کہ کمرے کی نیم تاریکی میں ہوس کی چنگاڑ بھٹک  
رہی ہے، اندھیرے کی دیواروں سے ٹکرا رہی ہے، پھر پھر زاری ہے مگر اسے دیوار کے اس  
بار جانے کا راستہ نہیں مل رہا ہے کوئی دروازہ نظر نہیں آ رہا ہے۔

میں ہوش سے بے گانہ ہو رہا تھا، مدہوش ہونے کے لیے مزید نشے کی ضرورت تھی۔  
نشہ بھی ہوتا ہے جو ٹکے پان والا فروخت کرتا ہے لہذا پہلی بار زندگی میں پہلی بار میں اس  
دکان کے پچھلے دروازے پر گیا اور نشے کی انتہا کو چھو لیا۔ اف! کیسا خالم اور کیسا مہربان نشہ  
تھا۔ میں ان فیصلے لحاظ کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ وہ لحاظ جبکہ میں خود کو اور ساری دنیا کو اور  
نیکاروں کو بھلا بیٹھا تھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو وہ اپنی بانسوں میں منہ چھپائے دوڑ رہی تھی۔

”یہ دیکھنے کہ تم میرے بغیر کس طرح ترپتی ہو؟“

اللہ! آپ نے بہت ظلم کیا ہے میں کیا بتاؤں کہ میری کیا حالت ہو گئی تھی۔  
لگ رہا تھا کہ میری جان نکل گئی ہے میری زندگی میرے پاس نہیں ہے، آپ کے زمانہ  
گئی ہے اور میں بالکل خالی ہو گئی ہوں۔ کسی سے باتیں کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔  
پاس مگر تھی۔ ماں جی پوچھتی رہیں کہ مجھے کیا ہو گیا ہے، صبح سے میں نے کچھ کھا  
نہیں ہے مگر میں انہیں بتاتی رہی کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے کھانے کو جی نہیں چاہتا  
جانے آپ میں کیا جادو ہے کہ آپ کے بغیر بھوک پیاس۔“

میں نے اس کے لبوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ اس کی آواز گھٹ گئی پھر  
اسے جوم کر کہا ”اور باقی باتیں بعد میں ہوں گی تم صبح سے بھوکی ہو۔ جاؤ روٹیاں  
میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گا“ اس نے خوش ہو کر مجھے دیکھا۔ پھر میرے  
بانہیں ڈال کر بولی ”ایسا لگتا ہے کہ آپ کو کھو کر بڑی مدت کے بعد پایا ہے، چھوڑ دو  
جی نہیں چاہتا۔“

میں نے اسے سمجھا بھجا کر روٹی لانے کے لیے بھیج دیا اور منجی پر آکر بیٹھ گیا۔  
دیر کے بعد وہ سالن اور روٹیاں لے کر آئی، ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے  
کھانے لگے۔ کبھی میں نوالہ بنا کر اسے کھلاتا تھا اور کبھی وہ مجھے کھلاتی تھی۔ اس وقت  
بڑی دنیا ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی اس کائنات میں صرف ہم دو  
والے تھے۔ ہمارے علاوہ کوئی دنیا کوئی ہستی اور کوئی آواز نہیں تھی۔ وہ بول رہی  
سن رہا تھا۔ میں محبت کے گنگنائے وعدے کر رہا تھا وہ خوشی سے پھولی نہیں ماری  
کھانے کے بعد اس نے برتنوں کو ایک طرف رکھ دیا پھر میرے پہلو میں آکر بیٹھ  
پچھلی رات سے اب تک کے جھری و استان سنانے لگی کہ کس طرح اس کی خیر

دن کے وقت بھی وہ سونہ سکی میرے انتظار میں اب تک جاگتی رہی۔ میں نے کہا  
”تمہیں اب سو جانا چاہیے چلو یہاں لیٹ جاؤ میں تمہیں سلا دیتا ہوں۔“

یہ کہہ کر میں وہاں سے اٹھ گیا اور سوچ سوچ بورڈ کے پاس آکر لائٹ آف کر لی  
اندھرا پچھل گیا، لگا ہوں سے ہر چیز اوجھل ہو گئی۔ اس تاریکی اور خاموشی میں  
بول رہی تھی کہ ایک مسکند دیکھتا بدن کروٹ لے رہا ہے۔ میں آہستہ آہستہ چل

صاف ستھرا سرخ رنگ کا لباس تھا۔ وہ ہمیشہ سرخ لباس پہنتی تھی کیونکہ سدا سہاگن تھی اور ایک پاک روح تھی، ہمیشہ پاک صاف رہتی تھی۔ وہ پاک روح ہو یا نہ ہو لیکن میں نہایت سے مرعوب تھا کہ اس کی پاکیزگی کو دوبارہ لگا دیتا تھا۔

اس کی ماں روٹی ہوئی کمرے میں آئی۔ ایک شخص نے پوچھا۔

”ماں جی! یہ کل شام تک اچھی بھلی تھی پھر چاکلے اسے کیا ہو گیا ہے؟“

وہ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی بولی ”کیا بتاؤں بیٹا! پر سو رات کو تین بجے میری آنکھ کھلی تو یہ آنگن میں نسل رہی تھی، صبح اس کی آنکھیں بتاری تھیں کہ یہ رات بھر جاگتی رہی ہے۔ کل تمام دن اس نے کچھ نہیں کھایا، کل رات کو ایک بجے میری آنکھ کھلی تو دیکھا یہ آنگن میں نسل کر رہی ہے۔ پاک صاف رہنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ آدھی رات کو غسل کیا جائے نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ میں پوچھتی رہی مگر اس نے جواب نہیں دیا۔ لباس بدل کر سال آکر لٹ گئی تب سے اٹھاتی ہوں تو اٹھتی نہیں بات کرتی ہوں تو جواب نہیں دیتی ہائے میری بچی کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔ دو راتیں گزر گئیں، دوسرا دن گزر رہا ہے اور یہ اب تک جاگ رہی ہے۔ ہائے رہا! ایسے جاگتی رہے گی تو مرجائے گی۔ لوگو! کچھ کر دیے معصوم تمہاری کام آتی رہی ہے آج تم اس کے کام آؤ اسے کسی طرح بچاؤ۔“

ماں جی کی باتیں سن کر میرے دل پر کیا گز رہی تھی میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ غلطی میں کروں گا اور بچہ تارے کے عذاب میں وہ مبتلا ہو جائے گی۔ وہ بچہ مجھ سے سمجھا گیا تھا کہ وہ ایک پاک روح ہے اس دنیا کی کوئی غلامت اسے چھو نہیں سکتی، وہی معصوم لڑکی آنکھیں کھولے سکتے کے عالم میں اس غلامت کو دیکھ رہی تھی جو اس کے دامن پر لگ گئی تھی۔ اس نے آدھی رات کو غسل کیا تھا، صاف ستھرا لباس پہنا تھا، بستر پر سفید ابلے چادر بچھائی تھی پھر بھی احساس گناہ کا وہ اس کے دماغ سے نہیں مٹ رہا تھا۔ میں نہایت سے سر ہٹا کر منجی کے قریب آیا اور اسے آواز دی۔

میرا سر نہایت سے جھک گیا۔ جب جوش اور جذبے سرور پڑ گئے تب احساس ہوا کہ جسے میں جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ہوں، اسے تکلیف پہنچائی ہے۔ اس کے ساتھ ایک غیر انسانی سلوک کیا ہے۔ میں بڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا اور وہ ہچکیاں لے کر رہی۔ شرمندگی سے میری زبان نہیں کھل رہی تھی، میں نے خاموشی سے اسے تسلی دے اور چپ کرانے کے لیے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا۔ اس نے فوراً ہی میرا ہاتھ ہٹا دیا اندازاً یہاں ہی تھا جسے ایک غلامت کو اپنے جسم سے جھٹک رہی ہو پھر وہ کھٹکی منجی کے سرے پر گئی اپنے لباس کو درست کیا اور کراہتی اور کانپتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ نیم تاریکی میں وہ ایک سائے کی طرح نظر آ رہی تھی اور سسکیاں لیتی کراہتی ہوئی قدم پر ڈگمگاتی اور سنبھلتی ہوئی مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا وہ کیوں جا رہی ہے؟ میں اسے روکنا چاہتا تھا، ایک بار سینے سے لگا کر تسلی دینا چاہتا تھا۔ میری زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

میں ایک مجرم کی طرح خاموش رہا اور وہ چلی گئی۔ دوسری صبح بیدار ہوا تو آنگن دھوپ پھیل گئی تھی۔ دوسری طرف آنگن میں کچھ مردوں اور عورتوں کی باتیں کرنے آوازیں آ رہی تھیں پھر کسی عورت کے رونے کی آواز سن کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ”زیلنا کے گھر میں کوئی عورت کیوں رو رہی ہے؟ یہ سوال میرے دماغ میں چٹنے لگا۔ میں دروازہ کھول کر اس آنگن میں گیا، وہاں مٹکے کی عورتیں تھیں کچھ جانے پا گئے لوگ تھے اور ان کے درمیان زیلنا کی ماں بیٹھی رو رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

”کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟“

ایک نے جواب دیا ”زیلنا پر سکتہ طاری ہے کچھ بولتی نہیں ہے۔ پتہ نہیں۔“

ہو گیا ہے؟“

میں حیرتی سے چلتا ہوا اس کے کمرے میں آیا، وہاں بھی مرد عورتوں کی باتیں سب ہی اسے چاہتے تھے اس لیے اس کے دکھ میں شریک ہونے آ گئے تھے اور آوازیں دے دے کر اپنی طرف مخاطب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

وہ اپنی منجی پر لیٹی ہوئی چھت کی جانب تنک رہی تھی۔ پلکیں نہیں جھپک رہی یوں لگتا تھا کہ ویدے پتھر ہو گئے ہیں۔ بستر پر سفید چادر چھٹی ہوئی تھی۔ اس کے

وہ ایسے خاموش رہی جیسے اس کے کان اس دنیا کی کوئی آواز نہیں سن رہے ہو۔ میں نے منجی کے سرے پر جھک کر اسے پھر ایک بار بڑی محبت سے مخاطب کیا۔

”زیلنا! میں ہوں بالے۔ میری طرف دیکھو۔“

پاہتی تھی اس لیے آپ کی خاطر اسے قبول کر لیا۔“

اب آپ اس پر بحث نہ کریں۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے اور مجھے بہت مہر گری نیند آرہی ہے۔ ایسی نیند مجھ جیسی عورت کو ایک ہی ٹھوکر کے بعد سلا دیتی ہے۔ آپ میری باتیں غور سے سنیں۔ مدد چاہا، موسیٰ بھائی اور احمد دین کے آئندہ کبھی کوئی میت ہو تو آپ وہاں نہ جائیں۔ آج کے بعد میں خسروں کی پابندیوں سے آزاد ہو جاؤں گی۔ وہ لوگ خسروں کا جنازہ اٹھاتے ہیں۔ آپ سب اس دنیا میں خسروں کا وجود دیکھتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ وہ کب مرتے ہیں اور کہاں دفن ہوتے ہیں؟

یہ ایک لمبی داستان ہے اخترازی نے مجھے بتایا ہے۔ وہی خسر جو کل آپ کے پاس گیا تھا اسی نے میرے ابا جان سے کہا تھا کہ مجھے ان کے حوالے کیا جائے ورنہ میرے جوان ہونے پر وہ مجھ پر بد فعلی کا الزام لگائیں گے۔ مجھ جیسی ہستی جو نہ مرد ہے نہ عورت اس پر ایسا الزام لگایا جائے تو ایک باپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ خسروں کا ڈھیٹ پن مشہور ہے۔ انہیں لات جوتے مار کر بھی ان کی زبانیں بند نہیں کی جاسکتی۔ یہ خسرے جس شہر میں رہتے ہیں بڑے اتحاد سے ایک جماعت بنا کر رہتے ہیں۔ اپنی کمانی کا کچھ حصہ ایک فنڈ کی صورت میں جمع کرتے ہیں۔ ہر شہر میں ان کے خاص ملازم ہوتے ہیں جو آدمی رات کے بعد مرنے والے خسروں کا جنازہ اٹھاتے ہیں اور انہیں اپنی کوئی عزیزہ بنا کر قبرستان لے جاتے ہیں۔

مدد چاہا، موسیٰ بھائی اور احمد دین جیسے شوقین مزاج رکھیں کسی جوان خسرے کو اپنی داشتہ بناتے ہیں تو اس بات کا وعدہ کرتے ہیں کہ ان کے کفن و دفن کا انتظام وہ خود کریں گے۔ آٹھ رات کے بعد مدد چاہا اور موسیٰ بھائی کی داشتہوں کی لاشیں انہی خسروں کے گھر سے لگی تھیں۔ اسپتال یا کراچی سے ان کی بیویاں نہیں آئی تھیں۔ پھر یہ خسرے مجھ جیسی مددگاروں کی تلاش میں رہتے ہیں اور ہماری ان پیدائشی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر ہمارے والدین کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ خسروں کے کفن و دفن کا بندوبست کریں ورنہ وہ سدا ناماں جوان ہو کر بدنامی کی زندگی گزاریں گی۔ میرے ابا جان راضی ہو گئے۔ جب تک وہ اندر ہے مرنے والے خسروں کے کفن و دفن کے لیے چندہ دیتے رہے۔ کئی بار جوری چھپے انہیں کا نہ مارے کر بھی آئے۔

اس کے پھیلے ہوئے دیدے ذرا۔ ادھر سے ادھر ہوئے وہ مجھے دیکھنے لگی۔ جب اس کی نظریں چھت پر مرکوز تھیں اس کی آنکھوں میں دیرانی تھی۔ مجھے دیکھنے کی لالچ آنکھوں میں زندگی کی ہلکی سی چمک پیدا ہوئی۔ دور کھڑے ہوئے افراد منجی کے قریب اسے غور سے دیکھنے لگے۔ انہوں نے صرف اتنا ہی دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں زارہ حرکت ہوئی ہے لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کتنی محبت اور شکایت بھری نظروں سے مجھ پر رہی تھی۔

اس کی ماں نے قریب آکر کہا ”ماں صدے، میری بچی تجھے کیا ہو گیا ہے؟“ اس نے ایک مہر گری سانس لی۔ میرے لباس کو دیکھا جسے میں پچھلی رات سے پہنہ تھا۔ پھر وہ بڑی غماہت سے بولی۔ ”خسل کر لیجیہ!“ میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس پاکیزگی کے سامنے میں نے خود کو ذرا کلب غلیظ انسان محسوس کیا۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔ ”اچھا میں ابھی خسل کر کے آتا ہوں۔ میں تمہیں سلاؤں کا تم سوجاؤں گا؟“ ”ہاں!“ وہ پھر چھت کی جانب گھورنے لگی۔

میں فوراً ہی وہاں سے پلٹ کر اپنے مکان میں آیا۔ جلدی جلدی خسل کیا۔ ہوئے کپڑے پہنے۔ کچھ لوگ میرے آئین میں آکر کہہ رہے تھے کہ میں براخونہ ہوں۔ پاک روح مجھ پر مہربان ہے اور میری موجودگی میں سونا چاہتی ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ اچھا ہی ہے تم لوگ اسی غلط فہمی میں مبتلا رہو۔ میں زنا و باغ سے گناہ کا احساس منانے جا رہا ہوں۔

جب میں وہاں پہنچا تو اس کی ماں تمام لوگوں کو کمرے سے باہر لا آئی تھی۔ آواز نہ ہو اور بیٹی سکون سے سو جائے۔ میں منجی کے سرے پر بیٹھ گیا اور اس کے بڑی محبت سے تمام کر کہا۔

”نہ لیا! تم گناہ کا احساس کر رہی ہو اور میں ندامت سے مراجہا ہوں۔ جو اسے بھول جاؤ۔“

”کیسے بھول جاؤں۔ محبت کے نام پر میں کچھ دے رہی تھی، آپ نے کہا کہ روح کی پاکیزگی دے رہی تھی، آپ نے جسم کی غلاط دی۔ میں آپ کو مارا ہوں۔“

ہمارے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں ہے۔ اباجان نے مرنے سے پہلے مجھے نصیحت کی تھی کہ میں ان خسروں کی ضروریات پوری کرتی رہوں ورنہ میری نیک نامی پر حرف نہ لگا۔ میں اس نصیحت پر آج تک عمل کرتی رہی۔ سدا سہاگن پاک ہستی سمجھی جاتی ہے مجھے اپنے وجود کے آئینے کو صاف رکھنا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ الزام تراشی ہو مگر آپ کی محبت نے مجھے زندگی بھی دی اور موت بھی۔ میں جھوٹی عزت و احترام کے سارے نہیں جی سکتی۔ پاکیزگی کا جو آئینہ سب سے زیادہ عزیز تھا وہ ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے خود کو برا سمجھایا کہ میں نے اپنے محبوب کی خوشی پوری کی ہے مگر دل نہیں مانا۔ جب میں بیچارہ طور پر مکمل عورت نہیں ہوں تو میں نے کیسے خوشی پوری کی؟ مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ نہاد سہاگن ہو کر سہاگ کی بیج پر جاؤں؟ آج مجھ میں اور ایک خسرے میں کوئی فرق نہ رہا یہ تو بین میں کیسے برداشت کروں؟ میں قانون قدرت کے خلاف آپ کی بیج پر چل گئی۔ وہ خسرے شریعت کے خلاف نماز جنازہ سے گزر کر دفن ہوتے ہیں۔ اس دنیا میں کیسے تماشے ہوتے ہیں۔ میرے مالک! میرے محبوب! مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں نے غسل کرنا آپ نے غسل کر لیا۔ اب وہی پرانی آرزو ہے کہ آپ مجھے چاہیں۔ مجھ سے محبت کر ایسی محبت جس میں کوئی غرض نہیں ہوتی، کوئی لالچ نہیں ہوتا۔ کیا ایسی محبت اس دنیا ہے؟ میں اس پر جھک گیا اور اس آئینے کی طرح صاف اور شفاف چہرے کو اپنا ہتھیلیوں میں سجا کر بولا۔

”ہاں! ہر محبت کے پیچھے ایک غرض پوشیدہ ہوتی ہے لیکن اب مجھے نصیحت ہے۔ میں تم سے بے لوث محبت کروں گا تم سے کچھ طلب نہیں کروں گا، تمہارے پیار کی ہر طلب پوری کروں گا میں وعدہ کرتا ہوں۔ میں قسم کھاتا ہوں۔“

اس کے لبوں پر پھینکی سی بے جان سی مسکراہٹ آئی اس نے آنکھیں بند کر لیں وہ سو رہی تھی۔ باہر لوگ دھیمی سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے کہ کہیں اس اچانٹ نہ ہو جائے۔ کمرہ بھی خاموش تھا میں بھی خاموش کہ وہ سو رہی ہے۔ وہ سوتا اور میرا دل رو رہا تھا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے سینے پر تھا اور دوسرا ہاتھ اس کی گت سے گری نیند اٹھتی تھی۔ نیند خواہ کتنی ہی گہری ہو میرا ایمان ہے کہ وہ نیند ضرور اٹھے گی۔

## میٹھا زہر

کمانی وہ ہوتی ہے  
جو ایک تہذیب کے اس مخصوص دور کو اپنے  
اندہرے ہمیشہ زندہ رکھتی ہے۔  
ہجرت کی زندہ تہذیب کی زندہ کمانی  
اس کا اختتام نہایت ہی چونکا دینے والا اور  
ناقابل فراموش ہے۔

وہ خود بھی اپنے چنڈ کا ایک گہرو جوان تھا۔ چیتھے ہوئے رنگوں کی قمیص اور چھینٹ کی ربڑی لنگی پہنتا تھا۔ چھ مہرے کی زمینداری میں جہاں جاتا تھا اپنی رعیت سے حاکموں جیسا سلوک کرتا تھا۔ اگر کوئی بغاوت پر اتر آتا تو زوردار بڑک لگا کر اسے لٹکارتا تھا۔ کبھی اپنی طاقت سے اور کبھی جاگیردارانہ حکمت عملی سے اس باغی کو کڑی سزائیں دیتا تھا۔ تعلیم کا مہرباں سے روانہ تھا، زندگی کے اہم مسائل لائیبوں سے، رانگلوں سے یا دولت سے مل کیے جاتے تھے لیکن بقول شاعر

سرخ پوش یہ لب بام نظری آید۔

نہ برور و نہ براری نہ بزر می آید

وہ حسینہ نظر آ رہی تھی وہ نہ تو طاقت سے، نہ آہ و زاری سے اور نہ ہی دولت سے حاصل ہو سکتی تھی لہذا پہلی بار اس نے دولت بھرے دماغ کے بجائے محبت بھرے دل سے سوچا کہ وہ دشمنی اور داؤد قحج سے نہیں بلکہ پیار و محبت سے اپنائی جاسکتی ہے۔

اس وقت وہ گلبرگ کی ایک شاندار کونہی کے برآمدے میں کھڑا ہوا تھا۔ سامنے ڈانگ روم کے کھلے ہوئے دروازے سے عمارہ عورتوں کی بھیڑ میں کبھی نظر آتی تھی اور کبھی کونہی کے پچھلے حصے میں جا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔ برآمدے کے دوسری طرف کونہی کے برے سے احاطے میں میز اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ دور دور کے چنڈوں سے آئے ہوئے زمیندار، پنواری اور تحصیل دار اپنے اپنے حواریوں کے ساتھ بیٹھے خوش گہلوں میں مصروف تھے۔ ان میں واجد کا باپ چوہدری جناب علی بھی تھا اور اس کا دشمن مٹی عمارہ کا باپ چوہدری کرم دین بھی تھا۔ دونوں کے شانوں سے ریوالور اور گولیوں کی پٹیاں لٹک رہی تھیں۔ وہ ایک دوسرے سے بہت دور تھے پھر بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر اس طرح مونچھوں پر تاؤ دے رہے تھے جیسے وہ ریوالور کے بجائے مونچھوں سے فائر کرنے کا ارادہ کر رہے ہوں۔

وہ برآمدے سے اتر آیا اور لان میں ٹھلنے لگا۔ ٹھلنے کا صرف بہانہ تھا، وہ آہستہ آہستہ کونہی کے پچھلے حصے کی طرف جا رہا تھا۔ ایسے وقت جب دو بوڑھے مزید دشمنی کے لیے پر تل رہے تھے، وہ عمارہ کی طرف دوستی کا پہلا قدم اٹھا رہا تھا اور دل ہی دل میں شہت چاچا کوہائیں دے رہا تھا جن کی وجہ سے وہ دشمنوں کا پورا خاندان اٹھ کر اس کونہی میں آگیا تھا۔

## میٹھا زہر

عمارہ کو دیکھتے ہی گونگی صورت اور بولتی صورت کو دیکھنے کا فرق واضح ہو گیا۔ وہ اب سے پہلے محض اس کی تصویر دیکھی تھی اور اسے دیکھ کر سوچا تھا کہ لڑکی بے حد ہے، اپنے معیار کی ہے۔ اس کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزارا جاسکتا ہے اور اسے جانے کا وقت آئے تو اپنی عادت کے مطابق اسے بھلایا بھی جاسکتا ہے۔ مگر میں ڈاکے سامنے اسے دیکھتے ہی خود تصویر کی صورت گم سم ہو گیا۔ وہ اوپر سے قاتل تھا نہ بیکل بن کر رہ گیا۔

عمارہ کی تصویر کو اس نے ایک ہی زاویے سے دیکھا تھا اور اس وقت وہی عمارہ برنگے لباس پہنے ہوئے عورتوں کی بھیڑ میں صدمہ ہزار پہلوؤں سے جلوہ نکالتی تھی۔ طرف شادی کی رونق لگی ہوئی تھی۔ وہ مہمان عورتوں کی خاطر عمارت کے لیے اوپر اور بجلی کی طرح چھب دکھا کر چھپ رہی تھی۔ کبھی اس زاویے سے، کبھی اس سے ٹکا ہوں کی پیاس بڑھا رہی تھی۔ وہاں اور بھی ڈھیر ساری لڑکیاں تھیں۔ ایک طرح دار، کوئی سج و سج میں ہیر سیال، کوئی حسن میں دلخا اور کوئی اوادوں میں شیریں عمارہ کی بات کچھ اور تھی۔ وہ قول میں بھی بھاری تھی اور مول میں بھی۔ اس کے میں محض حسن واد کی فتنہ گری نہیں تھی۔ رعب حسن اس لیے بھی طاری ہو رہا چک نمبر دو سو تیس کے زمیندار کی اکلوتی بیٹی تھی۔

واجد چک نمبر دو سو تیرہ کے زمیندار چوہدری جناب علی کا بیٹا تھا۔ وہ ایک ذہنی سے مرعوب نہ ہو سکا۔ اس کے دل میں جو پچھل سی گونگی تھی وہ محض اس دشمن کی بیٹی تھی اور اس کے داؤد قحج سے دور تھی۔ جو چند دسترس سے باہر ہوا اس دل زیادہ چلتا ہے یہی وجہ تھی کہ وہ اس البرز دیہاتی لڑکی کے لیے کچھ زیادہ ہی بن گیا تھا۔

لے طور چلایا تو کیا ہو گا؟

”تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں نے ایسی چال چلی ہے کہ وہ تمہارے قدموں میں لوٹے گی  
تمہاری ہر بات پر آمنا و صدا قائم کی۔ میں نے اس کے دماغ میں کیسا زہر گھولا ہے، یہ  
بلے کا وقت نہیں ہے۔ تم اب جاؤ اور مالی کے کمرے میں اس کا انتظار کرو۔“  
یہ کہہ کر نازنین خالہ نے اس کی پیشانی کو چوم لیا پھر تنبیہ کے انداز میں بولی۔  
”دیکھو جتنی جلدی ہو سکے اسے یہاں سے لے کر چلے جانا ہے اگر تم ناکام ہوئے تو  
اپنے باپ کا غصہ بھی جانتے ہو وہ تمہاری ناکامی برداشت نہیں کریں گے۔“

یہ کہہ کر وہاں سے جلدی جلدی قدم بڑھاتی ہوئی کوٹھی کی جانب چلی گئی۔ واجد  
خوفزدہ دیر تک وہاں گم صم کھڑا رہا۔ اس وقت اس کی حالت عجیب سی تھی۔ وہ اپنی قسمت  
بازاں تھا کہ عمارہ اسے مل رہی ہے، وہ حیران تھا کہ پلک جھپکتے ہی نازنین خالہ نے اس  
کے لیے سارے راستے ہموار کر دیئے تھے وہ پریشان تھا کہ اب آگ اور خون کے دریا سے  
لارہ کے ساتھ کس طرح گزر سکے گا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مالی کی کوٹھی میں آگیا اور ایک چارپائی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔  
اس کے آگے عمارہ کی محبت تھی اور پیچھے برسوں پرانی دشمنی اور نفرتیں تھیں۔  
اب وہ محبت اور دیا منداری سے عمارہ کو نہیں اپنا سکتا تھا۔ نازنین خالہ اور چوہدری  
جانب علی کی نفرتوں کا سارا لے کر ایک باپ سے جبراً اس کی بیٹی کو چھین سکتا تھا۔  
وہ پچیس برس پیچھے پرانی نفرتوں کی طرف پلٹ گیا۔

پچیس برس پہلے انسان کسی حد تک آسودہ اور خوش حال تھا۔ کھانا، کپڑا اور ضروریات  
زندگی کی دوسری چیزیں قدرے سستی تھیں مگر محبت اس وقت بھی منگتی تھی۔

جہاں زن زور اور زمین کا جھگڑا ہو وہاں سے محبت کا گزر نہیں ہوتا۔ جناب علی اور کرم  
دونوں کے خاندانوں میں پشت پشت سے دشمنی چلی آ رہی تھی۔ دونوں کی زینتیں ایک سرحد  
پر آگئی تھیں اس لیے کبھی زمینوں کے لیے مقدمے بازیاں ہوتی تھیں کبھی نہری پانی کے  
لیے لٹائیاں اور رائٹنگوں چلتی تھیں۔ جب ان جھگڑوں سے بھی قرار نہ آتا تو پھر کسی  
اورت کے لیے کوئی فساد کھڑا ہو جاتا تھا۔

دونوں زمینداروں کی حویلیوں میں عورتوں کا میلہ سا لگا رہتا تھا۔ کبھی شہنشاہوں کے

تھا۔ اگر وہ بھی اپنے گھروالوں کے ساتھ یہاں نہ آتا تو کبھی عمارہ کا دیدار نصیب نہ ہوا  
زندگی میں پہلی بار کسی کو چاہنے اور کسی سے چاہے جانے کی ترپ پیدا نہ ہوئی۔  
کوٹھی کے پیچھے سروٹ کو ارنڈز کے قریب نازنین خالہ سے سامنا ہو گیا۔ نازنین  
خالہ ایک دوسرے کو آنے سامنے دیکھ کر وہ دونوں ٹھٹھک گئے تھے۔ نازنین خالہ  
چاروں طرف محتاط نظروں سے دیکھا۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ اس پاس اور  
دشمنوں میں سے کوئی انہیں دیکھنے والا نہیں ہے تو انہوں نے آگے بڑھ کر واجد  
لگا لیا۔

”میرے بچے! تمہیں اپنے کلیجے سے لگانے کے لیے ایک مدت سے ترس رہی  
یہاں کوئی آئے گا تو نہیں؟“

”نہیں۔ میں خوب سوچ سمجھ کر آیا ہوں، ابھی وہاں مجرا شروع ہونے والا ہے  
طرف کوئی نہیں آئے گا۔ کیا آپ میرا انتظار کر رہی تھیں؟“

”ہاں میں سوچ رہی تھی کہ کسی طرح تم سے یا تمہارے لیے ملاقات ہو  
خدا کا شکر ہے کہ تم اوھر آگئے۔ میں چاہتی ہوں کہ جو کل ہوتا ہے، وہ آج ہی ہو جا۔  
دیکھو سامنے مالی کا کمرہ ہے، تم وہاں جا کر بیٹھو۔ میں سب انتظام کر چکی ہوں، وہاں کو  
آئے گا۔ میں ابھی جا کر وہاں عمارہ کو بھیجتی ہوں۔۔۔۔۔“

عمارہ! واجد کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ جس کی تلاش میں وہ بھٹکتا ہوا یہاں  
تھا وہ آپ ہی آپ اس کے قریب پہنچنے والی تھی۔ نازنین خالہ نے پوچھا۔

”تم نے عمارہ کی تصویر دیکھی تھی؟“  
”جی، جی ہاں۔ ابھی ابھی اسے دیکھا ہے وہ بہت اچھی ہے۔“

”بس تو ٹھیک ہے جو کل ہوتا ہے وہ آج ہو جائے۔ تم آج ہی اسے لے جاؤ۔“  
”جی!“ وہ چونک کر بڑی حیرانی سے اپنی خالہ کو دیکھنے لگا۔ خالہ نے پوچھا۔

”تم اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا انتقام نہیں لو گے؟ آج سے چھین کر  
چوہدری مجھے اٹھا کر لے گیا تھا۔ کیا تم اپنی خالہ کا انتقام لینے کے لیے چوہدری کی بیٹی  
سے چھین کر نہیں لے جاؤ گے؟“

”آں۔ ہاں۔ لے جاؤں گا مہ۔۔۔ مگر یہاں تو چاروں طرف لوگوں کی جھلپ ہے!“

گیلری ہوتا ہے جہاں ملک بھر کی حسینائیں ہائی کے طور پر جمع کی جاتی ہیں اور اپنا حویلی ایک بیگار کیپ ہوتی ہے جہاں کسانوں کی بیوی بیاں خدمت گزار کی کے لیے جاتی ہیں پھر ان کا خون پسینہ چھوڑنے کے بعد انہیں واپس بھیج دیا جاتا ہے۔

جناب علی اور کرم دین کی حویلیوں میں جو خادماں آیا کرتی تھیں ان کا نام ہو سکتا تھا کیونکہ ایک بیمار یا بوڑھی ہو کر جاتی تھی تو دوسری چار اس کی جگہ آجاتی جس طرح خاندانی منصوبہ بندی کے دفتر میں مرنے والوں کی تعداد کم اور پیدا ہونے والے تعداد زیادہ ہے اسی طرح حویلیوں میں بھڑھاپے کی طرف جانے والیاں کم اور بچہ جوانی کی طرف آنے والیاں زیادہ ہوتی تھیں۔ اتنی زیادہ کہ ان کے نام یا تعداد بڑھتے تھے۔ یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ کون باپ کی خدمت کے لیے مامور بھی اور کی خدمت کے لیے مخصوص تھی۔ آقاؤں کی غلطیوں کی وجہ سے بچاریاں اور ہو جاتی تھیں۔ انسان خطا کا پتلا ہے زمیندار بھی خطا کے پتکے تھے۔

اگر یہ بات اپنی اپنی زمینداری تک محدود ہوتی تو بھگڑے فساد کی فوٹ نہ کیونکہ اپنے کھیتوں کی فصل سے بھوک مٹانے کا حق ہر زمیندار کو پہنچتا ہے۔ گویا ان اور شان کا سوال تھا کہ کس کے پاس سب سے زیادہ زر خیز زمین ہے؟ کس کے سب سے زیادہ دولت ہے اور کس کے پہلو میں سب سے زیادہ حسین عورت ہے؟ یہ مقابلہ ہر سال لاہور کی ہیرا منڈی میں ہوا کرتا تھا۔ اس منڈی کی نگاہ دریافت کے لیے دونوں طرف سے بڑھ چڑھ کر بولیاں دی جاتی تھیں۔ کوئی کت کھانا پسند نہیں کرتا تھا۔ بولیاں اس حد تک بڑھ جاتی تھیں کہ دس ہزار کی گواہی میں پڑ جاتی تھی۔ جناب علی ایک ایک پیسہ دانتوں سے پکڑنے کا عادی تھا۔ جب دیکھا کہ محض ان کی خاطر دولت ضائع ہو رہی ہے تو ایک بار اس نے مقابلے میں ا کو چھوٹ دے دی۔

چوہدری کرم دین نے جیت کے نشے میں یہ نہیں سوچا کہ دشمن آسمانی ہے کھانکر پیچھے کیوں ہٹ گیا ہے؟ وہ تو اسے اس وقت پتہ چلا جب وہ بازار حسن کار مہنگی طوائف کو ساتھ لے کر یزین گزارنے کے لیے مری جا رہا تھا۔ راستے میں ان کے مسلح آدمیوں نے اسے روک لیا۔ وہ پہلے سے محتاط نہیں تھا اس کے پاس مرنے کی گیلی اور ایک بوڑھا ملازم تھا۔ وہ چاروں طرف سے انھی ہوئی رانگٹوں کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ جناب علی کے آدمیوں نے اس کے ربوہ اور کون لوڑ اور کار کے پیوں کو پتھر کیا اس کی دلت سے خریدی ہوئی طوائف کو اٹھا کر چپ میں ڈالا اور راستے کی دھول اڑاتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

یہ تو تین ناقابل برداشت تھی۔ اگر اس کے ساتھ بھی مسلح آدمی ہوتے تو وہ ایک طوائف کے لیے خون کی ندیاں بہا دیتا کیونکہ اس وقت وہ محض ایک طوائف نہیں تھی، اس کا غور تھی دشمن کے مقابلے میں جیتنے والا ایک تمغہ تھی۔ زمینداروں کی شان و شوکت ان کی زمینوں سے یا ان کی داشتاؤں کی تعداد سے پہچانی جاتی ہے۔ اور جناب علی نے اس کی پہچان بڑا دکھ ڈالا تھا۔ اس وقت کرم دین مجبور تھا کوئی قانونی کارروائی بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ ایک عورت کا خریدار تھا جو چور دروازے سے خریدی گئی تھی لہذا قانون کی نظروں میں وہ خود بھی ایک مجرم تھا اس لیے مبر کر کے رہ گیا۔

یہ خبر در در کے زمینداروں تک پہنچ گئی کہ چوہدری جناب علی سب سے خوب صورت میرے کو کرم دین کے پہلو سے اڑا کر لے گیا ہے۔ کرم دین یہ بدنامی اور جگہ بدنامی کے حوصلے سے برداشت کر رہا تھا، یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ اس کے حواریوں نے مشورہ دیا کہ جناب علی سے انتقام لینے کے لیے اس کی حویلی سے کسی حسین لڑکی کو اغوا کیا جائے۔ لیکن وہ کوئی اونچا شکار کرنا چاہتا تھا۔ حویلیوں میں غریب کسانوں کی بیوی بیاں ہوتی ہیں خواہ وہ کتنی ہی خوب صورت ہوں ان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ جو چیز مفت مل جائے وہ چرائی نہیں جاتی۔ وہ کوئی قیمتی نایاب ہیرا اٹھا کر لانا چاہتا تھا جو اس طوائف کی فکر کا ہو یا اس سے بھی زیادہ مہنگا ہو۔

ایک سال تک وہ مبر کرتا رہا۔ اس دوران جناب علی کی بیوی کچھ عرصے تک بیمار رہ کر اس دنیا سے پیشے کے لیے رخصت ہو گئی۔ ان دنوں واجد پانچ برس کا تھا۔ وہ مرنے کے بعد جناب علی کا نام لیا اور جائیداد کا وارث چھوڑ گئی تھی۔ اگر وہ دوسری شادی نہ کرتا تو کوئی فتنہ نہ پڑا کیونکہ عورتیں تو ہر وقت ہوس کی دستر خوان پر موجود رہتی تھیں لیکن اس کی بہن سالی یعنی واجد کی خالہ نازنین بے حد حسین تھی۔ ایسی حسین عورت کسی دوسرے کی نگاہ میں جاتے یہ جناب علی کو منظور نہیں تھا۔ اس نے اپنے سر کے پاس اپنی سالی کے

جس طرح میں مری کے راستے سے خالی ہاتھ واپس گیا تھا اسی طرح تو اپنی اجڑی ہوئی برات لے کر خالی ہاتھ یہاں سے واپس جائے گا۔

نازنین کا باپ ڈنگماتے ہوئے قدموں سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا جناب علی کے پاس آیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”بیٹا! میں مجبور ہو گیا تھا۔ چوہدری کرم دین نے بندوق کے زور پر نکاح پڑھوایا ہے۔ دیکھ بھی ہوا زبردستی ہوا۔ مگر اب نازد چوہدری سے راضی ہے۔ شریف زادوں کو نقد پر کسی کے ہاتھوں سوئپ دیتی ہے، وہ ساری زندگی اسی کا دم بھرتی ہیں اور کسی دوسرے کا خیال تک دل میں نہیں لاتیں۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں یہاں جھگڑا فساد نہ لے۔ تم بھی میرے داماد ہو میرے غریب خانے میں آؤ۔ میری خوشیوں میں شریک رہاؤ۔“

اس نے غصے سے جھلا کر کہا ”تمہاری خوشیاں تمہیں مبارک ہوں۔ میں یہاں سے اتنا واپس لے جا رہا ہوں۔ اس بے عزتی کے بعد میں کسی کے سامنے سر نہیں اٹھا سکوں۔ لیکن میری یہ ناکامی کرم دین کو بڑی ہمتی پڑے گی۔ میں بہت جلد اس کا یہ قرض ادا کر دوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ گھوڑی پر سوار ہونے لگا۔ کرم دین نے گرج کر کہا۔ ”جناب! دک چاہے پہلے میری برات تمہارے سامنے سے گزرے گی تاکہ تجھے بھی ملو کہ کسی کو بے بس کر کے اس کی عزیز ترین شے چھین کر لے جانی جائے تو دل پر کیا لڑتی ہے۔“

”جناب علی نے چاروں طرف اٹھی ہوئی رانٹلوں کو دیکھا، موت کے دہانے پر کھڑے دار کرم دین کے حکم سے انکار کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ وہ گھوڑی سے نیچے اتر آیا پھر ملٹاٹھے بننے لگے۔ تھوڑی دیر بعد دو کمار نازد کی ڈولی اٹھا کر باہر آگئے۔ کرم دین کے نئی آنے آگے ہنگڑا ناچ رہے تھے اور پیچھے پیچھے نازد کی ڈولی جناب علی کے سامنے سے لڑتی تھی۔

نوزین کے احساس سے آدمی مرنے نہیں جاتا۔ مجبوراً صبر کرتا ہے اور انتقام لینے کے لیے ہتھیار کا انتظار کرتا ہے۔ جناب علی نے بھی قسم کھائی کہ وہ کرم دین سے ایسا عبرت ناک

لے پیغام بھیجا۔ وہ ایک آزمودہ داماد تھا انکار کی گنجائش نہیں تھی اس لیے رشتہ نظر اور نکاح کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔

نکاح کے دن جناب علی بڑی شاندار بارات لے کر گیا۔ اس کی حویلی سے سزا تک ڈھول تانے بجتے رہے اور بارات میں شریک ہونے والے گھرجوان لنگ لگیت گاتے اور ہنگڑا ناچتے رہے۔ سسرال والوں نے بھی خوب رونق لگائی تھی۔ چھوٹے سے پنڈ کو دلہن کی طرح سجایا تھا۔ دلہن کی ڈیوڑھی سے پچاس گز کے ٹاٹے راستے کے اطراف رانٹل بردار نوجوان کھڑے ہوئے تھے اور سلامی کے طور پر رانٹلوں کی زبان سے دلہا کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ راستے کا ایک موڑ کان بارات دروازے پر پہنچی تو اچانک جناب علی کو خطرے کا احساس ہو گیا۔ اس کے کھلے دروازے پر چوہدری کرم دین دونوں ہاتھ کمر پر رکھے ہنستا کھڑا تھا۔ اسے دیکھتی تاشوں کی اتوار مچھنی، شادی کی جگہ موت کی سی خاموشی چھا گئی۔

چوہدری کرم دین نے ایک بڑک لگا کر کہا۔ ”اے جناب! یہاں سے وہاں تک رانٹلیں گھن لے۔ یہ سب میرے بند۔ میرے ایک اشارے پر تیرا قہم بنادیں گے۔ میں ہمیشہ اونچا شکار کھیلنے کا عادی ہوں طرح ذلیل نہیں ہوں کہ ایک بازاری عورت پر ہاتھ ڈالوں۔ تو جس شریف زادی کو آیا ہے، میں اسے تیری نگاہوں کے سامنے سے لے جاؤں گا۔ بول اپنے جوانوں۔ میرا راستہ روک لیں۔“

جناب علی نے اپنا سرائو فوج کر پھینک دیا اور گھوڑی سے اتر کر بولا۔ ”چوہدری! تو مجھے نہیں قانون کو لگا رہا ہے۔ یاد رکھ تو ایک بازاری عورت سے عدالت نہیں پہنچ سکا لیکن میں ایک شریف زادی کو اغوا کرنے اور اس کی بے کرنے کے جرم میں تجھے کڑی سے کڑی سزا دلا سکتا ہوں۔“

چوہدری کرم دین نے ایک فلک شکاف قہمہ لگایا۔ تھوڑی دیر تک اس کے آسے سارا ماحول گونج رہا پھر اس نے کہا۔

”بے وقوف میں وہی کھاتا ہوں جسے میں آسانی سے ہضم کر لیتا ہوں۔ کل بار نے نازنین سے نکاح پڑھوایا ہے وہ ذہنی، جسمانی اور قانونی طور سے میری ہوئی



”تم تک مجھے یو نہی سلاتی رہو گی۔ مجھے ایک بیٹے کی ضرورت ہے، بیٹا پیدا کرو“ نہیں تو میں دوسری لے آؤں گا۔ نازنین واقعی اسے سہارا دی تھی اور پھر وہ فقیروں کے ہاں جا کر تعویذ گنڈے کر رہی تھی مگر گاؤں کی ایک تجربے کار دانی نے بتا دیا تھا کہ وہ بانجھ ہے۔ اس سے اولاد نہیں ہوگی۔

یہ سننے ہی کرم دین چار ماہ کے بعد ایک نئی لڑکی بیاہ کر لے آیا۔ عورت اپنے مرد کی انتہاؤں کو تو برداشت کر لیتی ہے مگر نکاحی بیاہی سو کن کو کبھی برداشت نہیں کرتی۔ بس ماہ نازنین کا دل کھٹا ہو گیا۔ اسے اپنی وفاداری اور کرم دین کی کچھلی زیادتی یاد آنے لگی۔ ایک تو اس نے جبراً بندوبست کے زور پر نکاح قبول کروایا تھا اور جبکہ وہ جسم و جان سے ہاں کی ہو چکی تھی تو وہ محض ایک بیٹا پیدا نہ کرنے کے جرم میں اس کے اوپر سو کن لے آیا

وہ غصے سے تھلا لاتی رہی، کبھی عمارہ پر غصہ اتارتی اور کبھی اپنی سو کن سے جھگڑتی تھی۔ جناب علی کو اپنے تجربے کے ذریعے وہاں کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ وہ خبر کرم دین کی بی ایک ملازمہ بشیرا تھا۔ جناب علی نے بشیرا کے ذریعے نازنین کو کھلا سمجھا کہ جھجھکانے سے تمہاری بگڑی ہوئی تقدیر نہیں بنے گی۔ کرم دین مطلب کا بندہ ہے، صرف تمہارے من و شباب کا رسیا ہے۔ شباب ڈھلنے ہی تمہیں حویلی کے ایک کونے میں بٹھا کر بھول جائے گا۔ اگر تم اس کا مانع درست کرنا چاہتی ہو تو عمارہ سے محبت کرو۔ اتنی محبت کرو کہ وہ تمہارے اشاروں پر ناچنے لگے۔ وہ ظالم باپ کی ستائی ہوئی ہے تمہاری محبت پا کر وہ تمہارے ہاتھوں سے زہر بھی پینے کے لیے تیار ہو جائے گی۔“

نازنین نے ایسا ہی کیا۔ وہ رفتہ رفتہ عمارہ کو اپنی محبت کا بیٹھا زہر ملائے لگی۔ جیسے جیسے عمارہ بچپن سے جوانی کی طرف بڑھتی گئی، نازنین سے اس کی محبت اور عقیدت بھی بڑھتی گئی۔ باپ نے اسے مدرسے میں نہیں پڑھایا تھا اور نہ ہی حویلی میں بٹھا کر پڑھانے کے لیے کوئی ماسٹر رکھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکیاں پڑھ لکھ کر چالاک ہو جاتی ہیں، انہیں ہزار ہوں میں رکھو پھر بھی چٹھیاں لکھ کر عشق بازی کرتی ہیں لہذا عمارہ کو جابلو رہنا چاہیے۔ دن آنے پہ وہ بیٹی کو جس کے پلے باندھے گا اسی کے ساتھ وہ بے زبان گائے کی طرح چلی جائے گی۔

انتقام لے گا کہ اس کی آئندہ تسلیں بھی جناب علی کا نام سن کر تھرا میں گی۔ پھر مناسب موقع کا انتظار ہونے لگا۔ چوہدری کرم دین بہت محتاط تھا وہ اپنی کمزوری سے اسے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ تین سال بعد اس کی بیٹی سے عمارہ پیدا ہوئی۔ عورت کی عزت کو کھلوٹا سمجھنے والے بیٹی کے وجود کو اپنے لیے سمجھتے ہیں۔ کرم دین عمارہ کی پیدائش پر جھلا گیا۔ اس نے اپنی بیوی کو ایک ہزار گالیاں ڈالیں۔ ایک ماہ تک حویلی میں نہیں آیا۔ نازنین کو لے کر دوسرے مکان میں چلا گیا۔ جناب علی نے جب عمارہ کے متعلق سنا تو خوشی سے اچھل کر کہا۔

”ابا۔ اب چوہدری منہ کی کھائے گا۔ اب میری باری ہے وہ نازنین کو مجھ سے کرے گا۔ اب چوہدری منہ کی کھائے گا۔ اب میری باری ہے وہ نازنین کو مجھ سے کرے گا۔ اب چوہدری منہ کی کھائے گا۔ اب میری باری ہے وہ نازنین کو مجھ سے کرے گا۔“

ابھی عمارہ کے جوان ہونے میں دیر تھی۔ برسوں کا انتظار اور صبر و تحمل کی فراہمی۔ دشمن کو ذلت کی موت مارنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرنا پڑا ہے۔ انتظار ہی نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر رفتہ رفتہ اپنی سازش کو دشمن کی دلیہ تک پہنچا دینا دشمن کی دلیہ پر اس کا ایک ہی مہو تھا، وہ نازنین تھی، جس سے سالی اور بہن کی کار تھا۔ پرانے رشتے کی محبت اور۔ عورت نہیں جاتی۔

نازنین کی بہن مرگئی، بہن کا بیٹا واجد زندہ سلامت تھا جسے گلے سے لگے ترستی تھی مگر وہ زمینداروں کی دشمنی نے واجد تک پہنچنے کے تمام راستے بند کر دیے شروع شروع میں نازنین نے جناب علی کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ چوہدری کرم دین کے پاس بہت خوش تھی۔ ایک سال بعد عمارہ کی ماں چلی گئی۔ لے وہ تنہا چوہدری منہ کی حویلی میں راج کر رہی تھی۔ دولت اس کے قدموں چوہدری اس کا دیوانہ تھا۔ اس کی رعیت میں جتنے بھی لوگ تھے ان کی تقدیر کے ایک اشارے پر غنی اور بگڑتی رہتی تھیں۔ پھر وہ کیوں جناب علی کی باتوں میں نصیب کی آپ دشمن بن جاتی؟ اس لیے اس نے جناب علی کا ساتھ نہیں دیا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کا مزاج بدلتے لگا۔ عمارہ جب بھی کرم دین کے سامنے آتا جھڑکیاں دے کر بھاگتا تھا اور جھجھکا کر نازنین سے کہتا تھا۔

نہیں ہے؟“

عمارہ نے بڑی عقیدت سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”آپ پر بھروسہ نہیں کروں گی تو اور کس پر کروں گی۔ اس دنیا میں میرا اور کون ہے؟“

”ہاں میرے سوا تمہارا کوئی نہیں ہے۔ باپ کتنا ظالم ہے، وہ تم دیکھ رہی ہو۔ یہ کون عجیب سی بات ہے کہ میں سوتیلی ہوں مگر سگوں سے زیادہ چاہتی ہوں، وہ سگ ہے سوتیلوں کی طرح تم سے نفرت کرتا ہے۔ تم بہت بد نصیب ہو عمارہ!“

وہ اپنی بد قسمتی پر ہمیشہ روتی اور کڑھتی رہتی تھی اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ نازنین نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر کہا۔

”بچی کیس کی۔ روتی کیوں ہو؟ میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔ میری بات مانو اور شادی کرلو، تمہاری زندگی سنور جائے گی۔ وہ خوب صورت ہے، دولت مند ہے، تمہارے لیے زندگی کی ساری خوشیاں خرید سکتا ہے۔ بولو اس سے ملو گی؟“

وہ ہولے سے بولی ”مم۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ ابا کو معلوم ہو گیا تو وہ جان سے مار ڈالے گا۔“

”جب تمہارے ساتھ تمہاری زندگی کا محافظ ہو گا تو تمہارے دل سے سارا ڈر نکل جائے گا۔ واجد تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا اور تم سے نکاح پڑھائے گا اس کے ہاں تمہارے ابا تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکیں گے۔ تم حشت بیگ کو جانتی ہو، وہ جوار پکڑوں کی مل کے لیے یہاں کپاس کا سودا کرتے آتے ہیں وہ چوہ بڑی جناب علی سے، کپاس کی فصل کا سودا کرتے ہیں۔ دونوں زمینداروں سے ان کے کاروباری تعلقات ہیں انہوں نے اگلے ہفتے اپنی بیٹی کی شادی میں ہمیں لاہور بلایا ہے۔ ادھر سے جناب علی واجد بھی آئیں گے۔ میں موقع دیکھ کر تمہیں واجد سے ملاؤں گی یا جناب علی سے کہو کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جا کر واجد کے ساتھ تمہارا نکاح پڑھا دے۔“

”مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”پھر وہی ڈر کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہیں تباہی کی طرف لے جاؤں گی؟“

”نہیں۔ آپ میری بہت اچھی اہی ہیں۔ ابا مجھ سے دشمنی کرتے ہیں لیکن آپ

لیکن نازنین اسے ایسا سبق پڑھا رہی تھی جو کتا میں بھی نہیں پڑھا سکتی تھیں۔ جوانی میں خواب بھی بدل جاتے ہیں اور خیالات بھی۔ انہی کی مناسبت سے عمارہ کو عشق و محبت کی داستانیں سنایا کرتی تھی۔ ایسی داستانیں جن میں باپ ظالم ہوتا تھا اور بیٹی مظلوم۔ وہ بچے محبوب سے ملنا چاہتی تھی لیکن باپ اس کے راستے کا پتھر بن جاتا تھا۔ کمانی سانے کے دوران کسی خوبو عاشق کا ذکر آتا تو نازنین چٹکارے لے کر کہتی ”ہائے ہائے وہ ایسا زب صورت تھا جیسے واجد ہے۔ تم واجد کو دیکھو گی تو بس دیکھتی ہی رہ جاؤ گی میں کسی دن تمہارے ابا سے چوری اس کی تصویر منگواؤں گی۔ تم دیکھنا وہ ایک دم شزارہ معلوم ہوتا ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ وہ لڑکی جس سے محبت کرتی تھی وہ نوجوان دشمن قبیلے کے مردار کا بیٹا تھا۔“

کمانی ایسے نفسیاتی انداز میں سناتی جاتی تھی کہ عمارہ کی نگاہوں کے سامنے کمانی کا ہر ارادہ جسم ہو جاتا تھا۔ ہر کمانی کا دل اسے اپنے باپ کی صورت میں نظر آتا تھا اور میرو کا مور کرتے وقت واجد کی خالی تصویر سامنے آ جاتی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد نازنین نے واجد کی تصویر منگوا کر چپکے سے اسے دے دی۔ تصویر بچہ ہی کمانیوں کے تمام شزارے چپکے پڑ گئے۔ جتنے رازدارانہ طریقے سے وہ تصویر آئی لی اتنے ہی رازدارانہ انداز سے واجد اس کے دل میں آکر بیٹھ گیا اور اس کے دماغ کی اہل تختی پر محبت کی ایک نئی کمانی لکھنے لگا۔

اب وہ تھی اور واجد کی تصویر تھی۔ جب بھی اسے تھامی نصیب ہوتی وہ اپنے صندوق سے اسے نکال کر دیکھنے لگتی۔ رات کو بستر پر جب تنگ جاگتی اسے دیکھتی رہتی۔ نیند آ جاتی تو اسے دھڑکنے ہوئے سینے سے لگا کر سو جاتی۔

ایک رات نازنین نے پوچھا ”واجد سے ملو گی؟“

اس نے شرما کر منہ چھپا لیا۔

”دیکھو میں ہزار بار تمہیں سمجھا چکی ہوں کہ مجھے سوتیلی ماں نہ سمجھو۔ میں تمہاری بہن ہوں۔“

”آپ۔ آپ بہت اچھی ہیں۔“

”مگر میں اچھی ہوں تو مجھ سے اپنے دل کی بات کیوں چھپاتی ہو؟ کیا مجھ پر بھروسہ

بیٹوں سے آنکھیں ملا کر باتیں نہ کر سکیں۔ جب تک انسان دوسروں کو نچانہ رکھے خود کو اونچا نہیں کر سکتا۔ غرضیکہ اس ماحول میں ایسی تعلیم دی جاتی تھی جو کتابوں اور درسگاہوں سے کبھی نہیں ملتی۔

لیکن واجد کے دل میں ایک ذرا سی شرافت کہیں سے بھولے پھٹکے آگئی تھی۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کبھی مولوی کے گھر میں شیطان پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی شیطان کے گھر میں مولوی۔ اس کی نیک نیتی دور دور تک مشہور تھی کہ وہ پرانی ہونیٹیوں کے سامنے سے نظریں چمکا کر گزر جاتا ہے۔ نہ کسی کو چھیڑتا ہے نہ کسی سے ہاتھیں کرتا ہے۔ اتنی بڑی حویلی میں جہاں رنگارنگ لڑکیوں کا میلہ سالہا رستا تھا وہاں کوئی کھب جانے والی ہوگی مگر وہ کسی کی آزد نہیں کرتا تھا۔

چوہدری جناب علی نے جب بیٹے کو لڑکیوں سے کتراتے دیکھا تو تشویش پیدا ہوئی۔ نر پڑ جوانی میں پہچانا جاتا ہے، کہیں بیٹے کے روپ میں وہ بیٹی کی خصلتیں لے کر تو نہیں آیا ہے؟

کسی نے کہا ایسی بات نہیں ہے دراصل واجد نے لنگوٹ باندھ رکھی ہے، صبح و شام اکھاڑے میں جاتا ہے اب کے سال و نکل میں حصہ لینے کے لیے لاہور جائے گا۔ جناب علی نے جھلا کر حکم دیا۔

۳۱ اردو اس کی لنگوٹ۔ زمیندار کا بیٹا ہو کر پہلوان بن رہا ہے الوکا چھا۔“  
حکم حاکم مرگ مغابات کے مصداق الو کے بٹھے کی لنگوٹ انا ددی گئی۔ اسے رنگیلے اور زہد لوگوں کی محبت میں بٹھا یا گیا۔ جب ان کی رنگین اور سنگین باتیں سن کر اس کی طبیعت میں ترک آنے لگی تو اسے کچھ دنوں کے لیے تجربے کا درود ستوں کے ساتھ لاہور کی رنگین گلیوں میں بھیج دیا گیا۔ زمینیں کس طرح خریدی جاتی ہیں وہ بچپن ہی میں سیکھ چکا تھا اور کس طرح خریدی جاتی ہے وہ جوانی میں سیکھنے لگا۔

جناب علی کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اس کی دولت کو ٹھٹھے پر ضائع ہو بلکہ وہ صرف اتنا چاہتا تھا کہ میرے منہ کو خون کا چمکا لگا جائے اس کے بعد کوٹھے کا راستہ بند کر دیا جائے گا۔ ان کی اپنی کوٹھی میں عورتوں کی کمی نہیں تھی۔ بعض کوٹھنی اور کوٹھے میں بس اتنی ہی فرق ہوتا ہے کہ کوٹھے سے تعلیم حاصل کی جاتی ہے اور کوٹھی میں اس تعلیم سے ساری زندگی

مجھ سے دشمنی نہیں کر سکتیں۔ میں یہ سوچ کر ڈرتی ہوں کہ نہ جانے وہ لوگ مجھ سے کیا سلوک کریں گے۔“

۳۲ اچھا سلوک کریں گے کہ تم وہاں سے واپس آنا بھول جاؤ گی۔ تمہارے اباؤ خواہ جناب علی کے دشمن بن گئے ہیں مگر جناب علی تمہیں بیٹی سمجھ کر محبت کرتا ہے۔ تمہیں آنکھوں میں بٹھائے گا، دل میں جگہ دے گا اور واجد تو ہمیشہ تمہیں اپنے بیٹے کا کر کے گا اور اس طرح پیدا کرے گا۔“

نازنین نے اسے سینے سے لگا کر چوم لیا۔ وہ پلنگ پر لیٹے ہی لیٹے شرم سے دھڑا ہو گئی۔

سازش کتنی دھیمی، کتنی میٹھی اور کتنی محبت میں ڈوبی ہوتی ہے یہ ایک ان پڑہ لڑکے اور معصوم دہائی لڑکی نہیں جانتی تھی۔ خوابوں سے کون نہیں بھٹکتا؟ وہ بھی بل رہی تھی۔

عشق یہ کمائیوں کے پچکنے راستے پر کون نہیں پھسلتا؟ وہ بھی پھسل رہی تھی۔ انجام سے بے خبر۔



مالی کے کمرے میں روشنی نہیں تھی کوٹھی کے چلتے بچتے قہقروں کی جھنجھکی روشنی وہاں تک پہنچنے پہنچتے دم توڑ رہی تھی۔ اس نیم تاریکی میں واجد سر جھکائے چاہا۔ بیٹھا ہوا تھا۔

دور کوٹھی کے اگلے حصے سے ہارمونیم اور طبلے کی آوازیں آرہی تھیں۔ محفل کا جھنکار اور نغمے کی ڈوبتی ابھرتی لے میں کوئی بانی جی بجز اپیش کر رہی تھی۔ واجد اکی ٹھٹھا شوقین تھا۔ ناچ و رنگ اور شراب و شباب کے نشے میں ڈوبے رہنے کی عادتیں اسے اس میں ملی تھیں۔ اس کے خاندان میں بھی تعلیم حاصل کرنے کا دستور نہیں تھا۔ ان کے کتابیں پڑھا کر عرصائے کرنے کے بجائے زراعت کی عملی تعلیم دی جاتی تھی۔ زربہ بانجھ زمینوں کی شناخت، فصلوں کی بوائی کٹائی کے طریقے، ایک کسان کے پیسے کمال زمین کی بیچائی ہو سکتی ہے، کھیت مزدوروں کو دوا چاہیٹ کھلا کر کس طرح اڑا جاتا ہے اور کس طرح ان کی ہونیٹیوں کو مسل کر رکھا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی عزت

استفادہ کیا جاتا ہے۔  
لیکن واجد اپنے باپ کی امیدوں کے مخالف جا رہا تھا۔ کوٹھے کی رنگینوں میں لڑنے کے باوجود پنڈ کی شریف بونیٹوں سے بدکتا تھا۔ اس کی پرہیزگاری جناب علی کی کھلم نہیں آئی۔ اس نے غصے سے کہا۔

”اس گدھے سے جا کر کہو اگر مولوی بن کر رہے گا تو چودہری کرم دین سے انتقام لے گا۔ اس کی بیٹی جو ان ہو گئی ہے وہ کسی کے ساتھ چلی گئی تو میں اس مرد کو بٹالے سے انکار کر دوں گا۔“

باپ کا پیغام بیٹے تک پہنچا دیا گیا بلکہ عمارہ کی ایک تصویر بھی اسے دے دی گئی کہ اپنے شکار کو اچھی طرح پہچان لے۔ یہ تصویر بس یونی سی تھی کسی میلے میں ڈال دی گئی تھی۔ کی اتاری ہوئی تھی۔ روشنی اور سائے کے امتزاج سے تصویر کے حسن کو جس طرح دکھاتا جاتا ہے وہ بات اس میں نہ تھی پھر بھی چہرے کے کھینکے نقوش خسار آلود آنکھوں کی کلم اور جسم کی شادابیاں واضح تھیں۔ اگر یہ سب کچھ نہ بھی ہوتا تب بھی واجد اپنی توبہ نواز کیونکہ وہ دشمن کی بیٹی تھی۔ خاندانی روایات کے مطابق انتقام لینا اس کا سب سے فرض تھا اور فرض کی ادائیگی میں بعض اوقات نیکی اور بردی کی تمیز نہیں کی جاتی۔

تصویر کو دیکھ کر اس نے سوچا کہ لڑکی حسین ہے، اپنے معیار کی ہے، اس کے ماں تھوڑا سا وقت گزارا جاسکتا ہے اور اسے بھولنے کا وقت آئے تو جس طرح طوائف بھلا دیا جاتا ہے اسے بھی بھلایا جاسکتا ہے۔ لیکن عین نگاہوں کے سامنے آنے کی صورت اور بولتی صورت کو دیکھنے کا فرق واضح ہو گیا۔

وہ چارپائی سے ہڑبا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ عین نگاہوں کے سامنے آگئی تھی۔ دروازے پہلے ایک تاریک سائیلا نظر آیا۔ پھر کوٹھی کے سرخ تختے روشن ہوئے۔ عمارہ کا چہرہ دانے کی طرح کھل گیا۔ وہ جینٹ کی چادر میں لپی سر جھکائے کھڑی تھی۔ سرخ تختے گئے، مزہ روشن ہوئے، اس کا چہرہ ناگن کی پختی جلد کی طرح سبزی مائل ہو گیا۔

ہوئی ایک قدم آگے بڑھی اور کمرے کے اندریوں آگئی جیسے کوئی ناگن خاموشی سے اس کے لیے رگ جاں تک پہنچ گئی ہو۔  
بزرگ نے بھگ گئے، زرد روشن ہو گئے۔ حلقہ چہرے پر ریاست کا رنگ چھانبا۔  
”میں بتاتا ہوں۔ انہوں نے کہا ہو گا کہ تمہاری فریاد سن کر میں تمہیں قدموں سے ڈالوں گا اور دل میں بٹالوں گا۔ دیکھ تو تم میرے دھڑکنے ہوئے دل کے قریب آگئی ہو۔“  
نئے کوئی ہنسی پہلی بار جال میں پھنس کر کانپتا ہے اسی طرح وہ ہولے ہولے اس کی آواز میں لرز رہی تھی۔

”تم بہت اچھی ہو عمارہ۔ بہت اچھی اور بہت معصوم۔ تمہارے بھائی نے  
خرید لیا ہے۔ میں اپنے بزرگوں کی دشمنی اور ان کی آپس کی نفرتوں کو بھول کر نہیں  
سے اپنا رہا ہوں تم میرے ساتھ چلو گی؟“  
اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تم میرے لیے اپنے آپ کو اپنے رشتے داروں کو اور اپنے گاؤں کو چھوڑ دو گی؟“  
وہ سر ہلا کر بولی۔

”ہاں۔ آپ مجھے چھوڑ تو نہیں دیں گے؟“  
”نہیں۔ میں آخری سانس تک تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا جب میں مر جاؤں۔“

عمارہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا ”تو میں بھی مر جاؤں گی۔“ واجد نے اپنے  
پر رکھی ہوئی گلابی پتیلی کو چوم لیا۔ تھوڑی دیر تک وہ ایک دوسرے کی محبت و فتن  
سرشار ہوتے رہے پھر کمرے کے باہر کسی کی آہٹ سن کر چونک گئے۔ نازنین  
دروازے پر آکر کہا ”کیا تم لوگوں کو خطرے کا احساس نہیں ہے۔ چلو نکلو میاں۔“  
گیٹ پر بیٹھا انتظار کر رہا ہے وہ تمہیں جہاں لے جائے وہاں چلے جانا۔“

واجد نے کہا ”لیکن میں تو عمارہ کو اپنے ایک دوست کے ہاں لے جانا چاہتا ہوں۔“  
”نہیں!“ نازنین نے سخت لہجے میں کہا ”تمہارے ابا نے کہا بھیجا ہے کہ تم  
بشیرے کے ساتھ جاؤ گے۔ رائل پارک میں تمہارے کہیں رہنے کا انتظام ہو گا۔“  
صبح آکر تم سے ملیں گے، تم دونوں کی حفاظت کرنا۔ ان کا فرض ہے وہ جیسا کہتے ہیں  
کرو۔ چلو جلدی میاں سے نکل جاؤ۔“

واجد نے عمارہ کا ہاتھ تھام لیا۔ کہیں بھی وہ رات گزارنی تھی اور دوسری  
زمینوں پر چلے جانا تھا لہذا اس نے نازنین خالہ سے بحث نہیں کی چپ چاپ عمارہ  
وہاں سے نکل گیا۔

رات کے گیارہ بجے تھے۔ لکشمی چوک اور رائل پارک میں اچھی خاصی  
تھی۔ تماشا بین سینما گھروں کا طواف کر رہے تھے۔ کچی عمر کے چھوکرے جو کرا  
بھاگ کر فکروں میں ہیرو بننے کے لیے آتے تھے وہ ہوٹلوں میں برتن دھو رہے تھے۔

کہا ہے تھے جو ہوٹلوں کے باہر بیٹھے ہوئے فلاپ فکروں کے پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں  
کی بچی کر رہے تھے اور کچھ لڑکے رائل پارک کے دفاتروں میں سوڑے کی بوتلیں پینا  
رہتے۔ رائل پارک کی دفاتروں میں گھروں سے بھاگ کر آنے والیاں لڑکیاں بھی  
نہیں اشتہاری فکروں میں چائس لینے والی ماڈل گرلوں بھی اور اویز عمر کی ایسی عورتیں جو بیڑا  
مٹی میں غیر قانونی طور پر دلالہ کھلاتی تھیں لیکن قلمی دنیا میں قانونی طور سے انہیں ایکسٹرا  
پلازما کہا جاتا تھا۔

ان دفاتروں میں عورتوں کی کھٹکتی ہوئی ہنسی اور مردوں کے گونجنے مگر جتنے ہوئے قہقہے  
لگتے ہوئے تھے۔ سوڑے کی بوتلیں کھل رہی تھیں۔ کھلی ہوئی کھڑکیوں سے شراب کے  
پلے اور پان کی جھپٹکیں باہر آرہی تھیں۔ وہیں ایک گلی کے آخری دفتر میں عمارہ اور واجد  
پابجیت کی پہلی رات گزار رہے تھے۔

کمرے میں اندھرا تھا۔ اس اندھیرے میں کبھی کبھی ان کی میٹھی سرگوشیاں ابھرتی  
تھیں اور پارک کے کسی نازک موڑ پر پہنچ کر گرم ہو جاتی تھیں۔ بند دروازے کے باہر بشیرا  
بچے بھائی فضلے کے ساتھ بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا۔

فضلہ پانچ برس پہلے نوکری کی تلاش میں پنڈ چھوڑ کر میاں آیا تھا اور تب سے فلم کے  
دفتر میں چڑاسی کا کام کر رہا تھا۔ اس کی رہائش اسی دفتر میں تھی۔ ان دنوں اس کا  
محب آؤٹ ڈور شوٹنگ میں گیا ہوا تھا اس لیے میدان خالی دیکھ کر اس نے بشیرے کو  
بازت دے دی تھی کہ وہ کسی بھی چھوکرے کو میاں لاسکتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد فضلے نے  
نے کاش لگا کر پوچھا ”تو نے کہا تھا کہ وہ بڑی (عورت) تیری ہے پھر وہ زمیندار کا بیٹا وہاں  
بکر رہا ہے؟“

بشیرے نے جواب دیا ”وہ بڑی میری ہے۔ جب پولیس میاں آئے گی تو مجھے یہی بیان  
دیا ہو گا۔“ فضلے نے لا پرواہی سے کہا ”میاں پولیس کبھی نہیں آئے گی۔ میاں جتنے دفتر  
والے ہیں سب تھانے والوں کو کھلاتے پلاتے رہتے ہیں اس لیے میاں کبھی پولیس کا چھاپہ  
نہیں لگتا۔“

”وہ اور بات ہے۔“ بشیرے نے کہا ”پنا چودھری جناب علی دور تک پہنچا ہوا ہے  
بل کے تھانے دار سے سب باتیں کر لی ہیں۔ ابھی میاں پولیس آئے گی۔ تجھے تو کسی بات

”ہمت دیر ہو گئی ہے“ آپ کا لڑکا ابھی تک نہیں آیا ہے۔“  
 ”جی آئی ہو گا اگر پانچ منٹ تک نہیں آیا تو میں خود جا کر اسے لے آؤں گا۔ آپ  
 انتظار رکھیں کہ لڑکی حوالات میں ضرور پہنچ جائے اور اخباروں میں اس کا نام جلی  
 میں شائع ہو جائے۔“ جناب علی نے کہا۔

”تب ہو جائے گا“ فکر نہ کریں۔“ تھانیدار نے کہا۔  
 ”لیک بات کی فکر ہے“ چوہدری کرم دین بیٹی کو یہاں سے لے جانے اور خود کو بدنامی  
 پانے کے لیے آپ کو بڑی سے بڑی رقم دے گا۔ میں دو ہزار آپ کو دے چکا ہوں  
 کے بعد کرم دین آپ کو جتنی بھی رقم دے گا میں بھی اتنی رقم نقد ادا کروں گا۔ میں  
 ہوں کہ وہ اپنی ساری دولت اور ساری زندگی داؤ پر لگانے کے بعد بھی بدنامی سے نہ بچ

”لیک ہے ایسا ہی ہو گا“ آپ اطمینان رکھیں۔“ تھانیدار نے کہا۔  
 اس وقت واجد بشیر کے ساتھ وہاں آگیا۔ جناب علی نے تھانے دار سے کہا۔  
 ”پیر الڑکا ہے میں اسے لے جاتا ہوں۔ اب آپ اپنا فرض ادا کیجئے۔“

تھانے دار نے کمری نظروں سے واجد کو دیکھا پھر کہیں سے باہر آکر اپنے سپاہیوں کے  
 وہاں سے چلا گیا۔ واجد نے حیرانی سے پوچھا ”ابا جان کیا بات ہے؟“  
 ”کچھ نہیں“ تم میرے ساتھ آؤ۔“ وہ تیزی سے چلتا ہوا ہوٹل سے باہر جانے لگا واجد  
 لے کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے پوچھا۔

”آؤ کچھ بتائیے یہ اسپینز کہاں گیا ہے؟ آپ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟ عمار  
 اکیلا ہے میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتا۔ جناب علی اپنے پرانے مائل کی کار  
 لے آکر گیا اور دروازہ کھول کر بولا ”چلو بیٹھو۔ وہ بعد میں آجائے گی۔“

واجد نے ایک دم پیچھے ہٹ کر کہا ”میں وہ میری خاطر اپنے باپ کا گھر چھوڑ کر آئی  
 میں اسے چھوڑ کر یہاں سے نہیں جاسکتا۔“ جناب علی نے غرا کر کہا ”تم میرے حکم  
 انکار کر رہے ہو۔ جانے ہو وہاں تھانے دار گیا ہے“ اس کے ساتھ ہمیں بھی حوالات  
 بند کر دیا جائے گا۔“

واجد کے چہرے پر غمی آگئی ”اس کا مطلب ہے کہ آپ نے چوہدری سے بدلہ لینے  
 کے لیے جال بٹا ہے۔“

کی فکر نہیں ہونا چاہیے۔ اس کام کے لیے تجھے دو سو روپے دیے ہیں۔ اگر تم  
 مصیبت آئے گی تو چوہدری تجھے اور پیسے دے گا۔ تیری ہر طرح سے مدد کرے گا۔  
 فضلے نے حقے کی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تجھے اپنی فکر ہے یا نہیں؟۔ وہ زمیندار کا چھوڑا وہاں بیٹھ کر رہا ہے اور  
 میں اس لڑکی کے ساتھ بدنام ہو کر جیل جائے گا۔“

”مفت میں نہیں۔ چوہدری مجھے مخفی رقم دیتا رہتا ہے۔ آگے بھی دیتا رہے گا  
 کون سا نیک نام ہوں۔ اتنے بڑے زمیندار کی بیٹی کے ساتھ بدنام ہونا بھی بڑے  
 بات ہے۔ ذرا ٹائم دیکھ، ہمت دیر ہو گئی ہے۔ وہ لوگ ہوٹل میں میرا انتظار کر رہے  
 تھے۔“

”یہاں دفتر میں گھڑی نہیں ہے۔ میرے خیال میں ایک بج رہا ہے۔“ بشیر  
 کراٹھ گیا اور دروازے پر آکر دستک دینے لگا اندر سے واجد کی آواز آئی۔

”کون ہے؟“  
 ”میں ہوں بشیر!“

”جھاگ جاؤ یہاں سے۔ چپ چاپ سو جا۔“  
 ”مالک بہت ضروری کام ہے چوہدری صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔“

اس بار کوئی جواب نہ دیا ذرا دیر کی خاموشی کے بعد کمرے کے اندر روشنی ہو گئی  
 مطلب تھا وہ کمرے سے نکلنے کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ بشیر اسی خیر نظروں سے  
 دیکھتے لگا۔ واجد نے دروازہ کھول کر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد پوچھا۔

”کہاں ہیں ابا جان؟“  
 ”وہ ادھر ایک ہوٹل میں بیٹھے ہیں“ آپ کو بتا رہے ہیں۔“ واجد تھوڑی دیر کا

رہا پھر اس نے پلٹ کر کہا ”عمارہ دروازہ بند کرلو“ میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ کمرے  
 آگیا۔ دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔ اس نے بڑی محبت اور حسرت سے بند دروازے کا

اس کاٹل نہیں چاہتا تھا کہ عمارہ کو چھوڑ کر جائے لیکن جو باپ اس کی محبت کا مانو  
 ہے اس کے حکم سے انکار کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ بڑی بے ملے ہوئی

جائے لگا۔ ہوٹل کے ایک کہیں کے باہر دو سپاہی ایک میز پر بیٹھے چائے پیا رہے  
 کہیں کے اندر جناب علی ایک تھانے دار کے ساتھ باتیں کر رہا تھا تھانے دار نے

نہ گناہ کی عمر کسلائی ہے وہ پہلے شرماتی ہے۔ مرد کو صدیاں گزر جاتی ہیں لیکن وہ شرماتا۔

قلعے دار نے کرسی پر پسلوبد لئے ہوئے جناب علی سے کہا ”چوہدری صاحب آپ کا فوری اقرار کر رہا ہے کہ اس لڑکی کو بھگا کر لایا ہے۔ میں کیا کروں بتائیے اب تو لڑکی ماٹھ لڑکے کو بھی قلعے لے جاتا ہوگا۔“ جناب علی غصے سے واجد کو دیکھنے لگا۔ واجد

”اے چوہدری صاحب! اباجان سے مت پوچھئے میں آپ سے احتجاج کرنا ہوں کہ مجھے عمارہ کے حالات میں بند کر دیجئے۔ میں اسے چاہتا ہوں میں اس سے شادی کروں گا۔ میرا دل ہے اس لیے مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔“

جناب علی نے غصے سے کہا ”تم ایک چھو کر کی خاطر چوہدری کے سامنے سر جھکانا نہیں۔ لیکن میں ہار ماننے والا نہیں ہوں۔ مجھے یہ منظور ہے کہ تم جیل چلے جاؤ لیکن یہ نہیں ہے کہ چوہدری اتنی بڑی بدنامی سے بچ کر نکل جائے۔“

واجد نے پوچھا ”میں جیل جاؤں گا تو کیا آپ کی بدنامی نہیں ہوگی؟“  
 ”ہوئی تو ہوگی ایک بدنامی ہوگی۔ ہزار گناہ کے بعد بھی مرد کی نیک نامی کو خدشہ پہنچتی۔ لیکن عورت ایک بار بدنام ہو جائے تو اس کے دروازے پر رشتہ مانگنے تو کیا توڑنے کی نہیں جانتا۔ اب اس سے ہمتز انتقام اور کیا ہو سکتا ہے کہ چوہدری ساری ایک ٹیٹی کا بوجھ اٹھائے پھرے گا اور اپنے برابر کے لوگوں سے نظریں ملا کر بات نہیں کرے گا۔“

قلعے دار نے ہاتھ اٹھا کر جناب علی سے کہا ”چوہدری صاحب! آپ میرے سامنے دشمن سے انتقام لینے کی باتیں نہ کریں۔ یہ قانون کے خلاف ہے مجھے جو کچھ کرنا ہے اسے مطابق سوچ بچھ کر کروں گا۔ آپ چپ چاپ تماشہ دیکھیے۔“  
 ”تمہیں دروازے پر دستک ہوئی اس کے ساتھ ہی سپاہی کی آواز سنائی دی۔“

”جناب چوہدری کرم دین حاضر ہے۔“  
 ”ٹانڈر اور سٹ کر کوٹے میں چلی گئی۔ جناب علی اپنی کرسی پر فخریہ انداز میں اکڑا۔ واجد رشتان نظروں سے دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ قلعے دار اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی جانب جا رہا تھا۔ جناب علی نے کہا۔

”ہاں اس نے سیکڑوں براتیوں کے سامنے میری بے عزتی کی تھی۔ تمہارا زبردستی نکاح پر بھگا کر میری غیرت کو لٹکا رہا تھا۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ اسے شکار کھیلوں گا۔ آج میری قسم پوری ہو رہی ہے۔“

”آپ چوہدری سے انتقام لینے کے لیے ایک معصوم لڑکی کو بدنام کر رہے۔ کہاں کا انصاف ہے۔ عمارہ نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔“  
 ”نازنین نے بھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ وہ بھی کسی کی بیٹی تھی۔ کہیں سے زبردستی کیوں کی تھی؟ تم مجھ سے بحث نہ کرو۔ چلو میرے ساتھ۔“

واجد نے بے بسی سے کہا ”جی بات ہے میں آپ سے بحث نہیں کروں انتقام لیجئے لیکن میں عمارہ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے رائل پارک کی طرف جانے لگا۔ جناب علی نے کار کے دروازے کو ایک جگہ کرتے ہوئے کہا۔  
 ”اے لو کا بھگا۔“



کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایک کرسی پر قلعے دار بٹ دو سری کرسی پر جناب علی تھا اس کے پیچھے بشیر اور فضلہ ہاتھ باندھے کمرے کے وار کے قریب کھڑا ہوا واجد سر جھکائے عمارہ کی جانب دیکھ رہا تھا۔

وہ ایک کونے میں چھینٹ کی چادر اوڑھے بیٹھی تھی اور مٹھنوں پر چھپائے سسکیاں لے رہی تھی۔ وہ اپنی زندہ لاش پر آنسو بہا رہی تھی۔ وہ ایسی لڑکی تھی جس نے اپنی زندگی میں کسی سے نفرت نہیں کی تھی بلکہ کی نفرتوں کا نشانہ بنتی رہی تھی۔ وہ ایسی بے نیاز تھی کہ اس نے کبھی کسی سے اور جب اپنے محبوب سے ایک اعتماد کا رشتہ لے کر محبت کی انمول سومات۔ بدنامی کے کانٹوں پر لا کر بٹھا دیا گیا۔

کچھ ہی دیر میں اس کا باپ آنے والا تھا۔ قلعے دار نے کرم دین کو ایک سپاہی بھیج دیا تھا عمارہ کو اس بات کا خوف نہیں تھا کہ اس کا باپ اسے موت اب اسے آسان نظر آرہی تھی لیکن ذلت اور رسوائی کی جو موت اتنی شرمناک تھی کہ شرم سے نظریں اوپر نہیں اٹھا سکتی تھی۔ یہ عجب کا

لیکن ایسے وقت انسان کو اپنی غلطیاں یاد نہیں آتیں۔ وہ جو انتقام کی آگ ہوئی ہے لافرت کی بجلی میں سلگتی رہتی ہے۔

شمت بیگ نے جناب علی سے شکایت کی مچوہری صاحب آپ نے عمارہ کو میرے رستہ لاکرا چھانسی کیا۔ آپ کو کم از کم میری عزت کا خیال کرنا چاہیے تھا۔“  
جناب علی نے کہا ”میں کسی کو لے کر نہیں آیا ہوں عمارہ ہی واجد کے ساتھ آئی ہے۔ یہ دونوں حالات میں جائیں گے اور ان کے دماغ درست ہو جائیں گے۔“  
شمت بیگ نے حیرانی سے کہا ”تو جب ہے آپ ابھی معاملے کو یہاں ختم کرنے کے لئے بیٹے کو بھی حالات میں بھیجتا چاہتے ہیں؟“

جناب علی نے غصہ سے کہا ”یہ نالائق میرا بیٹا نہیں ہے۔ جب تک یہ میری مخالفت کرے گا اس وقت تک میں اسے اپنا بیٹا تسلیم نہیں کروں گا۔“  
”یہ کیا بات ہوئی؟“ شمت بیگ نے پوچھا ”کیا واجد آپ کی مرضی کے خلاف عمارہ بلالایا ہے؟“

واجد نے شمت بیگ سے کہا ”چاچا جی! بابا جان یہ چاہتے تھے کہ میں عمارہ کو یہاں بہانہ ہونے کے لیے جھوڑوں اور خود ان کے ساتھ پٹو ڈاپس چلا جاؤں۔ لیکن مجھے نہ ہری صاحب سے دشمنی ہے اور نہ ہی میں عمارہ کو کسی مصیبت میں تھما چھوڑنا چاہتا ہوں۔ مجھے حالات کی دھمکی دے رہے ہیں حالانکہ یہ حالات تو کیا میں عمارہ کے ساتھ لے کر نکلے تو بھی چڑھنے کو تیار ہوں۔“ مچوہری کرم دین نے چونک کر اسے دیکھا وہ ہنس بھی نہیں سکتا تھا کہ واجد ایک دشمن کی بیٹی کے لیے اپنے باپ کی مخالفت کرے گا ایک کرم دین کے دماغ میں یہ بات آئی کہ وہ اپنے دشمن سے اس کے بیٹے کو چھین لے گا۔

بل جین سکا ہے۔ بدنامی کے بعد بھی عمارہ کو کسی نہ کسی کے پلے باندھنا ہی ہو گا پھر رستہ کیل نہ اسے منسوب کیا جائے جبکہ وہ دونوں ایک دوسرے کو جی جان سے چاہتے ہیں اس سے بہتر انتقام اور کیا ہو گا کہ ایک بیٹے کو اس کے باپ سے چھین لیا جائے۔  
آؤ ان کا چراغ ہوتا ہے پوچھا پے کا سارا ہوتا ہے۔ جناب علی کی کراہیک دم سے ہلے گی۔ بعض اوقات دشمن تیرے نہیں مرنے، تلوار سے نہیں مرنے، گھر میں ایک آدمی کے رشتے سے مر جاتا ہے۔ بیٹی خدا کی دین ہے دنیا کا سب سے قیمتی ختم ہے جو

”مچوہری کے پاس ریو الوور ہے وہ یہاں آتے ہی مجھ پر حملہ کرے گا۔“  
ریو الوور نے کہنے۔

تھانے دار ٹھنک کر دروازے پر رک گیا۔ اس نے اپنے سپاہی کو آواز دی۔  
مچوہری سے ریو الوور نے کہے۔ ”تھوڑی دیر بعد آواز آئی“ جی حضور ریو الوور نے۔  
تھانے دار نے دروازہ کھول دیا۔ باہر ایک سپاہی کے پیچھے مچوہری کرم دین شمت بیگ کھڑے ہوئے تھے۔ کرم دین کے چہرے پر مروتی چھائی ہوئی تھی۔  
اس نے اندر آنا چاہا۔ تھانے دار نے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔

”ٹھہریے! آپ ادھر دیوار کے پاس کھڑے ہو جائیے۔ اگر آپ نے لڑنا ہے میں بڑی سختی سے پیش آؤں گا۔“

شمت بیگ نے کہا ”آپ اطمینان رکھیے ہم خود نہیں چاہتے کہ کوئی ہمارے بات اس کمرے سے باہر جائے۔“ وہ دونوں اندر آگئے۔ کرم دین کی نظریں اپنے دشمن پر گئیں۔ وہ طنز انداز میں مسکراتے ہوئے اپنی مونچھوں پر ہلکے اس نے کوئی نہیں دیکھی ہوئی عمارہ کو دیکھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنا کیا زیادہ یوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کے کھٹے کانپنے لگے۔ وہ ذرا سال بڑھ گیا پھر شمت بیگ نے کمرہ سنبھل گیا۔ اس نے دل میں کہا۔

”اؤ اسی دن کے لیے میں بیٹی کی پیدائش پر جینھلایا تھا۔ میں تیرے ہر سے نہ ہی دشمنوں کی چال سے لیکن ایک بیٹی کی لغزش نے مجھے بے موت مار دیا۔“  
جناب علی کے سامنے نظریں نہیں اٹھا سکا۔ میں یہ تو بہن کیسے برواشت کرنا کے جوش میں آکر بیٹی کے گلے سے گلے کر دوں تب بھی یہ بدنامی ہو کر رہے گی کی غلطی کو معاف کر دوں پھر بھی وہ زندہ لاش کی طرح میرے گھر پر پڑی رہے گی۔  
مندرے قبول کرنے نہیں آئے گا۔

مجھے ہنتا کر دیا گیا ہے میں نہ تو دشمن کو مار سکتا ہوں اور نہ ہی خود کو۔ کیونکہ میں بزدلوں کی طرح مرنے نہیں چاہتا۔ میں آخری دم تک جناب علی کی کوشش کرتا رہوں گا۔

ایسے وقت بھی وہ انتقام کے متعلق سوچ رہا تھا حالانکہ اسے اپنی بھلی متعلق سوچنا چاہیے تھا۔ وہ بھی کسی کی بیٹی کو اور کسی کی ہونے والی دکن کو



تھانے دار نے انکار کر دیا۔

رشت کی رقم بڑھتی گئی۔ تھانے دار جناب علی کی طرف دیکھ گیا اور انکار کر گیا۔  
باب علی کی خاموش نظروں کہہ رہی تھیں کہ میں اس سے زیادہ رقم دے سکتا ہوں لیکن  
وہی ثابت کے لیے میڈیکل رپورٹ ضرور حاصل کرنی ہوگی۔

کونے میں سٹھی ہوئی عمارہ کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔ اس کے بہت سے حامی اور ہمدرد  
نے ہر لمحہ غمناک حسی تھی۔ بعض اوقات اپنی کی ہمدردیاں کام نہیں آتیں، صرف دعا کا  
بلا کا سہارا جاتا ہے کہ شاید قبول ہو جائے۔ اس نے سسکتے ہوئے دعا مانگی۔ ایک  
لاٹھی ہوئی بہت سی دھیمی سی آواز اس کی دل کی گہرائی سے نکلی۔  
”برابرا! بھائیوں۔ بچالے۔ رہا۔!“



ہاں ہسپتال کے برآمدے میں یوں بیٹھے تھے جیسے عدالت کے دروازے پر عمارہ کی  
ذر کا فیصلہ سننے بیٹھے ہوں۔ یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ فیصلہ کیا ہو گا لیکن اس فیصلے کو  
مہیا جاسکتا تھا۔ غلطی کس سے نہیں ہوتی؟ اور اس غلطی کی سزا کے نہیں ملتی؟ سزا ضرور  
لنا چاہیے لیکن اسے اشتہار بنا کر ایک لڑکی کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہیے، اس کے  
بارے خاندان کو بدنام نہیں کرنا چاہیے۔ بس وہ یہی چاہتے تھے جہاں تک بدنامی ہو چکی  
ہے وہاں سے آگے نہ بڑھے۔

چوہدری کریم دین نے کراچے ہوئے کہا ”خدا مددگار ہے وہ ہماری عزت رکھے گا۔“  
حشمت بیگ نے تائید کی ”ہاں جب تمام سہارے چھوٹ جاتے ہیں تو ایک اسی عالم  
غیب کا سہارا رہ جاتا ہے۔“ واجد ان سے ذرا دور سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے دل میں کہا  
”مہیا میں رانا پانی ہوں مگر عمارہ ایسی نہیں ہے، زندگی میں پہلی بار اس سے ایک غلطی  
ہو گئی ہے، مجھے میرے بچانے پر۔ تو اس کی سزا مجھے دے، اس مظلوم کو بچالے اس کے  
اگرے دامن پر جو دم لگا ہے، اسے مٹا دے۔ تو قادر مطلق ہے، تیرے لیے ناممکن کو  
ممکن بنا دیتی بات نہیں ہے۔“

تو کہہ بخت انسان کو کس وقت خدا یاد آتا ہے؟ جب کہیں سے بچنے کی کوئی صورت  
نظر نہیں آتی تو وہ ایک معجزے کی تمنا کرتا ہے۔ لیکن خدا اب کیا کر سکتا تھا؟ کیا طبی  
معالجے کو لگا دیتا یا میڈیکل رپورٹ کو بدل دیتا؟ عقیدے کے مطابق یہی سوچا جاسکتا

عورت اپنے خاوند کو دیتی ہے میں خواہ مخواہ بیٹی کی پیدائش پر مجبور کیا تھا۔

اس نے واجد سے کہا۔

”بیٹے تم سمجھدار ہو۔ مجھے بھی تم سے کوئی عداوت نہیں ہے۔ اگر تمہارا باب  
عاق کرتا ہے تو کر لے۔ آج سے تم میرے بیٹے ہو۔“  
حشمت بیگ نے خوش ہو کر تھانیدار سے کہا ”جناب لڑکی راضی ہے لڑکی  
راضی ہے اور لڑکا بھی راضی ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اب اس  
کو آگے نہ بڑھائیں۔“

”نہیں جناب!“ جناب علی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا ”میں راضی نہیں ہوں  
اس معاملے کو عدالت تک لے جاؤں گا۔“

تھانیدار نے کہا ”میں کسی کا مشورہ نہیں سنتا چاہتا۔ میں قانونی کارروائی کو  
لڑکے اور لڑکی کو فحاشی کی الزام میں گرفتار کر کے لے جاؤں گا۔“ فحاشی؟ کمر ہیز؟  
بیگ اور واجد پریشان ہو کر تھانیدار کا منہ تکٹنے لگے اس نے کہا۔  
”بشیرے اور فضلے کے بیان کے مطابق واجد اور عمارہ تین گھنٹے تک اس کو  
بند رہے۔ اس کمرے کی تاریکی میں وہ کیا کرتے رہے؟ یہ میڈیکل رپورٹ  
ہو جائے گا۔ میں اس لڑکی کو طبی معاینے کے لیے ابھی ہسپتال بھیجتا ہوں۔“

چوہدری کریم دین چکر اکر رہ گیا۔ بات بنتے بنتے بگڑ رہی تھی۔ یہ تو ذلت اور  
انتہا ہے کہ اس کی بیٹی طبی معاینے کے لیے ہسپتال جائے گی۔ اس معاینے کی  
تھانے میں پہنچے گی پھر وہ تھانے سے نکل کر اخباروں میں شائع ہوگی اور جناب  
ایک ایک پنڈ اور ایک ایک زمیندار کے گھر تک پہنچے گی۔ وہ چکر اکر کر رہی  
گیا۔ حشمت بیگ نے تھانے دار سے التجا کی۔

”جناب! یہ ایک شریف لڑکی کی عزت کا سوال ہے۔ آپ چاہیں تو بات  
ہو سکتی ہے۔“

تھانے دار نے جواب دیا ”مگر یہ شریف لڑکی ہے تو پھر گھبرانے کی کیا  
میڈیکل رپورٹ بھی اسے شریف کہے گی۔ اگر یہ بد چلن ثابت ہوگی تو تھانیدار  
معاف نہیں کرے گا۔“

چوہدری کریم دین نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال کر آگے بڑھا دی۔

اس کی ٹپکیں جھپک گئیں۔ اسی وقت ایک لیڈی ڈاکٹر پارٹیشن میں آگئی اس نے ایک رٹائرڈ ڈاکٹر اور رٹائرڈی پر سے زر کا دستاں اٹھا کر بائیں ہاتھ میں پھنسنے لگی۔ باہر انتظار کرنے والے بے چینی سے برآمدے میں ٹھہر رہے تھے۔ تھانے دار نے جھلا کر کہا ”لعنت! میری تمام رات ضائع ہو گئی۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔“

دارڈیوئے نے کہا ”ڈاکٹر! صاحبہ ابھی اندر گئی ہیں، تم سے کم ایک گھنٹہ اور انتظار کرو گا۔“

تھانے دار پاؤں پٹختا ہوا ڈاکٹر باری کے کمرے کی جانب چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ڈاکٹر پارٹیشن میں آئے اس نے کانڈ کا ایک پرزہ دارڈیوئے کو دیتے ہوئے کہا ”یہ ڈاکٹر باری کو دے دو، لڑکی کا معائنہ نہیں ہو سکتا۔ سننے والوں کے ذہن میں ایک دھماکہ سا ہوا۔ مروتوں کی آتش بازیوں نگاہوں کے سامنے جھللا گئیں۔ چوہدری کرم دین مارے خوشی شت بیگ سے پٹ گیا۔ اس وقت کسی نے نہیں سوچا کہ ایک ناممکن سی بات ممکن ہو گی۔“

بچہ راجد ذرا ہوش میں آتے ہی دوڑتا ہوا ڈاکٹر باری کے کمرے میں آیا۔ ڈاکٹر تھانے دار کے کہہ رہا تھا۔

”لڑکی خوش نصیب ہے اس کی میڈیکل رپورٹ آپ کو نہیں ملے گی۔“

تھانے دار نے کہا ”کیوں نہیں ملے گی۔ میں قانوناً آپ سے مطالبہ کر سکتا ہوں۔“

”آپ ضرور مطالبہ کر سکتے ہیں لیکن دنیا کا کوئی ڈاکٹر اس لڑکی کی میڈیکل رپورٹ دے کے گا اور وہ اس لیے کہ اس کا مینہ شروع ہو چکا ہے۔ طبی سائنس مجبور ہے۔“



ہے کہ اچانک زلزلہ آئے گا اور معائنہ ملتوی ہو جائے گا یا بے چاروں کی دعا تھا۔

میں تھوڑی جیل سیسٹ کے دوران خوردبین کا لینس ترخ جائے گا۔

آج کے دور میں یہ سب باتیں مضحکہ خیز ہیں۔ طبی سائنس ایک اعلیٰ حقیقت روحانی نظریات سائنسی حقیقت کی مضبوط چٹان کو نہیں توڑ سکتے۔ لیکن وہ سائنس کی حقیقت کو نہیں سمجھ رہے تھے اس لیے دعائیں مانگ کر اپنے دل کو تسلیاں دے رہے تھے۔

اسپتال کے ایک کمرے میں پارٹیشن کے پیچھے عمارہ ایک بیڈ پر لاش کی طرح لیٹا تھا۔ اور چھت سے لٹکا ہوا الیکٹرک فین تیزی سے گردش کر رہا تھا اور وہ دیر سے بج رہا تھا۔

پلکیں جھپکے بغیر اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ خاموش تھی مگر اس کا دل رد رہا تھا۔

”میں گناہ گار ہوں۔ کیا میں گناہ گار ہوں؟“

عام طور سے یہی کہا جاتا ہے کہ جس لڑکی نے شادی سے پہلے اپنا کنوارا پن گنوا گناہ گار ہو گئی۔ اگر یہ سچ ہے تو مجھے سزا ملنی چاہیے لیکن سزا دینے سے پہلے یہ ضرور چاہیے کہ میں اس مقام تک کیسے پہنچی؟ جب میں پیدا ہوئی تو جناب علی میری والدہ انتظار میں گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ میری سوتیلی ماں سستے عشق کا زہر قطرہ قطرہ میرے دل پر ڈکاتی رہی۔

میں جس ماحول میں تھی وہاں عورتیں مرد کے ایک اشارے پر بک جاتی تھیں۔ حویلی نہیں تھی، میرے باپ کا سچا ہوا ایک چمکے تھی۔ یہ چمکے ہر شرم میں ہے ہر گناہ میں ہے اور ہر عیاش مرد کی منہی میں ہے۔ تم اس چمکے میں اپنی بیٹی کو پالتے ہو اس کے رنگ رلیاں مٹاتے ہو اور دعا مانگتے ہو کہ جی کسی مقام پر طبی معائنے تک نہ پہنچے تم ذلیل قسم کے احمق ہو! ہو اس کے غلام! اپنی کے دلال! تمہاری تہذیب اپنے ہی بچہ آپ خود کشی کر رہی ہے۔

”میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔ رحم کی بھیک بھی نہیں مانگتی۔ جہاں انصاف نہ ہو انصاف کیا مانگنا؟ میں خدا سے کہتی ہوں اگر میں مظلوم ہوں، اگر میرے دل میں اور شرافت ہے، اگر میں گناہ گار نہیں بنی بلکہ بنائی گئی ہوں تو مجھے تیری رعایت کا ہے مجھے بچالے۔“

رہا! میں طبی سائنس کی ٹھوس سچائی کو نہیں جانتی صرف ایک سچائی کو جانتی ہوں وہ تو ہے۔ مجھے بچالے۔“

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : [www.iqbalkalmati.blogspot.com](http://www.iqbalkalmati.blogspot.com)

## آئینہ خانہ

ہم اس دنیا کے ایسے آئینہ خانے میں جی  
 رہے ہیں جہاں ہمیں اپنے گھناؤنے کردار  
 کا ہر پہلو نظر آتا ہے۔ بشرطیکہ ہماری  
 آنکھیں دیکھنا جانتی ہوں۔

لڑائی سے نکل جاتی وہ پتھر کی لکیر بن جاتی تھی۔ مگر افسوس صد افسوس کہ نئی نسل کے لڑائی لڑنے والے اور لڑکیاں اب خود ہی اسکولوں، کالجوں، تفریح گاہوں اور بس کے اوٹوں پر اپنے معاملات طے کر لیتے ہیں۔ اگر ماں باپ سیدھی طرح مان گئے تو ان کی بزرگی کا بھرم رہ جاتا ہے۔ ورنہ وہ عدالت میں پہنچ کر اپنے بالغ ہونے کا سرٹیفکیٹ پیش کر کے کورٹ میں شامل میں ’لو میں یا خانہ خراب میری کر لیتے ہیں۔

میری دعا ہے کہ نئی نسل کے نوجوانوں کو کہیں سے لو لگ جائے مگر کسی سے لو نہ لگے، پہنچے ای طرح ’لو میری تک پہنچ جاتے ہیں۔ دو برس پہلے ہماری برادری کا ایک بندہ لندن سے زیت حاصل کر کے یہاں آیا تھا۔ جب وہ ہمارے ملک خدا داد میں تھا تو محض ایک ہفتہ لندن سے واپس آتے ہی بار بار ماسٹر بن گیا۔ وہ اپنے ساتھ حجامت بنانے کی جدید فیشن اور ایک عدد گوری گوری میم لے کر آیا۔ میں نے پوچھا۔

”اس میم کا کیا مصرف ہے؟“

اس نے جواب دیا ”میں مشینوں سے حجامت بناؤں گا۔ وہ اپنے خوب صورت ملائم انہوں سے سراج کرے گی اور تبسم کی بجائیں گرائی ہوئی چبی کیا کرے گی۔ تم مردوں کی ہانک کو نہیں سمجھتے ہو۔ براہیم کے معنی جانتے ہو؟ اونہ، تم گیسے جانو گے۔ تم تو کبھی لندن میں گئے۔ بس یہ سمجھ لو کہ حجام سے بار بار ماسٹر بننے کے لیے بیچ بیچ میں انگریزی کا ایک آدھ لفظ پڑنا ضروری ہے۔ ہمارے ملک کی پان کھانے والی کتھی ہی اماں جانیں اور حقہ پینے والے ابا جان اسی طرح می اور ڈیڈی کے خطابات پر پہنچ چکے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو تم بھی ایک دن بار بن جاؤ گے۔“

”تم براہیم کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے؟“

”ہاں، براہیم کا مطلب ہے مسئلہ۔ مردوں کا مسئلہ یہ ہے کہ اپنی حجامت بنواتے وقت ان کی حسین عورت کی قربت چاہتے ہیں۔ اگر عورت پانچ روپے کے بجائے پچیس روپے کی حجامت بنا دے تو وہ خوش ہو کر مستقل گاہک بن جاتے ہیں۔ نوجوانوں کے مسائل یہ ہیں کہ انہیں کیس آرام سے بیٹھ کر عشق کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ میں ان بوجھ ماسٹروں کے لیے یہاں ایک بڑی سی دکان کھولوں گا، اس دکان کے دو حصے ہوں گے۔ ایک حصے میں لڑکیاں اپنی زلفوں کو کرلنگ، میس اور ہیل اپ بنوانے آئیں گی۔ دوسرے

## آئینہ خانہ

میں اس دنیا کے ہر ملک، ہر شہر اور ہر بازار میں پایا جاتا ہوں۔ میرے دم سے لڑائی کی خوب صورتی قائم ہے۔ بے شک خداوند کرم نے اچھی صورت دے کر بیدار کیا ہے۔ میں ان صورتوں پر جھاؤ پھیرتا ہوں، انہیں بنا تا سنوارتا ہوں، ان کی مرمت کرتا ہوں، ان کی اچھی طرح حجامت بنانے کے بعد ان کو سنوارتا اور نکھارتا ہوں۔ اب آپ گئے ہوں گے کہ میں کون ہوں؟

میں ایک حجام ہوں۔ اگر آپ کمائیاں پڑھ کر انسانوں کے مسائل کو سمجھنا چاہتے تو میرا نام سن کر ناک بھون نہ چڑھائیں۔ میں آپ ہی کی دنیا کا آدمی ہوں۔ آپ ہی کا انسان ہوں۔ فیشن ایبل عورتوں کی تراشیدہ زلفیں، کمان جیسی بھوس، فریڈی ہوئے چکنے چکنے چرے اور مردوں کے سولجر کٹ، کالج کٹ اور ہی کٹ جیسے تراشیدہ کلین شیڈو چرے، یہ سب کچھ میرے ہی ہاتھوں کی صفائی کا نتیجہ ہیں۔ آپ کو لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے مجھے آپ کی دنیا میں پیدا کیا اور جانوروں کو انہیں اہم ہستی سے محروم رکھا۔

جب انسان عمار کے زمانے سے نکل کر تہذیبی دور میں داخل ہوا تو اسے بندروں اور رنجھوں سے الگ نظر آنے اور خوب صورت بننے کے لیے سب میری ضرورت اور اہمیت کا احساس ہوا۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا جب مجھے بڑی محنت اور سے غلیظہ کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا اور اپنے پاس بٹھایا جاتا تھا۔ گھروں کے مسائل اور محفل میں شریک کیا جاتا تھا۔ غریب گھرانہ ہو یا امیر گھرانہ، شادی بیاہ کے موقع پر موجودگی لازمی ہوتی تھی۔ جب رشتوں کی بات چلتی تو آگوا کے طور پر میں ہی کم از کم لڑکے اور لڑکی کے متعلق چھان پچک کرنے اور صحیح معلومات حاصل کرنے کے لیے خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ پھر اس سلسلے میں لڑکے اور لڑکیوں کے متعلق زیادہ

بڑھا ہو کر رہ جائے گا۔ مجھے اس سے بہت کچھ سیکھنا تھا۔ ویسے تو میں حجامت کے فن میں پہلی سے استاد کامل تھا مگر وقت کے نئے تقاضوں کو سمجھتا اور ان سے نمٹنے کے جدید طریقے سیکھنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے میں اس کا شاگرد بن گیا۔ لندن جانے سے پہلے اس کا نام رمنو نائی تھا۔ لندن پہنچتے ہی وہ اپنے نام کو توڑ موڑ کر باربر ماسٹر مزی بن گیا تھا اور اب یہاں اگر مزی ہیر ڈرننگ اور بیوٹی پارلر کے نام سے ایک بڑی دکان کھول لی تھی۔ دکان کیا تھی آئینہ خانہ تھا۔ چاروں طرف نیلیم کے صاف و شفاف آئینے لگے ہوئے تھے۔ وہاں آنے والے گاہک کہیں بھی کھڑے ہو کر خود کو ہر زاویے سے دیکھ سکتے تھے۔ میں نے وہاں پہلی بار کھڑے ہو کر یہ گمان حاصل کیا کہ ایسی جگہ انسان کو اپنا ہر پہلو نظر آئے تب بھی وہ خود کو نظر انداز کر کے دوسروں کو ہر زاویے سے دیکھتا ہے۔ میں نے وہاں سوئی کو پہلی بار ہر طرف سے دیکھا کہ وہ کس طرح ایک ایک زاویے سے متناظر بن کر اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

سوئی اس انگریزی حسینہ کا نام تھا جو مزی کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ وہ دروازہ لڑکھاری بھر کم عورت تھی۔ بدن میں گوشت اور چربی کی اتنی بہتات تھی کہ اسے سوئی کے بجائے فیٹی (مکڑی) کہنا زیادہ مناسب ہوتا۔ اس کی جگہ کوئی دسی عورت ہوتی تو دبے کی طرح بھدی نظر آتی مگر وہ لباس کے اندر کو رسیٹ چٹ باندھ کر پیٹ کے لٹکے ہوئے کٹ کو سمیٹ کر پچکا لیتی تھی۔ کمر کو پتلی بنا کر اس میں خم پیدا کر لیتی تھی۔ اس طرح کو لے خود بخود ابھر آتے تھے۔ سینے کے ابھار کو ان کی بھولی ہوئی بلندی پر قائم رکھنے کے لیے فوم کے بریزر پینڈ استعمال کرتی تھی۔ جتنی ہوشیاری سے بدلی مال کی پینٹنگ ہوتی ہے اور اسے اوپر سے خوب صورت بنایا جاتا ہے، اتنی ہی ہوشیاری سے وہ پیک ہو کر ہمارے ملک میں آئی تھی۔

ہمارے ہاں ایک سے بڑھ کر ایک مثالی حسن ہے۔ ایسی ایسی طرح دار حسینائیں ہیں کہ انہیں دیکھنے اور سمجھنے کے لیے حسن نظر چاہیے مگر ہماری نظریں لوٹ پوٹ کر بدلی پینٹ پر ہی ٹھہرتی ہیں۔ مے سٹر مزی نے ہماری اسی کمزوری کو سمجھ کر سوئی کو یہاں ابھرنے لیا تھا۔ میں خود اس کے قریب رہنے کے باوجود اسے آئینے کے ایک ایک زاویے سے دیکھتا رہتا تھا۔ دیکھنے کے لیے یوں تو اور بھی بہت کچھ تھا۔ ہماری دکان کے خوب

جھے میں نوجوان اپنا حلیہ درست کرانے آئیں گے۔ لڑکے اور لڑکیوں کے لیے ایک ڈرائنگ روم ہوگا۔ وہ آئے سانسے صوفوں پر بیٹھ کر اپنی اپنی باری کا انتظار کریں گے۔ آئے سانسے بیٹھنے سے کوئی خوشگوار حادثہ پیش آجائے تو اس کی ذمہ داری ہم پر ہوگی۔ اگر ہوگی بھی تو کیا فرق پڑتا ہے؟ پہلے بھی تو ہمارے باپ دادا لڑکوں کو لڑکیوں کو شادی کے مرحلے تک پہنچاتے تھے۔

میں نے قائل ہو کر سر ہلاتے ہوئے کہا ”واقعی“ ناک اور سرے پکڑا دو اور ناک ہی پکڑی جائے گی۔ ہمارے باپ دادا کا انداز پرانا تھا۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ فوم بہت کچھ سیکھ کر آئے ہو۔ نئے دور کے تقاضوں کے مطابق ہم ہیر ڈرننگ اور پیک کے خوب صورت اڈے بنا کر اگوا کے فرائض انجام دے سکتے ہیں۔ میں نے جمبر مان لیا۔ تم مجھے اپنا شاگرد بنا لو۔

”ونہ۔ یہ استاد کیا ہوتا ہے؟ میں نے کہا کہ تمہیں انگریزی کا ایک ٹوہ ٹا چاہیے تم مجھے ماسٹر کہہ سکتے ہو۔“

”اچھا استاد! ماسٹر کہا کروں گا۔“

”اول ہونہ۔ اس طرح ماسٹر نہ کہو۔ ماسٹر کے ما کو ذرا ٹیڑھا کر کے لے“

”سٹر۔“

میں نے ذرا سامنے ٹیڑھا کر کے سٹر کہا۔ وہ خوش ہو کر سمجھانے لگا۔

”دیکھو۔ میں تمہیں انسانوں کے ٹیڑھے پن کا راز بتاتا ہوں۔ انسان نے از کبھی کسی چیز کو سیدھا رکھنے کی کوشش ہی نہیں۔ الفاظ بہت ملامت اور نازک ہونے انسان تو فولا دی تنہا کبھی کبھی جگہ جگہ سے ٹیڑھا کر دیتا ہے۔ ہمارے باپ دادا نے اسے ان کی حجامت کرتے کرتے انہیں آدمی کی شکل دی تھی۔ یہ پھر دوسرے آدم ہو کر ہی بن گئے۔ عورت کو پرہ سکھایا تو اس نے سیدھے سادے برقعے کو اپنے شہابی حصوں کے مطابق تراش کر اسے میسکی برقعہ بنادیا۔ اس طرح ہر چیز کو ٹیڑھے سے بعض اوقات ایک نیا حسن پیدا ہو جاتا ہے اور اکثر اوقات اچھا خاصہ حسن بن جاتا ہے مگر سٹر کہنے میں بڑا حسن ہے، ہے نا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ یہ شکایت نہیں کی کہ اسے سٹر کہنے کے

چو کر جاتا تھا۔ کام کے دوران ہمیں اپنے گاہکوں سے باتیں کرتے رہنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھا۔

”بائی! آپ کے والد صاحب تو بڑے بزنس مین ہوں گے؟“

ہم اپنے گاہکوں کو بھائی جان اور باجی کہتے ہیں خواہ وہ عمر میں ہم سے کتنے ہی چھوٹے ہوں۔ اس نے جواب دیا۔

”میرے والدین مر چکے ہیں، میں اکیلی ہوں۔“

”آپ کیا کرتی ہیں؟“

”میں ایک انگلش اسکول میں ٹیچر ہوں۔ اس کے علاوہ دو ریٹس زادویوں کو ٹیوشن دے رہی ہوں۔ ہر ماہ بارہ سو روپے مل جاتے ہیں۔“

روز روز گاہکوں سے بے تکلفی بڑھتی ہے۔ کچھ عرصے بعد اس نے بتایا کہ وہ واجد نامی ایک خوب نوجوان سے محبت کرتی ہے، جب وہ ٹیکنیکل کالج سے پاس ہو کر کہیں ملازمت کر لے گا تو ان کی شادی ہو جائے گی۔ ایک بار واجد نے اس کے قریب بیٹھ کر پوچھا تھا کہ وہ ان کو کم دیکھو کیوں استعمال نہیں کرتی ہے؟ ان کے بغیر چہرہ کچھ روکھا پھیکا سا نظر آتا ہے۔ جیلہ اپنے چہرے کا رنگ نکھارنے کے لیے کتنے ہی چمن کرتی تھی۔ اس کی کسی سہیلی نے سمجھایا، اسے تھریڈنگ کرانا چاہیے تب سے وہ ہماری دکان کی مستقل گاہک بن گئی۔ مہرول کی حسن پرستی عورتوں کو بیوی پار کر کا راستہ دکھاتی ہے۔ اگر واجد جیلہ پر تنقید نہ کرتا تو کبھی اس طرف نہ آتی۔ جیلہ نے ایک دن بتایا کہ جب سے وہ تھریڈنگ کے بعد واجد سے ملنے لگی ہے تو وہ مجبوراً انداز میں اس کے چہرے کی صابحت اور گیسوئے درازی فزینگی کرنا رہا ہے۔ بار بار ماسٹر مرزا نے جیلہ سے کئی بار کہا۔

”تپ کے بال واقعی خوب صورت ہیں۔ اگر آپ کبھی بال ترشوانا چاہیں تو سیدھی ہمارے پاس آئیے گا، ہم بالکل مفت آپ کے بالوں کو تراش کر سیٹ کریں گے اور آپ کو دو روپے بھی دیں گے۔ ہم ضرورت مند عورتوں کو سو روپے سے زیادہ نہیں دیتے مگر تپ کے بال ایکسٹرا آرڈنری ہیں۔ ایکسٹرا آرڈنری سمجھتی ہیں؟ ہاں یاد آیا، آپ تو انگلش لکھتی ہیں۔ ضرور سمجھتی ہوں گی۔“

جیلہ نے مسکرا کر جواب دیا ”میں ایک ہی بات سمجھتی ہوں کہ میرے بال واجد کو بے

صورت دینگ روم میں جوان لڑکے لڑکیاں آنے لگے تھے۔ وہاں ایک طرف کے صوفے لڑکے اپنی حجامت بنوانے کی باری کے انتظار میں بیٹھے ہوئے سامنے صوفے پر بیٹھے لڑکیوں کو کتلتے رہتے تھے۔ لڑکیاں سامنے میز پر رکھے ہوئے میگزین اٹھا کر ان کی گردانی کرنے کے بہانے شرابی لچاقی اور نظریں چراتی رہتی تھیں۔ بڑی سی ماحول تھا۔ پہلے پہل کنواری نظریں یونہی جھکتی ہیں اس کے بعد دیکھنے والوں کو جھکا جاتی ہیں۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ جھکنے والے ہر دوسرے تیرے روزانہ سیلون میں پہنچ جاتے تھے۔ وہ روزانہ اپنی حجامت نہیں ہوا سکتے تھے اس لیے بک کر کرواتے اور کبھی بیروڑا رنگ کے بہانے آتے رہتے تھے۔

آئینہ خانہ میں روزانہ کتنے ہی چہرے نظر آتے تھے۔ ہر چہرہ اپنی ایک کہانی سنانا وہاں جیلہ نام کی ایک لڑکی اکثر آتی تھی، اسے اپنے نام کی مناسبت سے حیدر جی چاہیے تھا مگر وہ خوب صورت نہیں تھی، بد صورت بھی نہیں تھی۔ اگر کوئی اس سے نہ دیکھتا تو نفرت سے بھی نہ دیکھتا۔ جس طرح گوشت کا تانہ ہو تو تیزی سے گزرا ہے۔ اسی طرح وہ بھی گزارے کے قابل تھی، بالکل ہی مٹی کی گزری نہیں تھی۔ جیلہ نے اس کے ساتھ بالکل نا انصافی نہیں کی تھی۔ اس کی زلفوں کو بے حد خوب صورت تھا۔ ایسے گھنے اور لانے بال تھے کہ پیچھے گھنٹوں تک آتے تھے۔ ریٹیم کی ملازمت کو اس کی زلفیں تو نازک سے جڈوں کی طرح ملائم تھیں، جوانی کے ہر خطرہ پاک ہو کر خم کھائی ہوئی تھیں اور ایسی گہری سیاہ تھیں کہ اس تاریک صحرائیں کوئی بھی مسافر بھول سکتا تھا۔

میں نے بار بار ڈرائر سے بال خشک کرنے کے دوران انہیں بار بار چھو کر دیکھا سیدھی مانگ نکالتی تھی اور بڑی خوب صورتی سے چوٹی گوندھتی تھی۔ یعنی ہماری دکان والوں کے اسٹائل بدلنے نہیں آتی تھی۔ وہ صرف تھریڈنگ کی محتاج تھی۔ میں بتاتا تھریڈنگ کیا ہوتی ہے اکثر عورتوں کے چروں پر مہین ملائم روئیں ہوتے ہیں جو جھکا نہیں آتے مگر ان کی موجودگی سے چہرے کی صابحت اور چمکانا ہٹ ماند پڑ جاتی ہے۔ ہوئے دھاگے سے ایک خاص تکنیک کے ذریعے یہ روئیں صاف کر دیتے ہیں۔ بعد چہرے کی قدرتی چمکانا ہٹ اور اجلا پن نمایاں ہو جاتا ہے اور اس کے بعد دکان

آرہ میرے لیے جیلہ کے بالوں کی دگ تیار کروے تو میں دگنی قیمت دوں گی۔ پورے تین ہزار روپے۔“

مجھے میڈم کی یہ خریدنے والی ذہنیت بہت بری لگی۔ یوں تو جیلہ کے بال ہم بھی خریدنا چاہتے تھے مگر ہمارے خریدنے کے انداز میں کبیر نہیں تھا۔ ہم نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ کبھی اپنے بال کو اتنا چاہے تب ہم اسے دو سو روپے دیں گے لیکن میڈم ہمارے آگے تین ہزار کا چارہ ڈال کر ایک طرح سے لپکاری تھی اور بھرکاری تھی کہ ہم کسی طرح جیلہ کو بال کو اتنے پر راضی کر لیں۔

جی پوچھتے تو مجھے جیلہ سے دلی لگاؤ تھا۔ آپ اسے عشق نہ سمجھیں۔ بچے عشق یا سنی سبت سے قطع نظر ہمارے دلوں میں کبھی کبھی کسی کے لیے اچھائی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے وہی جذبہ مجھ میں تھا۔ اس بے چاری جیلہ کے پاس کیا تھا؟ وہ حسین نہیں تھی، دل نشیں نہیں تھی۔ نہ جانے کتنے انتظار کے بعد اسے دل نشیں بننے کے لیے ایک واجد کا دل لاقاب دیا اور واجد کی نظروں میں حسین بن کر رہنے کے لیے ہمارے ہاں آکر اپنے چہرے کو بھانپتی پونچھتی رہتی تھی۔ اس طرح وہ بہت زیادہ خوب صورت تو نہیں بن جاتی تھی مگر اتنے زیادہ کرطل بن جاتی تھی۔ میں آپ کو ایک پتے کی بات بتاتا ہوں کہ جس عورت کو ایک محبوب کا پیار مل جائے وہ آئینے کے سامنے اپنی آنکھیں کھودیتی ہے اور محبوب کی آنکھوں سے اپنا جلوہ دیکھتی ہے۔ پس آئینہ وہ ہوتی تھی، پیش آئینہ واجد ہوتا تھا اور چپکے چپکے اس کے دل میں کتا تھا ”بس مجھے اتنا ہی حسن چاہیے جو صرف میری نگاہوں میں ساگر رہے۔ میں ایسی ہی محدود دولت چاہتا ہوں جسے کوئی چرانے کی کوشش نہ کرے۔ جب مجھے بہت زیادہ حسن کی تمنا ہوگی تو میں تمہارے دل میں جھانک کر یہ گیان حاصل کر لوں گا کہ ایک خوب صورت چہرہ بڑھاپے میں مرجاتا ہے مگر ایک خوب صورت دل کبھی نہیں مرتا۔ لہذا کمال فنی تمہاری طرح معمولی صورت کی تھی مگر اس کے دل کی خوب صورتی آج بھی تمام انسانوں میں دھڑکتی ہے۔“

میں میڈم کی بات کر رہا تھا۔ جو بڑھاپے میں جوانی کا پیوند لگانے کے لیے جیلہ کے بالوں کی دگ پہننا چاہتی تھی۔ یعنی جیلہ کے پاس جو ایک حسن تھا اسے بھی چھین لینا چاہتی تھی۔ غمناک طرز کے لائے بالوں کو مغربی اسٹائل سے تراش دیا جاتا تو بیچاری مشرقی رہتی نہ

حد پسند ہیں وہ اتنے لائے بالوں کی وجہ سے مجھے ہزاروں کے مجموعے میں پہچان جاتا ہے۔ یہ کہتے کہتے اس نے شرما کر رندن جھکالی۔ میں اس کے پیچھے دوسرے آئینے مقابل دوسری عورت کے بال سیٹ کر رہا تھا لیکن اس آئینے میں بھی جیلہ نظر آتی تھی اس کی شرمیلی سوچ بتا رہی تھی کہ اس کا دلہا کنواری زلفوں کی خوشبو میں گھٹی زلفوں جھاڑوں میں لٹائی زلفوں کی جج پر اور کالی زلفوں کی رات میں کیسے صبح کرے گا۔

اس شرمیلی کو سوچنے دیجئے۔ جب وہ زندگی کے کسی نئے موڑ پر پہنچے گی تو میں تو بھی وہاں پہنچا دوں گا۔ اب آپ دوسرا آئینہ دیکھیں۔ اس آئینے کے دروازے میڈم نے دوسرے تیسرے دن آکر ٹھنکتی ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق میڈم کی عمر چالیس ہوگی لیکن عورت کو عورت ہی پہچانتی ہے۔ سوئی نے مجھ سے شرط لگائی کہ میڈم برس سے نیچے کی نہیں ہیں کچھ اوپر ہی ہوں گی۔ چونکہ وہ دولت مند ہیں اچھا کھاتی اور ہیں، کسی بھی فکر میں دلی نہیں ہوتیں اور ڈانٹ کی وجہ سے موٹی نہیں ہوتیں اس کی صحیح عمر کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

اتنا تو میں سمجھ گیا تھا کہ وہ اپنی دولت سے جوانی خریدنے کے لیے بولی پار لارہ تھیں۔ کبھی بالوں کی سفیدی کو چھپانے کے لیے بلیک یا براؤن کلر کی ڈانٹ کر لائی کبھی خوب صورت بالوں کی دگ سیٹ کراتی تھیں۔ ایسے وقت انہیں اکثر بجا آجاتی۔ ایک دن وہ مجھ سے بولیں۔

”وہ لڑکی یاد ہے؟ وہ جو پرسوں اس آئینے کے سامنے تھریڈنگ کروا رہی تھی؟“ انہوں نے جیلہ کا حلیہ بتایا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

”جی ہاں۔ اس باجی کا نام جیلہ ہے۔ وہ ایک انگلش اسکول میں ٹیچر ہیں۔“ وہ کچھ بھی ہو۔ ”میڈم نے پہلے ناگواری سے کہا۔ پھر حسرت سے بولیں۔ ”میں کہتے خوب صورت ہیں۔ ایسی قدرتی ملائمت اور چمک میں نے کسی کے بالوں کو دیکھی ہے۔“

یہ کہہ کر انہوں نے ایک انگلی کے اشارے سے مجھے اپنے قریب جھکنے کے لیے کہا۔ جب میں ذرا قریب جھک گیا تو وہ بڑی آہستگی سے بولی۔

”تمہارا باربر ماسٹر مرزا مجھے اصلی بالوں کی دگ پندرہ سو میں دیتا ہے۔ اس۔“

لے لے گئے اس لیے بوڑھے رشتوں کا تقدس اور جوان خوابوں کا حسن فنا ہو چکا تھا۔  
 آئیے! ابھی بہت کچھ دکھائے گا۔ ذرا دم لے۔ مجھے دوسرے آئینوں میں بھی  
 مانگے۔ اس آئینہ خانے میں ایک عزت مآب رئیس احمد فدوی کی بھی نظر آیا کرتے  
 تھے ایک شاندار امپالامین ان کی چودہ برس کی صاحبزادی مدہ جبین برقع پہن کر آتی  
 تھی۔ بات کچھ میں نہیں آتی کہ پردہ کرنے والیاں بیوی پارلر میں کیوں آتی ہیں؟ کیونکہ  
 گھر اور رواداری بالکل ہی متضاد عمل ہیں۔ وہ ہمارے ہاں سے بن سنور کر برقع کی چار  
 اڑی میں کس طرح نمائشی جذبے کی تسکین کرتی ہیں؟ گھر کی چار دیواری میں جو تعریفات  
 آتی ہیں ان میں صرف عورت کو عورت دیکھتی ہے۔ ٹھیک ہے کہ وہاں بھی مقابلہ حسن و  
 بد میں عورتیں ایک دوسرے سے برتر ہونے کی پوری کوشش کرتی ہیں لیکن فطرتاً مرد  
 کی ہو کہ عورت کی عورت کبھی عورت کو اپنا آپ دکھا کر مطمئن نہیں ہوتی کیونکہ خالق کائنات  
 عورت کو شعر کے حسن اور اس کی نزاکت میں ڈھال کر مڑی زبان کو شاعری کا کلم  
 آیا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو عورتیں اشعار کی نوک پلک درست کرنے کے لیے بیوی پارلر کا  
 پتہ نہ کرتیں۔

مدہ جبین کو ابھی مکمل عورت نہیں کہا جاسکتا تھا کیونکہ وہ چودہ برس کی بچی تھی اور  
 ت کے خانے میں قدم رکھنے کے لیے آئینہ خانے میں آئی تھی، اس کے پاس ساٹھ  
 کے بوڑھے باپ رئیس احمد فدوی کی بے انتہا دولت تھی اور قدرت کا دیا ہوا بے  
 لای حن تھا۔ باؤ سنگھار کے بعد وہ فتنہ قیامت بن جاتی تھی۔ اس کے باوجود دل اور زیادہ  
 بچے بننے کے لیے چلتا ہے اس لیے وہ بھی جیلہ کے بالوں کو دیکھ کر ترستی تھی۔ رئیس  
 فدوی اپنی لادلی کی ہر ضد پوری کرتا تھا۔ وہ بار بار ماسٹر مزی سے کئی بار کہہ چکا تھا کہ اگر  
 جبین کے لیے جیلہ کے بالوں کی وگ تیار کی جائے گی تو وہ اس کی بڑی سے بڑی قیمت ادا  
 کرے گا۔

جیلہ کی بیوی دشمن نہیں تھی مگر اس کے بال بال دشمن تھے۔ وہاں آنے والی سب ہی  
 جوان اور دولت مند عورتیں اس کے بالوں کو حسرت سے مگر کینہ پرور نگاہوں سے دیکھتی  
 تھیں۔ ”جیلہ کے فرش پر قالین، ٹاٹ میں مکمل کا پونڈ اور سانولے  
 ہار دی گئی لٹکے نہیں جتتیں۔ مانا کہ پھول کسی کے بالوں میں نہیں کھلتے مگر انہیں

مغربی۔ یہ انسان یوں تو دوسرے انسان کی جیب سے اس کا آخری پیسہ اس کے دل  
 آخری نالہ اور اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ چھینتا ہی ہے لیکن دوسروں سے چھینے  
 عمل میں دیوانگی ایسی ہے کہ وہ کسی معمولی سی صورت والی کے حسن کی آخری دھجکی  
 چھین لیتا ہے۔ کیا میڈم اس کے بالوں کو اپنے سر پر سجا کر از سر نو جوان بن سکتی تھی؟  
 مگر دوسروں سے کچھ چھین لینے کی انہی خواہش کی تکمیل ہو جاتی۔

ہیر کنگ سلون اور بیوی پارلر کے مردانہ حصے میں ایک خیر نو جوان کو دیکھیے۔  
 سوئی کو میرے تعاون کی ضرورت نہیں ہوتی ہے تو میں مردانہ حصے میں چلا آؤں۔  
 نے اس خیر نو جوان کو اکثر اپنے سلون میں ایسے وقت دیکھا تھا جب میڈم فیروزہ  
 پہنچتی تھی، وہ دونوں ویننگ روم میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر اپنی اپنی باری لگانا  
 کرتے تھے۔ انتظار کے دوران وہ نو جوان اپنے صوفے پر بیٹھا ہوا میڈم کی طرف دیکھ  
 تھا۔ میڈم تغافل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کبھی کسی انگریزی رسالے کی دقت گرا لیتی  
 تھی، کبھی صوفے پر یہ پہلو سے وہ پہلو بدل کر اپنی خزاں رسیدہ عمر کو کہیں کہیں سے چبا  
 کی کوشش کرتی تھی۔

میں اس نو جوان کو آئینہ خانہ میں بھی دیکھتا تھا اور ذاتی طور پر بھی جانتا تھا۔ اس کا  
 ہیکو (فخرو) تھا۔ اکثر ناموں سے بھی ان نام والوں کے کردار اور ان کی زندگی کی کو  
 تک عکاسی ہو جاتی ہے۔ فخرو خود اپنے نام کو صحیح طور سے زبان تک نہیں لاسکتا تھا۔  
 اپنی موجودہ زندگی پر فخر کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک ہوٹل کا ہیرا تھا۔ اسے تنخواہ  
 روزانہ اوسطاً پچیس روپے ٹپ کے طور مل جاتے تھے۔ یہ بات میڈم کو معلوم نہیں  
 اس لیے کہ فخرو صرف خوش شکل ہی نہیں، خوش پوش بھی تھا۔ اس کے ظاہری طرز  
 کر کوئی اسے ہوٹل کا ہیرا نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ آمدنی کی بات نہیں ہے نمائشی جذبہ  
 باتیں ہیں۔ ہوٹل کا ہیرا تو کیا، مسٹر اور چمار بھی سمجھو سی ساج کے نمائشی آئینے میں  
 نہیں جاتے۔

میں اس بات پر حیران تھا کہ میڈم پچاس سے اوپر تھیں اور فخرو پچیس سے نیچے  
 میڈم کے دل میں ممتا ہونا چاہیے تھی اور فخرو کی آنکھوں میں کسی حسین کم سن دل  
 خواب کی چمک ہونا چاہیے تھی۔ مگر وہ اندھی خواہشات کے بازار میں خرید و فروخت



بائیں ایک انسان محنت بہنر اور صلاحیتوں سے بالکل ہی خالی ہوتا ہے تو وہ اعلیٰ خاندان کا  
ملک لگا کر دوسروں سے اونچا ہو جاتا ہے۔ خود ہماری برادری میں جو نائی سیلون میں حجامت  
کرتے ہیں وہ خود کو فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے نائیسوں سے افضل اور برتر سمجھتے ہیں۔ ایسا ہر  
بہنر فریٹے اور ہر برادری میں ہوتا ہے۔ انسان کو برابر رہنے کے بجائے بڑا بننے کی  
یادت پڑتی ہے کہ اس نے (غور با شد) خدا سے بھی برتر ہونے کی کوشش کر ڈالی۔  
ان اور خدا واسی ذلیل کوشش میں اپنی بلندی سے قبر کی پستی میں چلے گئے۔

بڑے امیں یہ سمجھنا چاہتا ہوں کہ جب تم اپنی حیثیت بدل کر اور بڑے بن کر جہاں  
نہایتے جاؤ گے وہاں وہ تم سے کچھ اور اونچے بن جائیں گے۔ وہ صرف حجامت بخوانے  
اور ان کے ہمارے سامنے سر جھکاتے ہیں لہذا اپنی تسلی کے لیے ان کی حجامت بتاتے رہو  
ان کے سر جھکاتے رہو۔ جب یہاں انگریز کی حکومت تھی تو انگریز ہم سے برتر تھے  
ہے آتے تھے اور اس ملک کے تمام لوگوں کو تحارت سے کالا آدمی کہتے تھے۔ کسی کو  
ان کے برابر بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہمارے علاقے میں انگریز ہمارے تھے ان کے پاس  
دلی پلندہ آئی۔ انہوں نے اسے اپنی ریزیڈنسی میں بلوالیا۔ وہ دن اور دور اتوں تک گوری  
پہنہ چلا تیسرے دن جنگل میں اس کی لاش ملی۔ اسے گولی مار دی گئی تھی۔ پتہ نہیں  
ہاں وہ تو بے چاری حکم کی بندی تھی۔ آقا کے کسی حکم سے انکار نہیں کیا ہوگا۔ اس ظلم  
مخالف کسی نے آواز نہیں اٹھائی۔ کس کی مجال تھی کہ انگریز ہمارے خلاف چوں بھی  
راندہ وہ صاحب یہاں سے جانے لگے تو ریاست کے ایک راجا ہمارے ان سے  
دروازت کی کہ ان کی کالی گھوڑی اسے نشانے کے طور پر دے دی جائے۔

”تو توجس پر ہم سواری کرتا“ اس پر کالا آدمی سواری ہی کرنے لگا۔

یہ کہہ کر انگریز ہمارے کالی گھوڑی کو اسی وقت گولی مار دی۔ پھر اسے بھی جنگل میں  
پھینکا۔ یہ ہے انسان کے برتر بننے کی داستان بیٹے اتم مغفور انسانوں کی دنیا میں جس  
مہر پہ وہاں سے اونچا اڑنے کی کوشش نہ کرو۔

بارہ ماہر مزی کے بوڑھے باپ نے اسے اپنے طور پر بہت سمجھایا لیکن وہ اونچا  
ان کے لیے لندن چلا گیا۔ ہمارے سیلون اور یوٹی پارلر میں جب رات کے آٹھ بجے

شاخ سے توڑ کر بالوں میں سجایا جاسکتا ہے۔ پھر اس جیلہ کے بال اس کی وجہ سے  
ہمارے حسن کی جلوہ سالانی میں اضافہ کیوں نہیں کر سکتے؟ ضرور کر سکتے ہیں۔“  
حسن میں اضافہ کرنے کی ضد ضرور تھی اس لیے ہر طرف سے بولیاں بڑھ رہی تھیں  
میں سب سے زیادہ دولت مند میڈم فیروزہ اور رکش احمد فدوی تھے۔ میڈم نے ہزار  
دیکھ کر چار ہزار کی بولی دی۔ رکش احمد فدوی نے چھ ہزار تک چھلا لگا لگا۔ میڈم  
چلا تو وہ ایک قدم آگے بڑھ کر سات ہزار تک پہنچ گئی۔

چلے بولیاں پڑھنے دیجئے۔ اس آئینہ خانے میں اب ہمیں بھی دیکھیے، آفریں  
ان آئینوں میں ہر پہلو سے نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، ہمارے  
جانے سے پہلے ر منو نائی تھا اور کسی سڑک کے کنارے کسی فٹ پاتھ پر بیٹھ کر  
حجامت دیتا تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب مہنگائی لوگوں کی حجامت نہیں دلاتی تھی۔  
محبت اس وقت بھی مہنگی تھی۔ ر منو کو اٹھائیس برس کی عمر میں ایک ر منو  
عشق ہو گیا تھا۔ کہاں ایک ر منو کی زادی اور کہاں ایک نائی کہاں آسمان اور کہاں  
ایک خدا! ایک رسول کو ماننے اور مسلمان ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ کسی کو  
فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھادیا جائے۔ ایسا اس لیے نہیں ہوتا کہ سائی حیثیت  
تہذیب اور زندگی گزارنے کا معیار دیکھا جاتا ہے۔ کوئی بھی صاحب عقل اپنی لائو  
پالی ہوئی بیٹی کو فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے نائی کے لیے باندھنا گوارا نہیں کر سکتا۔  
بوڑھے باپ نے اسے سمجھایا۔

”بیٹا! اپنی حیثیت کو دیکھو۔ سرائی کر آسمان کو دیکھو گے تو گردن دیکھنے لگی۔  
”نہیں بابا! اگر میں آسمان تک پہنچ جاؤں تو پھر گردن نہیں دیکھے گی۔ میں؟  
پیشہ چھوڑ دوں گا کوئی دسرا ہند اکروں گا۔ اپنی حیثیت بدل دوں گا۔“

”پیشہ بدلنے سے کیا حیثیت بدل جائے گی؟ جب بھی تمہارے باپ دادا کا  
تم نائی ہی کہلاؤ گے۔ کیا تم اپنے باپ دادا کو بھی بدل دو گے؟“  
ر منو نے جواب نہیں دیا۔ وہ بچپن سے ضدی تھا۔ عشق میں ناکامی اور  
بن گیا۔ اس کے باپ نے کہا۔

”یہ دنیا اپنی ابتدا سے ایسی ہی ہے۔ ہم اپنے باپ دادا کے زمانے سے بڑے

دست اور ہمدرد سمجھ کر میرے سامنے رمزی کی شکایت کرتی تھی کہ وہ اس سے لڑتا جھگڑتا رہتا ہے اور اسے چھوڑ دینے کی دھمکی دیتا ہے۔

ایسا کہتے وقت وہ مجھے یوں دیکھتی تھی جیسے رمزی سے جھوٹے کے بعد سارا تلاش کر رہی ہو لیکن میرے لیے اتنی بڑی سیم کو پالنا ہاتھی پالنے کے برابر تھا اس لیے میں اسے دوری سے دیکھ کر خوش رہتا تھا۔ ایک صبح میں کلام کے اوقات کے مطابق دکان پر آیا تو دکان بند تھی۔ اس کی چابیاں رمزی کے پاس رہتی تھیں۔ وہیں سوئی کے ساتھ صبح اگر دکان کھولتا تھا۔ جب دیر ہو گئی تو میں خیریت معلوم کرنے اس کی کونٹھی کی طرف چلا گیا۔ اور میں گیا اور ہاسٹر رمزی نے آکر دکان کھول دی۔ لیکن کونٹھی میں سوئی سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے اسے بڑی ایزی ہوئی حالت میں دیکھا۔ وہ پٹنگ کے پاس فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا شب خوانی کا لباس تار تار تھا اور ایسی بے لباس تھی کہ بدن کا تار تار نظر آ رہا تھا اس وقت پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ آئینہ خانے میں ہر پلو سے صحت مند اور جوان نظر آنے والی اندر سے کتنی کھوکھلی اور خزاں رسیدہ ہے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ایک دم سے مٹ کر ڈھک چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے چھج کر بولی۔

”یونان سس اگٹ آؤٹ۔۔۔“

میں جلدی سے آؤٹ ہو گیا۔ دوسرے کمرے میں آکر حیرانی سے سوچنے لگا کہ میں نے آئینہ خانے میں نظر آنے والی اسی سوئی کو دیکھا تھا یا سوئی کی بوڑھی ماں کو؟ نہیں سچائی زہرے بھی زیادہ زہریلی ہوتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایسی فیشن زدہ جوان عورتیں اپنے بزدلی کی خفائی میں خود اپنی ہی اماں جان نظر آتی ہیں لیکن مجھے ایسی باتیں نہیں کرنا ہائیں۔ ایسی ہی عورتوں کے دم قدم سے ہمارے بیوی پار لکاکام چلتا ہے۔ میں تھوڑی دیر تک سوئی کا انتظار کرتا رہا پھر سمجھ میں آ گیا کہ میں نے ایک عورت کے اندر جھانک کر اس کے نود کو نہیں پسچائی ہے وہ ابھی سامنے نہیں آئے گی۔ مجھے بھی اس کا سامنا نہیں کرنا ہائے لڑا میں دکان پر واپس چلا آیا۔ وہاں ہاسٹر رمزی کا موڑ بگڑا ہوا تھا۔ اس وقت کوئی ایک تھیں آیا تھا ورنہ وہ جبراً مسکراتا رہتا۔ اس نے ناگواری سے پوچھا ”تج تم اتنی دیر سے کھل گئے ہو؟“

”اسرا میں وقت پر آیا تھا پھر تم سے چابیاں لینے تمہاری کونٹھی کی طرف جانا پڑا۔ ابھی

سنا ہوا جاتا ہے“ اس وقت سے سٹر رمزی لندن اور انگریزوں کے بارے میں بہت ریتا تھا۔ ایک رات جب سوئی موجود نہیں تھی تو میں نے اس سے پوچھا۔

”سے سٹرایہ سوئی تمہارے ہاتھ کیسے لگ گئی؟“

اس نے ایک قہقہہ لگانے کے بعد جواب دیا ”سوئی جیسی لڑکیاں لندن کے گلیاں میں مل جاتی ہیں۔ جس سیلون میں“ میں کام کرتا تھا وہاں سوئی بھی کام کرنے آتی تھیں۔ خود ہی میری طرف مائل ہونے لگی تب مجھے اپنے باپ کی بہت سی باتیں یاد آئیں۔ سوچا یہ سوئی اسی انگریز کی بیٹی پوتی یا نواسی ہوگی جس نے ہمارے گاؤں کی گوری کا گھوڑی کو برتری کے غور میں گولی ماردی تھی۔ تاریخ کے اس موڑ پر اب مجھے بڑا موقع ملا تھا اس لیے میں انگریز ہمارا کی عمری سے سوئی کو یہاں لے آیا۔“

یہ کہہ کر وہ فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگا۔ اس کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ اس نے محبت یا کسی مرہبان جذبے کے تحت نہیں اپنایا تھا۔ بلکہ بہت پرانا انتقام لینے کے لیے اکثر عورت ہی نشانہ بنتی ہے، انصاف کی نظر سے دیکھا تو تاریخ کے اس موڑ پر گوری مظلوم تھی اور تاریخ کے اس موڑ پر سوئی مظلوم لگتی آئیے اب اس آئینہ خانے میں ذرا سوئی کو دیکھیے۔

مجھے سوئی سے اکثر خفائی میں باتیں کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ بڑے بڑے گورم عورتیں کبھی مجھے اور کبھی ہاسٹر رمزی کو دگ لگانے اور پٹلیں لگانے کے لیے آئے کرتی تھیں۔ جب ہاسٹر رمزی ان خدمات کے لیے دکان سے باہر جاتا تو سوئی مجھے آگے بارے میں بہت کچھ بتایا کرتی تھی۔ یہ توجہ میں پتہ چلتا ہے کہ عورت بہت کچھ بتا دے جو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔

ابتدا میں اس نے یہی کہا تھا کہ وہ ایک اعلیٰ خاندان کی لڑکی ہے۔ ذلنوں کو زائے سنوارنے کا کام محض اس نے مشغلے کے طور پر سیکھا تھا۔ پھر حالات سے مجھ ملازمت کر لی۔ اس وقت تک وہ معصوم اور اچھوتی دو شیرہ تھی۔ ہاسٹر رمزی اس کا پہلا مرد تھا۔ یہ دعویٰ ہر عورت کرتی ہے لیکن سوئی جیسی بھاری بھر کم عورت ہا کرے تو مشکل ہی سے یقین آتا ہے۔ ویسے میں کسی عورت کا دل نہیں توڑتا بلکہ کی طرح سوئی کی ہر بات کو سچ سمجھ لیتا تھا اس لیے وہ مجھ سے بہت خوش تھی۔

اناری صورت میں ی سرخ یا ہائیں بنائی جاتی ہیں مثلاً یہ کہ لڑکی ابھی بڑھ رہی ہے یا لڑکی  
کارشہ پہلے ہی سے کہیں ملے ہو چکا ہے۔ اس طرح شرفانہ انداز میں ہائیں بنا کر ٹالنا بہتر  
ہے یا رشتہ مانگنے والے کی حیثیت پر تنقید کرنا بہتر ہے؟ تمہیں کیا معلوم کہ انہوں نے مجھے  
دل کے کانٹائی کہہ کر ذلیل کیا تھا۔“

مجھے اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہاتھ نظر آرہے تھے۔ وہ غصے سے مٹھیاں بھیجنے رہا تھا  
”ہاں میں ٹائی ہوں مگر انسان بھی تو ہوں۔ دوسرے انسانوں کی طرح میرا دل بھی تو آرزوؤں  
کا گھر ہے۔ اگر میں اونچی کوالٹی کی آرزو کرتا ہوں تو مجھے بتایا جائے کہ اس کوالٹی کو چھوٹے  
کے لیے کتنی آزمائشوں سے گزرنا ہو گا؟ فریاد کی طرح تیشہ لے کر جٹانوں کے سینے سے دودھ  
کی نرنگائی ہو گی یا قارون کا خزانہ لانا ہو گا؟ یہ لوگ انسان ہو کر انسانوں کو نہیں سمجھتے کہ وہ  
کیسا فدی ہوتا ہے اسے آزمائش میں جھلا کیا جائے تو وہ ذرے سے آفتاب بن جاتا ہے۔  
میں نے بھی اپنی حیثیت بدل دی۔ اب کون ہے جو مجھے فٹ پاٹھ کا ٹائی کہہ سکتا ہے۔  
میرے پاس ایک شاندار کوٹھی ہے، ہمارے آگم ٹیکس والے میری صحیح آمدنی تک نہیں پہنچ  
سکتے۔“ وہ ریو الونگ چیئر پر یک بیک گھوم کر میرے رویہ ہو گیا ”مگر حیثیت دولت سے بنتی  
ہے تو میں دولت مند ہوں۔ اگر شرافت سے بنتی ہے تو میں نے اپنی ذات سے آج تک کسی  
کال نہیں دکھایا۔ کوئی غیر شرفانہ حرکت نہیں کی اور اگر حیثیت مذہب سے بنتی ہے تو  
اللہ اللہ میں مسلمان ہوں اور آخری نبی کی امت سے ہوں۔ اس کے باوجود اپنے اعلیٰ  
خانہ پر غر کر کے والے مجھے یا تو مسلمان نہیں سمجھتے یا انسان نہیں سمجھتے صرف ٹائی کہتے  
ہیں۔“

”تمہاری ان تھک کوششوں کو دیکھنے کے بعد اب میں کہہ سکتا ہوں کہ انسان اپنی  
جودہ سے اپنی حیثیت بدل سکتا ہے۔ دیکھو یا تاکہنی کے ارب پتی مالک کو کوئی موجی نہیں  
کہا۔ اس لیے کہ دنیا کے ایک بڑے حصے میں اس کے نام کا ڈنکا بجاتا ہے۔ ہمارے ملک میں  
جودہ مند آٹوٹک ڈرائی کلیٹنگ کی بڑی بڑی دکانیں چلاتے ہیں کوئی انہیں دھوبی نہیں  
کہا۔ اونچی سوسائٹی میں انہیں گلے لگایا جاتا ہے۔ اس طرح تمہیں بھی کوئی ٹائی نہیں کے  
ایک بار قسمت آزمائو تم شریف آدمی ہو، کسی شریف گھرانے کی لڑکی کا رشتہ مانگو۔ لیکن  
میں میں تمہیں غلط مشورہ دے رہا ہوں کیونکہ تم ایک گوری میم کو بیاہ کر لے آئے ہو۔“

وہیں سے آ رہا ہوں۔“  
اس نے چونک کر پوچھا ”کیا سوئی تمہارے سامنے آئی تھی؟“  
”ہاں سن نہیں۔“ میں بوکھلا گیا کہ جواب کیا دوں؟ پھر میں نے سچ کہہ دیا ”ناہی۔“  
سامنے نہیں آئی تھی میں اس کے سامنے پہنچ گیا تھا۔“  
اس نے غصے سے میرا گریبان پکڑ کر مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا ”تم بے وقت  
پہنچے! تم بغیر دستک دیے کوٹھی کے اندر کیوں گئے تھے۔ یہ آؤٹ آف ایجی کیٹ ہے یا  
کیٹ کا مطلب جانتے ہو؟ نہیں تم جام ہو، تم کیسے جانو گے۔“  
میں نے کہا ”میرا گریبان چھوڑ دو، ورنہ یہ سوئی کے لباس کی طرح تمہارا بولہ  
گا۔“

وہ ایک دم سے ڈھیلا پڑ گیا۔ میرا گریبان چھوڑ کر پیچھے رکھی ہوئی ریو الونگ چیئر  
پر۔ پھر دیدے پھاڑ کر مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے معلوم کرنا چاہتا ہو کہ میری ان آنکھوں نے  
دیکھا ہے اور کہاں تک دیکھا ہے؟ میں نے کہا۔  
”مجھے آج معلوم ہو گیا کہ تم لندن کے کبائز خانے سے سوئی کو کتنی خوب صورت  
ساتھ پیک کر کے لائے ہو۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟ کیا ہماری برادری میں فوجیان اور  
صورت لڑکیوں کی کمی ہے؟“

”تم میرے ذاتی معاملات میں بولنے والے کون ہوتے ہو؟ جو میں نے بہتر کہا  
کیا۔“  
”اگر بہتر سمجھ کر کیا ہے تو پھر تم نے سوئی کو مارا کیوں؟ اس کے کپڑے کیلا  
ڈالے؟ نہیں جو حماقت تم کر بیٹھے ہو اسے اپنی ذات تک محدود رکھ کر دنیا والوں سے  
رہے ہو۔“

وہ ریو الونگ چیئر پر دوسری طرف گھوم گیا۔ میری طرف پشت کر لی۔ مجھ سے  
چھپا لیا۔ اس کے بعد کہنے لگا ”کیا میں نے لندن جانے سے پہلے اپنے ہی ملک کی  
مذہب کی ایک لڑکی کا رشتہ نہیں مانگا تھا؟ مجھے وہاں سے رشتہ نہیں ملاخارت لی۔“  
”تم اپنی حیثیت سے زیادہ مانگ رہے تھے۔“ میں نے کہا۔  
”دیکھو حیثیت کی بات نہ کرو۔ شریفوں کے ہاں جب کوئی لڑکی کا رشتہ مانگتا ہا

وہ اچانک ہی قہقہے لگانے لگا "شاری۔۔ اور سوئی سے بابا بابا۔۔"  
 "آخر اس میں قہقہے لگانے کی کیا بات ہے؟" میں متعلق ہوئی نظروں سے اسے بچے  
 لگا۔

جب قہقہوں کا طوفان مگرز گیا تو اس نے کہا "میں نے تم سے اور اپنی برادری کے  
 دوسرے لوگوں سے جھوٹ کہا تھا کہ میں سوئی کو لندن سے بیاہ کر لایا ہوں۔"  
 "اس کا مطلب ہے کہ تم نے اسے داشتہ بنا کر رکھا ہے؟"  
 "نہیں، مجھے غلط نہ سمجھو۔ خدا گواہ ہے کہ میں گناہ گار نہیں ہوں۔ میں نے آج تک

کبھی ایک رات بھی سوئی کے ساتھ نہیں گزارا۔ ہم دونوں کے بیڑم الگ ہیں۔  
 اسے یہاں کیوں لایا یہ بھی سن لو۔ سوئی ایک غریب والدین کی بیٹی ہے۔ سہولت  
 میں جہاں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا اب وہاں غریبی، بھوک، افلاس اور گناہ کی آگ  
 چھائی رہتی ہے۔ سوئی نے شرفناہ زندگی گزارنے کے لیے ہیر و زینت کا کام سیکھا  
 لیکن تکلیف دہ رشتوں کی وہی پرانی کہانی ہے یعنی ماں اندھی، باپ بیمار اور لاغر اور بیمار  
 آوارہ اور بد معاش لہذا سارا بوجھ اور ساری ذمہ داریاں ایک لڑکی کے کاندھے پر آجاتی  
 ہیں۔ سوئی کو کال گرل بننا پڑا۔ وہ میرے ساتھ جس سیلون میں کام کرتی تھی وہاں اسے  
 والے کسی گاہک سے معاملہ طے ہو جاتا تو وہ ڈیوٹی کے بعد اس کے ساتھ چلی جاتی۔"  
 "تمہارے ساتھ کبھی نہیں گئی؟"

"نہیں۔ میں اپنی پارسل، جہازوں کا تو تم یقین نہیں کرو گے۔ میں اپنے دل کا مال  
 ہوں۔ میرے دل و دماغ پر بیس برس کی عمر سے صرف ایک ہی حسینہ فحش ہو کر رہ گئی ہے  
 تم سمجھو؟ نہیں سمجھو۔ میں بتاتا ہوں۔ وہی حسینہ جس کا نام شینہ ہے اور جس سے میں  
 اس وقت محبت کی جب فٹ پاتھ پر بیٹھ کر دو ٹکے کھاتا تھا۔ میں شینہ کا ذکر کر رہا  
 کروں گا پہلے سوئی کی بات پوری ہونے دو۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ کال گرل بن گئی اس نے کئی بار میرے ساتھ بھی دو ٹکے  
 سے آگے بڑھنا چاہا لیکن میں نے صاف طور پر کہہ دیا۔

"سوئی میں تمہارے لندن میں دولت کمانے آیا ہوں۔ میں ضرورت کے مطابق  
 کھاتا ہوں اور ضرورت کے مطابق پہنتا ہوں۔ کوئی تیسرا شوق نہیں کرتا۔ ایک ایک

بابا ہوں۔ اگر میں اپنی موجودہ حیثیت سے بہت بلند ہو کر اپنے ملک میں نہیں جاؤں گا تو  
 اپنی ٹیڑھ کو کبھی نہ پاسکوں گا۔"

پہلے ہل سوئی کو اپنی توہین کا احساس ہوا کیونکہ وہ میرے دروہی اور میں اسے  
 فریاد گزار کہا تھا۔ شینہ خوابوں سے زیادہ دور تھی پھر بھی میں اسے ترجیح دے رہا تھا۔ اس  
 تہذیب مجھ سے کئی ماہ تک ناراض رہی، مجھ سے بات تک کرنا گوارا نہیں کی۔ مجھے کب  
 لگا کہ وہ تھی۔ میں تو اپنا بینک بیلنس بڑھا رہا تھا اور اسے آئے دن گناہوں کی دلدل میں  
 نہنے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

دن دن وہ کال گرل، ماڈل گرل اور بزنس گرل کی حیثیت سے اتنی عام ہو گئی کہ  
 لڑکی اور بچوں کے ہیرے اور عینکی ڈرائیور معقول کمیشن پر اسے بزنس پہنچانے لگے۔  
 نواہات برس تک میں یہ تماشا دیکھتا رہا۔ اس دوران میں نے خزاں کو بہت آہستہ  
 ان کی طرف بڑھتے دیکھا جیسے جیسے جوانی کی چمک ماند پڑتی جاتی تھی ویسے ہی ویسے اس کے  
 لباب کے سلمان میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ پہلے وہ ہلکا سا سوسائٹی میک اپ کرتی تھی پھر  
 نئے سے پہلے آنے والے بڑھاپے کو چھپانے کے لیے گہرا چہرہ میک اپ کرنے لگی۔

جوانی اور بڑھاپے کے درمیان سفر کرنے والے اس سچائی کو نہیں سمجھتے کہ عمر کبھی  
 بسے حملہ نہیں کرتی، اندر سے کھوکھلا کرتی ہے۔ جب بڑھاپے کی گرد اندر سے اڑنے  
 لگی تو سوئی کو کھانسی آگئی پھر کھانسی کے ساتھ بخار بھی آنے لگا۔ اب وہ پھر میری دوست  
 بن گئی تھی کیونکہ وہ بیماری میں اسے مجھ جیسے ہمدرد کی ضرورت تھی۔ دن بدن گاہک ٹوٹ  
 رہے تھے، کئی گرتی جا رہی تھی، میک اپ اور دواؤں کے اخراجات بڑھتے جا رہے تھے۔  
 لہذا اس سے سیدھی اور کھری بات کہہ دی۔

"دیکھ سوئی! میں شینہ کا عاشق بن کر آیا تھا۔ اب بزنس مین بن گیا ہوں۔ میں  
 نہیں دوبارہ جوان اور صحت مند بنانے کے لیے اپنی محنت کی کمائی کا ایک پونڈ بھی خرچ  
 نہیں کر سکتا۔ اگر گناہوں کے راستے سے واپس آ جاؤ تو میں دوسری طرح تمہاری مدد  
 کر سکتا ہوں یعنی تیس برسین دگ بیتانے کا فن سکھاؤں گا" اس سے تمہاری آمدنی بڑھ  
 جائے گی۔"

مجھ سے یہ فن سیکھنے لگی۔ میری لاعلمی میں گناہ کے راستے پر چلتی رہی۔ اس عرصے

میں اس کے ماں باپ مر چکے تھے بھائی جیل چلا گیا تھا اس کے باوجود اس کے اخراجات ادا کیے گئے تھے۔ مزید ایک سال بعد وہ وی ڈی ٹریٹمنٹ کے لیے اسپتال پہنچادی گئی۔ ٹریٹمنٹ سمجھتے ہو؟ تم تو کبھی لندن نہیں گئے تم کیسے سمجھو گے میں سمجھتا ہوں۔  
وہ مجھے سمجھانے لگا کہ لندن میں جو بازاری عورتیں تیار یوں کا گھر بن جاتی ہیں انہیں منوبہ قرار دے کر ان کا باقاعدہ علاج کیا جاتا ہے۔ جب سوئی اسپتال سے باہر آئی تو اس کے پرس میں ایک سرخ کارڈ تھا۔ وہ کارڈ ظاہر کرتا تھا کہ سوئی زیر علاج ہے لہذا اس سے دور رہیں۔ ایسی عورتوں کو اسپتال سے ملنے والے سبز، سرخ، نیلے یا کسی رنگ کا کارڈ اپنے پرس میں رکھنے پڑتے ہیں تاکہ ان کے قریب آنے والے پرس کھول کر اور خطرے سے آگاہ ہو جائیں۔ جس عورت کے پرس میں ایسا کارڈ نہ ہو اسے جیل میں پڑنا ہے اور ہماری جرمانہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔

سوئی وہ سرخ کارڈ لے کر میرے پاس آئی اور جھگ کی طرح بیٹھ گئی۔ وہ کارڈ ایک عورت کا اعمال نامہ تھا۔ حالانکہ اس کارڈ پر صرف چند الفاظ درج تھے لیکن سرخی تیار رہی تھی کہ وہ آٹھ برس تک کس طرح اپنے لہو کا قطرہ قطرہ ہوس کے دروازے پر پلائی رہی ہے۔ وہ کارڈ خطرے کا سرخ سنگل تھا۔ وہ کارڈ بے حیائی کے حامی کارڈ اور طبی دھلائی کے دوران سوئی کے ہاتھ میں پکڑا دیا گیا تھا۔ وہ ایک آئینہ تھا۔ آئیہ اس میں اپنا سکروہ چرو دیکھ کر واپس چلے جاتے تھے۔ ذرا بالغ نظری سے دیکھا جائے صرف سوئی کا نہیں بلکہ پورے گھناؤنے معاشرے کا شناختی کارڈ تھا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ اس کی آمدنی کے ذرائع ختم ہوئے اب ایک ہی ذریعہ تھا کہ وہ سیلون میں محنت کرے اور حلال کی کمائی کھائے۔ وہ نہیں تھی، محنت کرتی تھی لیکن اخراجات بہت بڑھ گئے تھے کیونکہ وہ بیمار ہوئے اور ہونے کے باوجود اپنے چہرے کو میک اپ کے لوازمات سے اور بھدے جسم کو ہیلٹ، فوم کے بریزر اور دوسری پیڈنگ کے ذریعے خوب صورت اور پرکشش بناتی تھی۔ عمر کتنی ہی ہو، حالات کیسے ہی ہوں، اکثر عورتیں اپنا آپ دکھانے بغیر والوں کی خاموش نگاہوں سے داد وصول کیے بغیر زندہ نہیں رہتیں۔

اس کے ظاہری حسن و شباب سے متاثر ہو کر لوگ اس کے پاس آتے تھے اور ڈاکٹر کی طرح دیکھ کر واپس چلے جاتے تھے۔ وہ آنے والوں کو دھوکا دے سکتی تھی کہ دوسری لڑکیوں کی طرح اس کے پرس میں صحت یابی کا سرٹیفکیٹ نہیں تھا۔ وہ سرخ کارڈ اس کے دماغ کا پھوٹا بین گیا تھا۔ ایک عورت کو چیلنج کر رہا تھا کہ اب وہ کچھ بھی نہیں دے رہی اور ایسا تو بین آمیز چیلنج کوئی عورت برواشت نہیں کرتی۔ وہ جھجلا کر کہنے لگی کہ اب مجھے لگے۔ میں نے پھر اسے سمجھایا۔  
”سوئی! تم سمجھتی ہو کہ تمہیں کوئی خریدنے آئے جب ہی تمہاری قیمت اور اہمیت واضح ہوگی۔ یہ غلط ہے۔ اپنی قیمت لگانا چھوڑ دو۔ جب کوئی خریدنے آئے اور تم بکنے سے انکار کرو تو اس کے بعد ہی تمہیں اپنی اہمیت کا اندازہ ہوگا کہ لوگ کس طرح دیوانہ وار تمہاری آرزو کرتے ہیں اور حسرت سے تمہیں دیکھتے رہ جاتے ہیں کہ تم بکنے والی عورت نہیں ہو۔“

میری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے وعدہ کیا کہ اب وہ بکنے کا خیال میں نہیں لائے گی۔ میں نے کہا۔

”اب میں پاکستان جانے والا ہوں۔ اگر تم گناہوں سے توبہ کر لو تو میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ وہاں کسی کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ تم کال گرل بن کر زندگی گزار چکی ہو۔ وہاں تمہیں عزت ملے گی۔ میں تمہاری رہائش کا بندوبست کروں گا اور تم میرے سیلون میں بنگلہ کام کرو گی اس کا معقول معاوضہ دوں گا۔“

وہ دو دن تک سوچتی رہی، کبھی کبھی پرس کھول کر سرخ کارڈ کو دیکھتی رہی۔ آخر اس نے فیملہ سٹارٹ کیا کہ میرے ساتھ پاکستان جائے گی۔ اس وقت تک میرے دل میں یہی بات تھی کہ میں سوئی کو گمراہی سے بچا رہا ہوں۔ جو عزت وہ اپنے وطن میں کھو چکی تھی اسے میں اپنے وطن میں بحال کرنے جا رہا ہوں اور اس کے لیے ایک معقول روزی کا ذریعہ پیدا کر رہا ہوں لیکن اپنے وطن کی زمین پر پہنچنے ہی ان نیک مقاصد میں میری ذرا سی خود غرضی مثال ہو گئی۔ یعنی وہی دوسروں سے برتر ہونے والا جذبہ میرے دل میں مچلنے لگا۔

میری برادری والے جانتے تھے کہ شینہ کار شینہ ملنے کے باعث میں ضد میں آکر اپنی طبیعت بدل کر گیا ہوں۔ اب لوگ پوچھتے کہ اپنی حیثیت سے اونچے مقام پر میں نے کیا پایا؟ ان کی قسلی کے لیے اور اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے میں نے کہہ دیا ”سوئی“

جیسی خوب صورت میم بیاہ کر لایا ہوں۔ شینہ جیسی اب ہزاروں لڑکیاں مجھے مل سکتی ہیں بھائیو! میں نے سوچا کہ اس قوم کی لڑکی بیاہ کر لاؤں جو ہم پر سو سال تک حکومت کر رہے۔ اب میں اس میم پر حکومت کرتا رہوں گا۔

جھوٹی شان اور اپنا بڑا پن کون نہیں دکھاتا؟ سب ہی اس لعنت میں مبتلا ہیں۔ میں نے ایسی برتری دکھائی ہے جس سے سوئی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہے اور نہ ہی اس کے غرور کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ اگر پہنچتی تو وہ سرخ کارڈ کے مرحلے تک نہ پہنچتی۔ میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ ہم ایک کوشی میں رہیں گے لیکن ہمارے بیدروم الگ ہوں گے۔

باربر ماسٹر رمزی یہ کہہ کر ذرا چپ ہوا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

”تم سمجھ رہے تھے کہ میں اتنی خوب صورت میم کے ساتھ راتیں گزارا ہوں نہیں۔ اب تمہیں یقین آ جانا چاہیے۔ اگر شیطان برکائے تب بھی ہمیں کراس کر رہے ہیں جاسکتا کیونکہ وہ ایک کارڈ یافتہ عورت ہے۔“

میں نے پوچھا ”تو پھر تم نے اسے اس قدر کیوں مارا کہ کپڑے تک پھاڑ ڈالے؟“

باربر ماسٹر رمزی نے ایک گہری سانس لی۔ پھر دھکے دے دے دل سے بولا ”سوئی۔ میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ کل رات مجھے اس بات کا پتہ چل گیا کہ وہ میرے کیوں آئی ہے۔ اس لیے کہ یہاں کسی کال گرل کے پاس شناختی کارڈ نہیں ہوتا۔“

اندرونی بیماری کا اشتہار اس کے پرس میں نہیں ہوتا اس لیے وہ بھی یہاں آکر کارڈ کے سے آزاد ہو گئی ہے۔ اس نے لندن چھوڑنے سے پہلے ہی اپنے اس لعنتی کارڈ کے پرزے کر دیئے تھے اور وہ جو خود وہاں اندر سے پرزے پرزے ہو گئی تھی یہاں آکر پارس کی طرح اسمبل ہو گئی ہے۔“

وہ غصے سے مٹھیاں بھیج کر بولا ”میں یہ فریب برداشت نہیں کر سکتا کل رات کو کوٹھی سے غائب رہی۔ صبح واپس آئی تو میں نے اس کی خوب پٹائی کی۔ تب اس نے مجھے بتایا کہ وہ یہاں دکان میں آنے والے گاؤں کو پھانسی ہے۔ اب سوسائٹی کے بیوٹی پارلر کے مالک نے اسے پھانس لیا ہے۔ اسے اپنے ہاں کام کرنے کا رت بڑا آفر دیا۔“

لہذا وہ مجھے چھوڑ کر جا رہی ہے۔“

باربر ماسٹر رمزی کے چہرے پر غصہ کم اور دکھ کی پچھائیاں زیادہ تھیں۔ وہ بڑے آواز سے

”کے“

”صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تمہارے پاس ہی ایک بالوں کی خوب صورتی ہے۔ یہ صورتی تمہارے سر سے جھڑ جائے گی تو اپنے محبوب کو دکھانے کے لیے تمہارے کچھ نہیں رہے گا۔“

میڈم نے یہ سب کچھ غصے میں کہا تھا مگر کچھ کما تھا۔ میں خوب صورت نہیں ہوں۔ یہ ابھین سے جانتی ہوں اور بچپن سے یہ بھی جانتی ہوں کہ میرے بال بہت خوب تھے ہیں اتنے خوب صورت کہ حسین ترین عورتیں بھی یہ زلفیں دیکھ کر احساس کمتری کا ہو جاتی ہیں۔ جب سے واجد کی نگاہوں نے مجھے پسند کیا ہے تب سے کئی بار میں دم قصور میں اپنے بال کاٹ کر خود کو دکھا تو پتہ چلا کہ اس طرح واجد کو دکھانے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں رہے گا۔ اس لیے میں اپنے بال کبھی نہیں کٹاؤں گی۔ آخر میں ایک عورت ہوں۔ میرے پاس بہت نہ سخی بال برابر تو خوب صورتی ہو جسے میں اپنے بے گمانے پیش کر سکوں مگر یہ دنیا والے پیار کی خوب صورتی کو نہیں سمجھتے۔ محبت کا سر نے بیٹھ جاتے ہیں۔“

جلیل کی بات سن کر میں نے کہا ”ہاں باجی! ہماری اس دنیا میں سب ہی جھام ہیں۔ اپنے دل کا ٹرا ایک دوسرے کی حجامت بناتے رہتے ہیں۔ اچھا تو پھر آپ نے میڈم کو کیا چڑا۔“

”میں نے انکار کر دیا۔ وہاں سے اٹھ کر آنے لگی تو میڈم فیروزہ نے غصے سے کہا ”تم بالوں پر نہ اتراؤ کسی دن کوئی زبردستی کاٹ کر لے جائے گا تو بجھتی نظر آؤ گی۔ اس دن میڈم کی باتوں کا مطلب نہ سمجھ سکی مگر ایک دن جب میں اسکول سے بچوں کو پڑھا دہی آڑی تھی تو بد بد معاش میرا پیچھا کرنے لگے میں نے ایک کے ہاتھ میں بڑی سی لڑکی کو بار بار اس طرح قہقہی چلا رہا تھا جیسے خیال ہی خیال میں میرے بال کاٹ رہا تھا۔“

”ہاں باجی! میں نے حیرانی سے کہا ”کہیں ایسا تو نہیں کہ میڈم نے ان بد معاشوں کو ہانکے پیچھے لگا با ہو؟“

”میں کبھی بھی سمجھنے پر مجبور ہوں لیکن میں میڈم کے منہ پر کچھ نہیں کہہ سکتی۔ وہ

”میں کھانے کی نہیں، تمہاری دوسری ضرورتوں کی بات کر رہی ہوں۔“

چار دس ہزار روپے کی ضرورت ہو تو مجھ سے ابھی لے سکتی ہو۔“

میڈم کی بات سن کر میرا ہاتھ کا لقمہ ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ میں دوا سے پرے نہ کے لیے بھاگ دوڑ میں لگی ہوئی تھی کیونکہ واجد میکینیکل کالج سے فیلور ماسٹر ہیں۔ سعودی عرب میں انہیں پانچ ہزار روپے کی ملازمت مل رہی ہے لیکن جہاز پر سعودی عرب لے جا رہی ہے وہ چھ ہزار روپے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ میرے پاس ایک دو ہزار روپے ہیں۔ ایک ہزار میں نے اسکول کی ہیڈ ماسٹرس سے قرض لیے ہیں۔ ہزار کا بندہ دست نہ ہو سکا میڈم نے فراخ دل دکھائی تو میں نے کہا۔

”آپ واقعی سہیلی بننے کا حق ادا کر رہی ہیں۔ مجھے تین ہزار روپے کی ضرورت ہے، میں دوا کے اندر یہ رقم واپس کر دوں گی۔“

میڈم نے کہا ”واپس کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ تم تین ہزار کیا چاہا جاؤ مگر جیلے پلیر اپنے یہ بال تھوڑے سے کاٹ کر دے۔“

میں ایک دم سے پریشان ہو کر اس کا منہ بچکنے لگی وہ میرے شانے پر ہل رہی ہوتی ہاتھ رکھ کر بولیں ”ہم آپس میں سببیاں ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کے کام آنا چاہیے۔ تمہیں روپے کی ضرورت ہے اور مجھے ان رشتہ نشی زلفوں کی، ہم اسی طرح ایک دوسرے کی ضرورت پوری کر سکتی ہیں۔“

”مگر میں یہ بال نہیں کاٹ سکتی۔ یہ واجد کو بے حد پسند ہیں۔“

”کیا وہ پسند کرنے والا تمہاری تین ہزار روپے کی ضرورت پوری کر سکتا ہے؟ میں اپنے واجد کے لیے ہی روپے مانگ رہی ہوں۔ اس رقم سے ان کا منہ بجائے گا۔“

”اچھا تو یوں کہو۔“ میڈم نے مسکرا کر کہا۔

”تم اپنے محبوب کے لیے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا رہی ہو۔ دیکھو عورت کسی سے محبت کرتی ہے تو اس پر اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ کیا تم مستقبل سنوارنے کے لیے اپنے بالوں کی قربانی نہیں دے سکتیں؟“

”میں تو اپنی جان بھی دے سکتی ہوں لیکن واجد مجھے کبھی بال کاٹنے کی اجازت

”مکمل نے توبت ختم کر دی ہے۔“

”ٹھیک ہے ہم دوسری بات کریں گے۔ کل میڈم سے مہ جیوں کی ملاقات ہوئی تھی۔  
ہم نے بتایا ہے کہ ہمارا منگیتتر سعودی عرب جانا چاہتا ہے شاید حمیس اور ہمارے منگیتتر  
کو انبار دہنے سے دلچسپی نہیں ہے ورنہ حمیس اخبار کے ذریعے پتہ چل جاتا کہ کچھ فراڈ  
باریاں لوگوں سے بڑی بڑی رقمیں لے کر انہیں غیر قانونی طریقے سے لالچ میں لے جاتی  
ہیں اور کیوریٹن صحرائیں لے جا کر چھوڑ دیتی ہیں۔“

مکمل نے کہا ”ہاں میں نے یہ سنا ہے مگر واعدہ کہتے ہیں کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں  
ہوئیں۔ سب ہی فراڈ نہیں ہوتے۔ پھر یہ کہ وہ مرد ہو کر انجانے خطرات سے ڈر جائیں تو  
کئی ایک شائد ار مستقبل نہیں بناسکیں گے۔“

”لیکن جیلہ! اگر میں ایسے انتظامات کر دوں کہ خطرات کا شہ ہی نہ رہے اور ایک پیسہ  
نفاذ کے بغیر واعدہ ہاں پہنچ کر سات ہزار روپے ماہوار کمانے لگے تو کیسا ہو؟“

مکمل نے بڑی بے یقینی سے پوچھا ”سات ہزار روپے ماہوار؟ ممہ! مجھے یقین نہیں  
آتا کہ آپ یہ ملازمت کس طرح دلا سکیں گے؟“

رئیس احمد فدوی نے فخریہ انداز میں کہا ”مکمل ایسٹ میں میرا بہت بڑا کاروبار ہے میں  
ہم سے تقرری کا لیٹر دیوں گا۔ واعدہ کے یہاں سے جانے کے تمام اخراجات میں برواشت  
لوں گا۔ تمہاری قسطی کے لیے واپسی کا ٹکٹ بھی اس کے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔ اگر وہ  
لازات اس کے مزاج کے خلاف ہو۔ تو وہ کسی وقت بھی بہ آسانی واپس آسکے گا۔ اور کوئی  
فریاد نہ کرے گا؟“

مکمل نے طرہ الجھ کر رہ گئی۔ بچپن سے جن بالوں کو اپنا غور بناتی آئی تھی میں انہیں  
ابو کے لیے اپنے ہاتھ پر شکن لائے بغیر کٹوا سکتی ہوں مگر ایک خوف میرے دل میں ہے  
کہ ان بالوں کے بغیر واعدہ کو اللہ واع کئے ایئر پورٹ جاؤں گی تو ملاقات کے آخری لمحے اور  
ہلال کی پہلی گھڑی میں میرے پاس ایسا کوئی حسن نہیں ہو گا جسے وہ آنکھوں میں سجا کر لے  
جائے۔ میں بہت جلد بھولنے والی چیز بن جاؤں گی۔ کوئی عورت نہیں چاہتی کہ اس کا  
ہونے والا نظروں سے اوجھل ہوئے ہی اسے بھول جائے۔ میں کیا کروں؟ اپنی محبت کو  
ابھ کر رکھنے کے لیے میرے پاس صرف زلفوں کی ذخیرہ ہے۔

صاف مگر جائیں گی۔ بہر حال میں نادان بچی نہیں ہوں کہ ان بد معاشوں سے  
بال کٹوا دیتی۔ میں نے چلتے چلتے راستہ بدل دیا۔ گھر جانے کے بجائے اس رات پہ  
جہاں آگے ایک پولیس اسٹیشن تھا۔ ان بد معاشوں کے قدم سست پڑنے جب  
پولیس اسٹیشن کے احاطے میں قدم رکھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تو وہ تیزی سے  
بھاگتے چلے جا رہے تھے۔“

”یہ آپ نے بڑی عقلمندی کا کام کیا باجی! لڑکیوں کو اس حد تک گھبرا  
چاہیے۔“

جیلہ نے کہا ”اس دن کے بعد وہ بد معاش دوبارہ نظر نہیں آئے لیکن اس دن  
مجھے بڑا دکھ پہنچا ہے۔ میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا پھر لوگ کیوں میری ذرا سی خوب  
کو کاٹ کر پھینکنا چاہتے ہیں۔ کسی کی ناک کاٹ کر کسی کے منہ پر حجاب پھینک کر  
کے سر سے بال نوچ کر کیوں بد صورت بنایا جاتا ہے؟ اور دوسروں کو بد صورت  
انسان کیسی غیر انسانی سرسریں حاصل کرتا ہے۔ ابھی صبح کے وقت میں یہاں آؤں  
رئیس احمد فدوی نے میرے قریب اپنی کار روک دی۔ کار کی انگلی سیٹ پر ان کے  
جبین برقعہ پہنے نقاب الٹائے بیٹھی تھی۔ وہ کھڑکی سے سر نکال کر بولی۔

”جیلہ باجی! آپ کہاں جا رہی ہیں؟ کار میں آجایے ہم آپ کو پہنچا دیں گے  
اب بڑے آدمیوں کی مہربانیاں سمجھ میں آجاتی ہیں۔ میں سمجھ گئی کہ یہ جہ  
چھو کر بھی میرے بالوں کے پیچھے پڑ جائے گی۔ میں نے کار میں بیٹھنے سے انکار  
احمد فدوی بھی التجا کرنے لگے کہ میں مہ جیوں کی بات مان لوں۔ مہ جیوں نے گاڑ  
کر خوشامد انداز میں میرا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے مجبوراً بیٹھنا پڑا۔ وہ بھی کار کی کچلی  
میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور بیٹھتے ہی بولی۔

”اللہ باجی! آپ کے بال کتنے خوب صورت ہیں۔ انہیں دیکھ کر میں ریڑھ کا  
ہوں۔“

”لیکن میں اپنے بال نہیں کٹواؤں گی۔“

میری صاف گویا پہلے تو وہ دونوں چونک گئے۔ پھر رئیس احمد فدوی نے  
کہا ”دیش اہل راسٹ۔ ہم کسی اسٹیک بار میں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے



اب پلے گئے تو میں سولہ تارن کو بال کٹوانے یہاں آجاؤں گی۔"

"مرحما کر جانے لگی۔ اس لمحے مجھے یوں لگا جیسے وہ اپنی موت کا دن اور تارن مقرر کر کے جاری ہو۔ بارہ ماہ سردی نے پوچھا۔

"اپنی آپ سولہ تارن کو صبح کو آئیں گی یا شام کو؟"

"شام کو آنے کی بات کہہ کر دروازے سے باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ماسٹر دھڑلے میرے قریب آکر ہنسی سے کہا۔

"یہاں آنے والی خواتین کے لیے یہ خیر بے حد دلچسپ ہوگی۔ آج سے ہم ہر خاتون کے سامنے کھٹکے دوران سولہ تارن کا ذکر ضرور کریں گے مگر یہ نہیں بتائیں گے کہ جیلہ کچے کی یا شام کو۔"

"ایسا کہنے نہ کہنے سے کیا فرق پڑے گا؟" میں نے پوچھا۔

"بہت فرق پڑے گا۔ تم نہیں جانتے یہ برٹس پالیسی ہے، سولہ تارن کو دیکھ لینا اور نہ یہاں صبح سے آکر بیٹھ جائیں گی۔ کوئی بال کٹوانے، کوئی بالوں کے اسٹائل میں چھینچ لائے یا ہیر ٹرنگ کے لیے یا وگ سیٹ کرانے کے بہانے یہاں جیلہ کو دیکھنے آئیں گی لہذا اس روز تارن چاندی ہوگی۔"

میں سمجھ گیا۔ کچھ خواتین اسی لیے آئیں گی کہ انہوں نے جیلہ کے بالوں کے لیے لڑی اونچی بولیاں دی تھیں اور جیلہ نے انکار کیا تھا۔ اب وہ طعنے دینے یا جھپکے جھپکے آئیں گی کہ اسے آخر کتنا پڑا۔ کچھ اس کی صورت دیکھنے آئیں گی کہ وہ بال کٹنے کے بعد کبھی بد صورت لگتی ہے۔ اپنی خوب صورتی پر ناز کرنے کے لیے بے حد ضروری ہے کہ وہ بال کی بد صورتی کا تماشا دیکھا جائے۔

جب وہ دن گزر گیا اور دکان بند کرنے کا وقت آیا تو ماسٹر سردی دن بھر کی آمدنی کا حجب کرنے لگا۔ میں نے اس سے کہا۔

"اے سراج تمہاری باتیں ادھوری رہ گئی تھیں۔ تم شینہ کے متعلق بھی کچھ کہنا چاہتے تھے۔"

ماسٹر سردی آمدنی کا حساب بھول گیا۔ نوٹ گنتے گنتے شینہ کے نام نے گنتی بھلا دی۔ اس نے سراج کو آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"جیلہ باجی!۔" وہ جیسے نے کہا "آپ گھبراتی کیوں ہیں؟ بال کاٹنے کے بعد وہاں سکتے ہیں۔ جب آپ کے واجد صاحب سال دو سال بعد واپس آئیں گے تو آپ کے بال میں پھر مکی حسن اور نگار پیدا کر چکا ہو گا۔"

"میں اپنی پریشانی کسی کو نہیں سمجھا سکتی۔ ایک شرط پر تمہاری بات مان لیتی ہوں۔ یہ کہ جس دن واجد یہاں سے جائیں گے۔ اس کے دوسرے دن میں تمہیں یہ بال کٹا دے دوں گی۔"

"ہاں!۔" وہ جیسے نے خوش ہو کر رئیس احمد فدوی سے کہا "کیوں ڈارلنگ؟"

"میں، ہنی، اٹ اڈن!۔" رئیس احمد فدوی نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔

میں حیرانی سے دونوں کا منہ ٹکٹے لگی، کیونکہ میں انہیں باپ بیٹی سمجھ رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو ڈارلنگ اور ہنی کہہ رہے تھے۔ میں نے کہا "معاف کیجئے کیا کیا سکتی ہوں کہ آپ دونوں میں رشتہ کیا ہے؟"

"کیوں نہیں۔ یہ میری جان سے زیادہ عزیز شریک حیات ہے۔"

"اور یہ میرے سرتاج ہیں۔" وہ جیسے نے کہا۔

میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ چودہ برس کی بیوی، ساٹھ برس کا شوہر۔ دونوں کو اس رشتے کا تعین نہیں آتا تو، مگر یہ سوچ کر تعین کرنا پڑا کہ اتنی کم سن بیوی کو خوشی کے لیے ہی ایک بوڑھا خاوند میرے بالوں کو اتنے متنگے داموں خرید رہا ہے اور مارڈن ہونے کے باوجود اپنی بیوی کی کم سن چھپانے کے لیے اسے بربق پستانا ہے۔ انہیں باپ بیٹی نہ سمجھیں جبکہ ہم کسی سمجھ رہے تھے۔

جیلہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔ ہمیں بھی تھوڑی دیر کے لیے چپ سی لگ گئی۔ بھی کیا کہتے تھے۔ قانون کے مطابق لڑکی سولہ برس سے کم ہو تو نکاح نہیں ہو سکتی۔ احمد فدوی جیسے ساٹھ برس کے دولت مند چودہ برس کی تو کیا چار برس کی لڑکی کو بیٹا بنالیں تو ہم ان کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ جیلہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنے چرے پر ہنسی ہوئے آئینے میں دیکھنے لگی۔ تھریڈنگ کے بعد اس کی سانولی رنگت گہرائی لگا۔ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"اگر رئیس احمد فدوی کے وعدے کے مطابق واجد اس ماہ کی بدھ تہوار

رہی میرے لیے کتنی بڑی گالی بن گئی ہے۔ اسی لیے اب میں تمہیں گالی نہیں دے رہا ہوں۔ ہاتھ جوڑ کر التجا کر رہا ہوں اگر تمہارا کوئی خط کسی کے ہاتھ لگ جائے تو شینہ خواہ خواہ رہا ہو جائے گی۔ اب بھی ہم اسی امید پر رہتے جا رہے ہیں کہ کبھی تو ہماری برادری میں سے کوئی شینہ کو اپنی دلہن بنانے کے لیے آئے گا۔ خدا کے لیے ہمیں اس امید کے سوا کچھ ہی ہے۔“

ایک بوڑھے باپ کا خط پڑھ کر میں شینہ کی عمر کا حساب کرنے لگا۔ شینہ مجھ سے ایک برس بھٹی ہے میں اسے بچپن سے جانتا ہوں میں اکتیس برس کی عمر میں لندن گیا تو وہ تیس برس کی کنواری تھی اور جب لندن سے سات برس بعد اس کے باپ کو خط لکھا تو وہ سینتیس برس کی ہو چکی تھی اور اب دس برس بعد آیا ہوں تو وہ چالیس برس کی کنواری اب تک برادری سسٹم کی بددھنی میں سماگن بننے کے خواب دیکھ رہی ہے۔“

ماہر مزدی پھر ریو لوگک چیئر پر آکر آرام سے بیٹھ گیا پھر ایک گہری سانس لینے کے بعد ”میں نے اپنی برادری والوں میں برتری حاصل کرنے کے لیے جموئی شان دکھائی کہ ایک انگریز قوم کی لڑکی بیاہ کر لایا ہوں لیکن اس سے مجھے کچھ حاصل نہ ہوا۔ میری برادری کے لوگ مجھ سے خوش نہیں ہیں۔ سوچتی بھی اب جاچکی ہوگی اور شینہ رسم و رواج کے نامے کنویں میں پڑی ہوئی ہے۔ ساری زندگی جدوجہد کرنے کے بعد میں خالی ہاتھ ہوں۔“

میں نے کہا ”اے سڑاگر تم پہلے ہی ہماری برادری میں کسی لڑکی سے شادی کر لیتے تو یہ گالی اور باتیں نہ ہوتی۔“

”یہ تو سی بات ہوئی کہ گھر میں روٹی کھالیتے تو باہر بھوکے نہ مرتے۔ لیکن محبت ایک لڑکا کا ٹکڑا تو نہیں ہوتی کہ گھر کے چولہے پر ہی پک کر پیٹ میں اتر جائے۔ محبت تو کیسے لگی ہو سکتی ہے، کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ کوئی بھی برادری ہو، کوئی بھی مذہب ہو وہ محبت سے خالی نہیں ہوتا۔ جو لوگ اپنا اجلا پن قائم رکھنے کے لیے رسم و رواج کی چار دیواری پر بند کی پھرتے رہتے ہیں ان کے گھروں کی بوڑھی کنواریاں اپنے سفید بالوں کو گنتی رہتی ہیں اس کا باوجود میں کونوں کا کہ محبت کی حرارت جو ان ہوگی اور مجھے سدا جو ان رکھنے کے لیے خیال کافی ہے کہ وہ میرے لیے کنواری بیٹھی ہے۔“

”شینہ ایک تحریک ہے جو محبت کے نام سے میرے اندر پیدا ہوئی۔ اس ٹوکہ مجھے فٹ پاتھ سے اٹھا کر اس اونچے مقام تک پہنچایا۔ جب میں لندن میں اپنی حالت دیکھنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا تو میرے دل میں خیال آیا کہ اب شینہ کے والد کو خط ہو جانا چاہیے کہ میری حیثیت بدل گئی ہے، میں نے انہیں بڑی عاجزی سے خاک میں انہیں سمجھا کہ میں اپنی محنت سے کس مقام پر پہنچ رہا ہوں۔ اگر اشرف انھوں نے کے لیے محنت اور ایمانداری لازمی ہے تو مجھے اشرف اور محنتی سمجھ کر شینہ کو انعام کے پر میرے نکاح میں دے دیں۔“

اس نے نوٹوں کو سمیٹ کر جب میں رکھنے کے بعد کہا ”انعام میں یہ کاغذ کے ٹکڑے مل جاتے ہیں مگر محبت نہیں ملتی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میرے خط کا جواب آئے گا۔ آئے گا بھی تو اس میں میرے لیے غصہ بھری گالیاں لکھی ہوں گی لیکن خلاف توقع باپ نے بڑی عاجزی اور نرمی سے لکھا کہ میں اسے رشتہ مانگنے کے لیے خط لکھا کہ بیٹی کو بدنام نہ کروں۔ اس نے اپنے خط میں مجھے بتا کہ کر مخاطب کیا تھا۔

”بیٹا! شینہ جب سے جوان ہوئی تب سے ہم اسے سماگن بنانے کے خواب رہے ہیں۔ خواب اس لیے دیکھ رہے ہیں کہ اپنی برادری سے باہر ہم اس کی شادی کر سکتے۔ جب میں دولت مند تھا۔ ان دنوں شینہ فی بی کی مریضہ تھی۔ اس کے باوجود برادری کے کتنے ہی نوجوانوں کا رشتہ آتا تھا لیکن ہم پہلے اس کا علاج مکمل کرنا چاہا۔ لہذا رشتہ مانگنے والے شینہ کی صحت یابی کا انتظار کرنے لگے۔ اسی انتظار میں وہ بگڑ کی ہو گئی، ہم اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ہمارا اسکے کھرا ہے بچیس برس کے بعد ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

مگر اچانک ہی کاروبار میں ایسا نقصان ہوا کہ گھر کا سامان بکتے لگا۔ شینہ تو نہ ہو گئی مگر غریبی کا روگ لگ گیا۔ اب پتہ چل رہا ہے کہ غریبی اس دنیا کی سب سے اور چھوٹ کی بیماری ہے۔ رشتہ مانگنے والے شینہ کی بی بی سے نہیں بھاگتے تھے کہ گھبرا کر ہٹا کر رہے تھے۔

ایسے وقت تم رشتہ مانگتے آئے تو میں غصہ سے پاگل ہو گیا۔ میں نے تمہارا زعم میں گالی دی۔ اس وقت تک یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اپنی ہی برادری والے

کے ساتھ رہیں اور رئیس احمد فدوی بھی تھے۔ ہم نے وقت ضائع نہیں کیا۔ جیلہ اپنے کے سامنے بیٹھ گئی تو ماسٹر رمزی نے اس کے بالوں کو شانے کے نیچے ایک فیتے باندھ دیا۔ یونٹی پارلر کی محدود فضا میں کمری خاموشی چھا گئی۔ جہاں بیٹھ عورتوں کو یہ صورت پایا جاتا ہے وہاں ایک عورت کو اس کی اکلوتی خوب صورتی سے محروم کر کے روت پایا جا رہا تھا۔

بدلے ہوئے فیتے کے نیچے بالوں پر قبچھی چلنے لگی۔ کرر کرر کرر کی آواز سے قبچھی کے ریشمی دل کو کاتی جا رہی تھی۔ آئینے میں ماسٹر رمزی، ہم جہیں اور رئیس احمد کی طرح کتنے ہی قاتلوں کے چہرے نظر آ رہے تھے ذرا سی دیر میں کٹے ہوئے گیسو آئینہ بنانے اس طرح بچھا کر رکھ دیئے گئے جیسے جیلہ کی لاش رکھی گئی ہو۔ میں نے گھبرا کر بے بسی اسے دیکھا تو دیکھنا نہ گیا۔ جولاہی مردہ ہو کر بھی زندہ رہے وہ بڑی بھیاں نظر آتی تھیں۔ اب اپنے مشاہدے کو کام میں لائیں تو یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ بالوں کو اٹانے یا اٹھانے سے یا ان کا اشکال بدلنے سے چہرے کس طرح بدل جاتے ہیں۔ جیلہ کا یہی خاصہ چہرے کی جوانی اور تازگی مرگئی تھی۔ اب وہ کم عمر و شیرازہ کے بجائے عمر رسیدہ رت کھائی دے رہی تھی۔ گھٹائیں چھٹ جانے کے بعد آسمان نکلا ہو جائے تو دیکھنے کے کہ نہیں رہ جاتا۔

ایک ایک کر کے سارے تماشائی چلے گئے۔ ماسٹر رمزی نے رئیس احمد فدوی کو سمجھا کر دیکھنے کے دوران بہت سے بال ضائع ہو جاتے ہیں لہذا اتنے بالوں سے صرف بدلی ہوگ تیار ہو سکے گی۔ ہم جہیں نے اس بحث کو طول نہیں پکڑنے دیا۔ وہ ایک ہی لے کے لیے راضی ہو گئی کیونکہ ایک ہی دگ سے اس کی ضد پوری ہو رہی تھی۔ وہ اپنے ہارے غلام کو لے کر چلی گئی۔ جیلہ اس وقت بھی گم سم آئینے کے سامنے بیٹھی خود کو دیکھ رہی تھی خود کو پہانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”بائی“ میں نے آواز دی تو وہ چونک گئی۔ خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

”ب چلے گئے؟“

”ایمانی! بس چلے گئے۔“

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ ہم نے تمام بنیاں بچھا دیں۔ تمام آنے والے اندر سے ہو گئے۔ جب صبح ہوئی تو پھر انہیں انسانی چہروں کی بصیرت حاصل ہو گئی۔ بند کر کے اپنے اپنے گھروں کی طرف چلے گئے۔

ہر ماہ کی طرح اس ماہ کی بھی سولہ تاریخ آگئی۔ اس صبح سب سے پہلے آئیں اور ماسٹر رمزی سے خوش آمدانہ اعزاز میں کہنے لگیں۔

”ماسٹر! تم بہت بڑے سن رہو اگر چاہو تو جیلہ کی لاشی زلفوں سے دودھیں پاز ہو۔“

”مشکل ہے میڈم! جناب رئیس احمد فدوی صاحب نے زلفوں کا پورا لانا ہے۔“

”خیر نے سے کیا ہوتا ہے تم ان سے کہنا کہ ایک ہی دگ تیار ہوگی۔ میں نے پانچ ہزار روپے دیے ہوں۔ تم ان کے علم میں لائے بغیر دوسری دگ تیار کر کے دو۔“

وہ اپنے پرس سے روپے نکال کر گنتے لگی۔ ماسٹر رمزی نے کہا۔

”آپ اور ہم جہیں ہماری مشعل گاہک ہیں اگر ہم جہیں نے آپ کو جیلہ دگ میں دیکھ لیا تو وہ ہم سے ناراض ہو جائے گی۔“

”تم فکر نہ کرو“ اگر کبھی اس نے دیکھ لیا تو میں کہہ دوں گی کہ میں نے دوسرے ملک سے منگوائی ہے کیا اتنی بڑی دنیا میں جیلہ جیسے بال اور کس جاسکتے؟“

وہ پانچ ہزار کی رقم ماسٹر کے ہاتھ پر رکھ کر چلی گئی۔ یہ اگرچہ ہم جہیں ہوتی مگر بے ایمانی کہاں نہیں ہوتی؟ جیلہ سے کب ایمانداری کا سودا ہوا ایمانی کو جائز اور وقت کا تقاضا ثابت کرنے کے لیے اسی طرح سارے ایمانیوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

شام تک عورتیں آتی رہیں اور جیلہ کے انتظار میں ہماری تکی کا شام کو وہ آئی تو اس کے لیوں پر اداس اداس مسکراہٹ تھی۔ اداس اس! واجد جاچکا تھا اور مسکراہٹ اس لیے تھی کہ وہ اپنے محبوب کے لیے قربانی

”کسی نے مجھے پہچانا نہیں ہوگا؟“  
 بڑا ہی زہریلا سوال تھا۔ مطلب نکل جانے کے بعد کون پہچانتا ہے۔ ہم بے گناہ  
 اس کا منہ کھٹکے گئے۔ وہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی ”اب میرے چہرے سے  
 عمر کا پتہ چل رہا ہوگا۔ میں پورے اکتیس برس کی ہوں۔“  
 یہ کہہ کر اس نے اپنے پنڈ بیگ میں سے برقع نکالا پھر اسے پہننے لگی۔ برقع اپنے  
 وقت کام آتا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ برقع میں چھپنے والی نے اپنی عمر کیلئے  
 چھپائی اگر وہ نہ جانتی تو ہم اسے زیادہ پچیس برس کی کنواری سمجھتے مگر وہ بگوار  
 سمجھانے کے لیے اکتیس کا ہندسہ ہمارے ذہن میں چھوڑ گئی تھی۔ اس کے جانے کے  
 میں نے کہا۔

”مے سڑا یہ اچھا نہیں ہوا۔ جیلہ کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے میرا سر موڑا گیا ہو۔“  
 چاری کو بد صورت بنا کر دنیا والوں کو کیا ملا؟“  
 ”کسی کو بگاڑ کر ایک عجیب طرح کی سرخس حاصل ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ تنہا  
 ابتدا سے پہلے انسان ہنستا نہیں جانتا تھا۔ ایک بار ایک شخص نے کسی بات پر ہنس  
 شخص کے چہرے پر کالک مل دی۔ اس کالک زدہ چہرے کو دیکھ کر سب ہی ہنسنے لگے۔  
 یہ بات سمجھ میں آئی کہ کسی پر کچھڑا چھال کر یا بد صورت بنا کر اس کے کپڑے اتار کر  
 اپنے مقام سے گرا کر خوب ہنسی آتی ہے۔ آج تک جتنے چٹکلے یا لطفے گھڑے گئے ہیں  
 غور کرو تو پتہ چلتا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی حماقتوں کی تشریح کر کے اس کی  
 بد صورتی پیش کر کے یا اس کی توہین کر کے دوسروں کو ہنساتا ہے۔ سب سے قہقہہ  
 وہ ہوتے ہیں جن میں عورتوں کی توہین کی جاتی ہے، بے شک ماؤں کے متعلق لہجہ کو  
 گئے ہوں گے مگر وہ قابل اشاعت اس لیے نہیں ہوتے کہ انسان اس سے پیدا ہوا ہے  
 ان کا دودھ پیتا ہے۔ بس اسی مقام پر ہماری خود غرضی کا ثبوت مل جاتا ہے۔“

ماسٹر مرزی بڑے موڈ میں بولتا رہا۔ وہ اس لیے اچھے موڈ میں تھا کہ اس روز  
 زیادہ کمائی ہوئی تھی۔ میڈم فیروزہ سے جو پانچ ہزار کی ادبیری آمدنی ہوئی تھی اس لئے  
 مجھے پانچ سو روپے کر بولا ”جاؤ صبح کرو اور یہ نہ سوچو کہ ایک کو فن کرنے سے سب کو  
 ہو جاتی ہے۔“

ہندوؤں میں دو دگیں تیار ہو گئیں۔ رئیس احمد فدوی ایک دگ کی بنوائی کے پانچ  
 دگ تیار کر اسے اپنی کم سن بیوی کے لیے گھر لے گیا۔ دوسرے دن میڈم فیروزہ آئیں  
 دگ لے گئے۔ بھکڑ (خرو) بھی دینگ روم میں پہنچ گیا۔ پتہ نہیں دل کو دل سے کیسے راہ  
 دیا ہے۔ وہ چھو کر اس بوڑھی کے پیچھے کچے دھاگے سے بندھا آتا تھا۔ اس روز میڈم  
 دگ لے کر جاری تھی۔ ماسٹر مرزی نے کہا۔

”میڈم! آپ کے لیے دگ تیار ہے مگر ہم یہاں ڈیوری نہیں دیں گے۔ آپ اپنا پتہ  
 دے۔ میرا کوئی دہاں جا کر آپ کو دگ سیٹ کرنا بتا دے گا۔“  
 میڈم نے اپنے پرس میں سے ایک کارڈ نکال کر دیتے ہوئے کہا۔  
 ”تم شام کو پانچ بجے تم اپنے کوئی کو بھیج دو۔ اس کے جو پیسے ہوں گے میں وہیں ادا  
 دلاؤں گا۔“

یہ کہہ کر وہ دینگ روم میں چلی گئی کیونکہ خود وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ ان کا خاموش عشق  
 میں نہیں آتا تھا۔ میڈم کوئی سا انگلیش میگزین اٹھا کر ایک صوفے میں بیٹھ جاتی تھیں  
 بار بار مسکرا کر یوں پلو بدلتی تھیں جیسے ہر پلو سے اپنی بوڑھی جوانی کی نمائش کر رہی  
 ہوں۔ خود جیسا تجربہ کار چھو کر احساس کمتری میں مبتلا رہتا تھا آخر اس روز میڈم کو ہی  
 خدمت آگے بڑھنا پڑا۔

مہمان پارٹیشن کے شیشے کے پار دیکھا۔ جب دینگ روم سے سب چلے گئے تو میڈم  
 ایک سے اٹھ کر خرو کے پاس گئیں۔ اپنا پرس کھول کر ایک کارڈ نکالا پھر اسے خرو کو  
 دے دیں۔ کچھ کہا۔ اس کے بعد جواب سے بغیر وہاں سے چلی گئیں۔ خرو خوشی سے کانپ  
 فانس کا چہرہ تانے کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ معلوم ہوا تھا کہ اسے بہت بڑی دولت مل  
 رہی ہے۔ الو کا پتہ۔

ماسٹر مرزی کے وعدے کے مطابق میں دگ لے کر میڈم کی کوٹھی میں پہنچا تو ملازم  
 مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ تھوڑی دیر بعد وہی ملازم میرے لیے چائے لے کر آیا۔  
 میں نے پوچھا۔

”میڈم کیا کر رہی ہیں؟“  
 ”مولہ سنگار کر رہی ہیں۔“ اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

لہذا امر کی۔ ان کے ہونٹوں کی لمبو رنگ لالی بتا رہی تھی کہ وہ اپنے گیارہ برس کے بچے  
فلان کی بیٹی ہیں۔

میں نے سنگار میز کے پاس پہنچ کر پلاسٹک کی ڈی پر سے کپڑا ہٹایا۔ اور جیلہ کے بالوں  
دل ان کے سامنے رکھ دی۔

”اگلی خوش صورت دگ ہے۔“ وہ بالوں پر ہولے سے ہاتھ پھرتے ہوئے  
کہا۔

”اس پلاسٹک کی ڈی پر یہ بال اتنے خوب صورت لگ رہے ہیں، جانے میرے سر پر  
باجا دیگا نہیں گے۔ چلو اسے جلدی سے سیٹ کرو۔“

اس لمبے میڈم مجھے پلاسٹک کی ڈی نظر آئیں۔ جو صرف کرائے کی خوب صورتی سے  
دلی جاتی ہے۔ میں نے اس دگ کو اٹھا کر ان کے سر پر رکھ دیا۔ احتیاط سے سیٹ  
لے گا۔ جیلہ کے سیاہ بالوں کا کفن پرسانے لگا۔ وہ بہت خوش تھیں۔ بار بار آئینے میں  
اکوڑی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر وہ بڑے اعتماد سے بولیں۔

”آج تو مجھے دیکھتے ہی دیوانہ ہو جائے گا۔“

فلان؟ میں نے پوچھا۔

”ہی جو تمہارے سیلون میں آتا ہے۔ آج بھی آیا تھا میں نے اسے چوبچے آنے کے  
بکاوے۔ عجیب بھولا بھالا سا جوان ہے مجھ سے بات کرتے ہوئے شرماتا ہے اسی لیے  
آج تک اس کا نام نہ پوچھ سکی۔“

”اس کا نام بھکرو ہے۔“ میں نے کہا ”یعنی فخر الدین محمد خود اپنا نام صحیح طور پر ادا  
کیں گے۔ اپنے آپ کو بھکرو کہتا ہے نرا جال ہے۔“

میڈم نے آئینے میں سے گھور کر مجھے دیکھا۔ پھر شاید خیال آیا کہ گھور کر دیکھنے سے  
انکوں کا لیمک اپ بگڑ جائے گا، ابھی ابھی جو مصنوعی پلکیں لگائی ہیں وہ اپنی جگہ سے ڈھیلی  
پاؤں کی گدھا آٹھنی سے بولیں۔

”گھر وہ جال ہے تو تمہیں اس کی توہین نہیں کرنی چاہیے۔ میں اسے پڑھاؤں گی،  
لے لوٹی ہوسا کی کے قابل بنادوں گی۔ جب وہ عمدہ سا سوٹ پہن کر میرے ساتھ کار میں  
کوئے گا تو ساری دنیا حاسد بن کر ہمیں دیکھتی رہے گی۔ شاید میں اب تک اسی لیے

”تو پھر تم ہی یہاں بیٹھ کر باتیں کرو۔ کچھ تو وقت گزرے گا۔ یہ جتاؤ کیا میڈم؟“  
کوٹھی میں تجار ہتی ہیں؟ مجھے یہاں کوئی ان کا رشتے دار نظر نہیں آ رہا ہے۔“

ملازم ایک ٹھنڈی سانس لے کر قائلین پر بیٹھ گیا، پھر کہنے لگا۔  
”میڈم کسی رشتے دار کو یہاں بغیر اجازت آنے نہیں دیتیں۔ انہیں تمہارے ٹیبل

آتا ہے۔“

”کیا انہوں نے کبھی شادی نہیں کی؟“

”بارہ برس پہلے ان کا ایک شوہر اور ایک بچہ تھا۔ شوہر غریب تھا مگر غیرت مند تھا۔  
میڈم کو منع کرتا تھا کہ وہ کلب وغیرہ نہ جایا کریں۔ اس بات پر آئے دن جھگڑے ہوتے  
رہتے تھے۔ وہ ایک غریب شوہر کو حکمران کی حیثیت سے برداشت نہ کر سکیں۔ طلاق لے  
انہیں یہاں سے نکال دیا۔“

”اور بچہ؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ بھی اپنے باپ کی گود میں چلا گیا۔ پتہ نہیں وہ باپ بیٹے کہاں چلے گئے۔ چار  
گیارہ برس کا ہو گیا ہو گا مگر میڈم کی آنکھ سے کبھی اس کے لیے آنسو کا ایک قطرہ نہیں پڑا  
یہ دیکھ کر بھی یقین نہیں آتا کہ کوئی ماں ایسی سنگدل بھی ہو سکتی ہے۔“

میں نے چائے کا آخری گھونٹ پی کر پانی کو میز پر رکھتے ہوئے کہا۔  
”ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی تنہائی میں اپنے بچے کو یاد کر کے روئی ہو۔ عورت کی بات

خالی نہیں ہوتی۔“

”بھئی آپ مجھ سے زیادہ نہیں جانتے۔ جو عورت اس عمر میں بھی سنگار میز کے  
اپنے ہی آپ کو دیکھتی رہتی ہو وہ کسی عاشق کے بارے میں تو سوچ سکتی ہے کہ بچے

بارے میں سوچ کر بوڑھی نہیں بن سکتی۔ میں اپنی زبان بند رکھنا چاہتا ہوں۔ اگر  
نکل گئی تو۔۔۔“

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میڈم نے بیڈروم سے آواز دی کہ مجھے اندر  
دیا جائے۔ میں اندر پہنچا تو ان کی خواب گاہ تیز قسم کی دلائی خوشبو سے مکھڑی

میڈم نے جوانی کا ہر رنگ اپنے اوپر لینے پھرتے کے لیے پڑا مگر ایک اپ کا تھکا  
بڑھاپے سے جوانی کی طرف آنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں نہ لوم کی

کنواری تھی کہ مجھے فخر الدین جیسا محبوب ملنے والا تھا، بلکہ ملنے والا ہے۔  
مجھے بڑا غصہ آیا، کم بخت ہمیں اندھا سمجھتی تھی کہ ہم اسے کلی آنکھوں سے دیکھ  
نہیں ہیں۔ اس کی عمر اور اس کے جموٹے کنوارے پن کو نہیں سمجھتے ہیں۔ میں نے  
حاصل سے پوچھا۔

”اگر آپ فخر الدین سے شادی کرنا چاہتی ہیں تو میں بیٹگی مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔ وہ فوراً ہی بوڑھی داداؤں سے جوان لڑکیوں کی طرح شرمانے لگیں۔ میں نے نکل۔“

”فخر الدین آپ سے زیادہ شرمیلا ہے اگر آپ بھی شرا میں گی تو پھر بات آگے نہ بڑھے گی۔ آپ ہاں یا نہ میں جواب دیں۔“

انہوں نے بدستور شرعاً تو ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے پھر کہا ”آپ بدستور  
جوڑا بڑا ہی رومانسک ہے، بڑی اچھی ازدواجی زندگی گزرے گی۔ پھر آپ ایک بچہ لیں  
بن جائیں گی۔“

”اے سب سب بچے۔۔۔“ وہ آگے کچھ نہ کہہ سکیں، اچانک ہی گیارہ برس کا  
پسند ان کی گلے میں پڑ گیا۔ اگر کوئی سنگدل ماں ہو، اس کے دل میں بچے کی یاد اور آنکھ  
میں آنسو نہ ہوں، تب بھی زندگی کے کسی موڑ پر ایک لمحے کے لیے اس کی کوکھ میں  
ضرور اٹھتا ہے۔ صرف ایک لمحے کے لیے میڈم کا چہرہ دھواں دھواں سا ہوا تھا۔  
یہی لمحے وہ سنبھل کر مسکرانے لگیں۔ اسی وقت ملازم نے آکر بتایا کہ کوئی کچھ لڑائی  
لڑکا ملنے آیا ہے۔ وگ ان کے سر پر سیٹ ہو چکی تھی وہ دائیں بائیں گھوم کر آئینہ میں  
ہوئی پولیس۔

”وڈو فیل“ میں سختی بدل گئی ہوں۔ خود پر مرثیے کو بھی چاہ رہا ہے۔ اب تھراپک  
روم میں بیٹھو، اگر سیکنگ میں دوبارہ گریڈ ہوئی تو میں جہیں بلاؤں گی، گھر نہ کرنا، مجھے  
نقصان نہیں ہوگا میں ذیل محاذوں دوں گی۔“

میں نے ڈرائنگ روم کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ ملازم فخر کو خواب لگی لڑائی لے جا رہا تھا۔ میں نے فخر کو عمر کا حساب لگایا۔ وہ بیس بائیس برس کا جوان ہو گا۔ میرا آدمی عمر سے بھی کچھ کم ہو گا۔ مگر اس وقت یہ صداقت نظر آرہی تھی کہ مشن ملازم سے اندھا ہوتا ہے۔

ملازم نے اگر مجھ سے چائے کے لیے پوچھا تو میں نے انکار کر دیا۔ وہ کسی کام سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کدو ٹھنکی کی دیرانی اور سناٹے میں یہ جینسن بیٹے لاکر میڈم کی خواب گاہ میں کیا ہو رہا تھا؟ مجھے وہ تماشا دیکھنا چاہیے، اگرچہ یہ بے نظارتانہ حرکت ہوگی لیکن خواب گاہ میں کون سے اخلاق کا مظاہرہ کیا جا رہا ہوگا؟ تھوڑی دیر تک میں نے خود کو اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی پھر ناکام ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ بیٹا۔ ازلہ رنگ اور بیڈ روم کے درمیان ایک کاریڈور تھا۔ جب میں کاریڈور میں پہنچا تو گاہ گاہ کاروانہ بند نظر آیا۔ مگر کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور وہاں سے میڈم کی آواز منتشر رہی تھی۔

”تم بہت شرمیلے ہو۔ میں چار ماہ سے انتظار کر رہی تھی کہ تم آگے بڑھو گے، کچھ بولو  
 آؤ میں نے تمہیں بلایا ہے تو تم یہاں تک آئے ہو۔ کیا مجھ سے ڈر لگتا ہے؟“  
 میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے کی آڑ سے دیکھا سامنے ہی ایک صوفے پر  
 انڈونے کے ساتھ پھیل کر بیٹھی ہوئی تھی اور غوراً نکل سنا ہوا سا کمرہ رہا تھا۔

”اے! ڈر لگتا ہے کیونکہ میں غریب ہوں اور آپ۔۔۔“

یڈم نے فوراً ہی بات کاٹ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”یہی بات نہ  
 دو اگر تم غریب ہو تو میں غریب پرور ہوں۔ میں تمہیں اچھی طرح بولانا سکھاؤں گی۔  
 یہاں ایک سے ایک عمدہ لباس پہناؤں گی، میری دولت تمہاری ہوگی۔ میں بھی تمہاری  
 دلہن بن جائی گی۔“

”چھوڑ دوں گا، میں کیا کروں۔ بچپن سے مجھے محبت نہیں ملی۔ میرا باپ شرابی، جواری اور نیکی بیچارہاں پر ظلم کرتا تھا۔ ظلم کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے وہ برداشت نہ کر سکی۔ ہمیں پندرہ برس کا تھا تو وہ مر گئی۔ اس کے بعد میں گھر سے بھاگ گیا محبت کی تلاش میں۔“

”خیر کا ہاتھ محبت سے اپنے ہاتھ میں لے کر بولی ”تم بہت دیکھی ہو“ میں ہمارے دکھ  
 بٹ لیں گی۔“

”تپ بڑی مہمان ہیں۔ پہلے ہی دن آپ کو دیکھا تو ایک دم سے اپنی امی کا چہرہ سامنے آگیا۔“

لی سکیں سے ہم آہنگ ہو رہی تھی۔ ان کے پیچھے دیوار پر ایک ٹیم عیاں حسین عورت  
لڑیام کے زانو پر سر رکھے لیٹی ہوئی شراب کے بھرے ہوئے جام کی طرح چٹک رہی تھی  
اور منہ پر جوانی کے خالی جام سے آنسو چٹک رہے تھے۔

تب ریکارڈ پلیئر سے ایک خاص میوزک کی ترتیب کے ساتھ قہقہے سنائی دینے لگے۔  
یاد ہو کلا کر چاروں طرف یوں دیکھنے لگیں جیسے دنیا والے ان پر ہنس رہے ہوں۔ اس  
وقت صاف طور پر ان کا چہرہ نظر آیا۔ آنسوؤں سے کابل دھل کر رخساروں پر کالک پھیلا  
ہاتھ۔ مصنوعی پٹلیں جھڑکنی تھیں آنکھوں کا شاعرانہ حسن مر گیا تھا۔ ہونٹوں کی سرخی  
مٹ گئی تھی۔ چہرے کے نقوش ٹیڑھے میڑھے ہو گئے تھے جیلر کے بال سر سے اڑ گئے  
تھے کسی سے بیک نامک کر خوب صورتی لاؤ یا بیوٹی پارلر سے خریدو وہ زیادہ دیر تک ساتھ  
نہیں رہتی۔ جو اصل چہرہ ہے وہ بہت جلد بے نقاب ہو جاتا ہے۔

اچانک ہی وہ اپنے خضاب رسیدہ بالوں کو لمبی میں جکڑ کر قہقہے لگانے لگیں۔ ریکارڈ  
پلیئر کی موسیقی سے ابھرنے والے قہقہوں کے پیش منظر میں وہ ایک چیل کی طرح ہی ہی  
وہی ہنسی جاری تھی ”ہی ہی ہی یہ جوانی جاتی ہے تو پھر آتی کیوں نہیں“ ہی ہی ہی اور جب  
آتی نہیں ہے تو پھر جاتی کیوں ہے۔ ہی ہی ہی میں نے اپنے بچے کی محبت کا گلا گھونٹ دیا  
اکہ کوئی مجھے نہ پالنے والی نہ سمجھے۔ ہی ہی ہی میں نے شوہر کو چھوڑ دیا تاکہ کنواری نظر آؤں۔  
میں بوی ہوں شوہر سے خالی۔ ہی ہی ہی میں میں میں ہوں بچے سے خالی۔ میں کنواری ہوں  
دہائی سے خالی۔ ہی ہی ہی اری اور حرام زادی جوانی! میری ساری دولت لے کر ایک بار ایک  
لے کے لیے آجا۔ نہیں تو چھو کرے ماں کہہ کر گالی دیتے رہیں گے۔“

میڈم کی حالت دیکھ کر میں نے سوچا۔ اب اپنی محنت کا معاوضہ نہیں ملے گا۔ میں ان  
سے معاوضہ مانگوں گا تو وہ مجھ سے جوانی مانگیں گی جبکہ ہم بیوٹی پارلر میں بیٹھ کر مصنوعی جوانی  
نظر کرتے ہیں۔ یہ اس لیے کرتے ہیں کہ عارضی طور پر کسی کو جوان بنا کر اس کے  
بچاپے کا فائدہ لیں مگر غم لپکا کہاں ہوتا ہے وہ تو بوجھ بننے بننے پاگل بنا دیتا ہے۔ میں اس  
پاگل عورت کو اس کے حال پر چھوڑ کر چلا آیا۔

اس دن کے بعد میڈم نے ہماری دکان میں آنا چھوڑ دیا۔ شاید اس خیال سے کہ وہاں  
لوہا لانا ہو گا۔ فحشو بھی میڈم کے ڈر سے ہماری دکان کا راستہ بھول گیا۔ ہمیں گاؤں

میڈم گھبرا کر پولیس ”یہ تم کیسی بکواس کر رہے ہو؟“  
”اب میں بکواس نہیں کروں گا۔ خود کو چھوٹا نہیں سمجھوں گا۔ مجھے اپنے بچے  
لگا لیجئے امی۔“

خزانہ کی زوردار آواز کے ساتھ فحشو کے منہ پر طمانچہ پڑا۔  
”سور کے بچے! مجھے امی کہتا ہے۔ کیا میں تجھے بوڑھی نظر آتی ہوں؟ دلیل کئے لیں  
تیرا منہ نوجوانوں کی تیری زبان جلا ڈالوں گی۔“

وہ غصے کی شدت سے بچ بچ اس کا منہ نوچنے لگیں۔ اس کے بالوں کو لمبی میں جکڑ  
جھٹکے دینے لگیں۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے ادھر ادھر یوں ہی ہاتھ چلا رہا تھا کہ ہاتھوں کی لٹکی  
اگر جیلر کے بالوں کی دگ ٹر پڑی تھی، طبل کا باریک کر پھٹ رہا تھا، چہرے سے بک  
اپ کا پلاسٹر اکھڑ رہا تھا مگر میڈم کو ہوش نہیں تھا۔ وہ پانچواں گھر ہو رہی تھیں۔

”دکھنے کا چھو کر باتیں کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ اپنی حیثیت سے اونچا اڑنا  
ہے۔ کتے کینے۔ اتنے دنوں سے تو مجھے ماں سمجھ کر دیکھ رہا تھا۔ میں تیری آنکھیں پھونکا  
گی۔“

ماں کی گالی سے بڑی اور کوئی گالی نہیں ہوتی۔ فحشو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس  
ماں کہہ کر کون سی گالی دے دی ہے۔ اگر اسے اتنی ہی عقل ہوتی تو وہ ایک دولت مند  
زود عورت کے چہرے پر اپنی ماں کا چہرہ نہ دیکھتا۔ ماں سے مشابہت رکھنے والا چہرہ نہیں  
بستی میں تلاش کرتا۔ بہت دیر تک مار کھانے کے بعد آخر اس نے بو کلا کر میڈم کو  
دیا۔ وہ صوفے پر گر پڑیں۔ وہ بھانکتا ہوا خواب گاہ سے باہر کارڈور میں آیا۔ مجھے دکا  
ایک ذرا ٹھنک گیا۔ اس کی سہمی ہوئی آنکھیں آنسوؤں سے جھیلی ہوئی تھیں۔ چہ  
لائے ناخنوں کی خراشیں پڑ گئی تھیں۔

اس کے گالوں اور ہونٹوں پر جا بجا خون کے ننھے دھبے نظر آ رہے تھے۔ وہاں  
کے بجائے سرخ لہیوں کے بو سے نظر آتے تھے اگر وہ صرف ماں نہ کہتا، محبوب کہتا۔  
وہ اپنے چہرے کو پونچھتا ہوا وہاں سے بھاگ گیا۔ میں پلٹ کر کڑکی کے پار کچے  
وہ صوفے پر جس انداز میں مری تھیں ”اسی طرح پڑی ہوئی دونوں ہاتھوں سے منہ چبا  
رہی تھیں۔ دور ایک ریکارڈ پلیئر سے انگریزی گانے کی دھیمی دھیمی آواز ابھر کر

تقریباً دس ماہ بعد ایک دن اچانک ہی جیلہ آگئی۔ میں اسے دیکھتے ہی خوشی سے اچھل پڑا۔ اسٹریمرز نے اسی وقت دکان کھولی تھی اس لیے کوئی گاہک نہیں تھا۔ صرف وہ تھی اور ہم تھے۔ دوسرے گاہکوں کے آنے تک اطمینان سے باتیں کر سکتے تھے۔ میں نے آئینے کے سامنے ایک ربوہ لونگ چپڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”آئیے بائی! آپ ایک مدت کے بعد آئی ہیں۔“

”ہاں“ ایک مدت تک مجھے تھریڈنگ کی ضرورت نہیں پڑی۔ کوئی مجھے دیکھنے والا نہ ملا۔“

وہ کرسی پر آئینے کے سامنے اپنے ربوہ بیٹھ گئی۔ بیٹھنے سے پہلے میں نے اس کے بالوں کو دکھا۔ اس کی زلفیں بروقتی ہوئی کمر تک پہنچ گئی تھیں۔ ان میں وہی حسن اور ریٹیم جیسی لاف تھی۔ میں نے پوچھا۔

”کیا آپ کے واجد صاحب واپس آگئے؟“

”وہ گئے کب تھے۔“

”کیا مطلب۔ کیا وہ سعودی عرب نہیں گئے؟“

”ہاں گئے تھے مگر ایک ہفتے میں واپس آگئے۔ انہوں نے مجھ پر کئی کوڈ دیکھا تو بدل ہوئے۔ ناراض ہو گئے کہ میں نے بال کیوں کٹوائے حالانکہ وہ سب کچھ جانتے تھے۔ میں نے پوچھا۔ آپ اتنی جلدی کیوں آگئے۔ انہوں نے کوئی معقول جواب نہیں دیا۔ یہ کہہ کر پلٹ گئے کہ واپس آکر اطمینان سے جواب دیں گے۔“

مگر وہ چند روز تک غائب رہے۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں ان کے گھر گئی تو دروازے پر لاکھڑا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر انہیں کیا پریشانی ہے؟ مجھے کیوں نہیں بتاتے؟ میں تو پیشہ آڑے وقت میں ان کے کام آتی رہی۔ اگر رئیس احمد فدوی نے لاف نہ کر فریب دیا تھا تو مجھے بتانا چاہیے تھا۔ میں ان سے نہ لیتی لیکن کوئی ایسی بات نہیں تھی ایک دن میں نے۔“

کتے کتے اس کے حلق میں آواز اٹک گئی ”ایک دن میں نے واجد کو مدہ جبین کے رات ٹانگ کرتے دیکھا۔“

”مدہ جبین کے ساتھ؟“ میں نے اور اسٹریمرز نے ایک ساتھ حیرانی سے کہا۔

کے چھوٹے کا زیادہ افسوس نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ پرانے جاتے ہیں تو نئے آتے ہیں۔ نئے گاہک اپنے جلو میں نئی داستانیں لے کر آتے ہیں کیونکہ یہی پارلر اور ڈرننگ سیلون ایسی جگہ ہے جہاں مرد، عورتیں اپنا کوئی عیب اپنی کوئی بد صورتی یا لاپرواہی چھپانے آتے ہیں۔ بہر حال مجھے موجودہ داستان سے شغف نہ تھوڑے۔

اچھے اور خوب صورت کردار ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ جیلہ مجھے ہمیشہ یاد آتی تھی۔ کے بغیر مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں اپنے خون کے رشتے سے کٹ گیا ہوں۔ میں جلد انتظار کرتا تھا۔ وہ ہم سے ناراض نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ ہم نے اس کی رضامندی اس کے بال کاٹنے تھی۔ وہ ماہ گزر گئے پھر چار ماہ گزر گئے۔ وہ نہیں آئی۔ مدہ جبین آگئی تھی میں نے اس سے پوچھا۔

”باہی! کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ جیلہ باہی آج کل کہاں رہتی ہیں؟“

یہ سوال کرتے وقت میں آئینے میں دیکھ رہا تھا کیونکہ بجیم کے آئینے اتنے شفاف ہوتے ہیں کہ جواب دینے والا اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپانا چاہے تو نہیں سکتا۔ وہ جیلہ کا نام سن کر بہت ہولے سے چونک گئی۔ پھر بہت جلدی سنبھل کر عارفانہ سے پوچھا۔

”کون جیلہ؟“

اس سوال میں کتنا غور تھا، ایک دولت مند لڑکی کے لیے جیلہ یاد رکھنا ہی بڑا نادر نہیں تھی۔ میں نے کہا۔

”وہی جیلہ باہی جن کے بالوں کی وگ آپ اکثر۔۔۔“

”اوہ اچھا اس کالی کلوٹی بد صورت سے لڑکی۔۔۔ کو پوچھ رہے ہو۔ کیا میں۔۔۔“

لڑکیوں کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟ اپنا کام کرو۔“

میں چپ چاپ اس لڑکی کے بال سیٹ کرنے لگا۔ جی چاہتا تھا کہ اس کا گلا باز اس کی گلے میں بہرے کا ٹیکس تھا۔ ہماری کمزور انگلیاں اتنی قیمتی گردن کو نہیں سکتیں لہذا ممبر کرنا پڑتا ہے۔ لیکن مدہ جبین نے جس طرح جھنجھلا کر جواب دیا تھا، ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک بد صورت لڑکی سے تھوڑی سی خوب صورتی ادھار لے کر کمتری کا شکار ہو گئی ہے۔



وہاں بیگلوں لوگ دھوپ میں کام کر رہے تھے، جبین کی نظروں میں کوئی بھی انسان نہیں تھا۔ وہ میرے ہاس کی بیوی تھی اس لیے مجھے کام چھوڑ کر اس کے ساتھ جانا پڑا۔ وہ ایک کار میں بٹھا کر ایک چھوٹی سی شاندار کوٹھی میں لے گئی۔ اس کار کو ڈرائیور چلا رہا تھا اور وہ میرے ساتھ کچھلی سیٹ پر بیٹھی انگریزی میں باتیں کر رہی تھی تاکہ ڈرائیور نہ سمجھ سکے۔ اس کی باتوں اور حرکتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میری بھوی ہے اور محض میری خاطر وہاں تک آئی ہے۔

کوٹھی میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے بیرونی دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ میں نے پڑن ہو کر کہا ”آپ کی بے تکلفی مجھے تنگی پڑے گی۔ میری ملازمت خطرے میں چاہئے گی۔“

جیلہ! تم نے اسے دیکھا ہے وہ چھوٹے سے قد کی لڑکی ہے تمہاری طرح میرے کاٹھے تک نہیں آتی۔ اس نے ایک اسٹول پر کھڑے ہو کر کہا ”میں اس آؤ“ میں قریب گیا تو وہ میری گردن میں بائیں ڈال کر بولی ”ملازمت کی تم فکر نہ کرو۔ یہ ملازمت بھی میں نے ڈالی ہے۔ وہ بڑھار نہیں احمد فدوی میرے اشاروں پر ناچتا ہے، تم میرا ساتھ دو گے تو ہم دونوں مل کر اسے نچائیں گے۔“

ہم تقریباً چھ گھنٹے تک اس کوٹھی میں بند رہے۔ کیسٹ ریکارڈر سے ڈانس کے لیے ٹاپ ٹیڈ کا آرکسٹرا بھرتا رہا اور ہم اس بڈھے کو بچانے سے پہلے خود ناچتے رہے۔ وہ جبین کوٹھی سے باہر ہو رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ بوڑھا فدوی ڈانس نہیں کر سکتا ہے۔ وہ ہارٹینک کے بعد ہی ہانپنے لگتا ہے۔ زندگی میں اور ہے کیا؟ ایک نوجوان خوب پارٹنر اور اس کے بعد ڈانس اینڈ بی میری۔۔۔“

شام کو رئیس احمد فدوی ورکنگ لوکیشن سے واپس آیا تو وہ جبین نے دروازہ کھول دیا۔ وہ چپ چاپ اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔ ایک گھنٹے تک وہ جبین مجھ سے دور رہی پھر رئیس احمد فدوی نے مجھے اپنے بیڈروم میں بلایا۔ میں کمرے میں پہنچا تو وہ جبین اس کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی، میں دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ رئیس احمد فدوی نے کہا

”سزاوار! آج میں نے اپنے جزل منجر سے تمہارے متعلق بات کی ہے اس نے کہا

”ہاں شاہنگ سینٹر کے باہر رئیس احمد فدوی کار کی اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ رہے تھے۔ واجد اور وہ جبین بیٹھے ہوئے باتیں کرتے ہوئے دکان سے باہر آئے اور گاڑی کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ واجد اتنا قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھے جیسے واقعی سات ہزار ماہوار کار ہوں گاڑ میں بیٹھنے سے پہلے انہوں نے مجھے دیکھا مگر انجان بن گئے۔ میں گم گم کر گئی۔ میں نے بیچ بازار میں اپنے آنسو کیسے ضبط کیے، یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ مگر روٹی اتار روٹی کہ واجد نے کبھی ہسایا بھی نہ ہو گا۔“

”یہ آپ پر بڑا ظلم ہوا ہے باجی! واجد صاحب کو شرم آنا چاہیے۔“

”ہاں انہیں شرم آئی تھی۔ اسی لیے وہ اپنی معافی پیش کرنے دوسری صاحبہ آئے اور سر جھکا کر کہنے لگے ”تمہیں معلوم ہے جیلہ! جب تم مجھے والوں کے اندر آئی تھیں تو رئیس احمد فدوی اور وہ جبین بھی وہاں موجود تھے۔ وہ جبین ٹھوٹے لگاؤ کی باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا ”ماکی گڈنس جیلہ نے یہاں نہیں بتایا کہ تم اتنے پڑھ سہو۔“

میں نے مسکرا کر کہا ”یہ آپ کا حسن نظر ہے۔“

وہ بڑی بے باکی سے کہنے لگی ”مگر تمہارے پاس حسن نظری کی کمی ہے اسی لیے مرئے ہو۔ اگر میں تمہیں یہاں اچھی ملازمت دلاؤں تو کرو گے؟ یہاں میرا تمہارا اچھا وقت گزرے گا۔ تم انجی سوسائٹی میں پہنچ جاؤ گے۔“

”محترمہ! ہر شخص اونچا اڑتا چاہتا ہے۔“

میں وہ جبین سے کھل کر باتیں نہ کر سکا کیونکہ جیلہ تم آگئی تھیں۔ اس فلائٹ کے ذریعے جدہ چلا گیا۔ تیسرے دن وہ جبین اپنے بوڑھے شوہر کے ساتھ گئی تو میں بھی سمجھا کہ رئیس احمد فدوی اپنے کاروبار کے سلسلے میں آئے ہیں آتے ہی جزل منجر کے کمرے میں چلے گئے۔ میں آؤٹ ڈور لوکیشن میں کھلی کار وازنگ کے نقشے کو سمجھنے میں مصروف تھا کہ وہ جبین وہاں پہنچ گئی۔ اس نے تھوٹے سامنے سے ہناتے ہوئے کہا۔

”کیا جانوروں کی طرح دھوپ میں کام کر رہے ہو، چلو میں تمہیں انسان ہوں۔“

ہائیکہ میں جاتا ہوں۔ اس لیے تم میری بیوی بن کر رہو گی اور مہ جیس کرل فریڈمن کر ہا کے گی۔“

میں نے غصے سے چیخ کر کہا ”چلے جاؤ یہاں سے اگر لوگ ایسے ہی جیتے ہیں تو میں نہلاں اس دنیا میں جینے سے انکار کر دوں گی۔ میں مر جاؤں گی مگر تمہارے ساتھ کھڑے ہو کر سانس لیتا بھی گوارا نہ کروں گی۔ گیٹ آؤٹ۔“

موزہ بار گیٹ آؤٹ کہہ دے تب بھی عورت اس کے قدموں سے نہیں جاتی۔ میں نے ایک بار کہا تو وہ چلے گئے۔ اس لیے کہ گیٹ کے باہر دولت اور خوش حالی ہاتھ بولاٹھ کھڑی تھی۔ کہتے ہیں زلفوں کی زنجیر بڑی مضبوط ہوتی ہے مگر میں نے وہ بھی اس کے لیے کاٹ ڈالی۔۔۔“

وہ ڈیڑھائی ہوئی آنکھوں سے آنکھیں کود دیکھنے لگی۔ یقیناً آئینہ دھندلا رہا ہو گا۔ ماسٹر مزی کہا ”۳ سے بھول جائیے کب تک روٹی رچیں گی۔“

وہ اٹھ کھڑی ہو گئی ”میں صرف اپنے لیے نہیں اس کے لیے بھی رو رہی ہوں کہ اب کدینا کے چکلے میں اپنی جوانی کے دوران بیکار رہے گا۔“

یہ کہہ کر وہ چلی گئی آئینہ خالی ہو گیا۔



ہے کہ یہاں کام زیادہ نہیں ہے اس لیے تمہاری یہاں ضرورت نہیں ہے گھبرائے کیا نہ نہیں، ہم نے جیل سے جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کریں گے۔“

مہ جیس نے کہا ”ڈارلنگ! تم جیل سے کیا ہوا وعدہ نہیں بلکہ میری خواہش کے مطابق ایسا کر رہے ہو۔ اپنے الفاظ واپس لو ورنہ میں ابھی چلی جاؤں گی۔“

وہ جانے کے لیے اٹھ گئی۔ بڑھے نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا ”سوری اچھے معاف کر دو۔ تم تو جانتی ہو کہ میں تمہاری مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ میں تمہارے حکم کے مطابق واحد کو اپنے ساتھ واپس لے جاؤں گا۔“

مہ جیس نے اپنی بات منوالی اور میں ایک ہفتے کے اندر اس کے ساتھ یہاں واپس آ گیا۔ یہاں میں رئیس احمد فدوی کا سیکرٹری ہوں لیکن حقیقتاً مہ جیس کا بوائے فرما ہوں۔ وہ بوڑھا ہوس پرست، دولت مند اپنی حسین اور کم سن بیوی کو کھونا نہیں چاہتا سوچتا ہے کہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ جائے گی تو دنیا بھی کسے گی کہ بوڑھا تھا اس لیے جا بیوی پر لگام نہ ڈال سکا۔ وہ یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا لہذا اس نے مجھے اپنا بکریہ بنا کر لگام ڈال دی ہے۔“

واجد اپنی آپ بیتی سنا رہے تھے اور میں چپ چاپ سن رہی تھی۔ میں کہہ بھی کیا تھی۔ جنہیں میں نے ٹوٹ کر چاہا اور جن کے لیے اپنی ایک خوب صورتی کو توڑ کر بھروسہ بن گئی، جب انہوں نے خود ایک الگ راستہ چن لیا تو میں کیا بول سکتی تھی۔ انہوں نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔

”تم بولتی کیوں نہیں؟ کچھ بولو مجھے جتنی باتیں سنا سکتی ہو سناؤ۔ میں صرف بڑا نہیں، احسان فراموش بھی ہوں مگر کچھ کہنے سے پہلے یہ سمجھ لیتا کہ فی زمانہ یہی ہوتا ہے آگے بڑھتے وقت پیچھے نہیں دیکھا جاتا، اوپر چڑھتے وقت نیچے گرے والوں کو نہیں یاد جاتا۔ اس کے باوجود میں تم سے ملنے آ گیا ہوں۔“

”آپ نے بڑا احسان کیا مگر اخلاقی قدروں کو بھلا کر یہاں نہ آتے تو اچھا ہوتا۔“

”اخلاق اور انسانیت کا معیار دولت والے ہی بناتے ہیں۔ یہ بات تمہاری بکریہ نہیں آئے گی۔ میں یہ کہنے آیا ہوں کہ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں تم ہی شادی کروں گا۔ شادی سے پہلے گھر جائیداد اور دولت کے ذرائع کس طرح پیدا

## آدمی کا باپ

وہ میرا باپ تھا۔  
 میں اس کا باپ بن گیا۔  
 پھر وہ اس کا باپ بننے لگا۔  
 ایک شرمناک سوال کہ  
 ہم آدمیوں کا باپ کون ہے؟

بھی طبقے ہوتے ہیں۔ نچلے طبقے میں جو شیم اور رضیہ ہوتی ہیں وہ اونچے طبقے میں پہنچ کر شے کی اور راضی بن جاتی ہیں۔

شے کی زندگی بدل گئی۔ نام بدل گیا حتیٰ کہ بیمار اور لاغر جسم بھی ڈبل روئی کی طرح صحت مند ہو گیا۔ بس اسی مقام پر اگر جوان بیوی اور بوڑھے خاوند کا فرق نمایاں ہو گیا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ وہ بے زاری سے ”اوندہ“ کہہ کر خاوند کے بیڑوم سے نکلی اور اپنے بیڑوم میں اگر ذرا آنسو بہا کر سو گئی۔

کوئی مرد اپنی عورت کی نظروں سے گرتا پسند نہیں کرتا حالانکہ اس میں مرد ذات کی ذہین کا پہلو نہیں نکلتا اگر کوئی عقلمند بوڑھا کسی جوان لڑکی سے شادی کرنے کی حماقت کرے تو یہ مرد باری کی نہیں بوڑھی باری کی غلطی ہے۔

دیے ڈاکٹر نے سوچا کہ ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے جو وہ اس نے شے کی پر آزمائی ہے وہی واغدا استعمال کرے گا اور شے کی طرح جوان اور زندہ جاوید ہو جائے گا۔ دوا کا فارمولا اس کے پاس محفوظ تھا لیکن اسے تیار کرنے کے لیے سکون و قحط اور ذہنی یکسوئی کی ضرورت تھی اور اس کا تمام سکون شے کی نے ورہم برہم کر رکھا تھا۔ جب بھی وہ بچی ہوئی فصل کی طرح اس کے سامنے لہراتی، وہ شدید احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا۔ ایسی حالت میں وہ اپنے لیے آب حیات کیسے تیار کرنا؟ اگر مختلف دواؤں کے اوزان اور ترکیب میں کوئی گڑبڑ ہو جاتی یا خالی رہ جاتی تو وہی آب حیات اس کے لیے سم قاتل بن جاتا۔

اس نے جھنجھاکر یہی فیصلہ کیا کہ پہلے شے کی کی موت کا سامان کرنا چاہیے۔ نہ رہے گا ہنس نہ بچے گی بانسری۔ پھر وہ اطمینان سے اپنے فارمولے پر عمل کرے گا۔ شے کی کیا چیز بے لبدی زندگی حاصل کرنے کے بعد اسے لاکھوں حسینا میں مل جائیں گی۔

لیکن پہلی کوشش میں وہ ناکام ہو گیا۔ وہ زہر لانا التجاشن شے کی کے جسم میں گیا اور پانی بن کر نکل گیا۔ دوسری بار ایسا ہوا کہ شے کی آدمی رات کو تنہا باغیچے میں شل رہی تھی ڈاکٹر نے ایک درخت کے پیچھے چھپ کر ریو اور میں سالنر لگایا پھر ایک ماہر نشاندہ بازی کی طرح پوری چھ گولیاں اس کے جسم میں اتار دیں۔ شے کی کے حلق سے چھین لکھیں پھر وہ ڈاکٹر کا گھاس پر گر پڑی۔

ڈاکٹر نے ریو اور کو ایک جھاڑی میں چھپا دیا، اس کے بعد تیزی سے چلتا ہوا اس کے

## آدمی کا باپ

ڈاکٹر عظیم صدیقی جانتا تھا اور پورے یقین کے ساتھ جانتا تھا کہ شے کی نہیں گی۔ پھر بھی اس نے اسے صفحہ ہستی سے مٹانے کی تمام کوششیں کر ڈالیں۔ پہلی کوشش یہ تھی کہ اسے ایک نہایت ہی زود اثر زہر لانا التجاشن دیا تھا۔ شے کی نہیں جانتی تھی کہ خاوند اس کی جان کا دشمن ہے، اس نے چپ چاپ التجاشن لگوا لیا۔ زہر اس کے جسم کے اندر سرایت کر گیا۔ چند لمحوں تک اسے اپنے اندر کچھ گڑبڑی محسوس ہوا اس نے ہاتھ روم میں جا کر تے کر دی۔ اس کے بعد اس نے پانی منہ میں لے کر کھینچا منہ پوچھتی ہوئی کھانا پکانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔ عظیم صدیقی پریشانی سے سوجا اپنی شریک حیات کو اپنی حیات سے ہمیشہ کے لیے الگ کر دینے کا بہترین طریقہ کیا ہوا شے کی کا اصل نام شیم بیگم تھا، وہ نچلے طبقے سے بیاہ کر لائی گئی تھی۔ ڈاکٹر عظیم نے دو مقاصد کے تحت اس سے شادی کی تھی۔ پہلا مقصد تو یہ تھا کہ شیم ستر سال کی حسین دوشیزہ تھی۔ ڈاکٹر پچیس سال کا بوڑھا تھا۔ اس عمر میں اتنی حسین لڑکی اس سے نہیں کر سکتی تھی لیکن شیم اس سے شادی کے لیے راضی ہو گئی کیونکہ وہ ڈاکٹر کا سلطان کے مملک مرض میں مبتلا تھی۔

ڈاکٹر کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی بیمار محبوبہ پر ایک تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ اگر تجربے سے صحت مند ہو جاتی تو یوم آخر تک زندہ سلامت رہتی ورنہ اس کے افسوس نہ ہوا کیونکہ اسے بلڈ کیسر ہو گیا تھا اور اس کا مرنا یقینی تھا۔

خوش قسمتی سے ڈاکٹر کا تجربہ کامیاب ہو گیا اور بد قسمتی سے اس پر ایک دوا ہمیشہ کے لیے مسلط ہو گئی۔ پہلے پہل اس کی جوانی کا اتنا شدید احساس نہیں ہوا کہ دونوں وہ اپنے کامیاب تجربے پر نازاں و شاداں تھا۔ سب سے پہلے اس نے خوش بیگم کا نام بدل دیا اور اسے پیار سے شے کی کہنے لگا۔ انسان کے طبقوں کی طرح

ہا خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ بوہی نے بھی اگر اسے پکڑ لیا۔ وہ دو طرفہ لٹوں میں ترپنے لگی، پھٹنے لگی۔ اگرچہ اس میں جوانی کا زور تھا۔ اس کے باوجود وہ عورت لہاس میں عورت کی نزاکت تھی اور جلد ہی خائف ہو کر شکست کھا جانے والی کمزوری پان دو بوہیوں نے اسے پکڑ کر زور دینی تابوت کے اندر ٹھونس دیا پھر اس کے ڈھکنے کو لکے اسے ہر طرف سے لاک کر دیا۔

تابوت کے اندر سے کھٹا کھٹ کی آواز آرہی تھی۔ آواز سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ اندر پڑی تھی اور کچھ کسمتی جاری تھی لیکن اس کی آواز منہاٹ کی طرح باہر آرہی تھی۔

دو دنوں کے خانے سے باہر آگئے۔ آئندہ کل تک ڈاکٹر کو مطمئن ہو جانا چاہیے تھا مگر ہٹے ہوئے بے چینی سے کمرٹ بدل بدل کر رات گزار دی۔ دوسرے دن وہ خانے میں باہر سے تابوت بالکل خاموش نظر آیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آیا اور تابوت کھل کر کھٹنے لگا۔ گہری خاموشی تھی۔

خوشی سے اس کی باجھیں کھل گئیں۔

لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا منہ لٹک گیا۔ اندر سے کچھ ایسی سرسراہٹ سنائی دی جو انسانی زندگی کے آخری بستر پر کوئیں بدل رہی ہو۔

ڈاکٹر نے ناگواری سے تابوت پر دستک دی۔ دستک دیتے ہی جیسے اندر کھلبلی مچ گئی۔ وہ اندر سے تابوت کی دیوار پر ہاتھ مارنے لگی۔

وہ جلا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر تابوت پر ایک زور کی لات مارتے ہوئے بولا۔

”ملا جان کا عذاب بن گئی ہے۔ لیکن میں بھی ضد کا پکا ہوں۔ اسی میں تجھے قید لیا گا دکھتا ہوں کہ تب تک زندہ رہے گی۔ ترپ ترپ کر مرے گی۔“

یہ کہ کر وہ پاؤں پٹختا ہوا خانے سے باہر آگیا اور بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹھٹھنے

قریب آیا۔ اس وقت تک شے می اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور اپنے بدن سے رپو اور کی ایک کی یوں نکال رہی تھی جیسے پاؤں میں ہتھا ہوا کاٹنا نکال رہی ہو۔ بدن میں کئی سوراخ ہو گئے تھے۔ جہاں جہاں سوراخ تھے وہاں خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ اگرچہ زیادہ مقدار میں خون بہنا چاہیے تھا لیکن وہ تمام سوراخ آپ ہی آپ بھرتے جا رہے تھے۔ فوم کے ٹکڑی انگلی کر دینے سے وہاں انگلی کا نشان نہیں پڑتا۔ فوم جلدی اپنی صحیح حالت میں آجاتا ہے یہی حال اس کے فوم جیسے پکھلے بدن کا تھا۔ ڈاکٹر اپنے ماتھے سے پسینہ پونٹھے لگا۔

شے می اس کے لیے دن رات کا عذاب بن گئی۔ جیسے جیسے دن گزرنے لگے شے می مزاج بدلنے لگا۔ وہ اس لیے بیاہ کر نہیں آئی تھی کہ ایک خوب صورت ڈیکوریشن بھری طرح اس کے گھر میں سجی رہے اور خاوند اسے دور سے دکھتا رہے۔ آخر وہ عورت شے می کی اپنی ضروریات اور جذبات تھے اور سب سے اہم بات یہ کہ اس کی عمر ایک جگہ ٹھہر گئی تھی۔ ڈاکٹر کے بڑھاپے میں مزید پانچ سال کا اضافہ ہو گیا تھا اس کے چہرے کی جھریاں کم اور گہری ہو گئی تھیں۔ شے می کے چہرے پر اور بدن کے شکوہوں پر وہی سترہ سال کی لائے اور رعنائیاں تھیں۔ لہذا اس کا بھگنا فطری امر تھا۔ وہ دو سروں کے بازوؤں میں کھلی کی طرح جھنجھنے اور پھول کی طرح مسکنے لگی۔

ڈاکٹر کے صبر کا پیمانہ لبرز ہو گیا۔ اس نے خوب سوچ سمجھ کر ایک بہت ہی مضبوط شیشم کی ٹکڑی کا تابوت بنانے والے بوہی کو اچھی خاصی رقم دے کر اپنا رازدار بنایا۔ کیونکہ آئندہ اس تابوت کو قبر کی میں پہنچانے کے لیے اسے ایک معاون کی ضرورت تھی۔

جب تابوت تیار ہو گیا تو ڈاکٹر شے می کو باتوں سے بسلا تا ہوا مکان کے خانے میں لے کر آیا۔ تابوت کھلا ہوا تھا اور شے می کے حسین وجود کا انتظار کر رہا تھا۔ قریب ہی بزم کھڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے شے می کو مضبوطی سے پکڑ کر کہا۔

”چلو اب اس میں لیٹ جاؤ۔“

”نہیں!“ وہ گھبرا کر بولی ”کیا تم مجھے اس میں بند کر دیتا چاہتے ہو؟“

”ہاں میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم اپنی قبر میں بھی زندہ رہو گی یا مر جاؤ گی؟“

”نہیں۔ میں جیتے جی قبر میں نہیں جاؤں گی۔ چھوڑ دو مجھے۔ جانے دو۔“

نہم کو بوہی اس کے پاس آیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔

”میں عورت سے اس طرح پیچھا نہیں چھوٹے گا۔ ہم آج رات اس تابوت کو جنگل میں لے جا کر ایک گہرے گڑھے میں دفن کر دیں گے، کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ جنگل کے

اے گا مجھے بھی ڈر لگ رہا ہے۔“

وہ دونوں ڈرتے جا رہے تھے اور ایک دوسرے کو تسلیاں بھی دیتے جا رہے تھے۔ وہ کچھ کے بعد جنگل کے اونچے نیچے راستوں پر ان کی دین ڈنگا گئی تھی پھر وہ گھنے درختوں کے درمیان آکر رک گئی۔

ڈاکٹر نے اپنی رست وادج میں وقت دیکھا۔ ڈیڑھ بج رہا تھا۔ بڑھی بچھلے دروازے کو غل کر کدال اور نیچے کو نکال رہا تھا۔ پھر وہ دونوں دین سے دور آکر گڑھا کھودنے لگے۔ بڑھی کے ہاتھوں میں کدال تھی وہ کھود رہا تھا اور ڈاکٹر نیچے سے مٹی اٹھا کر ایک طرف ڈھیر کر رہا تھا۔

ایک زندہ عورت کے لیے قبر کھودی جا رہی تھی، نیچے سے مٹی ہٹاتے وقت ڈاکٹر سوچ رہا تھا کہ ایک قبر میں دو انسانوں کے سونے کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ شے می تو وہاں قیامت تک پڑی رہے گی لیکن اس کے ساتھ وہ بڑھی بھی قیامت کی نیند سوئے گا۔ اتنے بڑے زرم کے ایک رازدار کو زندہ چھوڑنا دانش مندی نہیں ہے۔ اس قبر میں تمام راز و فن ہو جائیں گے تب ہی وہ اطمینان سے اپنے لیے آب حیات تیار کر سکے گا۔

چوٹ کی کمری قبر تیار ہو گئی۔ وہ دونوں دین کے بچھلے حصے سے تابوت کو کھینچتے ہوئے زرم کے کنارے تک لے آئے پھر اسے گمرانی میں دھکیل دیا۔ وہ لڑھکا ہوا نیچے جا کر قبر کی مٹی ڈال گیا۔ ڈاکٹر نے نیچے کو اٹھاتے ہوئے بڑھی سے کہا۔

”ذرا جھانک کر دیکھو اور سنو کیا وہ طبلہ بجا رہی ہے۔“

وہ قبر کے کنارے گھٹنے ٹیک کر جھک گیا اور توجہ سے سننے لگا۔ آواز آرہی تھی۔ صاف بے چل رہا تھا کہ شے می تابوت کی دیواروں پر ہاتھ مار رہی ہے۔

بڑھی نے صرف چند لمحوں تک وہ آواز سنی۔ وہ چند لمحوں ڈاکٹر کے لیے کافی تھے۔ اس کے ہاتھوں میں وہ طبلہ بلند ہوا اور بڑھی کی کھوپڑی نشان بن گئی۔ اس کے حلق سے ایک جھج جھج گنگوہر کے کنارے لڑھک گیا۔ دوسری بار نیچے کا پھل اس کی گردن میں اتر گیا۔ گردن ٹوٹی گئی تھی وہ تڑپ رہا تھا اور مٹی اس کے لمبے بھیک رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کا دم ساکت ہو گیا۔ ڈاکٹر نے جلدی سے وہ لاش قبر میں لڑھکا دی۔

”وہ“ کی آواز کے ساتھ وہ لاش تابوت پر جا کر اوندھی ہو گئی۔ دو انسانوں کی

کسی حصے میں زمین کے اندر وہ چھپا کر رکھ دی گئی ہے۔ نہ کسی کو معلوم ہو گا اور نہ اسے کھود کر باہر نکالے گا۔“

وہ بہت دیر تک اسے اپنی پلاننگ سمجھاتا رہا۔ جب رات گہری ہو گئی تو ڈاکٹر میں گیا وہاں سے اپنی دین میں بیٹھ کر اسے ڈرائیو کرتا ہوا کوٹھی کے بچھلے دروازے پر بڑھی کدال اور نیچے لے کر آگیا۔ وہ دونوں دین کا پچھلا دروازہ کھول کر کوٹھی کے آگے پھر وہاں سے یہ خانے میں پہنچے۔ تابوت پہلے کی طرح بظاہر خاموش نظر ہوا جب وہ دونوں اسے کھینچتے ہوئے یہ خانے سے نکالنے لگے تو اس تابوت میں بھرجاں اندر ہاتھ مار مار کر دستک کی زبان میں التجا کر رہی تھی کہ اسے باہر نکالا جائے۔

مگر وہ دونوں اس کی التجا سے موم ہونے والے نہ تھے، اسے خاموشی سے غم لے جا رہے تھے۔ اس ذہنی تابوت کو یہ خانے کی سیڑھیوں سے اوپر چڑھاتے وقتا پیسہ آنے لگا۔ وہ ہانپ رہے تھے اور زور لگا رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں تو سانسیں درست کرنے کے لیے رک جاتے تھے۔ آخر بڑی کوششوں کے بعد وہ خانے سے نکال لائے۔

کوٹھی سے باہر لا کر اسے دین میں رکھتے وقت بھی خاصی دشواری پیش آئی۔ مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ انہوں نے دین کے بچھلے دروازے کو اچھی طرح بند کیا اور آواز پر آکر بیٹھ گئے۔

اندھیری رات کی خاموشی میں دین تیز رفتاری سے بھاگنے لگی۔ اس خاموشی کے بچھلے حصے سے کبھی کبھی کھٹ کھٹ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ڈاکٹر سے کہا ”سامانی کے ہاتھ بھی نہیں دکھتے، طبلہ بجاتی جا رہی ہے۔ ہم سے بڑی طاقت اسے تابوت میں بند کرنے سے پہلے اس کے ہاتھ پاؤں کو رسی سے اچھی طرح چاہیے تھا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کوئی کار والا ہمیں اور ٹیک کرتے وقت اس طبلے نہ سن لے۔“

بڑھی گھبرا کر کھڑکی سے باہر سر نکالتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ”ہم آبادی سے بہت دور نکل آئے ہیں۔ آگے پیچھے کوئی گاڑی نظر نہیں آتی اور اتنی رات کو بھلا اس دیران راستے میں کون آئے گا؟ کوئی نہیں آئے گا۔“

انعام ایک بندر کی طبعی عمر ستر سال کی نہیں ہوتی کوئی بھی یہ یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ناطیل مدت سے اس لیباریٹری کے کمرے میں اچھل کود رہا ہے اور اپنی بندریا کے فرائض ایئر کنڈیشنڈ لیباریٹری میں عیش کر رہا ہے۔

اس نے سرگھا کر اپنی بندریا کی طرف دیکھا۔ وہ بے چاری ایک جانب چپ چاپ لیٹی تھی۔ اس کے پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر معلوم ہوا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ رات نکال کر اسے یوں دیکھنے لگا جیسے باپ بننے پر خوشی کا اظہار کر رہا ہو۔ یہ اس کی گامی میں پہلی بندریا نہیں تھی۔ ستر سال کے عرصے میں کتنی ہی آنی تھیں اور اپنی فانی عمر گزار چکی تھیں۔ بندر سمجھتا تھا کہ وہ جو ماں بننے والی ہے وہ بھی کسی دن بیسہ کے لیے مت ہو جائے گی اور اس کی جگہ پھر ایک نئی بندریا اس کا دل بھلانے آجائے گی۔

اس نے سرگھا کر ڈاکٹر عظیم صدیقی کو دیکھا۔ اسے یہ طویل عیش و عشرت کی زندگی ہم صدیقی کے دادا نے اپنے تجربوں سے دی تھی۔ اس کے دادا کلیم صدیقی نے آب تیار کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ انسان ازل سے ابدی زندگی کی تلاش میں بھٹک رہا ہے اور اس کے لیے طبی سائنس میں نت نئے چھ نوکادینے والے تجربات کر رہا ہے۔ خوش فہمی سے کلیم صدیقی نے آب حیات تیار کرنے میں کسی حد تک کامیابی حاصل کر لی تھی۔ وہاں جدید طبی دوائیں، بے داغ فلوئڈ کے آلات اور مشینیں وغیرہ نہیں تھیں اور ایسی کنڈیشنڈ لیباریٹری بھی نہیں تھی۔ کلیم صدیقی چٹائی پر بیٹھ کر ہاؤن دستے میں دوائیں پیستے مل کرتے تھے۔ کہاں وہ چٹائی پر بیٹھے کا زمانہ اور کہاں یہ لیباریٹری کی ایئر کنڈیشنڈ زون۔ بندر نے انسان کے دماغ کو اور اس کی تہذیب کو کتنی ہی کوششیں بدلتے دیکھا تھا۔

بہر حال کلیم صدیقی نے آب حیات تیار کر لیا تھا اور اسے اس بندر پر آزما کر اس بات یقین کر لیا تھا کہ اس دوا میں انسانی جسم کی مناسبت سے کچھ تبدیلیاں کر لی جائیں تو وہ بے کار بندر کی طرح ابدی زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ اس خیال کے تحت اس نے مختلف دواؤں سے اس آب حیات میں تھوڑی سی تبدیلیاں کیں۔ اسے اپنی تجربات پر بڑا اعتماد اور اصرار تھا۔ وہ اس آب حیات کو نوش کر گیا۔

بندر نے اس لیباریٹری میں بیٹھ کر عجیب عجیب تماشے دیکھے تھے۔ کلیم صدیقی نے اس کے سامنے ہی اس آب حیات کو نوش کیا تھا۔ فوری طور پر اس کا کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔

منجانبش نکل آئی۔ ایک تابوت کے اندر زندہ تھی، دوسرا تابوت کے اوپر مردہ تھا اور پہلے سے مٹی اٹھا کر قبر کے خالی پیٹ کو بھر رہا تھا۔

گڑھا بھر گیا۔ زمین پہلے کی طرح ہموار ہو گئی۔ وہ پہلے کو ایک طرف رکھ کر بیٹھ گیا۔ زمین سے کان لگا کر سننے لگا۔ آواز نہیں آرہی تھی۔ منوں مٹی کی یہ جچی ہوئی تھی۔ اس نے وہ سپاٹ قبر ساؤنڈ پروف ہو گئی تھی۔ اب اس دنیا کا کوئی فرد شے کی آواز نہیں سنا سکتا تھا۔

وہ صبح پانچ بجے تک وہاں بیٹھا رہا پھر مطمئن ہو کر وہاں سے چلا آیا۔



ڈاکٹر عظیم صدیقی کے عملی تجربے کو وہ تینوں بڑی توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ اس دن تینوں کے ذہن میں ایک ہی سوال گونج رہا تھا۔

”کیا عظیم صدیقی آب حیات تیار کر لے گا؟“

”شوں شک“ کی ہلکی آواز کے ساتھ سفید دھوپ کا ایک چپکا صراحی سے انوکھ لیباریٹری کی صاف ستھری فضا میں تحلیل ہونے لگا۔ شیشے کی صراحی سے ددفٹ کے ٹائٹ پر عظیم صدیقی میز سے لگا کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں صراحی کے پینڈے پر مرکوز تھیں اور زرد رنگ کا محلول نظر آ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ صراحی میں سے وہ سفید دھواں غائب ہونا شاید زرد رنگ کے محلول میں جذب ہو رہا تھا۔

وہ تینوں اس عمل کو یک نگہ دیکھے جا رہے تھے، صرف وہی نہیں بلکہ لیباریٹری کا ایک گوشے میں آہنی سلاخوں کے پیچھے بیٹھا ہوا ایک بندر بھی اس عملی تجربے کو کراہ دیکھے جا رہا تھا۔

ایک بندر کو بھلا سائنسی تجربات سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ لیکن کہتے ہیں کہ توہاں بندر کی عادتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ یہ دونوں اس تماشے کو خاص طور سے دیکھتے ہیں۔ دل کی سمجھ میں نہیں آتا۔

بندر عظیم صدیقی کے تجربے کو سمجھ یا نہ سمجھ لیکن وہ بڑی سنجیدگی سے دیکھ رہا تھا۔ شاید یہ سوچ رہا تھا کہ عظیم صدیقی ہمیشہ کی طرح اس دوا کو بھی اس پر آزمائے گا۔ وہ کمرے کی آہنی سلاخوں کے پیچھے تقریباً ستر سال سے بیٹھا ہوا اس لیباریٹری کو

لیکن ہر روز جب وہ لیبارٹری میں آتا تو پہلے سے زیادہ کمزور اور بیمار بیمار سا نظر آتا۔ وہ اندر کھوکھلا ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی تمام صلاحیتوں کو آزما کر اس آبِ حیات کے دل سے بچنے کی کوششیں کیں لیکن ایک روز اسی لیبارٹری میں خون ٹھوک کر مر گیا۔ اس کے بعد عظیم صدیقی کے باپ سلیم صدیقی کی باری آئی۔ سلیم صدیقی نے اپنے باپ کلیم صدیقی سے ہونے والی غلطیوں کا اچھی طرح جائزہ لیا تو اس آبِ حیات میں ایسی خامیاں نظر آئیں جنہیں دور کیے بغیر ابدی زندگی حاصل نہیں کی جاسکتی تھی۔ پھر بندر نے سلیم صدیقی کو اس لیبارٹری میں تجربے کرتے اور آبِ حیات جانے والی کمی کو پورا کرتے دکھا۔ اسی لیبارٹری میں اسے خوشی سے مظلوم ہو کر نر حیات کا جام پڑھا۔ اس نے اپنے باپ کی طرح دم توڑتے دیکھا تھا۔

اور اب عظیم صدیقی کی باری تھی۔ لیکن وہ اتنا جلد باز نہیں تھا اور اس دوا کے پہلے خود پر آزما کر اپنے دادا اور باپ کے عبرتناک انجام تک نہیں پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ بیس برس کی عمر سے اپنے باپ اور دادا کے ساتھ اس لیبارٹری میں کام کیا یعنی اسے تجربات سے گزرتے ہوئے پینتیس برس ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے باپ اور دادا کی ذہانت اور تجربات میں اپنے پینتیس سالہ تجربات کو سمو کرنے سے آگاہ تیار کیا تھا پھر اسے اپنی جوان اور حسین بیوی شے می پر آزمایا تھا۔

اس آبِ حیات کو شے می پر آزمانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے باپ دادا کی طرح نہیں چاہتا تھا۔ اگر شے می اسے نوش کر کے مر جاتی تو دوسری بیوی آسکتی تھی اور اگر جاوید ہو جاتی تو وہ اسے ٹھکانے لگا چکا تھا۔ شے می دور بہت دور کسی جنگل میں مٹی تلے دبلی پڑی تھی۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اب بھی زندہ ہوگی یا نہیں ہوگی۔

وہ عظیم صدیقی نے بڑی احتیاط سے کام کیا تھا۔ اسے دفن کرنے کے بعد بھی دوسرے تیسرے دن وہاں جایا کرتا اور اس جگہ کو دیکھتا تھا کہ وہاں کی مٹی مٹی ہوئی ہے؟ ہر بار وہاں پہنچ کر یہی اطمینان ہوا کہ گڑھا بدستور مٹی سے بھرا ہوا ہے۔ اس نے کسی کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کسی جانور کے بچوں کے نشان بھی نظر نہیں آتے تھے۔ نے کئی بار اس زمین کے حصے سے کان لگا کر سنا۔ اندر سے اس کی آواز سنائی نہیں دے

یہاں بڑی بڑی دولت حاصل کرنے کے لیے اپنے باپ کو بھی قتل کرنے سے باز نہیں آئے گی۔ جس موت سے بہت ڈرتا تھا اور موت سے زیادہ اپنی دولت سے ڈرتا تھا کہ موت کا یہی راز ہو جائے گی۔ اس لیے وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتا تھا کہ کسی طرح اس کی زندگی میں سے کچھ نہ بچا جائے۔ وہ تجسوس ضرور تھا لیکن دائمی زندگی کے لالچ میں اس نے اپنی دولت ڈاکٹروں کی جھولی میں جاتی رہتی تھی۔



برے لیے ہے۔

”اے لیلہ! میری کی خاموشی میں عظیم صدیقی کا قبضہ گونجنے لگا۔ وہ صراحی کی گروں کو اپنی طمٹ میں بکڑے ہوئے کہہ رہا تھا ”میرے معزز دوستو! دیکھو، دیکھو میں نے آبِ حیات تیار کر لیا ہے۔ یہ دنیا والے میرے دادا جان اور میرے ابا جان کو دیوانہ کہتے تھے لیکن مجھے بھی پیٹھ پیچھے دیوانہ کہتے ہوں مگر ہم دیوانے نہیں ہیں۔ دیوانے تو بھنوں اور فریاد بے ساختہ کرتے جنہوں نے محبت کے نام پر اچھی بھلی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ میں اپنی دھن کا اہل۔ ایک طویل مدت کی محنت اور جدوجہد کے بعد میں نے قیامت تک زندہ رہنے والی دھال بنے اور اس کا قارِ مولاً میری یادداشت میں محفوظ ہے۔“

یہودی جس نے خوشی سے کانپتے ہوئے کہا۔

”واکٹر عظیم صدیقی! میں اس کامیابی پر تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ تم اس آبِ حیات اُمیرے ہاتھ فروخت کرو۔ میں تمہیں ایک لاکھ ڈالر دینے کو تیار ہوں۔“

ہارڈی اور سون چونک کر بڑھے جس کو دیکھا لیکن عظیم صدیقی مسکراتا ہوا پیشے کا ایک شوکیس کی طرف چلا گیا اور اس میں صراحی کو حفاظت سے رکھنے لگا۔ جس بڑی بانٹلی سے بولی بڑھانے لگا۔

”ولاکھ ڈالر لے لو۔“

عظیم صدیقی جواب میں قبضے لگانے لگا۔

”تین لاکھ چار لاکھ۔ تم ہی کو کہ اس کی قیمت کیا ہو سکتی ہے؟“

اس نے بدستور ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”ہس کی کوئی قیمت نہیں ہے، تم اپنی تمام دولت بھی میرے قدموں پر رکھ دو تو بھی میں اسے فروخت نہیں کروں گا۔ میں اسے خود ہی نوش کروں گا اور امر ہو جاؤں گا پھر تاقیامت اس دنیا کی حسین لڑکیوں سے شادی کرتا رہوں گا۔ اس بندر کی طرح جو اس کمرے میں ستر ملائے بیٹھ کر رہا ہے۔ ایک بندر یا مراثی ہے تو دوسری آجاتی ہے۔ اسی طرح میری لکھنوی اپنی طبی عمر گزار کر مر جائے گی تو دوسری آجائے گی یعنی بیویاں مرنے جائیں گی اور نہ ہونے والی اولاد بڑھتی جائے گی۔ چند صدیوں میں اس زمین کے بچے بچے پر صرف بہن بنے ہوں گے۔ اس وقت میں اس دنیا کے آدمیوں کا واحد باپ کہلاؤں گا۔“

پھر وہ عظیم صدیقی کی شہرت سن کر مہاں آیا اور اس سے دوستی کا نٹنے لگا۔ اس نے سالہ بندر کو دیکھا تھا اور شے ہی جیسی بلڈ کینسر کی مریضہ کی حیرت انگیز صحت مند رپورٹ پڑھی تھی اور اب اس کے سامنے جو آبِ حیات تیار ہو رہا تھا اسے وہ بڑی بڑی قیمت دے کر خریدنا چاہتا تھا۔

زندگی۔ ابدی زندگی۔ وہ شیشے کی شفاف صراحی کو گھور رہا تھا اور انتہائی جوش و جذبے کے تحت اس طرح آگے پیچھے جھول رہا تھا جس طرح سانپ ڈسنے سے پہلے جو ہے۔ اس کی نگاہوں کا نشانہ ٹھیک مراثی پر تھا۔

ہارڈی اور جیمس کے درمیان سون بارڈلے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ جوان تھی اور تھی اور اس کا جسم شراب سے بھری ہوئی بوتل کی طرح نشہ انگیز تھا۔ وہ ہارڈی کی نگاہ تھی۔

اس وقت وہ اپنے خیالات کی دنیا میں بالکل تھا کھڑی تھی۔ اس کے آس پاس لگا تھا، صرف ایک شیشے کی شفاف صراحی تھی جس میں سرخ رنگ کا سیال لہریں لے رہا تھا اپنی ہلر کے ساتھ کہہ رہا تھا کہ میں نے شے کی سدا بہار جوانی دی ہے۔

شے ہی کہاں ہے؟ آبِ حیات نوش کر کے کہاں غائب ہو گئی؟ سون نے بڑے عظیم صدیقی سے کیا تھا اور عظیم صدیقی نے ہر ایک کو یہی جواب دیا تھا کہ وہ جوانی اور زندگی کے غور میں مجھے بھونٹتی ہے اور اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

عورت کچھ نہیں چاہتی۔ وہ دولت نہیں چاہتی، وہ دین نہیں چاہتی، دنیا نہیں کیونکہ یہ سب چیزیں مرد خود ہی اس کی جھولی میں ڈال دیتا ہے بشرطیکہ وہ جوان ہو۔ حسن اور منہ زور جوانی سے مرد پر حکومت کر سکتی ہے۔ اس کی دولت جھین سکتی ہے، توبہ شکن اداؤں سے اس کی عاقبت خراب کر سکتی ہے۔ عورت صرف اپنی جوانی طویل چاہتی ہے۔

سون اپنے تازہ رخساروں پر ہاتھ پھیر رہی تھی اور سوچ رہی تھی کیا ان رخسار بھی بڑھاپے کی جھریاں پڑ جائیں گی؟ وہ کانپ سی گئی۔ عورت اپنے برے اعمال سے کانپتی بڑھاپے کے تصور سے کانپ جاتی ہے۔

”نہیں۔ میں بوڑھی نہیں ہو سکتی۔ صراحی کا وہ سرخ سیال میرے لیے۔“

اس کے بوڑھے ہونٹ سون کے جوان لبوں میں پوسٹ ہو گئے۔ اس طویل بو سے کے دوران وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔

”بے وقوف ڈاکٹر! جس طرح تم ان ہونٹوں کے قریب آئے ہو اسی طرح آب حیات کو اور ہر جام بھی ان لبوں کو چومنے آئے گا۔“

بندر ان کی طرف دیکھ رہا تھا خونخوار اچھل اچھل کر اور چیخ کر کسی خطرے کا احساس دلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔



آجی رات گزر چکی تھی۔ لیبارٹری میں زیر و پا در کالبلب روشن تھا۔ جس کی روشنی نے ہر جگہ مٹی مٹی سی نظر آ رہی تھی۔ ڈاکٹر لیبارٹری بند کرتے وقت بندر کی خاطر زیر و پا در کالبلب روشن رکھتا تھا۔ اس وقت بندر اپنی بندرہ کے ساتھ مزے کی نیند سو رہا تھا۔ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔

ایک سارے لیبارٹری میں حرکت کر رہا تھا۔ وہ اچھل کر اکڑوں بیٹھ گیا اور اپنی ہتھیلیوں پر ہٹ سے آنکھیں ملنے کے بعد غور سے دیکھنے لگا۔

سیارہ نگ کے اسکرٹ اور بلاؤز میں سون بارڈلے کے بدن کی چاندنی پھوٹ رہی تھی لیبارٹری کے وسط میں آکر چند لمحوں تک دم سادھے کھڑی رہی اور گہری نظروں سے دل طرف کا جائزہ لیج رہی۔ پھر وہ قدم جما کر آہٹ پیدا کیے بغیر شیشے کے شوکیس کے لائن اور اسے کھول کر آب حیات کی مراچی کو باہر نکال لیا۔

سرخ سیال کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیات جادواں کی مسرتوں سے چپکنے لگیں۔ اس نے مراچی کو کمیز پر رکھ کر اپنے دہننی بیگ سے شیشے کی دو نکلیاں نکالیں۔ ایک نگلی میں سرخ سیال بھرا ہوا تھا اور دوسری نگلی بالکل خالی تھی۔

وہ مراچی کے آب حیات کو نگلی میں ڈالنے لگی۔ جب مراچی کا آخری قطرہ بھی نگلی میں ڈال دیا تو اس نے نگلی کو اچھی طرح بند کر دیا اور پہلی نگلی کے سرخ سیال کو خالی مراچی میں ڈال دیا۔

اس جبین عورت کے بیٹھے لبوں پر کڑوی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے مراچی کی نگلی کی طرح شوکیس میں بند کر دیا۔ پھر شیشے کی دونوں نکلیوں کو اپنے دہننی بیگ میں رکھ

”پھر یہ کہ میں صرف زمین پر نہیں رہوں گا چاند پر بھی جاؤں گا اور وہاں ایک ٹیٹا قائم کروں گا۔ دنیا بھر کے اخبارات میری تصویریں شائع کریں گے۔ اپنے گھروں میں ٹیٹا کی جگہ میری تصویریں لگایا کریں گے اور مجھے اپنا ایور گرین باپ سمجھ کر میری پوجا کرنے دیں گے۔“

اس کی باتیں ہارڈی مین کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھیں۔ ایک ایشیائی باشندہ سائنسی دوش میں اس سے بازی لے جائے یہ بات ناقابل برواقت تھی۔ اس نے بیچ و تاب کھاتے ہوئے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس کی حیات کو ضرور حاصل کرے گا۔ عظیم صدیقی کو موقع نہیں دے گا کہ وہ اسے نوش کرے لیکن اس وقت اس نے افلاطون مسکراتے ہوئے کہا۔

”ڈاکٹر عظیم صدیقی! تم واقعی عظیم ہو، میں اس کامیابی پر تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔“

”شکریہ“ عظیم صدیقی نے کہا ”میرے دوستوں! اکل کی تاریخ بہت لمبی ہے لیکن سیون۔ میں تم لوگوں کو کل صبح میرا آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ کل صبح تک یہ آب حیات استعمال کے قابل ہو جائے گا۔ میں تم لوگوں کے سامنے اسے نوش کروں گا تاکہ انہیں رپورٹوں کو تم بھی یہ بیان دے سکو کہ عظیم صدیقی ایک عظیم سائنس دان ہے۔“

سون اس کی باتیں سن رہی تھی۔ کبھی اسے اور کبھی شوکیس کو دیکھ رہی تھی۔ دل آب حیات رکھا ہوا تھا۔ پھر وہ ایک ادائے ناز سے مسکراتی ہوئی عظیم صدیقی کے پاس آئی اور اسے قاتلانہ انداز سے دیکھتی ہوئی بولی۔

”میری جان عظیم! تم نے وہ عظیم کارنامہ انجام دیا ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی اتنی زبردست کامیابی پر محض زبانی مبارکباد دینا ایک طرح کی سنجوسی ہے، میں تجھے یہ ہوں میں بڑی فراخ دلی سے مبارکباد دیتا چاہتی ہوں۔ زبان سے نہیں کہنے کا لبا ہوتا کی حرارت سے۔“

یہ کہتے ہوئے وہ عظیم صدیقی کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بچوں کے بل اٹھ گئی۔ ہر کے شکستہ چہرے کو اپنی سانسوں کے قریب دیکھ کر عظیم صدیقی نے جذباتی لمبے لمبے کہا۔

”واقعی یہ مبارکباد کا سب سے خوب صورت انداز ہے۔ میں چاند کی دنیا میں جا کے بعد مبارکباد دینے کا یہی طریقہ رائج کروں گا۔“

ایک انگلی سے بندر کی ٹھوڑی کو اٹھا کر مسکراتے ہوئے بولا۔

”میرے بے زبان دوست! اب میں تمہارے ساتھ قیامت تک زندہ رہوں گا اور تمہارا مالک اس صراحی کے آب حیات کو پی کر ہمیشہ کی نیند سو جائے گا۔ اس آب حیات کو میں ابھی نوش کر سکتا ہوں لیکن میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر اس صراحی کی دوا پینے سے پہلے کئی تبدیلی کرنا چاہتا ہے یا نہیں۔ اگر اس نے طبی نقطہ نظر سے کوئی اہم تبدیلی کی تو میں بھی اسے آب حیات میں وہی تبدیلی لاؤں گا۔ پھر اسے پی کر زندہ جاوید ہو جاؤں گا۔“

یہ کہ کر وہ ابدی زندگی کے نقشے میں جھومتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

بندر کی نیند اچانک ہو گئی تھی اس لیے وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے تھمائی سے اٹا کر بندر یا کوا جانپ دیکھا۔ اس کی ستر سالہ زندگی میں وہ دوسویں بندر یا تھی۔ اس کے آقا جانتے تھے کہ انسان اور بندر کی ضروریات ایک جیسی ہوتی ہیں۔ شاید ڈارون نے درست کہا تھا کہ انسان کے آباؤ اجداد بندر تھے جو ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے انسان بن گئے۔ ڈارون نے ارتقائی منزلوں کا ذکر کیا تھا۔ یہ نہیں بتایا تھا کہ تباہی کی منزلیں طے کرتا ہوا انسان دوبارہ بندر بن سکتا ہے یا نہیں؟

کوئی ایک گھنٹے کے بعد ایک بار پھر کھٹکا سانائی دیا۔ بندر نے سلاخوں کے پیچھے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ بوڑھا یہودی جیس تھا۔ اس کی دونوں ہاتھ لبادے میں چپے ہوئے تھے جب اس نے میز کے قریب آکر لبادے سے ہاتھوں کو نکالا تو اس کی گرفت میں دو بوتلیں تھیں۔ ایک بوتل میں سرخ سیال بھرا ہوا تھا اور دوسری بوتل خالی تھی۔

پھر اس نے بھی وہی عمل دہرایا۔ صراحی کے سیال کو خالی بوتل میں بھر کر اس نے دہری بوتل کے سرخ سیال کو صراحی میں انڈیل دیا اور صراحی کو پہلے کی طرح شوکیس میں رکھ کر دونوں بوتلوں کو پھر لبادے میں چھپا لیا۔

ابدی زندگی کی دوا مفت حاصل کرنے کی خوشی سے وہ پھولا نہیں سا رہا تھا۔ اس نے بندر کے سامنے دانت نکال کر کہا۔

”میں بھی کتنا احمق ہوں۔ ڈاکٹر کو لاکھوں ڈالر دینے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ ابے او بندر کی اولاد! اپنی زبان سے اگر اپنے آقا کو بول سکتا ہے تو بول دیتا کہ اب اس صراحی میں نظر رکھا ہوا ہے۔ میں یہ آب حیات مفت لے جا رہا ہوں اور اسے زہر بھی مفت دیئے

کر دے سب خرابی سے چلتی ہوئی کٹہرے کے پاس آئی اور مسکراتی ہوئی بولی۔

”پورے منگی! اکل تم اپنے مالک کا حشر دیکھ لیتا۔ اس نے قیامت تک زندہ رہنے کی دوا بیانی تھی لیکن اب اس صراحی کی دوا پی کر وہ قیامت کے دن ہی آنکھیں کھول سکے گا۔ اسی وقت اس دوا کو نوش کر سکتی ہوں لیکن ڈاکٹر نے اسے پینے کے لیے خودت مقرر کیا ہے اسی وقت مجھے نوش کرنا چاہیے، ہو سکتا ہے کہ اس میں کوئی مصلحت ہو۔ کل میں یہاں آؤں گی اور اس کا طریقہ استعمال دیکھوں گی۔ ویسے یہ آب حیات میں مفت نہیں لے جا رہی ہوں، میں نے اس کے لیے ایک بوسے کی قیمت ادا کی ہے یہ احمق مرد نہیں جانتے کہ ایک عورت کا بوسہ بعض اوقات کتنا منگنا پڑتا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے بندر کو ایک بوسہ دیا پھر فاتحانہ انداز سے چلتی ہوئی لبارنگلی سے چلی گئی۔

بندر بہت دیر تک اکڑوں بیٹھا رہا۔ وہ شاید اس حقیقت پر غور کر رہا تھا کہ انسان کو اس کی طرح دوسروں سے چھیننے اور جھپٹنے کا عادی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ بندر لالچہ کوئی بھی چیز چھین کر بھاگ جاتا ہے اور انسان اسی چیز کو دھوکے اور چال بازی سے حاصل کرتا ہے۔

آدھے گھنٹے کے بعد پھر ایک کھٹکا سانائی دیا۔ لبارنگلی کے اندر دروازے کے زہر پھر ایک سایہ نظر آ رہا تھا۔ جب وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب سے گزرا تو بندر نے نہ پہچان لیا۔ وہ بارڈی مین تھا۔ اپنی ملک کا عظیم سائنس دان۔ وہ بھی آب حیات چڑنے آ تھا۔ وہ سائنسی دواؤں میں عظیم صدیقی سے پیچھے نہیں رہتا چاہتا تھا اس لیے وہ عظیم مددگار ایجاد پر اپنے نام کی چھاپ لگا کر شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اس نے شوکیس سے صراحی نکال کر میز پر رکھ دی اور اپنے لالچہ کوٹ کی جیب سے شیشے کی دو تنکیاں نکال کر انہیں زیر و بالا کی روشنی میں دیکھنے لگا۔ ایک نگلی میں سرخ سیال بھرا ہوا تھا اور دوسری نگلی بالکل خالی تھی۔

اس نے صراحی کے سیال کو خالی نگلی میں بھرنے کے بعد دوسری نگلی کے بالکل صراحی میں انڈیل دیا اور اسے پہلے کی طرح شوکیس میں رکھ دیا۔ پھر شیشے کی دونوں تنکیاں لالچہ کوٹ کی جیب میں بچھ کر نکلیں۔ وہ فاتحانہ انداز میں چلتا ہوا کٹہرے کے پاس آیا اور

ہائے کے بعد اس مکمل آب حیات کو یا دوسرے لفظوں میں اس مکمل زہر کو ایک گلاس میں اٹھائیے لگا۔

بارڈی اور جیس دم سادھے کھڑے تھے۔ عظیم صدیقی نے گلاس اٹھا کر قلعہ لگاتے ہوئے کہا۔

”آب حیات..... ہا ہا..... آسمانی کتابیں کہتی ہیں کہ ہر انسان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ اب کی اس ہے، میں موت کو شکست دے رہا ہوں اور ابدی زندگی کا مزہ چکھ رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے زہر کے جام کو ہونٹوں سے لگالیا اور اسے غٹاٹ پینے لگا۔

”اوکے!“ دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھوں سے جام چھوٹ گیا۔ جام چھوٹ گیا اور ٹپٹا۔ وہ ٹوٹنے لگا۔ اس نے لڑکھڑاتے ہوئے میز کا سارا لیا لیکن اس کے تمام جسم کے اندر ایسی آگ پھیل رہی تھی کہ وہ سنبھل نہ سکا۔ اونڈھے منہ گر پڑا۔

وہ دم توڑ رہا تھا اور جیس قلعے لگا رہا تھا۔

”ہا ہا..... میرے دوست! کاش کہ تم میری بات مان لیتے اور میرے ہاتھوں اسے زہر نہ دیتے مگر تمہاری حماقتوں کا شکریہ..... تمہارا ایجاد کردہ آب حیات مجھے مفت حاصل ہو گیا ہے۔ پچھلی رات میں نے اسے صراحی سے نکال کر اس میں زہر بھر دیا تھا۔“

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی عظیم صدیقی پیشہ کے لیے ٹھنڈا ہو گیا۔ بارڈی اب جس کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جیس نے اس سے پہلے آکر صراحی کا آب حیات نکالا تھا یا اس کے بعد۔ اگر وہ پہلے آیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ جیس سے دھوکا کھائے والا ہے۔

جیس اس وقت اس خاص نکلی سے تین قطرے ایک بوتل میں پکا رہا تھا۔ بارڈی نے اس سے پوچھا۔

”یہاں تم پچھلی رات یہاں آئے تھے؟“

”ہاں!“ جیس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کس وقت؟“

”مجھ ہونے سے کوئی دو گھنٹے پہلے۔“

جارہا ہوں۔ میں کل آکر اس کی موت کا تماشا دیکھوں گا۔ ہی ہی ہی۔“

وہ جیسے سروں میں ہنستا ہوا لیبارٹری سے چلا گیا۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی اور وہ بے چارہ بندر کسی اداس فلسفی کی طرح پرہاتھ رکھے اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔

دوسری صبح لیبارٹری پھر آباد ہو گئی۔ رات کی تاریکی میں جو لوگ عظیم صدیقی کا دشمن بن کر آئے تھے وہ اب دوست بن کر اس کے سامنے کھڑے ہوئے تھے لیکن انہیں

سوس ہارڈی نہیں تھی۔ عظیم صدیقی نے مسکراتے ہوئے ہارڈی سے پوچھا۔

”کیا بات ہے آج تمہاری خوب صورت سیکریٹری نہیں آئی؟ ہائے کل کے بوسے لذت مجھے ابھی تک یاد ہے۔“

ہارڈی مین نے اپنی رست واپس کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ ٹھیک وقت پر یہاں پہنچ جائے لیکن یہ غور نہیں کیا

کہ سامنے میک اپ کرنے بیٹھتی ہیں تو پھر وقت کا خیال نہیں رکھتیں۔“

”بہر حال میرے لیے وقت کی پابندی لازمی ہے۔“ عظیم صدیقی نے شوکین۔

صراحی نکال کر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

ہارڈی اور جیس کے دل دھڑکنے لگے۔ آج ایک عظیم سائنس دان ان کے زہر

ہلاک ہونے والا تھا۔ انہوں نے آج تک کسی کو ایک ٹھکانہ بھی نہیں مارا تھا لیکن اب

زندگی کی خواہش انہیں قاتل بنا رہی تھی۔

ڈاکٹر عظیم صدیقی نے ریک کے مختلف سوراخوں میں لٹکی ہوئی شیشے کی ٹنگیاں

سے ایک نکلی کو نکال کر کہا۔

”مسٹر ہارڈی! اس نکلی میں کون سا سیال ہے؟ اسے میرے سوا کوئی نہیں جانتا۔

نے اپنی ڈائری میں آب حیات کا جو فارمولا لکھ رکھا ہے اس میں اس نکلی کا ذکر نہیں

مصلحت نہیں کیا ہے۔ یہ وہی دوا ہے جس کی کمی کے باعث میرے باپ دادا کو موت کے

میں جانا پڑا۔ اس کے صرف تین قطرے صراحی میں پکادیے جائیں تو یہ آب حیات

ہو جاتا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے تین قطرے صراحی کے سیال میں پکادیے۔ پھر صراحی کو اچھا

ہارڈی نے اطمینان کی سانس لی اور طنزیہ نظروں سے جیس کو دیکھنے لگا کیونکہ وہ بولا

اب ہارڈی کے رکھے ہوئے زہر کو پینے جا رہا تھا۔

اس نے ایک گلاس میں زہر کو ایزیل کر اسے ہاتھوں میں لیا اور خوشی سے محرم کرنے لگا۔

”میں زندہ جاوید ہو رہا ہوں۔ اب کوئی میری دولت کو ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔ اب مجا دولت قیامت تک میرے ساتھ رہے گی۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک ہی سانس میں تمام زہر حلق سے نیچے اتار لیا۔

”آہ۔۔۔ ایک کراہ کے ساتھ گلاس اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ وہ ٹھوڑے

نیچے اپنے حلق کو جلدی جلدی سسلانے لگا۔ کوئی چیز اس کے حلق سے لے کر کیلئے نہ آ چھیتی چلی جا رہی تھی۔ پھر اس پر ایسا لرزہ طاری ہوا کہ وہ اپنا توازن نہ سنبھال سکا اور ایک کئی ہوئی شستیر کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

ہارڈی خاموشی سے تماشہ دیکھ رہا تھا پھر اس نے حقارت سے دونوں لاشوں کو کیچے ہوئے کہا۔

”بے وقوف لالچی بوڑھے! ابدی زندگی اتنی سستی نہیں ہوتی کہ ایک سانس والی تجھے اتنی آسانی سے بخش دے۔ تم دونوں کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر عظیم بن تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم اس انمول دوا کے ساتھ میرے لیے شہرت کے راستے بھی ہموار کر گئے ہو۔ یہ دنیا تمہارے اس کارنامے کو میرے نام سے منسوب کرتی رہے گی۔“

وہ حاصل کیے ہوئے آب حیات میں اسی خاص ٹکلی سے تین قطرے پگائے گا۔  
”یہ ہے اصلی آب حیات۔ میں ہوں عظیم سائنس داں جس نے اس آب حیات کا فارمولا بنایا ہے۔ ڈاکٹر عظیم گمنامی کے اندھیرے میں جا چکا ہے، اب میری شہرت کا دربار ہے۔“

یہ کہہ کر وہ بھی اس زہر کو غٹا غٹ پی گیا۔

بندر دیکھ رہا تھا۔ دیکھ رہا تھا کہ انسان کس طرح زندگی کے لالچ میں موت کو گلے گا ہے۔ اس کے سامنے ہارڈی بھی سبک کر دم توڑ چکا تھا۔

تین لاشیں ادھر ادھر پڑی ہوئی تھیں، زندگی ناپائیدار ہے۔ ناپائیدار رہی۔ موت نا

ہارڈی پر اکڑا تھا۔

ہارڈی کی لیب ہارڈی کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور سوس ہارڈی نے تیزی سے

لاڑ لکھ لیکن تین لاشوں کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ کیونکہ اس نے صرف عظیم صدیقی کی موت

لاڑ لکھ لی تھی۔ وہ شخص اس لیے دیر سے آئی تھی کہ اپنے دیے ہوئے زہر سے ڈاکٹر کو

ہٹے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ عورت بہت رحم دل ہوتی ہے جسے قتل کرتی ہے اس کے

زپ کا ٹھہر نہیں دیکھ سکتی۔

تین لاشوں کا مطلب اچھی طرح نہ سمجھ سکی۔ اس نے سوچا کہ شاید ان تینوں نے

زہر کو باٹ کر پیا ہے یا کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ ابدی زندگی کا لالچ کسے نہیں

لاڑ لکھ سکتا تھا۔

اس نے سوچا یہ اچھا ہی ہوا۔ اب کوئی یہ الزام عائد نہیں کرے گا کہ سوس ہارڈی

ناٹکی آب حیات کو چرا کر اس لیب ہارڈی سے ایک نئی زندگی کی ابتدا کی ہے۔

اس خیال سے مطمئن ہو کر اس نے اپنے دشمنی، یک سے شیشے کی ایک ٹکلی نکالی جس

کا ڈاکٹر کا تیار کردہ ادھورا آب حیات بھرا ہوا تھا۔ اس خوب صورت ناگن کو یہ نہیں

لم تھا کہ اس کے علاوہ بھی ایک خاص ٹکلی ہے جس سے تین قطرے اس ادھورے

آب حیات میں پگائے جاتے ہیں، وہ دیر سے پہنچی تھی اس لیے ڈاکٹر کے فارمولے کے

لی ڈاکٹر کو نہ سمجھ سکتی تھی اس نے ٹکلی کھول کر ڈاکٹر کی لاش کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ڈاکٹر میری جان باریہ آب حیات تیرے مقدر میں نہیں تھا۔ یہ میری سدا بہار جوانی

ماتحت بن گیا ہے۔ اب میں کبھی بوڑھی نہیں ہو سکتی۔ میری زلفیں اسی طرح ریشم کی

ذلام رہیں گی، میرا جسم اسی طرح شاداب رہے گا۔ میں ہمیشہ ہمیشہ جوان رہوں گی۔“

یہ کہہ کر اس نے گلابی ہونٹوں سے زہر کے جام کو لگا لیا۔

”کئی کئی گھنٹے۔“ بندر کٹہرے کی سلاخوں کو پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگا اور دانت

لاڑ لکھنے لگا۔ اس کی آواز کے ساتھ سوس کی کراہیں اور پتکیاں گڈ گڈ ہو رہی

تھیں۔ لاڑ لکھ رہی تھی سائنسی آلات اور شیشے کے مرجان اس کی زدن میں آکر چھٹا کوں

ہٹ رہے تھے وہ اپنی بھانسی ہوئی زندگی کو پکڑنے کے لیے لیب ہارڈی کے دروازے پر سے

لاڑ لکھ رہی تھی لیکن موت اس کی شہ رگ تک پہنچ گئی تھی۔ وہ دھپ سے تین لاشوں کے

درمیان آکر گر پڑی۔ اب چوتھی لاش کا بھی اضافہ ہو گیا۔  
لیبارٹری میں سناٹا چھا گیا۔ بندر اکثروں بیٹھا اپنی دونوں ہتھیلیوں پر ٹھوکر مارا  
ایک فلسفی کی طرح سوچ میں گم ہو گیا تھا۔

انسان اسی طرح دوسروں کی زندگی چھینتا رہے گا اور اپنی زندگی سے بھی باخبر  
رہے گا۔ وہ سب مر گئے اور وہ بندر انسانوں کو ایک دوسرے کے ہاتھوں سے مرے  
اس دنیا کے فنا ہونے کا تماشا دیکھنے کے لیے زندہ رہ گیا۔ لیبارٹری سے باہر دقت  
لگا۔ سال گزر گیا، صدیاں بھی گزرنے لگیں۔ دقت کے ہاتھوں نے اس لیبارٹری کا  
بکاڑ دیا۔ اسے کھنڈر بنا کر آثار قدیمہ کے کھاتے میں لکھ دیا۔ وہ بندر پہلے چڑا گھر  
پھر عجائب گھر بھیج دیا گیا، اس کے بعد وہ ایک دن موقع پا کر عجائب گھر سے فرار ہو گیا  
جان سکا کہ وہ اتنا قیامت بھٹکنے کے لیے کہاں چلا گیا ہے۔

اس عرصے میں دنیا کا نقشہ بدل گیا تھا۔ کتنے ہی برا عظیم سمندر کی تہ میں چلے  
اور کتنے ہی سطح سمندر پر ابھر آئے تھے۔ اس وقت بھی انسانوں کے درمیان ایک  
کو قتل کرنے کا عمل جاری تھا۔ ایک انسان دوسرے انسان کو ایک مذہب دوسرے  
کو اور ایک قوم دوسری قوم کو کبھی زندہ سلامت نہیں دیکھنا چاہتی۔ جب سے انسان  
زندہ رہنے کے تمدنی اصول سیکھے ہیں تب سے دوسروں کو مارنے کی تدریجی حربہ

کامیابی سے آزماتے آئے ہیں۔ ان دنوں پستول اور بندو قبض پرانے زمانے کی چیز  
تھیں۔ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بموں کے توڑ دیرافت کر لیے گئے تھے۔ انسانوں کا  
طریقوں سے مارنے کے لیے لیزر شعاعیں بھی کام میں لائی گئیں۔ لیکن ہوتا یہ تھا کہ  
انسان ہلاک کرنے کا نیا ہتھیار ایجاد کرتا تھا اور دوسرا اس سے بچاؤ کی تدابیر کر لیتا تھا  
آخر چند بڑے بڑے داغوں نے یکجا ہو کر سوچا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس دنیا کی  
کم کرنے کے لیے دوسروں کو جبرا ہلاک نہیں کرنا چاہیے۔ کوئی ایسا طریقہ سوچا جائے  
لوگ خود ہی راضی خوشی مر جائیں۔

اس مقصد کے لیے انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ کیا گیا۔ اس مطالعہ سے کچھ  
معلوم ہوئی کہ زمانے کے ساتھ ساتھ انسان کی فطرت بھی بدل گئی ہے۔ کبھی  
درجہ حاصل کرنے میدان جنگ میں جاتا تھا اور اپنی خوشی سے مر جاتا تھا۔ کبھی

بیت کے جان پر کھیل جاتا تھا مگر اب اس کے سوچنے کا انداز بدل گیا تھا۔ وہ مرنے مارنے  
بالے بذات اور احساسات کی طرف بھٹکتا بھی نہیں تھا۔

ہر ایک عالم فاضل عمر دراز مومن نے کہا کہ انسان کی فطرت بدل سکتی ہے لیکن جو چیز  
اسے درشت نہیں ملتی ہے وہ اس کے دل و دماغ سے نہیں جاتی۔ وہ چیز کیا ہے؟ وہ عورت  
ہے۔ عورت پر مرنا آپس بھر بھر کر راضی خوشی مرنے کی عادت اس کی گھٹی میں پڑی ہے۔  
بڑے ناکہ دستور بادا آدم سے شروع ہوا اور ہزار ہا سالوں کے بعد بھی جاری و ساری ہے۔  
اس نکلے پر پہنچ کر اس دور کی حسین و جمیل عورتوں کو ایک نئے ہتھیار سے آراستہ کیا  
جائے۔ اب وہ ہتھیار عورتوں کے پاس پہلے سے موجود تھا صرف اس میں دھار پیدا کی گئی۔  
ان استعمال کرنے کے نت نئے طریقے سکھائے گئے۔ ان کی غزالی آنکھوں میں کچھ ایسا  
الٹو کد ستم رکھا گیا کہ وہ حسینا میں جسے آنکھ مار تیں وہ ہائے کے ساتھ مرجاتا۔ پہلے  
ان شہزادہ انداز میں مرتے تھے اب جی جان سے مر کر اس دنیا سے رخصت ہونے لگے۔

اس طرح انسان گھٹنے لگے۔ چونکہ وہ راضی خوشی مر رہے تھے اس لیے دنیا کی آبادی  
بڑھتی رہی۔ کچھ عرصے بعد بڑے بڑے داغوں کو اپنی ایک غلطی کا علم ہوا۔ وہ  
فطرتی طور پر عورتیں قاتل تھیں اور مرد مقتول، اس طرح مردوں کی تعداد گھٹ رہی تھی  
اور عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔

اس غلطی کی تلافی کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ بڑے بڑے داغوں نے ایک متفقہ  
فیصلہ عمل کرتے ہوئے عورتوں کے جسمانی نظام سے وہ خانہ نکال کر پیچھنک دیا جہاں ماہ  
رہنا لیتا ہے اور بچے پرورش پاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیدائش کا عمل رک گیا۔  
قدرت کے نظام میں ذرا بھی تبدیلی ہو تو انسان کی تہذیب بکسریں لگ جاتی ہے اب کوئی  
ارت مذہب مال نہیں بنتی تھی اب عورت محض داشتہ تھی کیونکہ جب عورت وارث نہ  
پارے اور ایک نسل کو آگے نہ بڑھائے تو پھر پوی کے رشتے کی تمام اہمیت ختم ہو جاتی  
ہے لہذا عورت صرف اس مصرف کے لیے رہ گئی کہ وہ رات کو ساتھ سوتے اور دن کو

بالا ہائے  
نصف صدی کے بعد مردوں اور عورتوں کی تعداد بہت ہی کم ہو گئی۔ ہر ملک میں لوگ  
بہ نیکوں کی تعداد میں رہ گئے۔ کچھ بڑے داغ اپنی عمر گزار کر مر گئے، جو بچ گئے انہیں

لے جی نہیں کریں کہ ایک عورت ہزاروں سال سے مٹی کے نیچے دبلی ہوئی ہے اور ہوا اور  
بائی کے بغیر کچھ کھائے پئے اب تک زندہ ہے۔“

نوبی نے جواب دیا۔

”میں نہیں جانتا کہ وہ کیسے زندہ ہے البتہ منطق سے سمجھا سکتا ہوں۔ مچھلی روشنی اور  
الے بغیر سمندر کی تہ میں زندہ رہتی ہے ایک کیڑا روشنی اور ہوا کے بغیر مٹی کی تہ میں زندہ  
ہے۔ دونوں کی زندگی کے لیے قدرتی طور پر خوراک ملتی رہتی ہے اس دیشور میں بھی  
بڑے اور مچھلیوں کی سی خاصیتیں ہیں۔ قدرت کا اپنا بھید ہے جسے ہم اور تم نہیں سمجھ  
تے ہم نے آج تک جتنی بھی سائنسی ترقیاں کی ہیں وہ دوسروں کو ہلاک کرنے اور خود کو  
روکنے کے لیے کی ہیں۔“

نوبی کے دلائل سننے کے بعد وہ اس مقام پر گئے جہاں وہ تابوت دفن کیا گیا تھا۔ دنیا کی  
ہر ایک ہی مختصر تھی اور وہ تمام مختصر آبادی اس جگہ آکر جمع ہو گئی تھی۔ ان میں مرد بھی  
اور عورتیں بھی تھیں لیکن کوئی بچہ یا نوجوان نہیں تھا کیونکہ نصف صدی سے پیدائش  
تلا رکھا ہوا تھا۔ پچاس برس پہلے جو جوان تھے وہ اب اسی نوے سال کے بوڑھے ہو گئے

”اب اس جگہ کو باری باری کھود رہے تھے کہ بڑھاپے کی وجہ سے مسلسل کدالیں  
لا چلا سکتے تھے۔ ذرا سی دیر میں تھک کر ہانپنے لگتے تھے پھر یہ کہ ہزاروں سال کی مدت  
اس جگہ مٹی اور پتھروں کا اتنا ڈھیر جمع ہو گیا تھا کہ وہ چھوٹی سی پہاڑی نظر آتی تھی۔

اس پہاڑی کے اطراف انسانوں کا میلہ سا لگا ہوا تھا۔ رات کے وقت کھدائی کی رفتار  
تھوڑی سی رہتی تھی۔

اس رات چند سمجھدار اور چالاک انسان ایک خیمے میں آکر کچھ خاص قسم کے  
دھول کے لیے جمع ہو گئے۔ تیل کا کٹواں ہو، سونے اور ہیرے کی کان ہو یا عورت کی قبر  
بھی کوئی نایاب چیز کھود کر نکالی جاتی ہے تو عالمی سیاست میدان عمل میں آجاتی ہے۔  
بڑے بڑے والی شے شی ان کے لیے ایک نایاب عورت تھی۔ ایک ایسی عورت جو اس  
بائے لے انسانوں کو جنم دے سکتی تھی۔

اس خیمے میں چار بڑے آدمی یا چار بڑی طاقتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک

لوگوں نے مار دیا کیونکہ ان کی ہی وجہ سے یہ وقت دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ اب دنیا میں  
عورت ایسی نہیں تھی جو ماں بن سکتی اور اس ویران ہونے والی دنیا کو پھر نئے سے آباد  
آباد کر سکتی۔

کوئی ہے ایسی عورت؟

اس دنیا کے بچے کچھ لوگ ایسی کسی عورت کو تلاش کرنے کے لیے ملک ملک  
خاک چھاننے لگے لیکن ایسی کوئی عورت نہ ملی۔ اس دنیا میں جو عورتیں رہ گئی تھیں  
پڑے ریکارڈ کی طرح تھیں جن میں سے پرانے جانے پہچانے سر نکلتے تھے مگر کسی سار  
سے لوری کی سحر آمیز آواز نہیں آتی تھی۔

پھر ایک نبوی نے بتایا کہ ایسی ایک عورت ابھی اس دنیا میں موجود ہے جو ابھی  
ہے اور اس دنیا کی آبادی کو آگے بڑھا سکتی ہے۔

اس نبوی نے اپنے علم کی قوت سے ہزاروں سال پیچھے ماضی کی تہ در تہ میں جا کر  
دیکھا تو اسے زمین کے ایک خطے میں منوں مٹی کے تیلے ایک تابوت نظر آیا۔ اس نبوی  
کہا۔

”میں اپنے علم کی آنکھ سے ایک ایسی حسین دیشورہ کو دیکھ رہا ہوں جس کے حسن  
مثال ہماری دنیا کی کوئی عورت پیش نہیں کر سکتی۔ میں اپنی سعی قوت سے جاسکا ہوں  
اس تابوت میں اس کے سانسوں کی سرگرم گونج رہی ہے۔ وہ ہزاروں سال سے زندہ  
اور زندہ رہے گی۔“

ایک سائنس دان نے بے یقینی سے کہا۔

”یہ کیسے ممکن ہے؟ ایک عورت ہزاروں سال سے کیسے زندہ ہے؟ ہم نے ہزاروں  
سائنسی ترقیاں کی ہیں۔ سمندر کی تہ سے ہم آسمان کی بلندیوں تک جا پہنچے ہیں۔ ہم  
کے کتنے ہی اسرار بے نقاب کر چکے ہیں۔ قدرت کے صرف دو راز ایسے ہیں جنہیں ہم  
پہنچ سکے۔ ایک تو یہ کہ ربر کی مصنوعی عورت نے اصلی بچے پیدا کرنا اگرچہ ایسی عورت  
بچے پیدا ہوئے تھے مگر وہ چند منٹ یا چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔ اس کو  
ہمیں ناکامی ہوئی۔ ہماری دوسری کوشش یہ تھی کہ ہم ابدی زندگی حاصل کریں  
کو ششیں ہر زمانے میں ہوتی رہی ہیں مگر آج تک کسی کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔“

طاقت نے کہا۔  
”اس دنیا کی پرانی آبادی تقریباً ختم ہو چکی ہے جو رہ گئے ہیں وہ اولاد پرانے کے  
مرجائیں گے۔ اب نئی دنیا کے نئے انسان اس عورت کی کوکھ سے جنم لیں گے جو بچہ  
دستیاب ہونے والی ہے لہذا ہمیں آپس میں فیصلہ کر لینا چاہیے کہ وہ عورت ہم میں  
کس کے بچے کی ماں بنے گی؟ یعنی آئندہ دنیا کے آئندہ آدمیوں کا باپ کون بنے گا؟“

”میں بنوں گا۔“ دوسری طاقت نے کہا ”کیونکہ میں بھی ایک بڑی طاقت ہوں۔“  
تیسری اور چوتھی طاقتوں نے بھی یہی دعویٰ کیا کہ وہ اس دنیا کے بڑے ہیں۔ لہذا  
دنیا میں صرف ان کی اولاد پھیلے گی اور پھلے پھولے گی۔ ایک طاقت نے کہا۔  
”ہم میں سے ہر ایک کی خواہش ہے کہ ہم آئندہ دنیا کے باپ بنیں لیکن ہم  
طاقتوں نے اگر الگ الگ اپنے متعلق خود غرضی سے فیصلہ کیا تو پھر ہمارے درمیان  
جھڑ جائے گی۔ ہم اس دنیا کی ابتدا سے لڑتے آئے ہیں اس لڑائی جھگڑے کا نتیجہ  
ہمارے سامنے ہے۔ ہم تعداد کے لحاظ سے برائے نام رہ گئے ہیں اگر جنگ جھگڑا  
سب مارے جائیں گے۔ اس دنیا میں ہم انسانوں کا یہ آخری وجود ہے۔ اس کے بعد  
ایک بھی آدمی کا بچہ نظر نہیں آئے گا لہذا دانش مندی یہ ہے کہ ہم آپس میں اس  
عورت کو بانٹ لیں۔ پہلے ہم میں سے کسی ایک کے پاس رہے گی۔ ایک سال کے  
جب وہ بچے کا باپ بن جائے گا تو پھر وہ عورت دوسری طاقت کے پاس چلی جائے گی۔“  
دوسری طاقت نے سر ہلا کر تائید کی۔

”ہاں ہزاروں سال پہلے جب کہ دنیا آباد ہوئی تھی اور جب انسان تہذیب کا  
اور شرم و حیا کے معنی نہیں جانتا تھا، ان دنوں بھی عورت مختلف وقتوں میں مختلف  
کے سرداروں کے بس بچے پیدا کرنے کے کام آیا کرتی تھی۔ ہماری اس دنیا کی عورت  
تھی۔ انتہا میں بھی وہی بے شرم تہذیب آئی ہے مگر کیا کیا جائے؟ مجبوری ہے۔ اگر  
دانشمندی ہوگی کہ وہ عورت ہر سال ہم میں سے ہر طاقت کے پاس رہے۔ یہ اچھا ہے  
دنیا میں صرف ہم چار طاقتوں کی اولادیں رہیں گی۔  
وہ چاروں اس دانشمندانہ فیصلے پر متفق ہو گئے۔ صبح کو نہونے والے زمین کی  
تابوت تک پہنچ گئے۔ چاروں طرف شور مچ گیا کہ تابوت نظر آگیا ہے۔ صرف ایک ہی

”ہاں ہزاروں سال پہلے جب کہ دنیا آباد ہوئی تھی اور جب انسان تہذیب کا  
اور شرم و حیا کے معنی نہیں جانتا تھا، ان دنوں بھی عورت مختلف وقتوں میں مختلف  
کے سرداروں کے بس بچے پیدا کرنے کے کام آیا کرتی تھی۔ ہماری اس دنیا کی عورت  
تھی۔ انتہا میں بھی وہی بے شرم تہذیب آئی ہے مگر کیا کیا جائے؟ مجبوری ہے۔ اگر  
دانشمندی ہوگی کہ وہ عورت ہر سال ہم میں سے ہر طاقت کے پاس رہے۔ یہ اچھا ہے  
دنیا میں صرف ہم چار طاقتوں کی اولادیں رہیں گی۔  
وہ چاروں اس دانشمندانہ فیصلے پر متفق ہو گئے۔ صبح کو نہونے والے زمین کی  
تابوت تک پہنچ گئے۔ چاروں طرف شور مچ گیا کہ تابوت نظر آگیا ہے۔ صرف ایک ہی



نوں میں لے کر محبت بھرے مکالے ادا کرنے لگا۔

نن کی تہ میں آتش فشاں کی طرح پھیلنے والی شے می کو مکالموں سے دلچسپی نہیں تھی لے اپنی مرمریں بائیں اس کی گردن میں حائل کر دیں۔ پھر اپنے لیوں کو اس کے نزل پر رکھ دیا۔ بوسے کی پہلی منزل بڑی صبر آزما تھی اتنی دیر میں وہ پینہ پینہ ہو گیا تھا۔ خواب گاہ کے باہر اس محل کے باہر فوری طور پر ایک میسرینی ہوم قائم کر دیا گیا تھا۔ یہ کارڈ انکڑوں اور نرسوں کی تقرری ہو چکی تھی۔ پرانے صحتکاروں کو بے بی نوڈیٹانے لائسنس جاری کر دیئے گئے تھے اور بوڑھی عورتیں اپنے گھروں میں بیٹھ کر بھولی ہوئی وال یاد کر رہی تھیں۔

تمام لوگ نئی نسل کو خوش آمدید کہنے کے اختلالات میں مصروف تھے لیکن محل کے رستاق تھا۔ آدھی رات کے بعد اس دنیا کے پہلے بیڈروم کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا نئی جھنکار ”اوندہ“ کہتی ہوئی باہر نکلی اور اپنی خواب گاہ میں آکر اور ذرا آنسو بہا کر پھر بے کوبے سے لگا کر سو گئی۔

”ہملا بڑا“ نہامت سے مر گیا۔ سچ مر گیا۔ اس دنیا کو تباہ کرنے کے بعد جب اولاد ہو جب وہ ایک عورت کو فتح نہ کر سکے اور جب ایک عورت ”اوندہ“ کی ہنک آمیز بر جھی بنیں انار کر جلی جائے تو اسے شرم سے مرجانا چاہیے تھا اس لیے وہ مر گیا۔

نئی دوسرے بوسے کے حصے میں آگئی۔

دوسرا زیادہ ہی سمجھدار تھا کیونکہ وہ اپنے بوجھاپے اور شے کی جوانی کے درمیان دویل فاصلہ ہے اس فاصلے کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ وہ اتنا طویل سفر نہیں کر سکے گا۔ لے نئے می کو ہسلا پھسلا کر رکھا تھا اور اپنے خاص آدمیوں کو کسی ایسے شخص کی تلاش میں روانہ کر دیا جو اس دنیا کے بوڑھوں میں کم بوڑھا ہو۔ یعنی قدرے جوان ہو اور شے می کے کچل کا باپ بن سکتا ہو۔

مضبوطی ہے تھا کہ خفیہ طور سے باپ کوئی بنے گا۔ پھر اس گناہ باپ کو ہلاک کر دیا جائے لیکن اس طرح باپ کا ناکش اس دنیا کے دوسرے بوسے کو مل جائے گا۔

دوسرے دن اس کے خاص آدمی دو ایسے بوڑھوں کو پکڑ لائے جو دوسروں کے مقابلے نام کرتے اب سے پچاس برس پہلے وہ نوزائیدہ بچے تھے اب وہ پچاس برس کے ہو گئے

تھیں۔ انہیں دیکھ کر شے می نے کہا۔

”میں نے وہاں بھی بوڑھے دیکھے یہاں بھی بوڑھیاں نظر آ رہی ہیں آخر میں کون میں آگئی ہوں کہ کوئی نوجوان چہرہ نظری نہیں آتا۔“

اس کے جواب میں وہ بوڑھیاں اسے عجیب و غریب باتیں بتانے لگیں۔ انہوں نے بتایا کہ نصف صدی سے وہاں کسی نوزائیدہ بچے کی صورت نہیں دیکھی گئی ہے۔ ان میں جتنے میسرینی ہوم ہیں وہاں پالتو کنوں اور بلیوں کے بچے جنم لیتے ہیں۔ بے با نوڈیٹانے کرنے والی جتنی صنعتیں تھیں اب وہ با نوڈیٹانے کرتی ہیں۔ وہاں کی عورتیں کاکا سے کسی بچے کو سینے سے لگانے اور لوری سنانے کے لیے ترس رہی ہیں۔ اس دکان کے بیوں کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا کہ اگر قانون قدرت کے خلاف عورتوں کی کاکا دی جائے تو یہ دنیا کس طرح اجڑ جاتی ہے۔

شے می کو حائل کرایا گیا۔ اسے رفتہ رفتہ ہر بات معلوم ہوتی گئی کہ اتنی بڑی دنیا وہی صرف ایسی عورت ہے جس کی کو کھ سلامت ہے۔ اور وہ اس دنیا کو نئے سرے سے کر سکتی ہے۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دنیا کی آبادی اب صرف چند سو یا ہزار افراد مشتمل ہے جن میں نصف سے زیادہ عورتیں ہیں۔ باقی بوڑھے مرد ہیں اور وہ لوگ بڑے رفتہ رفتہ موت کی طرف رینگتے جا رہے ہیں۔

حائل کے بعد شے می کو اس دور کا بہترین شیم ٹرانس پیرنٹ لباس پہنایا گیا پھر کھانا کھلایا گیا پھر وہ بوڑھی عورتیں اسے اس دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے بیڈو لے گئیں اور اسے پھولوں کی سچ پر ہٹا کر آگئیں۔

شے می سچ پر بیٹھ کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ وہ بہت ہی خوب صورت اور خواب گاہ تھی۔ دیواروں پر عریان اور جذبات میں بیجان پیدا کرنے والی تصویریں آ تھیں۔ ہزاروں برس تک مٹی کی تہ میں ساکت و جامد رہنے کے بعد پہلی بار شے می میں انگوائیاں مچنے لگیں۔ وہ خوشبوؤں میں بسی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس دنیا کا پہلا بڑا خواب گاہ میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے ہوئی سی مسکراہٹ تھی۔ پھولوں کی سچ پر سترو سال کی ایک دوشیزہ کو دیکھ کر وہ گنا سانس لینے لگا پھر وہ کانپتے ہوئے قدموں سے اس کے قریب آیا اور اس کا نام

تھے۔ انہیں مکمل بوڑھا نہیں کہا جاسکتا تھا وہ اوجیز عمر کے تھے اور کافی صحت مند نظر آتا تھا۔

ان کی صحت کو دیکھ کر دوسرے بڑے کو خطرہ لاحق ہوا کہ اگر شے ی ان میں سے کسی ایک کو پسند کر لیتی تو پھر اس دنیا کے بیٹوں کی ملکیت بننے سے انکار کر دیتی کیونکہ عورت کی بڑے کی بڑی بن کر کھوکھلی دنیا کی حکمرانی نہیں چاہتی۔ وہ ایسی سرسبز اور اسی کی آغوش میں اس کے اندر سے پھونکتی ہیں۔ وہ ایک جوانمرد کی آرزو کرتی ہے اور اسی کی آغوش میں اور مرنا چاہتی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں وہ اپنے بچوں کے باپ کا نام بھی شے سے لیتی ہے کسی بوڑھے کے وجود پر باپ کا جھوٹا لیل لگا کر اپنی آئندہ نسل کی توہین نہیں کرتی۔

دوسرا بڑا اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ گیا۔ اس نے مجبور ہو کر تیسرے اور بڑے بڑے سے مشورہ کیا۔ وہ بھی حقیقت حال کو اچھی طرح سمجھ گئے اور اپنی کمزوریوں کا اعتراف کر لیا۔ پھر انہوں نے سوچا کہ جب ہم سے ہماری اولاد نہیں ہوگی تو پھر یہ دنیا یا انسانوں سے خالی ہو جائے، ہمارے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا لہذا اس دنیا کو خالی ہو جانے دو۔ ہم یہ توہین برداشت نہیں کریں گے کہ کسی دوسرے کی اولاد اس دنیا پر ظفر کرے۔

اب اس دنیا میں صرف وہی نیم جوان اور نیم بوڑھے ایسے تھے جن میں باپ بننے صلاحیتیں تھیں اور جو وہاں پکڑ کر لائے گئے تھے۔ تین بیٹوں کے حکم سے انہیں قتل کیا اور ان کی لاشیں چھپا دی گئیں۔ اس کے بعد شے ی کو آزاد چھوڑ دیا گیا۔ اب بھی جا کر اس دنیا کو تباہ کرنے کے لیے اپنی قسمت آزمائی کرتی تھی۔

اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایسا نہ تھا جو اس کا بیٹن اس سہمی بن سکتا۔ وہاں صرف ایسے تھے جو بڑھاپے کی آخری منزل پر اپنی اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔

وہ مایوس ہو کر رونے لگی۔ وہ تابوت میں دفن ہو گئی تھی۔ اچھا یہ تھا وہاں سکون تھی۔ اب اسے قبر سے نکال کر اور اس کے جذبات بھڑکا کر اسے رونے کے لیے مجبور کیا تھا۔ وہ جگہ جگہ جاتی تھی کبھی فریاد کرتی تھی اور کبھی ان پر لعنت و ملاحت کرتی تھی۔ ”یہ کیسی دنیا ہے؟ کیا یہ ان ہی انسانوں کی دنیا ہے جنہیں اشرف المخلوقات کا ہے۔ ذرا آئینہ اٹھا کر دیکھو تمہارے مردہ چہروں پر کیسے پھنکار برس رہی ہے۔“

نم بچے تھے کہ بچوں اور جوانوں کے بغیر تمہاری دنیا آباد رہے گی۔ کیسے رہے گی؟ نایاب وقت کا نام ہے جو پھول کھلاتی ہے فصل اگاتی ہے اور عورت کو ماں بناتی ہے۔ ہفت سے کوئی انکار کر سکتا ہے۔ تم سب اس حق ہو، تم نے اپنی تقدیر کو خدا کے بجائے ہانکے چار بڑے شیطانوں کے حوالے کر دیا۔ وہ بڑی طاقتیں تمہاری تقدیر کی مالک بن گئیں۔ انہیں غلطی موت مارتے تھے اور زندہ رکھنے کے لیے گندم کی خیرات دیتے۔ انہوں نے آبادی کم کرنے کے لیے تمہاری ماؤں اور بہنوں کی کھانچاؤ دی اور اب طاقت تمام تر اپنی اور اس دنیا کی تباہی کا تماشا دیکھ رہے ہو۔

وہ جہاں جاتی تھی فریاد کرتی تھی اور روتی تھی، روتے روتے وقت گزرنے لگا۔ رات ہوئے وقت کے ساتھ بوڑھیاں اور بوڑھے مرنے لگے۔ ان تین بڑی طاقتوں کی کمزوری اور وہ اس دنیا میں تنہا رہ گئی۔

انہیں دیران ہو گئیں۔ راستوں میں دھول اڑنے لگی۔ زمین کے ایک سرے سے دوسرے تک کسی انسان کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ہر طرف گہری خاموشی اور مٹا ہوا چھایا ہوا تھا۔ وہ دیران بیستوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں بھٹکنے لگی۔

جنگلوں میں چھمکتے ہوئے پرندے اور غراتے ہوئے درندے تھے وہ دنیا اب انہوں سے آباد تھی اور وہاں ہر پرندے اور ہر جانور کا جوڑا تھا صرف شے ی تنہا تھی۔ لاکھوں بوڑھیاں تھیں وہاں قیامت کے انتظار میں تھیں بھٹک رہی تھیں اور قیامت کا دور دورہ ہونے نہیں تھا۔

وہ کچھ جنگلوں سے نکل کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر آکر بیٹھ گئی۔ اس بلندی سے دھرتی نظر آتی تھی۔ لباس کے بغیر یہ دنیا نکلی ہو جاتی ہے اس لیے یہ دنیا نکلی نظر آ رہی تھی۔

اس پہاڑ کی چوٹی پر صبح سے شام ہونے لگی۔ تب اچانک ہی اسے عجیب سی آواز سنائی دی۔ ”ہی ہی ہی ہی آواز تھی۔“ آدمی انسانی نہیں تھی، آدمی حیوانی نہیں تھی۔ ”ہی ہی ہی ہی“

مانے ایک درخت کی شاخیں مل رہی تھیں اور پتیاں شور مچا رہی تھیں۔ پھر اس نے درخت سے ایک بندر چھلانگ لگا کر اس کے سامنے آیا اور ایک قلابازی کھا کر کھڑا ہوا۔

شے نے جیرانی سے چلکیں جھپک جھپک کر دیکھا۔ وہ ایسا بندر تھا جو ہر  
تصویری کے مطابق ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا انسانی سراپے میں داخل کیا تھا اس کے  
کے بال دقت کے ساتھ ساتھ سوکھے پتوں کی طرح جھڑ گئے تھے اس کے ہاتھ بالکل کڑ  
سیدھے ہو گئے تھے اور چار پاؤں کے بجائے دو پاؤں سے چلنے لگا تھا۔  
وہ دو پاؤں سے چلتا ہوا اس کے قریب آیا پھر اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا  
سر جھکا کر کہا۔

”آپ نے شاید مجھے نہیں پہچانا لیکن میں نے پہچان لیا۔ آپ میری مالکین  
ہزاروں سال سے گھڑے ہوئے ہیں اور آج پہاڑ کی اس چوٹی پر آئے ہیں۔“  
شے می کو یاد آگیا کہ اس کے خاوند عظیم صدیقی کے دادا نے اس بندر کو آب  
پلایا تھا۔ وہ خوش ہو کر بول۔

”میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم مل گئے۔ میں تمہاری بڑا  
تھی۔ اب مجھ سے باتیں کرنے والا ایک ساتھی مل گیا ہے۔“  
”ہاں ہم باتیں کریں گے دیکھو یہ دنیا کیسی اجڑ گئی ہے۔“  
”ہاں اب زمین پر میں اکیلی رہ گئی ہوں۔“  
بندر نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”اب اس دھرتی پر ہم دو ہی جاندار رہ گئے ہیں۔ یہ دنیا بچوں کی ہنسی کے  
او اس ہے تو ہم ایک نئی دنیا کی تیاری کریں۔“  
یہ کہتے ہی اس نے شے می کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔ وہ ایک دم سے گلاب  
نے دھڑکتے دل سے سوچا۔

”آہ! کیا دنوں کی تھیوری کے مطابق اب یہ آدمیوں کا باپ بنے گا؟“  
اس خیال کے آتے ہی وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی۔



## شیشوں کے مسیحا

ایسے مسیحاؤں کی کمائی  
جو شیشوں کے نازک بدن  
کو توڑتے ہیں پھر ہار پھرتا  
کرا نہیں پیار سے جوڑنے پر  
مجبور ہو جاتے ہیں۔

ڈرانگ روم کا بلب اونگھ رہا تھا۔ وہ بلب ان کی زندگی کے کمپاور کی طرح اونگھتا رہتا تھا ڈرانگ روم کی ہر چیز کو ٹوٹی ٹوٹی نظروں سے دیکھتا رہتا تھا۔  
خالد نے بڑی مایوسی سے کہا۔

”ہاں بایہ ڈرانگ روم کچھ سلیقے کا ہے۔ ایک صوفہ دس برس پرانا ہے۔ دوسرے کی لمبات برس ہے۔ تیسرے صوفے کی عمر کا اندازہ کرنے کے لیے اس کی ایک ٹوٹی ہوئی بٹن کو کچھ لپٹا کٹنی ہے۔ ان کے درمیان جو سینئر ٹیبل ہے۔ اس کی سطح پر جابجا خراشیں بنی ہوئی ہیں۔ میری تنخواہ سے اتنے پیسے نہیں بچتے کہ ان پر رنگ دوغٹن چڑھایا جاسکے۔ اننگ ٹیبل کی بھی یہی حالت ہے۔ اس کا عیب چھپانے کے لیے اس پر پلاسٹک کی چادر لٹائی گئی ہے۔ شیشے کا شوکیس برتنوں سے خالی ہے۔ وہاں تم نے شیشے کی ایک گڑیا کو بت لڑنے سے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ تمہارے دل میں ہر وقت یہ دھڑکنا لگا رہتا ہے کہ یہ کہیں بٹ نہ جائے۔ اس ڈرانگ روم کی سجاوٹ ایسی لگتی ہے جیسے کوئی بوڑھی عورت اپنی ناہنجی خوبصورتی کو برقرار رکھنے کے لیے پرانے زمانے کے مسی کاہل یا سرے سے کام چارہری ہو کر نہ گئے زمانے کے میک اپ کے لوازمات بت منگے ہیں۔ اس بوڑھے ڈرانگ روم تک نہیں پہنچ سکتے۔“

”خالد! تم ہمیشہ دل توڑنے والی باتیں کرتے ہو۔ دل ہویا کانچ کی گڑیا! انہیں توڑنے کے بجائے سنبھال سنبھال کر رکھنے کا نام ہی زندگی ہے۔“  
ابنا کتنے وقت وہ بڑی اداس نظروں سے شوکیس میں رکھی ہوئی کانچ کی گڑیا کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شبنم سی جتنے لگی۔ خالد نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔  
”بائی! تم تک ایک اس گڑیا سے کھیلتی رہو گی؟“

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر اسی وقت ایک کرخت سی آواز سنائی دی۔ اس آواز سے بوسیدہ دیواریں گونج اٹھیں۔

”تم آج بھی اتنی رات کو آئے ہو اور نشے کی حالت میں صوفیہ کو پھر باجی کہہ رہے ہو اگر کسی نے سن لیا تو؟“

بوڑھی ماں اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ ڈرانگ روم ایک قسم کا ہوا تھا۔ وہاں سے دوسرے کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔ ایک دروازہ خالد کے کمرے

## شیشوں کے مسیحا

آدھی رات ادھر تھی اور آدھی ادھر اور وہ ادھر ہی آ رہا تھا۔ صوفیہ کی ٹانگیں تکیے سے سرائٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دروازے تک آیا تھا اور یہ چابیوں کا گچھا نکال کر ٹالا کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ صوفیہ نے پریشان نظروں سے طرف دیکھا پھر بستر سے اٹھ کر آہستہ آہستہ لنگراتی ہوئی اس کے پاس آکر کھڑی ہوئی۔ دروازے کے کی ہول میں چابی ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا مرنے کے باعث اس بے بسک بے بسک جاتا تھا۔

”آدھی نستی آسانی سے قبر میں اتر جاتا ہے مگر ایک چابی اپنے سوراخ میں نہ سما جب تک سانس چلتی رہتی ہے۔ زندگی کی چابی اسی طرح ادھر سے ادھر بھٹکتی رہتی۔ ٹالا کھلتا ہے، نہ سوچی ہوئی جنت کا دروازہ کھلتا ہے۔“

وہ نشے میں بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ صوفیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔  
”خالد! تمہیں ہزار بار سمجھایا ہے کہ آدھی رات کو اگر بیڑیا نہ کروا لی تو گی۔ لاؤ میں دروازہ کھولتی ہوں۔“

وہ اس کے ہاتھ سے چابی لے کر دروازہ کھولنے لگی۔ خالد نے دیوار سے جڑ

کہا۔  
”دروازہ کھولنا۔ جی نہ جانا۔ یہ اندھیرا ہماری بہت سی کمزوریوں کو چھپاتا ہے۔“

”اپنی کمزوریوں کی طرف سے آنکھ بند کر لینا اچھی بات نہیں ہے۔ ام آنا خانہ کہتے ہو۔ ٹھیک ہے۔ دوسرے کمروں میں ڈھنگ کا سامان نہیں ہے۔ لڑا لڑا اکھڑے ہوئے ہیں۔ تم اب اپنے کمرے میں جا کر ٹوٹی ہوئی چابیائی پر سوجا اندھیرے میں اس کمرے کو قبول کر لیتے ہو مگر روشنی میں اس ٹوٹی ہوئی چابیائی کو چاہتے۔ تم یہاں ڈرانگ روم میں کیوں نہیں سو جاتے؟“

نخل کراچی کی گڑیا اٹھائی۔ وہ جتنی عمر کی گڑیا بنائی گئی تھی اس کی وہی عمر اس کے کالج کے دوست گھر کی تھی۔ اس وقت بوڑھی ماں نے بڑی حسرت سے سوچا۔ کاش کہ صوفیہ کی عمر گھر جاتی۔ وہ بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گئی۔ اسے سہارا دے کر چارپائی پر اب بٹھاس کے قریب بیٹھنا چاہا تو ٹوٹی ہوئی چارپائی احتجاج کرنے لگی۔ وہ مجبوراً فرش پر لیٹنے لگی۔

”تم روز کو می رات کے بعد آتے ہو۔ فضول سے نشے میں پیے برباد کرتے ہو یہی بچا کر ہم صوفیہ کو دلہن بنا سکتے ہیں۔“  
”کس کی دلہن؟“

بیٹے کا سوال ماں کے دل میں نشتر بن کر چھ گیا۔ دلہما کا دور دور دور تک پتا نہیں تھا اور وہ اس میں بیٹی کو دلہن بنا کر بٹھائے رکھتی تھی۔ کبھی نہ کبھی تو وہ دلہن بنے گی ہی۔ اسی امید اس نے کہا۔

”کسی دلہما کو بلانے سے پہلے دلہن کو بنا سنوار کر رکھنا پڑتا ہے۔ جس گھر میں وہ رہتی بات بھی خود اہستہ سجا بنا کر رکھنا ضروری ہے۔ میں چاہتی ہوں قسطوں پر نئے صوفے، دلہن، حوڑے پیے بچا کر دروازے کھڑکیوں کے لیے نئے پردے لے آئیں۔ یہاں روزی نہ نکالیں کیے بغیر کام نہیں بناتا۔ تم اس فضول نشے میں پیے برباد کرتے ہو۔“

خالد نے کوٹ بدل کر کہا۔

”ہی! سستے سے سستا صوفہ ایک ہزار روپے میں آئے گا۔ سستے پردوں اور کمرے نمونہ دو دفن میں مزید ایک ہزار روپے خرچ ہوں گے اور میں جو سستی سی شراب پیتا ہوں اس کا پورا چھ روپے میں آتا ہے۔ میں چھ روپے خرچ کر کے اس غم کو بھول جاتا ہوں اور ابھی ہزار روپے کہیں سے نہیں ملیں گے۔ یہ نشہ اعت نہیں ہے، بہت بڑی نعمت ہے۔ ہم تک تمام محرومیوں کو بھول جاتے ہیں اور میں کو سنا روز روز پیتا ہوں۔ مگر کبھی لپٹا جینے کے لیے شراب پی کر مرنے کی اجازت دیا کریں۔“

”کی باتیں نہ کرو۔ اس گھر میں میری بہو آجائے گی تو تم بہت سے غم بھول جایا کرو گے۔“

”اے! اگر کبھی آپ کی بہو آئے گی تو کچھ پرانے غم بھول جائیں گے مگر بہت سی نئی

میں کھلتا تھا دو سرا دروازہ ان کی ماں کے کمرے میں لے جاتا تھا۔ تیسرے دروازے کا پیچھے باورچی خانہ تھا۔ اور چوتھا دروازہ باہر سے آنے والوں کے لیے تھا۔ صوفیہ کے لیے کوئی کمرہ نہیں تھا۔ اس کا سامان ماں کے کمرے میں رہتا تھا اور رات کو وہ ڈرائنگ روم کے فرش پر چٹائی بچھا کر سوتی تھی۔ ان ماں، بیٹے اور بیٹی کی سب سے پہلی اور اہم بات ہوتی تھی کہ کوئی مسمان ان کے یہاں نہ آئے ورنہ اوپر سے جو خوش پوشی کا بھرم قائم ہے وہ ٹوٹ جائے گا۔ ماں نے قریب آکر پوچھا۔

”بناؤ تم نے صوفیہ کو باجی کیوں کہا؟“

”اے! باجی مجھ سے بڑی ہیں اس لیے میں انہیں باجی کہتا ہوں۔“

ماں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”ہزار بار منع کیا ہے کہ شراب نہ پیا کرو۔ نشے میں کچا ہوا شروع کر دیتے ہو۔“

”اے! جھوٹ بول کر دیکھ لیا۔ اب تک کہیں سے باجی کا رشتہ نہیں آیا۔“

”تم پھر باجی کہہ رہے ہو۔ اتنے لیے چوڑے جوان ہو، لوگ تمہیں دیکھ کر تمہارا بہن کا اندازہ لگائیں گے اگر تم اسے صوفیہ کہہ کر پکارا کرو گے تو تمہارے ایک نام لے لے سے اس کی عمر تم سے پانچ دس برس کم ہو جائے گی۔ بھاگتے ہوئے رشتوں کو پکڑنے کے لیے بھاگتی ہوئی عمر کو پکڑ کر جھوٹ کے شوکیس میں بند کرنا ضروری ہے بیٹے۔“

خالد کے دماغ میں نشہ گھوم رہا تھا۔ نگاہوں کے سامنے ہر چیز گھومتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس چکراتے ہوئے منظر میں اس نے دیکھا، اس کی بہن ڈنگاتی ہوئی شوکیس کی طرف جا رہی ہے۔ اس کے چہرے پر تاریک سائے لہرا رہے تھے۔ وہ نشے میں نہیں تھی ڈنگانے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے ایک پاؤں میں معمولی سا نقص تھا۔ چلتے وقت وہ دائیں طرف ایک ذرا سی یوں جھک جاتی تھی جیسے قد رات مار کر ایک طرف گرائی جا رہی ہو اور وہ سنبھلتی جا رہی ہو۔ چال میں اتنی معمولی سی لنگڑاہٹ تھی جو پہلی نظر میں محسوس نہ ہوتی تھی۔ اگر وہ تیزی سے چلتی تو یہ عیب بھی چھپ جاتا لیکن قدرت نے عورت کو کہا کہ لہروں کی طرح بننے کے لیے پیدا کیا ہے، وہ سیلاب کی طرح نہیں گزر سکتی تھی۔ جوانی کی ایک جاذبیت یہ بھی ہے کہ وہ ٹھہر ٹھہر کر نگاہوں کے سامنے سے گزرے۔

وہ شوکیس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے شیشے کی دیوار کو ہٹا کر بڑی محبت اور

لگا ہے کہ سب لوگ مجھے لنگڑاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔“

”تم کیوں احساس کمتری میں مبتلا ہوتی ہو۔ تم لنگڑی نہیں ہو۔ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی نقص ہوتا ہے۔ کوئی بظاہر جسمانی طور پر کھل ہوتا ہے تو اس کے اندر کوئی نہ کوئی خرابی چھپی رہتی ہے۔ چھپی ہوئی خرابی ظاہری عیب سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ دیکھو! خود کو تسلی دینے اور سمجھانے کے کچھ طریقے ہوتے ہیں۔ اگر تم خود کو گراؤ کی تو دوسرے اور گرائیں گے۔ تم خود کو یہ سمجھاؤ کہ اس دنیا میں ایسی بے شمار لڑکیاں ہیں جو تم سے زیادہ لنگڑی ہیں۔ تم ان سے ہزار درجہ بہتر ہو۔ اب میں نے سوچ لیا ہے کہ کیس سے قرضہ لے کر اور قسطوں میں سامان لے کر اس ڈرائنگ روم کو سجاؤں گی۔ کراچی جیسے شہر میں ڈرائنگ روم کی سجاوٹ سے ہم انسانوں کی حیثیت کا پتا چلتا ہے۔ تم سوجاؤ۔ فکر نہ کرو۔ فکر کرنے کے لیے ابھی میں زندہ ہوں۔“

ماں نے اس کے ہاتھ سے کالج کی گڑیا لے لی پھر اسے شوکیس میں رکھتے ہوئے بڑھانے لگی۔

”ہر بڑے آدمی کے گھر کا دروازہ اس کے ڈرائنگ روم سے کھلتا ہے۔ آنے والوں کو صرف ڈرائنگ روم میں بٹھایا جاتا ہے۔ اپنی اونچی حیثیت کی نمائش کرنے کے لیے اس کمرے کو خوب سے خوب سجایا جاتا ہے۔ کسی ناول کا دیباچہ خوبصورت نہ ہو تو اس کے بعد شروع ہونے والی کہانی کی ہیروئن کی خوبصورتی اور معیار کا پتا نہیں چلتا۔ ڈرائنگ روم کو ناول کے پیش لفظ کی طرح سجانا پڑتا ہے۔ اب میں یہی کروں گی۔

اس نے گڑیا کو شوکیس میں رکھنے کے بعد بیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ فرش پر بھیٹی ہوئی چٹائی پر جا کر لیٹ گئی تھی۔ لیٹنے بیٹھنے اور کھڑے ہونے سے ذرا بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ نموداری لنگڑی ہے۔ لیٹنے کے بعد تو قیامت نظر آتی تھی۔ پکا ہوا بدن لباس میں چھپ کر بھی ہر طرف سے منہ زوری کرتا تھا۔ ماں سوچتی رہ جاتی تھی کہ اسے کس شوکیس میں بند کر کے رکھے۔ کھلا چھوڑے گی تو یہ کالج کی گڑیا کسی کے ہاتھوں سے نوٹ جائے گی۔

وہ بڑھاتی ہوئی اور اپنی قسمت کو کوسی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ڈرائنگ روم میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ چپ چاپ چٹائی پر لیٹی ہوئی دیوار گھڑی کی ٹک ٹک سن رہی تھی۔ دیوار گھڑی زمانے کی ستانی ہوئی تھی۔ اتنی بوڑھی ہو گئی تھی کہ اس کے ذائقے

پریشانیاں اور نت نئی ضرورتیں آپ کی ہوساتھ لے آئے گی۔ ای! میں تو شادی کے بارے میں کبھی سوچنا بھی نہیں۔ جب ایک بیوی کے لیے دل چلتا ہے تو میں کوئی فیصلہ نہیں لیتا ہوں۔ جب ہم غریبوں کو عورت نہیں ملتی تو ظلم کی نئی ہیروئن مل جاتی ہے۔ سناں کے اندھیرے میں وہ صرف ہمارے لیے گیت گاتی ہے۔ ہمارے لیے آپیں بھرتی ہے۔ دولت مند باپ کی بیٹی ہو کر ایک غریب سے شادی کرنے کے لیے روم دوں اور بھروسہ شان و شوکت سے بے نکات کرتی ہے۔ آخر میں مجھ جیسے غریب سے شادی کر لیتی ہے۔ سینما ہال کے اندھیرے سے نکل کر اندھیری گلیوں سے گزرتا ہوا اپنے اس اندھیرے کمرے میں آجاتا ہوں۔ میرے ساتھ سینما ہال سے نکلی ہوئی دلہن بھی ہوتی ہے۔ بھی یہاں موجود ہے۔ اس کمرے کی جتنی جگہ کی تو وہ چلی جائے گی۔ جب بیٹے کے کمرے ہو موجود ہو تو ماں کو وہاں نہیں رہنا چاہیے۔ آپ چلی جائیں ای۔ کیوں میرا شہر کر رہی ہیں۔“

اس کی بڑبڑاہٹ سن کر ماں اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور خود بھی بڑبڑاتی ہوئی اس کمرے سے باہر آگئی۔ وہ کس کی ضرورت پوری کر سکتی تھی؟ کیا ایک بیوی کے بغیر وہ ان لوگوں کی خالی سی زندگی گزار رہا تھا اور بیٹی سا گھننے کے انتظار میں بوڑھی ہو رہی تھی۔ ان بیٹے کے کمرے کی طرف پلٹ کر دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے ایک دولت مند ہوا اس کے کمرے میں آگئی ہو اور اس کی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر اس کے ساتھ۔۔۔۔۔

آگے سوچتے ہی اس نے دروازے کو بند کر دیا۔ یہ آج کل کے لڑکوں کو روکا دینے کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ صبح چائے کے لیے ایک پاؤ دوڑھ رکھا ہوا تھا۔ بڑے لیے وہ دوڑھ کمرے میں بھیجنا ہو گا۔ اس نے شوکیس کے پاس بیٹھی ہوئی صوفیہ کو کنارے والا سانا خواب نوٹ گیا کیونکہ بیٹی ابھی تک اپنی گڑیا کی عمر کو ہاتھوں میں لے بیٹھی تھا۔

نئے بیٹی کے پاس آکر کہا۔  
”کب تک بیٹھی رہے گی۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ گھر میں بیٹھے رہنے سے کیا ہو گا۔ تجھے سیلیاں بنانا چاہئیں۔ دوسروں کے یہاں آتی جاتی رہے گی تو رشتہ دار والوں کی نظروں میں بھی آتی رہے گی۔“  
وہ سر جھکا کر بولی۔ ”ای! مجھے شرم آتی ہے۔ میں باہر نکلتی ہوں تو یہ سوچ کر لڑتی



”لیات ہے۔ اتنی دیر تک کیوں سو رہی ہو؟ اب اٹھ بھی جاؤ۔“  
 اس نے چونک کر آنکھ کھولی تو خواب کے ساتھ ساتھ دل بھی ٹوٹ گیا۔ کسی نامراد  
 بڑے نے نہ جانکی آنکھوں کے سامنے کوئی دہلا دروازہ بند کرنا ہے نہ سوتی آنکھ کے پیچھے  
 اوندھ شرمندہ تھیل ہوتی ہے۔ وہ بے دلی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سامنے ڈانگ ٹھیل پر  
 لڑکا ہوا ناشتا میں مشغول تھا۔ امی اس کے پاس بیٹھی ہوئی سمجھا رہی تھیں۔

”ہم پر جانے کی جلدی ہوتی ہے تو ذرا سویرے اٹھ جایا کرو۔ جلدی جلدی لو الے چبا  
 رکھو گے تو ہاضمہ خراب ہو جائے گا۔ تم جانور تو نہیں ہو کہ بعد میں جگالی کر کے ہضم کر لو  
 گا۔“

”ہی! ہم مزدور تیل کی طرح جگالی نہیں کرتے مگر کوہلو کے تیل کی طرح محنت کے ایک  
 ٹونڈر ہماری زندگی گھومتے رہتے ہیں۔ آپ چائے پیتی جائیں ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“  
 اس کی امی چائے کی پیالی پر جھکی تو وہ صوفیہ کو دیکھ کر نظروں ہی نظروں میں بہت کچھ  
 لگا۔ پچھلی رات رازداری کی بات ہو چکی تھی لہذا نظروں نے نظروں کو پہچان لیا۔  
 ”کوہلو اپنے دھڑے پر قائم رہنا۔ امی کو کچھ نہ بتانا۔ میں گیارہ بجے زیدہ کے ساتھ  
 جاؤں گا۔“

خیمہ دیر میں اس کی امی نے چائے کا ایک گھونٹ لیا ”اتنی دیر میں خالد نے نظروں سے  
 کچھ سمجھا ہوا۔ پھر وہ اضطراب کے عالم میں ادھر ادھر ناشتا چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ماں نے  
 لپٹ لے لیا۔“

”ارے کہاں چلے ناشتا تو ٹھکانے سے کر لیا کرو۔“

”ہی بیٹ بھر دکا ہے۔“

”پھر چائے پی لو۔“

”امی! آپ تو پیچھے پڑ جاتی ہیں چائے ڈیوٹی سے بڑھ کر نہیں ہے مجھے دیر ہو رہی ہے۔“  
 ہار کی سی پشت سے کوٹ اٹھا کر پسینے لگا۔ وہ کوٹ اس کے لیے پچھلے ہی پہنے امریکا  
 کا تھا۔ امریکا والے بڑے غریب پروردہ ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک کے غریبوں کے لیے  
 دل کے حساب سے جدید فیشن کے کوٹ چٹلون بھیجتے رہتے ہیں۔ سردی کا موسم ابھی  
 نہیں آئی ہوا تھا مگر پیارا کاموسم شروع ہو گیا تھا۔ زیدہ کے ساتھ ذرا چپے کے لیے اس

خالد نے خوش ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا ”اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر  
 چلا گیا۔ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا تھا مگر صوفیہ کی آنکھوں کے دروازے کل  
 گئے تھے۔ نیند اچانک ہی اڑ گئی تھی وہ سوتا چاہتی تھی مگر اس کا دماغ اس کے دل کو ٹھکے  
 دے دے کر پوچھ رہا تھا۔

”زیدہ یہاں کیوں آئے گی؟ ایک جوان لڑکی اس کے بھائی کے ساتھ کیوں آئے گی۔  
 یہاں کیا ہو گا؟“

وہ سوالیہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اسے یہ گھبرایا ہوا نظر آنے لگا۔ اس  
 میں وہ بات ہونے والی تھی جو پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ مگر وہ بات کیا تھی؟ کچھ سمجھ میں نہیں  
 آرہی تھی جسے وہ سمجھنے سے انکار کرتے ہوئے سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کو ٹھل  
 میں صبح ہونے لگی۔ اذان کے بعد ذرا آنکھ لگی تو اس نے خواب میں کسی انجینی نوڈل  
 دیکھا جو اس سے کہہ رہا تھا۔

”راستے میں باتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ آس پاس سے گزرنے والے لوگ ہم  
 دیکھتے رہتے ہیں تم میرے ساتھ میرے گھر چلو وہاں ہم تنہائی میں اطمینان سے یاد دہ  
 کی باتیں کریں گے۔“

وہ خواب کے شہزادے سے کہنے لگی۔  
 ”مجھے ڈر لگتا ہے میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر کیسے جاسکتی ہوں۔ کسی نے کہا  
 تو میں بدنام ہو جاؤں گی۔“

”کسی سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم محبت کر رہے ہیں کوئی جرم تو نہ  
 کر رہے۔ تم گھبراؤ نہیں۔ ہم تنہائی میں صرف باتیں کریں گے۔“  
 صرف باتیں ہی کرنے کی بات تھی وہ اپنے آئیڈیل کے ساتھ اس کے گھر میں آئے  
 پھر اس کے کمرے میں پہنچ گئی کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے محبوب نے دروازے  
 اندر سے بند کر لیا۔

اکثر خواب کلا مکس پر پہنچ کر ٹوٹ جاتے ہیں یا پھر جوابات سمجھ میں نہیں آتی ہوا  
 تک پہنچنے سے پہلے وہ خواب بکھر جاتے ہیں۔ جیسے ہی اس نے جوان نے دروازہ بند کر لیا  
 اس کی امی کی آواز نے چونکا دیا۔



”ایسا کم گوئی ہو؟ مجھے یقین نہیں آتا کہ اتنی خوبصورت لڑکی قوت گویائی سے محروم رکھی ہے۔“

اس کی بات سن کر وہ گھبرا گئی۔ ایک تو پہلے ہی قدرت نے اس میں عیب لگا دیا تھا اب اسے اسے کوئی سمجھ لیا تو کیا ہو گا؟ وہ کوئی تاثر حاصل کیے بغیر وہاں سے چلا جائے گا۔ وہ بالکل سے ہچکچاتی ہوئی بولی۔

”وہ نہیں ہیں۔“

”خدا کا شکر ہے کہ تم بولنے والی گڑیا ہو۔ میں تعریف کرنے پر مجبور ہوں۔ تم برائے بہراجمی چیز تعریف کی مستحق ہوتی ہے۔ تم ایک گڑیا کی طرح حسین بھی ہو اور معصوم بھی۔“

موند کے کانوں میں شبتائی بج رہی تھی۔ اپنے اپنے احساسات ہوتے ہیں۔ کوئی اس کے پارے میں بند کرنے کے لیے بین بجاتا ہے، کوئی اسے شبتائی کی آواز سمجھ لیتا ہے، اپنی اپنی سمجھ کی بات ہوتی ہے۔ اجنبی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”خالد نے شادی نہیں کی ہے تم اس کی گھر والی تو نہیں ہو سکتیں۔ پھر کون ہو؟“

”میں۔ میں ان کی بہن ہوں۔ بس آپ۔ آپ چلے جائیں۔ میں دروازہ بند کروں گا۔“

”چلا جاؤں گا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں خالد کے ساتھ مل میں کام کرتا ہوں۔ آج وہ بازار نہیں آیا ہے۔ میں آدھے گھنٹے کی چھٹی لے کر اس کی خیریت معلوم کرنے آیا ہوں۔ اور تم ہو کہ دروازہ بند کر رہی ہو۔“

وہ جواب کا انتظار کرنے لگا۔ جواب نہیں ملا۔ دروازہ بھی بند نہیں ہوا۔ کسی لڑکی کی نئی خاموشی سب کچھ سمجھا دیتی ہے۔ اس نے پھر کھٹک کر گھاسا کرتے ہوئے کہا۔

”تم بہت اچھی ہو۔ میں پہلے بھی اس گھر کے سامنے آچکا ہوں۔ میری خالد سے باہر ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ آج پہلی بار دستک دینے کا اتفاق ہوا۔ کتنا حسین اتفاق ہے۔ میں ایک بات مان لوں۔ پھر ایک بار اپنا چہرہ دکھاؤ۔ میں تمہاری صورت اپنے دل میں اتار لے گا۔“

”خدا جانوں گا۔“

نے کوٹ پہن لیا تھا۔ اپنی شخصیت کو زور پر کشش بنانے کے لیے اس کے پاس اس کے سے بہتر کوئی چیز نہیں تھی۔

جب وہ چلا گیا تو صوفیہ کے لیے گیارہ بجے تک وقت گزارنا مشکل ہو گیا۔ وہ رپڑ تک اپنی ماں کے ساتھ گھر کے کاسوں میں وقت گزارنے کی کوشش کرتی رہی۔ جب بجے اس کی ماں پر انہی اسکول میں بچوں کو پڑھانے چلی گئی تو باقی ایک گھنٹہ پائین لگا۔ خالد کی باتوں نے اسے الجھا دیا تھا کچھ اس کا اپنا خواب اسے پریشان کر رہا تھا۔

”توبہ۔ توبہ۔“ کیسا شرمناک خواب تھا۔ آج تک اس نے کسی اجنبی نوجوان سے نہ کی تھی اور خواب ہی خواب میں اس کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی تھی۔ توبہ توبہ ہی ایسا نہیں کروں گی۔“

وہ اس نفسیاتی الجھن کو نہ سمجھ سکی کہ لڑکی جس بات سے انکار کرتی ہے۔ بالآخر طور پر خواب کے عالم میں اسی بات کا اقرار کرتی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ شرمیلی تھی اور اس قدر احساس کمتری میں مبتلا تھی کہ کبھی کسی اجنبی کے قریب گزرتے وقت بھی خود کو بالکل ہی حقیر سمجھ کر سرکسی جاتی تھی۔

گیارہ بجنے سے پہلے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک سننے ہی اس کا دل تیز دھڑکنے لگا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی دوسرے کے ساتھ دوسرے گھر کا دروازہ کر اندر جانے والی ہو۔ اس نے دروازہ کھولا تو خود کو ایک دم سے اجنبی ماحول میں ملایا۔ اجنبی نوجوان دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ وہ جلدی سے دروازے کی آڑ لے کر اپنا درست کرنے لگی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کون ہے؟ سوچی آنکھ کے دروازے سے نکلی جاگتی آنکھوں کے سامنے کیسے آیا ہے؟

صوفیہ نے دروازہ کھولتے وقت اسے صرف ایک نظر دیکھا تھا کیونکہ وہ دروازے کے پیچھے چلی گئی تھی وہ بھی چند لمحوں تک گم سم کھڑا پھر اس نے نکلا صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

”خالد کہاں ہے؟ میں اس کا دوست ہوں۔“

صوفیہ کے داغ میں اس کی بات کا جواب موجود تھا مگر اس وقت وہ بولنا بھول گئی۔ اجنبی نے انتظار کے بعد پوچھا۔

دروازے پر پہلی بولی آئی تھی جو اس گم نام سی لڑکی کا بھلا بھلا رہی تھی۔ اپنی قدروں پر اندازہ ہونے کے بعد بھی اس میں اتنی جرات نہ ہوئی کہ وہ خود کو دکھانے کے لیے بیڑے سے سامنے چلی جاتی۔ وہ دروازے کے پیچھے ہولے ہولے لرزتی رہی۔ انہی لمبے ہونے کو کرکھا۔

”میں سمجھ گیا تم سامنے نہیں آؤ گی۔ میں جا رہا ہوں۔ اگر میرا نام یاد رکھ کر نہ کر لیتا۔ میرا نام احسن ہے۔ خدا حافظ۔“

اس کے بعد اس کی آواز گم ہو گئی۔ شاید وہ چلا گیا تھا۔ وہ بڑی پریشانی سے بیڑے کے وہ سامنے کیوں نہیں گئی۔ آج کل کی لڑکیاں تو مرد سے ایک ہاتھ آگے نکل جاتی ہیں پیچھے کیوں رہ گئی۔ اس نے ڈوبتے ہوئے دل سے دروازے کو بند کر دیا۔ اس کے بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی شوکیس کے پاس آگئی۔ شیشے کی دیوار کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ اس گڑیا کے سامنے بھی کوئی اجنبی آیا ہو گا مگر اس بے جان لڑکے کی دیوار نہیں بنائی ہوگی اس کی طرح دروازے کے پیچھے سے نکل کر اپنا کھڑا ہو گا۔

اس نے شیشے کو ایک طرف سرکا کر گڑیا کو بڑی احتیاط سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ آہ زندگی کے راز میں ہر ایک کو ایک نہ ایک ہم سفر مل جاتا ہے۔ زبیدہ کو بھی مل گیا۔ اور وہ اپنی ننگی چمپاے شوکیس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔

اس ڈرائنگ روم کے باہر جب تک وہ قدم نہ نکالتی سمجھنے والا اسے کوئی ہم سفر ملتا۔ ماں نے اسے کئی بار سمجھایا تھا مگر وہ اپنے داغ سے احساس کمتری کو نہیں جانتی اس لیے وہ کبھی کبھی بہت مجبور ہو کر باہر نکلتی تھی۔ کسی اجنبی کو دوست بنانا تو دور ہے وہ کسی لڑکی کو سیل بناتے ہوئے بھی ہچکچاتی تھی اسی لیے باہر جا کر غلط افواہیں آجاتی تھی۔ یہ تو پتا نہیں کیسے اتنی مدت کے بعد ایک اجنبی راستہ بھول کر آیا تھا۔

نے شرم و حیا کے باعث یا ماڈرن خیال کے مطابق اپنی حماقت سے دروازہ بند کر لیا۔ اسے آگے بڑھنے کا موقع نہیں ملا وہاں جانے پر مجبور کر دیا۔

پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ چونک کر کھڑی ہو گئی۔ پچھلی رات سے اس نے

فاکر خالد اپنی دوست لڑکی کو لے کر آئے گا تو وہ اپنی اس عارضی بھابی کے لیے ناشتے کا نام کرے گی مگر اس اجنبی نے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے گڑیا کو تھامے ایک تک آئی پھر اسے ایک جھٹکے سے کھول دیا۔

دروازے پر احسن کھڑا ہوا تھا۔ اسے خلاف توقع دوبارہ دیکھتے ہی صوفیہ کی سانس اوپر اوپر ہو گئی۔ اسے فوراً ہی دروازہ بند کرنے یا اس کے پیچھے چھپنے کا ہوش نہ رہا۔ ہو سکتا کہ اسے ہوش رہا ہو اور یہ عقل آگئی ہو کہ بار بار دروازے پر آنے والے کو مایوس نہ کیا

ایک وقت الجھے ہوئے خیالات کو سمجھنا نامت مشکل ہوتا ہے۔ احسن نے مسکرا کر

میں نے دوبارہ حمیس دیکھنے کی آرزو کی مگر تم نے دروازہ بند کر دیا۔ حمیس نظر بھر کر لڑکی کی تدبیر سمجھ میں آئی کہ ایک مرتبہ پھر دروازے پر دستک دوں۔ اب دیکھ لو کہ اصل کی مراد کس طرح پوری ہوتی ہے۔“

صوفیہ ایک دم سے جھینپ کر دروازے کے پیچھے چلی گئی۔ اس وقت احسن کی بات رعبہ بھی آ رہا تھا اور ایک انجانی سی مسرت کا احساس بھی ہو رہا تھا کہ کوئی اسے غور نہ کئے کے لیے کسی تدبیریں کر رہا ہے۔ اس دروازے کے باہر کھڑا صرف اسی کے ہونے کا ہے مگر وہ خود زیادہ دیر تک اس طرح کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ سسے ہوئے

”اب اس طرح بار بار نہ آئیں۔ میں بدنام ہو جاؤں گی۔“

”مجھے بھی اپنی بدنامی کا ڈر ہے۔ پہلے میں نے اطمینان کر لیا ہے کہ یہاں آتے ہوئے

میرا ہی آپ چلے جائیں، میرا دل گھبرا رہا ہے۔“ اس کی آواز میں لطیف سی لرزش

”پہلے پہل ایسا ہی ہوتا ہے۔ میرا دل بھی گھبرا رہا ہے۔ مگر یہ محبت سے آشنا کرنے والی بات ہے۔ جب آشنائی کی بات آئی ہے تو مجھے اپنا نام بھی بتا دو۔ میں یہاں سے جانے

جو نہیں کس نام سے یاد کروں؟“

رات گورت کی عمر بڑھا دیتی ہے۔ یہ نہ ہو تو اس کے حسن اور اس کی شادابی پر ذرا سی بھی زانی نہیں آتی۔

دلان بڑا خوشگوار تھا۔ کبھی کانوں میں شہنائیاں گونج رہی تھیں۔ کبھی دل کی دھڑکنوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ رگ رگ میں نشہ سا کھل رہا تھا۔ دھک دھکا ہٹا ہٹا کر دل کے ساتھ پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کی آواز سنتے ہی دل کی دھڑکنیں پھر پھاگل ہو گئیں۔ شاید وہ جانے والا پھر واپس آگیا تھا۔ وہ لنگراتی ہوئی دروازے کی طرف جاتے ہوئے سوچنے لگی کہ اب وہ دروازہ کھول کر ایک دم سے سامنا نہیں کرے گا۔ اور اسی دروازے کے پیچھے چلی جائے گی۔ پھر داغ نے سمجھایا کہ ایسی حالتیں کرتے رہے مگر کڑی ہے۔ اب بھی یہی کرے گی تو اسی ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے بوڑھی بنے گی۔ بھلا کون عورت بوڑھی ہونا پسند کرتی ہے۔ اس نے بالکل سامنے ہو کر دروازہ کھولا۔

مگر وہ نہیں تھا۔ اس کے سامنے خالد ایک سانولی لڑکی کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ صوفیہ نے کچھ لیا کہ وہ زبیدہ ہی ہوگی۔ زبیدہ نے سر کے دوپٹے کو آگے کی طرف اتار کھینچ لیا تھا کہ کیا آگےوں تک اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔ صوفیہ نے جلدی سے زبیدہ کا ہاتھ تھام لیا اور

”اگر اندر آجاؤ۔ یہ دوپٹے کا گھونگھٹ یوں لگ رہا ہے جیسے بچ میری دلہن بھالی“

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے آئی پھر اسے صوفیہ پر بٹھانے لگی تو خالد نے کہا۔ ”میں زبیدہ سے بعد میں باتیں کر لیتا ہوں۔ ہمیں ضروری باتیں کر لینے دو۔ ایسا نہ ہو کہ“

”وہ اتنی جلدی نہیں آئیں گی۔“ صوفیہ نے زبیدہ کو بٹھانے کے لیے اپنی طرف کھینچا۔ وہ اس کے ہاتھ میں آکر سرک گیا۔ گھونگھٹ والا چہرہ کھل کر سامنے آگیا۔ تب صوفیہ کو ہاتھ کا گھونگھٹ کے پیچھے چھپنے والی کی ایک آنکھ چمکی ہے۔ اس کی ایک آنکھ پلکیں

موزید اسے دیکھ کر سناکت ہو گئی۔ اسے پتا ہی نہ چلا کہ خالد کب زبیدہ کو اس کے

گڑیا اس کے سینے سے لگی ہوئی تھی اور سوچ رہی تھی۔ ہائے اللہ کیا اب ایک ہی زبان پر میرا نام آئے گا۔ یہ سوچ کر خوشی تو ہوتی ہے مگر ڈر لگتا ہے احسن کی آواز نہ آتی۔

”ایک گڑیا تمہارے سینے سے لگی ہوئی ہے۔ کتنی خوش نصیب ہے وہ۔ چلو اس کا نام بتاؤ۔ میرا دل اس گڑیا کا نام پکارے گا تو تم میرے خیالوں میں آجایا کرو گی۔ کیا؟“

”صوفیہ۔“ شرماتی ہوئی زبان سے اپنا ہی نام ادا ہو گیا۔

”شکریہ۔ اب یہ بتاؤ کیا تم روز اس وقت تمہارا ہوتا ہو؟ خالد نے اپنی اپنی کڑیاں دیکھ کر کہاں ہیں؟“

”وہ صبح دس بجے بچوں کو پڑھانے جاتی ہیں پھر تین بجے واپس آتی ہیں۔“

”پھر ایک بار شکریہ۔ اب میں جا رہا ہوں، کل موقع دیکھ کر پھر آؤں گا۔“

صوفیہ نے گھبرا کر کہا۔ ”نہیں آپ نہ آئیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”میں نے کہا تھا مجھے بھی ڈر لگتا ہے۔ میں بہت سوچ سمجھ کر آؤں گا۔ تم اطمینان نہ کریں بدنام نہیں ہونے دوں گا۔ خدا حافظ۔“

شاید وہ چلا گیا۔ صوفیہ دروازے کے پیچھے سے نکل کر اسے نہ دیکھ سکی۔ لڑکی تھوڑی دیر تک انتظار کرتی رہی پھر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ اب وہ اپنے

اور زبیدہ کو بالکل ہی بھول گئی تھی۔ پتا نہیں وہ آنے والے کہاں گم ہو گئے تھے اور آنے کی کبھی توقع نہیں کی جاسکتی تھی وہ دوبارہ اس کے دل کے دروازے کو کھول پاتا

اس نے گڑیا کو شوکیس میں رکھ کر شیشے کی دیوار کھڑی کر دی۔ اب گڑیا کی عمر

ساتھ تھی۔ پہلی بار ایک مرد کی تعریفی نگاہوں نے اس کی عمر کا تعین کیا تھا اسے

طرح کم از کم سولہ سال کی نہ سہی بیس سال کا سمجھ کر بل گیا تھا۔ حالانکہ خالد

سال کا تھا اور وہ خالد سے تین سال بڑی تھی۔ اس طرح عمر کا حساب لگاتے

لگتا تھا۔ وہ جلدی سے پلٹ کر دیوار پر لگے ہوئے چھوٹے سے آئینے کے پاس

اسے احسن کی نظروں سے دیکھنے لگا، اسے اب تک کسی مرد کی نگاہوں نے قریب

کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ بالکل اچھوتی تھی۔ دراصل مرد کی انگلیاں اور اس کی

سامنے سے کھینچ کر لے گیا۔ وہ تو اپنی زندگی کے آئینے میں زندہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل  
 نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس دنیا میں ایسی بے شمار لڑکیاں ہیں جو اس سے بھی زیادہ بے  
 عیب رہ سکتی ہیں۔ لیکن وہ لڑکیاں اس کی طرح احساس کمتری میں مبتلا نہیں رہیں۔ ہر  
 سے باہر نکلتی ہیں۔ محنت مزدوری کرتی ہیں۔ اپنی کمائی سے اپنے جیز کے لیے سالانہ  
 ہیں۔ وہ دل برباد ہو کر یہ نہیں سوچتیں کہ انہیں کوئی جیون ساتھی نہیں ملے گا۔  
 میاں نے اس دنیا میں سبھی کا جوڑا بنایا ہے۔ زندہ کو بھی اپنا جوڑا مل گیا تھا۔ مرنے  
 گھوم کر دیکھا تو خالد کے کمرے کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔

وہ صوفے پر بیٹھ کر بند دروازے کو دیکھنے لگی۔ انسانوں کی اس دنیا میں آگے کے  
 ہی دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ دوسروں سے چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ گراں  
 دیکھنے والی کا داغ سوچ رہا تھا کہ دروازہ کیوں بند کر دیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں کس  
 بڑھتا ہی جاتا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی اور اس کے داغ کے بند دروازے پر احسن دیکھ  
 دے کہ بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ جب بہت کچھ سمجھانے سے کچھ کچھ سمجھ میں آیا تو وہ  
 ہی آپ شرمندہ ہو گئی۔

زیدہ ایک اجنبی لڑکی کی طرح آئی تھی اور اجنبی کی طرح واپس چلی گئی۔ مرنے  
 دل میں ڈھیر ساری آرزوئیں تھیں کہ وہ کس طرح اپنی عارضی بھالی سے ڈھیر ساری بائرن  
 کرے گی مگر خالد نے اپنی باتوں میں بہت سارا وقت گنوا دیا تھا۔ اسی لیے زندہ اس  
 باتیں کیے بغیر چلی گئی تھی۔ خالد بھی اسے چھوڑنے کے لیے چلا گیا تھا۔ اسے یہ بتانے  
 موقع نہیں ملا کہ اس کا ایک دوست احسن اس سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ تین بجے کہ  
 اس کی امی واپس آئیں تو بیٹی کو دیکھ کر ٹھک سی گئیں۔ ماں نے پہلی بار اس چپ چاپ  
 رہنے والی لڑکی کے ہونٹوں پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ دیکھی تھی۔ مسکراہٹ کھل کر ماں  
 آئے تو عام سی خوشیوں کا اظہار ہوتا ہے۔ جوان لڑکی کے ہونٹوں پر چھپ چھپ کر آنے  
 کوئی خاص بات ہوتی ہے وہ خاص بات کیا ہو سکتی ہے؟

زمانہ شناس بوڑھی ماں پہلے تو اپنے طور پر سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔  
 کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو وہ ٹوٹے ہوئے صوفے پر آرام سے بیٹھ گئی پھر بیٹی کو مخاطب کیا۔  
 ”صوفی! یہاں آؤ بیٹی! ذرا میرے پاس بیٹھو۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔ تمہیں یہ  
 ”نہیں۔ میں صبح سے گھر کے اندر ہوں۔“

لہا تا جان لینا کافی ہے کہ کیا کہتا ہے۔ اور کیا بچتا ہے؟ اس میں سارے جہاں کے بوب ہوں مگر جواری نہ ہو۔ اس لیے کہ قمار بازی بہت بری لعنت ہے۔ بعض لوگ جوئے میں اپنی بیویوں کو ہار جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ جواری نہیں ہوگا۔ تو یہ ہے، میں ہی اپنی جلی جاری ہوں اور تم چپ بیٹھی ہو۔ اچھا یہ بتاؤ اس کا نام کیا ہے؟

”حسن۔ انہوں نے خود ہی اپنا نام بتایا تھا۔“

”تم نے بھی اپنا نام بتایا ہوگا؟“

”کتنے ہیں کہ مشرقی مائیں اپنی بیٹیوں سے ایسی باتیں نہیں کرتیں۔ ایسی باتوں سے بچوں کو بے حیائی کا سبق ملتا ہے۔ مگر شاید مشرقی روایات بدلتی جا رہی ہیں۔ بڑھتی ہوئی تعلیم کے ساتھ لڑکے منگے ہوتے جا رہے ہیں۔ صرف مزدوروں کی تنخواہ بڑھانے سے تعلیم کا دور کم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اب روزانہ اجرت پر مزدوری کرنے والے بھی اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ کہیں سے دولت لانے والی یا خود اپنی محنت سے دولت پیدا کرنے والی بیوی انہیں مل جائے۔ گھر نبھانے والی بھی باہر جا کر کام کرے گی تو دونوں کی کائی سے زندگی گزر سکتی ہے۔ جب افراد کے سوچنے کا انداز بدل رہا ہے تو ان کی روایات بھی بدلتی ہیں۔ معاشرے کا اندرون تو ڈھانچہ بھی چپکے چپکے بدلتا ہے۔ چپکے چپکے ہماری مائیں اپنی بیٹیوں کو سمجھاتی ہیں کہ اگر کوئی بھولے بھٹکے دستک دینے آجائے تو کس طرح نئے رشتے کا دروازہ کھول دینا چاہیے۔ ایسا چور سبق ہر گھر میں پڑھایا جا رہا ہے۔ کوئی تسلیم نہ کرے یہ روایات ہے۔

جب ماں حوصلہ دے رہی تھی تو بیٹی نے خاموشی سے سر جھکا کر اعتراف کر لیا کہ وہ اپنا نام بتا چکی ہے۔ اس وقت ماں کا دل سینے کی ہانڈی میں کھد بدار تھا۔ وہ ایک بھٹکے ہوئے مسافر کو عزت و آبرو سے داماد بنانے کے لیے اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس نے بے چینی سے صوفے پر پوسلبد لٹے ہوئے سوچا۔

”کیا اس نے تمہیں دیکھا ہے؟“

”میں انجانے میں دروازہ کھول کر ایک دم سے سامنے چلی گئی تھی۔ پھر جلدی سے دروازے کے پیچھے چھپ گئی تھی۔“

”تم نے دروازہ تو جلدی سے بند نہیں کیا ہوگا؟“

”اچھا اچھا۔“ ماں نے سر ہلا کر کہا۔ ”تو پھر مجھے کوئی بلائے آیا ہوگا۔“

”آپ کو نہیں خالد کو۔“ وہ روانی میں کہہ گئی پھر جانے کہاں سے جھجک اٹھی۔

”کریڈ نے پرتلی ہوئی تھی۔ اس نے پھر سر ہلا کر کہا۔

”اچھا تو خالد کو کوئی بلائے آیا تھا۔“

”جی۔ جی ہاں۔“

”اس کا کوئی دوست ہوگا۔“

”جی ہاں۔ خالد کے ساتھ وہ بھی مل میں کام کرتے ہیں۔ وہ یہ پوچھنے آئے تھے کہ آج ڈیوٹی پر۔۔۔“

وہ کہنا چاہتی تھی کہ خالد آج ڈیوٹی پر نہیں گیا ہے اسی لیے اس کا ایک دوست اس کی خیریت پوچھنے یہاں آیا تھا۔ اسے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا مگر بات زبان سے پھسل گئی تھی۔

”تم رک کیوں گئیں؟ کیا خالد آج پھر ڈیوٹی پر نہیں گیا ہے؟“

”آں۔ وہ گیا ہوگا مجھے کیا معلوم۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“

”تم سب جانتی ہو۔ بھائی کی باتیں مجھ سے چھپاتی ہو۔ اس نے آج پھر بتا دیا ہے محلے میں کہیں بیٹھا تاش کھیل رہا ہوگا۔“

”نہیں اے۔ وہ تاش نہیں کھیل رہے وہ تو۔۔۔۔۔۔“

”دیکھو صوفی! تم اپنی ماں سے کچھ نہیں چھپا سکتیں۔ تمہاری مصیبت اور گھبراہٹ مجھے سب کچھ بتا دیتی ہے۔ مجھے سچ بتاؤ کہ کیا بات ہے؟“

صوفیہ بری طرح بدحواس ہو گئی تھی اس کا دل سینے کے اندر الٹ پلٹ کر دوڑ رہا تھا۔ اچانک ماں کو خیال آیا کہ وہ تو بیٹی کی خوشیاں معلوم کرنا چاہتی تھی اب اصل ہونٹ سے ہٹ کر بیٹے کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ یہ سوچتے ہی اس نے کہا۔

”اچھا جانے دو۔ میں خالد سے پوچھ لوں گی۔ ابھی تو تم مجھے اپنی خوشیوں میں ٹرکا کر دو۔ صوفی۔ میں تم سے پوچھ رہی تھی کہ اس کا دوست کیسا ہے؟ اس کے ساتھ لڑے کام کرتا ہے؟ اچھا کمالیہ ہوگا۔ تم ایک ہی ملاقات میں اسے نہیں پرکھ سکتیں۔ میرا بھائی اسے پرکھ لے گا اور آج کل کسی کو سمجھنے کے لیے بہت زیادہ سمجھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

ہاں نے کہا۔

صوفی اتم اپنے بھائی کی کوئی بات چھپا رہی ہو۔“

مؤید نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر فوراً ہی نظریں چرانے لگی۔ ماں نے کہا۔

”میں باہر نفسیات نہیں ہوں لیکن اپنے بچوں کے ساتھ وہ کرباں باپ کو اتنا سلیقہ بانپ کہ وہ ان کے مزاج کو سمجھ سکیں اور ان کی سوچ کو پڑھ سکیں۔ جب ہم کسی کی نہ کہتے ہیں تو بات ختم ہونے کے بعد اسی کے متعلق سوچتے ہیں۔ ابھی میں خالد کی نہ کر رہی تھی۔ لہذا اتم خالد کے بارے میں سوچ رہی ہو اور کچھ چھپا رہی ہو۔“

”کچھ نہیں ابی! آپ تو بس پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ آپ بھائی جان پر نکتہ چینی کرنے اور ہارٹے ڈپٹنے کے سوا کچھ نہیں جانتیں۔ آخر وہ بھی تو انسان ہیں۔ روز صبح سے شام بچے ہوئی مٹینوں کے ساتھ مشین نہیں بن سکتے۔ لوگ تو گھبرا کر دنیا سے بھاگ جانا پڑے ہیں۔ وہ تو کبھی کبھی اپنی مل سے بھاگتے ہیں۔ آج بہت عرصے کے بعد انہوں نے ناٹھ لے۔ بہت مدت کے بعد وہ اپنی ایک دوست کے ساتھ۔۔۔۔۔۔“

وہ کہتے کہ رک گئی۔ ماں نے اسے گھور کر دیکھا۔

”دوست مذکور ہوتا ہے۔ تم مونث کے طور پر یہ کیوں کہہ رہی ہو کہ وہ اپنی ایک ت کے ساتھ۔ اپنی دوست کیا ہوتا ہے؟ یا تو تمہاری زبان کمزور ہے بعض اوقات تم بڑا ناہنجار بنی ہو یا وہ سچ کچ کسی ناہنجار کے ساتھ۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ وہ شراب کے ہلکے انوکھے ہیروئنوں کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ سچ بچاؤ کیا اس نے اپنی کسی دوست کا تذکرہ تم سے کیا ہے؟“

مؤید نے چپ چاپ اثبات میں سر ہلا دیا۔

”کون ہے وہ لڑکی؟“

”زیدہ۔“

”زیدہ کہہ دینے سے میں کیسے سمجھ لوں گی کہ وہ کون ہے؟“

”اس کی ایک آنکھ نہیں ہے۔“

”کب؟“ ماں نے تقریباً چیخ کر پوچھا۔ ”کیا فلم کی ہیروئن ایسی ہوتی ہے۔“

”کارانی زندگی میں ایسی ہوتی ہے۔ مجھ میں بھی تو ایک نقص ہے۔“

”نہیں۔ میں تو گھبرا گئی تھی۔ دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ جب وہ باتیں کرنے لگے تو

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسے وقت دروازہ بند کرنا چاہیے یا نہیں۔“

”تم نے اچھا کیا جو دروازہ بند نہیں کیا بنی۔ تم تو بیسویں صدی میں رہ کر بھی صدیوں پرانی لڑکی ہو۔ تمہیں تو بچے کر کے سمجھانا ہو گا۔ ایسے وقت دروازہ بند کرنے سے قدر کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ ہاں تو اس نے کیا کیا؟ مجھے بتاؤ تاکہ میں بھی تمہیں کچھ بتا سکوں۔“

اب وہ ماں کو کیا بتاتی کہ احسن کے بات کرنے کا انداز کیا تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر ماں نے پوچھا۔

”اس نے تمہاری تعریف کی ہوگی؟“

صوفیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ماں نے خوش ہو کر کہا۔

”بس اتنا ہی کافی ہے۔ اب میں خالد سے بات کروں گی۔ یہ لڑکا بالکل ہی ناکارہ ہے۔ اس کی مل میں اور اس کے دوستوں میں کتنے کنوارے ہیں مگر وہ کسی کو دوست بنا کر گھر نہیں لاتا۔ پتا نہیں یہ جو احسن آیا تھا یہ کنوارا ہے یا شادی شدہ۔ میں خالد سے پوچھوں گی کہ وہ کبھی دو گھنٹی چین سے بیٹھ کر بات ہی نہیں کرتا۔ آج بھی جلدی جلدی ناشتہ کر کے چلا گیا۔ ایسی جلد بازی کرتا ہے جیسے وہ نہیں جائے گا تو مل کی تمام مشینیں بند ہو جائیں گی۔ گریہ سب دکھاوا ہے۔ وہ کام کرنے نہیں جاتا کیسے بیٹھ کر تاش کھیلتا ہے۔ آنے والے دیکھ لیا آج کیسی باتیں سناتی ہوں۔“

صوفیہ نے پریشان ہو کر کہا۔ ”امی آپ خالد سے کچھ نہ کہیں۔“

”کیوں نہ کہوں۔ کیا اسے جواری بننے کی آزادی دے دوں۔“

”امی بھائی جان تاش نہیں کھیلتے ہیں۔“

”وہ تاش نہیں کھیلتا ہے۔ ڈیوٹی پر نہیں جاتا ہے تو پھر وہ کیا کرتا ہے؟ کہاں جاتا ہے؟“

صوفیہ کا سر جھک گیا۔ ایک بار اس کے جی میں آئی وہ ماں کو بھائی کے بارے میں سب کچھ بتا دے۔ آخر وہ ماں ہے بیٹے کی محرومیوں اور نامرادیوں کو سمجھ کر چپ ہو جائے گی۔

جب مائیں بچوں کی خواہشیں پوری کرنے کے قابل نہیں رہتیں تو چپ چاپ تماشا دیکھنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ ماں اپنی بیٹی کے جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر اس کی بہت سی چوریاں بھڑکنا

ماں کو اپنی بیٹی کی لشکر اہٹ یاد آگئی۔ ایک ذرا دیر پہلے وہ ساس بن کر اپنی ان بچیوں پر  
میں کھڑے نکالنا چاہتی تھی۔ ماں بن کر یاد آگیا کہ لڑکیوں کے ساتھ یہ قدرت کا نڈیا ہے  
اس مذاق کے آگے صوفیہ اور زیدہ جیسی لڑکیاں مجبور اور بے بس ہیں۔ وہ بے جملہ  
پہلو بدلتے ہوئے بولی۔  
”ٹھیک ہے۔ مگر میرا بیٹا بہت خوبصورت ہے، اسے اچھے گھرانوں کی کتنی ہی لڑکیاں  
مل سکتی ہیں۔“  
صوفیہ نے جواب نہیں دیا۔ ماں اسے خاموش دیکھ کر خود ہی سوچنے لگی۔  
”میری طرح دوسرے لڑکوں کی مائیں بھی اسی انداز میں سوچ سکتی ہیں کہ ان کے  
بیٹوں کو ایک سے ایک حسین لڑکی مل سکتی ہے جو تمام عیبوں سے پاک ہوتی ہے پھر لڑکی  
صوفیہ کو اپنی بسویوں بنایا جائے۔“

خود غرضی تو ہر جگہ ہے، ہر دل میں ہے، انسان کے ہر مفاد میں ہے، ماں کے دل نے  
سمجھا یا کہ صوفیہ کے جسم میں ایسا نقص نہیں ہے جیسا کہ زیدہ میں ہے، جیسا کہ اور وہ  
لڑکیوں میں ہو سکتا ہے۔ اپنی بیٹی میں تو عیب ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ چلتے وقت لشکرانی عیب  
نہیں بلکہ لڑائی ہوئی بل کھائی ہوئی نظر آتی ہے۔  
گمریات بیٹے کی ہو رہی تھی۔ اس نے ایسی لڑکی کو کیوں پسند کیا۔ ایسی ہو کو تو ہر دہ  
کالا چشمہ پٹائے رکھنا ہوگا۔ اگر وہ چشمہ بار بار ٹوٹا رہا یا ہونے والے بچے توڑتے رہے  
چھوٹی سی تنخواہ میں سے چشمے کے پیسے الگ نکالنے ہوں گے۔ اس نے بیٹی سے پوچھا۔  
”آخر اس لڑکے نے زیدہ میں کیا خوبی دیکھی ہے۔ تم انصاف سے کہو میں اسے  
کیسے بنا سکتی ہوں؟“

”آپ بسویوں بنانا چاہتی ہیں؟ خالد۔ میرا مطلب ہے بھائی جان تو اس سے ٹھیک  
کرنا نہیں چاہتے۔“  
”ہاں۔ شادی نہیں کرنا چاہتا؟ تو پھر دوستی کیوں کی ہے؟“  
”صرف ضروری باتیں کرنے کے لیے۔“  
”ضروری باتیں۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟“  
”وہ۔۔۔ اصل بات یہ ہے کہ امی زیدہ ایک فیکٹری میں بیکنگ کا کام کرتی ہے۔ اس کی

بھائی جان کے راستے میں پڑتی ہے۔ اس طرف سے آتے جاتے زیدہ سے دوستی  
بھائی کا نہیں راستے میں ضروری باتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا اس لیے آج وہ زیدہ کو  
ہلائے آئے تھے۔ دیکھیے امی، آپ بھائی جان سے کچھ نہ کہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا  
کہ آپ کو کچھ نہ بتاؤں۔ انہوں نے بڑے اعتماد سے مجھے اپنا راز دار بنایا ہے مگر میں کیا  
لگا رہے پیٹ میں بات نہیں رہتی۔ آپ ان سے کچھ نہیں کہیں گی؟“  
”کیوں نہیں کہوں گی، اسے آئے تو وہ۔۔۔ توبہ توبہ گھر میں جوان بہن ہے اور اس کے  
انہی حرکتیں۔۔۔“  
”مگر کتنی کیسی وہ تو ضروری باتیں کرنے۔۔۔“ صوفیہ نے جلدی سے صفائی پیش کی۔  
”تھپ رہو۔ کیا ضروری باتیں کرنے کے لیے یہی گھر ملا تھا۔ کیا وہ اپنے کمرے میں  
باتھا؟“  
صوفیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔  
”کیا اس نے دروازہ بند کیا تھا؟“  
صوفیہ نے پھر سر ہلا دیا۔ ماں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ”کیسی خنس لڑکی ہے۔ گڑیا کی طرح  
ماں میں گردن ہلائے جا رہی ہے۔ کیا یہ اندر سے کچھ نہیں سمجھتی ہوگی۔ جب میں  
ان کی تو میں بھی اپنے اندر بہت سے طوفان چھپائے رکھتی تھی اور اوپر سے بے حس بنی  
پتی تھی۔ میں اپنی بیٹی کو نہیں سمجھوں گی تو اور کون سمجھے گا۔ آئے دے اسے، آج میں اسے  
کہوں گی۔“  
وہ بڑا تکی ہوئی گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ کام کے دوران کبھی وہ اپنے کمرے  
جا رہی تھی اور کبھی باورچی خانے میں جا رہی تھی ایک بار وہ باورچی خانے سے باہر آکر  
ٹھہر گئی۔  
”یہ لڑکے تو ماں کو پریشان کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے لیے سوچتی ہوں تو  
میں بھول جاتی ہوں۔ ابھی احسن کی بات سن کر سوچ رہی تھی کہ اس ذرا تنگ روم کا  
طرز کیا ہوگا۔ ہم اسے دعوت دیں گے تو وہ یہاں آکر کیا دیکھے گا؟ ہماری شکستہ حالی سے  
بہل جائے گا۔ گڑیا کا بھاء ہٹانے سے پہلے شوکیس کو سجانا پڑتا ہے۔ مگر تمہارا بھائی یہ  
باتیں نہیں سمجھتا۔ وہ تو ایسے الجھا کر رکھ دیتا ہے کہ میں ساری باتیں بھول جاتی ہوں۔ ابھی

میں نہیں ایک خوشخبری سنانے والی تھی۔ دیکھو میں پھر بھول جاؤں گی۔ تم بچ میں کچھ نہیں بولنا۔ خالد کی بات چھیڑو گی تو میں پھوس۔۔۔۔۔۔

”امی آپ پھر بھول رہی ہیں۔ وہ خوش خبری کیا ہے؟“

”وہ پچھلے دو سال سے جو نیچروں کی اضافی تنخواہیں رکی ہوئی تھیں؟ وہ کل ہمیں مل جائیں گی۔ نئی حکومت کا بھلا ہوا مجھے پورے چوبیس سو روپے ملیں گے۔ یعنی دو ہزار چار سو روپے۔ مگر تم چوبیس سو یا دو رکھو۔ اس طرح تمہیں یاد رہے گا کہ خالد کی عمر چوبیس ہی ہے۔ اور اس سے تم چار سال چھوٹی ہو اور ہاں خالد سے روپے کی بات نہ کرنا ورنہ ۲۰ پیاس مانگنا شروع کر دے گا۔ میں تمہاری شادی کے لیے یہ روپے رکھ رہی ہوں۔ مرنے ڈرانگ روم کے لیے پانچ سو روپے خرچ کروں گی۔ قسطوں پر نئے صوفے آجائیں گے لنڈے بازار سے کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے لے آؤں گی۔ تھوڑی سی تبدیلی ہو جائے تو ڈرانگ روم اک دم سے بدل جائے گا۔ تمہاری نقد پر بھی بدل جائے گا۔“

یہ کہہ کر وہ پھر یاد رچی خانے میں چلی گئیں۔ صوفیہ شوکیس کی طرف دیکھ کر بونے لگی۔ ”سی ایسے منصوبے بنا رہی ہیں جیسے وہ جج و دھما بن کر آئیں گے۔ کیا جج ایسا ہو سکتا ہے؟ یہ سوچتے ہی اس کے کانوں میں شہنائیاں گونجنے لگیں۔ ڈھولک کی تھاپ پھونکیاں گیت گانے لگیں۔ ”ہاں میرا آئے گا۔۔۔۔۔۔“ بے کو چشم تصور میں دیکھتے ہی اس نے شہر اکبر چرے کو دونوں ہاتھوں سے چسپا کیا۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ خیال کی دنیا میں بچ بچ کر سب ہی اپنی نظر آتی ہوئی زندگی کو بھول جاتے ہیں۔

خالد شام کو ڈیوٹی کے وقت کے مطابق واپس آیا۔ ماں غصے میں بھری بیٹھی تھی۔ زیادہ غصے میں بولا نہیں جاتا۔ وہ بھی کئی بار بولنے بولتے رہ گئی۔ خالد بیشہ کالا پرانا قانا ماں کو نظر انداز کر کے کوٹ اتارتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تب ماں نے برداشت نہ ہو سکا۔

”کہاں جا رہے ہو؟ ادھر آؤ۔ اتنی گرمی میں یہ کوٹ کسے پسند کرانے گئے تھے؟ اب جھوٹ نہ بولنا کہ ڈیوٹی پر گئے تھے مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔ بہتر ہے کہ اپنی زبان سے سب کچھ کہہ دو۔“

خالد نے گھوم کر صوفیہ کی جانب شکایت بھری نظروں سے دیکھا۔ ماں نے زبان کر

”ہر ایک بھائی اپنی بہن کے سامنے بھی تو ایسا نہیں کر سکتا۔“

”ہی آپ میرا محاسبہ کرنے سے پہلے میری مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ باہر آتی ہیں؟ کیا میں ساری زندگی خواب دیکھتے دیکھتے یا فلمیں دیکھتے دیکھتے گزار دوں؟“

”تم فلمیں کیوں دیکھتے ہو؟ یہ فلمیں اخلاق بگاڑ دیتی ہیں۔“

”یہ غلط ہے امی۔ ہماری محرمیاں ہمارا اخلاق بگاڑتی ہیں۔ ہم انسان فطرتاً شکاری ہیں اور جنگجو واقع ہوئے ہیں۔ جب ہمارے اس فطری جذبے کی تسکین نہیں ہوتی تو ہم اپنی عافیت اور جنگجو قسم کے ہیرو کی فلمیں دیکھتے ہیں۔ وہ خطرات میں گھبراتا ہے تو ہم ان خطرات میں گھرجاتے ہیں۔ وہ دشمنوں کو ٹھوکر مارتا ہے، حالات سے لڑتا ہے اور اسی کے ظالم بچوں سے اپنی دولت مند حسین محبوبہ کو چھین لیتا ہے تو ایسے وقت ہمارے لیاں کی تسکین ہوتی رہتی ہے۔ پھر ہم اپنے اس بوسیدہ مکان میں آکر سوچتے ہیں کہ ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔ پھر ہماری محرمیاں ہمیں سمجھاتی ہیں کہ اکبر سیٹھ اگر دو لاکھ روپے کما ہے تو ہم اپنی محنت سے کم از کم دو سو کما سکتے ہیں۔ اکبر سیٹھ کے پتلو میں دو گول والی محبوبہ آتی ہے ہمارے حصے میں کم از کم ایک آنکھ والی تو آ سکتی ہے مگر جب اس حصے کی بات آتی ہے تو اخلاقی قدروں کی دیواریں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔“

”اخلاقی قدروں کو بھولا نہیں جاسکتا۔ یہ کیسی غیر اخلاقی بلکہ شرمناک حرکت ہے کہ تم خدوان بہن کو اپنا رازدار بنایا ہے۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ وہ معصوم کتنی محرمیوں کا



”دہاں تم سے ملنے آیا تھا۔ میں گھر پر نہیں تھی۔ صوفی نے دروازہ کھولا۔ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔“  
 ”کیا مطلب؟ کیا وہ گھر کے اندر آیا تھا؟“  
 ”نہیں، دروازے پر کھڑا رہا۔“  
 ”آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ صوفیہ نے آپ سے بچ کہا ہے۔ وہ یہاں اندر آیا ہو گا۔“  
 ”اگر میری بیٹی نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے تو اس جھوٹ پر تمہیں شرمنا چاہیے، لڑکے تم نے ایک لڑکی کے لیے اس گھر کا دروازہ کھولا ہے۔“  
 خالد نے غصے سے منہ پھیر کر کہا۔

”میں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صوفیہ بے حیائی پر اتر آئے۔ میں اس کا گلا گھونٹ کر لیں گا۔“

”کیا اس مت کرو۔ اپنے بدن میں آگ لگتی ہے تو جلن کا احساس ہوتا ہے۔ تمہارے اندر ابھی عقل ہے تو سمجھ داری سے کام لو۔ ابھی اس گھر میں آگ نہیں لگی ہے۔ مجھے نیچے پرورا اعتماد ہے۔ وہ میرے سامنے کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ میں نے اس سے معلوم کیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ احسن اس کی تعریف کر رہا تھا۔“

”کیا وہ میری بہن کی تعریف کر رہا تھا۔ میں اس کی زبان کھینچ لوں گا۔“  
 ”بے وقوف کہیں کے، زبان کھینچنے کے بجائے تم اسے یہاں کھینچ کر کیوں نہیں لے میری عقل سے کام کرو۔ وہ یہاں ایک بار آئے گا۔ ہمارے یہاں ایک وقت کا کھانا کھا لے گا۔ یہاں اطمینان سے بیٹھ کر صوفیہ سے باتیں کرے گا تو شادی کے لیے فوراً فی ہوجائے گا۔“

”کیا آپ چاہتی ہیں کہ وہ یہاں آئے اور میں اپنی بہن سے اسے باتیں کرنے کا موقع نہ ملے؟“

”یہ مصلحت اندیشی ہے۔ تم کیا جانو، کتنے ہی گھروں میں جھانک کر دیکھتی ہوں، ہر جگہ ہوتا ہے۔ اپنی بیٹیوں کو سات پردوں میں رکھنے والے والدین بھی حالات سے مجبور لڑکھائی کو اپنے ہونے والے داماد سے مل بیٹھنے کا موقع دیتے ہیں۔ گھر کی بات گھر ہی

شکار ہے۔ تمہاری اس حرکت سے اس کے ذہن پر کیا اثر پڑے گا۔“  
 ”یہی سوچتے سوچتے اور ڈرتے ڈرتے اتنی عمر گزر گئی۔ اتنی مدت کے بعد یہ سوچ کر کڑا سی جرات پیدا ہوئی ہے کہ بھوک کے وقت مانگنے سے روٹی نہ ملے تو کسی سے مانگ کر کھا لی جاتی ہے یا چرا کر کھائی جاتی ہے۔ میں نے بہت مجبور ہو کر اس سماج کے دسترخوان سے ایک لڑکی کو چرایا ہے۔ آپ خود دیکھ لیں کہ میں نے بہت بڑی چوری نہیں کی ہے۔ چوری کے بعد بھی جس طرح ہمیں سوکھی روٹیاں ملتی ہیں اسی طرح ایک روکھی پھینکی لڑکی ملی ہے۔“  
 ”میں صوفیہ کی بات کر رہی ہوں اور تم بات بدل رہے ہو۔“

”صوفیہ ایک نادان لڑکی ہے ای۔ نادان ہے، معصوم ہے اور اس شوکیں میں رہا ہوئی گزیا کی طرح بے حس ہے۔ میں نے اسے کبھی مسکراتے اور کبھی رگھوں سے بن کرتے نہیں دیکھا۔“

”اچھے گھر کی لڑکی ایسی ہی نادان اور بے حس نظر آتی ہے مگر وہ اندر سے کیا ہے؟ ہم ماں سے زیادہ نہیں جانتے۔ مگر اب تمہیں سب کچھ جانا اور سمجھنا پڑے گا۔ تمہیں اس کے رشتے کی فکر کرنا ہوگی۔ تمہارا ایک دوست تمہارے ساتھ مل میں کام کرتا ہے اس کا نام احسن ہے۔ کیا اس کی شادی ہو چکی ہے؟“

”آپ احسن کو کیسے جانتی ہیں؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔  
 ”پہلے میری بات کا جزا۔ کیا اس کی شادی ہو چکی ہے؟“  
 ”نہیں۔ وہ بھی میری طرح خواب دیکھتا ہے۔ اس کی تنخواہ مجھ سے پچاس روپے زیادہ ہے۔“

”پھر تو اچھا لڑکا ہے۔“ ماں نے جلدی سے کہا۔  
 ”مگر وہ سوچتا ہے کہ جب بیوی آئے گی اور بچے پڑھیں گے تو تنخواہ نہیں پڑے گی۔ چار سو روپے چار سو روپے کے برابر ہو جائیں گے۔“

”تم اسے کسی دن یہاں لے کر آؤ۔ میں اسے سمجھاؤں گی کہ بیوی بچوں کی ضرورت بھی آمدنی بڑھتی ہے۔“

”اگر یہ کوئی لطیفہ ہے تو مجھے ہنسا چاہیے۔ اگر اس میں حقیقت ہے تو پھر ہم با بیوی بچوں کی فیکٹریاں کھول لینی چاہئیں۔ دیئے آپ یہ باتیں آپ احسن کو کیے با

بجائے تو ہم کی شرمیلی ہے۔ کبھی اس نے کسی غیر کے سامنے بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا۔  
ماتے سمجھا رہا ہے کہ یہ تمہیں غیر نہ سمجھے۔ تم خالد کے دوست ہو اس لیے میرے  
بچے ہو۔ بچی کھاتی رہو باتیں کرتی رہو۔ اب ایسا بھی کیا شرانا؟ دونوں سے تواضع کی  
لیا کر دی تھیں۔“

مزید کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا۔ ماں کیسا سفید جھوٹ بول رہی تھی۔ اس کی  
اتے تریف کا ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔ اس جھوٹ پر وہ شرم سے زمین میں گڑی  
انگی۔ ماں اسے گھبراتے دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ ”میں ابھی آتی ہوں۔“ کہہ کر  
خانے کی طرف چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی احسن نے بڑی آہستگی سے کہا۔

”تمہارے ہاتھ بہت نازک ہیں۔ لقمہ چھوٹ جاتا ہے۔ کو تو میں اپنے ہاتھوں سے  
کھاؤں۔“

والدک دم سے سٹ گئی۔ جیسے وہ حملہ کرنے آ رہا ہو۔ مگر وہ اپنی جگہ سنا بیٹھا ہوا تھا۔  
اپنی خانے سے باہر آئی تو اس کے ہاتھوں میں سالن کا ایک بڑا چالہ تھا۔ اس نے  
اکر کمال۔

مصلیٰ میں یہ سالن پڑوسن کو دے کر آ رہی ہوں جب تک تم احسن سے باتیں  
کرتے ہو۔

وہ اب سنے بغیر آگے بڑھتی چلی گئی۔ صوفیہ نے گھبرا کر آواز دیا چاہی مگر جتنی دیر میں  
نے نکلے سے آواز نکالنے کی کوشش کرتی اتنی دیر میں ماں جا چکی تھی۔ دروازہ بند ہو چکا

”تمہاری امی بہت سمجھ دار ہیں۔“

احسن اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے ساتھ والی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ صوفیہ نے ایک  
گہرا کراٹھے کی کوشش کی تو گڑبڑا گئی۔ کرسی پیچھے کی طرف الٹ گئی۔ وہ بھی پیچھے کی  
مال جاتی مگر احسن نے جلدی سے اٹھ کر اسے اپنے بازوؤں میں قحام لیا۔ اس  
راکھنا نہیں کہتے۔ اس نے تو اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ کر سینے سے لگا لیا تھا۔  
بازوؤں سمجھ نہ سکی کہ یہ اچانک کیا ہو رہا ہے۔ پہلے تو وہ سمجھی کہ گر رہی ہے پھر سمجھ  
اٹا کہ منہل رہی ہے۔ پھر خیال آیا کہ صدیوں سے دیکھے جانے والے سپنوں کا شہزادہ

میں رہتی ہے۔ باہر والوں کو پتا نہیں چلا کہ گھر کی چار دیواری میں تھوڑی دیر کے لیے  
کورٹ شب کی اجازت دی گئی ہے۔“

”مگر امی آپ یہ تو سوچنے کے بجائے کتنی شرم آئے گی۔“

”شرم تو مجھے بھی آئے گی مگر اب میں شرمانے سے زیادہ یہ سوچنے لگی ہوں کہ نہ میں  
پرس کی ہو چکی ہے۔ اس کے آگے میں اور کچھ نہیں سوچ سکتی۔ اگر تمہیں شرم آئے تو  
گھر میں نہ رہتا۔ تھوڑی دیر کے لیے باہر چلے جاتا۔“

خالد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جھجلاہٹ کا مظاہرہ کرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔  
دونوں میں ڈرائنگ روم کا نقشہ بدل گیا۔ محدود سرمائے کی مطابق فسطوں پر  
صوفے آگئے۔ دیواریں ستے ڈسٹمبر سے کلابی گلابی سی ہو گئیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر  
لنڈے بازار کے پرے لٹک گئے۔ ان حالات میں اکثر ہمارے گھروں کو کٹھنوں کی طرف  
سجایا جاتا ہے۔ تیسری شام احسن کھانے کی دعوت پر آیا تو صوفیہ کو سجا بنا کر بٹھا دیا گیا تھا۔  
تہذیب اور شرافت کے دائرے میں رہ کر ایسا کیا جائے تو بیٹی اور ہونے والے داماد کے لیے  
لائسنس کی ضرورت نہیں پڑتی۔

صوفیہ بہت گھبرا رہی تھی۔ احسن بھی اپنی ہونے والی ساس کے سامنے شرابانہ  
خالد ایک معقول سا بہانہ بنا کر باہر چلا گیا تھا۔

کھانے کی میز پر صوفیہ کی ماں احسن کے سامنے کھانے کی پلیٹیں بڑھاتی ہوئی اپنے  
خاندان کے گمن گارہی تھیں جو پہلے بہت اونچا تھا اب نیچا ہو گیا تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔  
”بیٹا تمہاری گھر میں کون کون ہے؟“

”کوئی نہیں ہے۔ ماں باپ مر چکے ہیں۔ غریبی نے رشتہ داروں سے نالہ توڑا ہوا  
ہے۔ صرف ایک چھوٹی بہن ہے۔ سوچتا ہوں پہلے اس کی شادی کروں پھر اپنی گھر  
کروں۔“

”اے بیٹا! میرے جیتے جی تم فکر نہ کرو۔ میں تمہاری بہن کے ہاتھ پہلے کروں گا۔  
کبھی اسے بھی یہاں لاؤ میں ذرا دیکھوں گی کہ میری بیٹی کیسی ہے۔“

”میں کل ہی اسے یہاں لے آؤں گا۔ مگر آپ کی یہ صاحبزادی خاموش بیٹی ہیں۔  
نہیں کھانے سے شراب رہی ہیں یا مجھ سے شرم آ رہی ہے۔“

انوش میں لے کر پوچھا۔

”ابو امیری جان۔ کیوں رو رہی ہو؟“

”سک سک کر کہنے لگی۔ ”میری کالج کی گزرا ٹوٹ گئی ہے۔ اللہ میں نے کتنی سنبال کر رکھا تھا۔ کبھی کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھی مگر اس بے نہ جانے نے اسے آرا سے توڑ دیا ہے۔“

”اس نے پکارنے لگا۔ ”اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ اسے تو ایک دن ٹوٹنا ہی ہوا ہے۔ اس کے بازوؤں سے نکل کر دباں سے اٹھ گئی۔ پھر اندھیرے میں راستہ ٹوٹتی ہوئی اس کی طرف جانے لگی۔ احسن نے اسے آواز دی۔

”کہاں ہو تم؟“

اسے جواب نہیں ملا۔ وہ مگھری تاریکی میں گھورتا رہا۔ پھر اچانک ہی بجلی آگئی۔ لوم روشن ہو گیا۔ وہ شوکیس کے پاس فوٹی ہوئی گزرا کو ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی۔ بڑے بانی کلڑے شوکیس کے اندر بھرے ہوئے تھے۔ احسن نے اس کے پاس بیٹھتے

نکل

”نہ نہ کرو۔ میں تمہیں دوسری گزرا لا کر دے دوں گا۔“

مزید اپنا سرا اس کے شانے پر رکھ دیا۔ پھر بڑی آہستگی سے بولی۔

”مجھے گزرا نہیں چاہیے۔ مجھے۔۔۔ آپ کی ضرورت ہے۔“

”مجھے بھی تمہاری ضرورت ہے۔ جب تک ہم ایک دوسرے کے دکھ درد کو نہیں

ہے اس وقت تک ایک دوسرے کے نہیں بن سکیں گے۔“

”میں آپ کے تمام دکھ سمیٹ لوں گی۔“

”میرا ایک ہی دکھ ہے اور وہ میری دکھی بہن ہے۔ جب بھی میں اپنی شادی کے لیے

ایں وزیر خیر مجھ سے کہتا ہے کہ پہلے بہن کی شادی کرو۔“

”بھال جان بھی میرے لیے پریشان رہتے ہیں۔“ صوفیہ نے کہا۔

”پر فرقت مند بھائی پہلے اپنی بہن کی فکر کرتا ہے۔ یہ فکر کرتے کرتے میں بوڑھا ہو رہا

اسے سنبال رہا ہے اور وہ اس کے سینے سے لگ گئی۔ یہ سب خواب کی سی کیفیت تھی۔ کھل آنکھوں کے سامنے تو کبھی کسی نے ایسی جرات نہیں کی تھی اور نہ ہی خود اس شان

حاصل تھا کہ وہ اپنے خوابوں کی تعبیر کو گلے لگاتی۔ جب تک وہ خواب کی سی حالت میں رہی وہ میٹھی میٹھی سرگوشیوں میں اسے بلاتا رہا۔ اپنے ہونٹوں سے اس کی گردن پر پھینٹاں پر آنکھوں پر اور لبوں پر اتارتا رہا۔ اس کے پر پہلے کبھی ایسی افتاد نہیں پڑی تھی۔ اپنی سانسوں کے جھوٹے نجانے اسے کہاں لانا لیے جارہے تھے۔ ایک دم سے اس کا سر چکر اٹھا۔ اچانک کوئی حادثہ پیش آجائے تو ابلار ہوتا ہے۔ احسن اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر ڈانٹنگ فیمل کی طرف سے گھوم کر صوفیہ پر لے آیا۔ پھر اسے نئے صوفے پر لٹا دیا۔ اس کے بعد اس کے رخساروں کو پیار سے تھپکھپک کر توازیں دینے لگا۔

”صوفیہ میری جان۔ کیا تم مجھ سے ڈرتی ہو؟“

اس کا سر پکڑا رہا تھا وہ آنکھیں کھول کر اس پاس کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کر گئی مگر کچھ سمجھنے سے پہلے ہی ایک بیک تاریکی چھا گئی۔ شاید بجلی کا فیوز اڑ گیا تھا یا بجروں علاقے کی بجلی چلی گئی تھی۔ اندھیرے نے اس لڑکی کو اور زیادہ بدحواس کر دیا۔ اندھیرے نے اس کی عمر کو بہت پیچھے لے جا کر پھینک دیا۔ عمر کے اس اندھیرے میں وہ کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھنے کی حالت سے دوچار ہونے لگی۔ فینڈ کی تاریکی میں خواب اتنا نہیں سمجھا جتنا کہ جاتی آنکھوں کا اندھیرا آہستہ آہستہ سمجھا رہا ہے۔

وہ بہت دیر تک اس اندھیرے سے الجھتی رہی جو ظالم بھی تھا اور مہمان بھی تھا اور بھی لگا تھا اور ذم کو چومتا بھی تھا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے اڑتا جا رہا تھا۔ اچانک ہی شوکیس کے پاس گزیر ہوئی۔ ایک چمٹا کے سے شیشہ ٹوٹ گیا انہوں نے سراٹھا کر دیکھا تو مگھری تاریکی میں دو آنکھیں گھور رہی تھیں۔ وہ بلا تھا۔ پہلے شوکیس پر آکر کودا تھا پھر اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ کھانے کی میز کی طرف جا رہا ہے۔ احسن نے ہش کر کے اسے بھگا دیا تو وہ خورا ہی بھاگ گیا۔

مگر اس کے بھاگنے سے کیا ہوتا ہے شیشہ تو ٹوٹ چکا تھا۔ احسن نے اندھیرے صوفیہ کو ٹوٹل کر دیکھا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے رو رہی تھی۔ اس نے دہان



کل وہ اپنی بہن کو لے کر یہاں آئے گا۔ تم اسے دیکھ لینا۔“  
”اگر وہ پسند آئی تو؟“

”یہاں لڑکی پسند کرنے کا سوال نہیں ہے۔ اپنے اپنے بہنوئی پسند کرنے کی بات ہے۔ وہ اپنی بہن کے لیے تمہیں پسند کر چکا ہے۔ تم اپنی بہن کے لیے اسے پسند کر لو۔ اپنے ہاں سے یہ احقانہ خیال نکال دو کہ تمہاری زندگی میں فطلوں جیسی کوئی دولت مند ہیروئن آئے گی۔ خواب کچھ ہوتے ہیں زندگی کچھ اور ہوتی ہے۔“

خالد ماں کے پاس سے اٹھ کر چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس رات مزید اپنی ماں کے کمرے میں سوئی رہی اور جاگتی رہی۔ ماں نے اسے بتا دیا تھا کہ خالد اپنی ٹائلی کی بات سن کر خاموش ہو گیا ہے۔ صرف اس کے دماغ میں ایک الجھن ہے وہ یہ کہ لڑکی اسے پسند آئے گی یا نہیں؟ صوفیہ ہر کرٹ پر دعا مانگ رہی تھی کہ جس طرح احسن نے اسے پسند کیا ہے اسی طرح خالد بھی اس کی بہن کو پسند کر لے۔

دعا مانگتے مانگتے صبح ہو گئی۔ اس روز خالد ڈیوٹی پر نہیں گیا۔ شاید وہ احسن کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس سے باتیں کرنے سے پہلے اس کی بہن کو دیکھنا چاہتا تھا۔ وقت گزرنے کتنی دیر لگتی ہے۔ شام کو احسن اپنی بہن کو لے کر ان کے دروازے پر آگیا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تو صوفیہ اور خالد کی آنکھیں بھی کھلی کھلی رہ گئیں۔ احسن کے ساتھ اس کی بہن زیدہ کھڑی ہوئی تھی اور وہ اپنے دوپٹے کو اپنے چہرے پر کھینچ کر ایک آنکھ کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ خالد کے دل میں آیا کہ وہ اسی وقت چیخ چیخ کر کنا شروع کر دے۔ نہیں میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔ میرے خوبصورت فلمی خوابوں کا اس طرح مذاق نہ اڑاؤ۔“

مگر وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی اپنی بہن لنگراتی ہوئی اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ احسن نے اپنی بہن کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لاتے ہوئے کہا۔

”یہ میری بہن زیدہ ہے۔ یہاں اس مکان کے سامنے آکر یہ اک دم سے گھبرا گئی تھی اور اندر آنے سے انکار کر رہی تھی۔ میں نے ڈانٹ ڈپٹ کر پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ یہاں پہلے بھی آچکی ہے۔ تعجب ہے آپ لوگوں نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی؟“

بوڑھی ماں نے زیدہ کو یہاں آتے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے پہلے بیٹے کو سوالیہ نظروں

دیکھا۔ اس کے بعد صوفیہ کو دیکھا تو وہ جھجکتی ہوئی ہوئی۔

”اگر یہ وہی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا۔ یہ بھائی جان کے ساتھ یہاں آئی۔“

”بہن بی بی احسن نے چونک کر پوچھا۔

”زیدہ تم خالد کے ساتھ یہاں آئی تھیں؟“ پھر اس نے خالد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیوں آئی تھی؟ تم کب سے میری بہن کو جانتے ہو؟ تم کس رشتے سے اسے یہاں لائے؟“

خالد نے کہا۔ ”حسن تم جابار خانہ انداز میں سوالات نہ کرو۔ تمہاری بہن اپنی مرضی سے ساتھ آئی تھی۔“

زیدہ نے چونک کر سر اٹھایا اور شکایت بھری نظروں سے خالد کو دیکھنے لگی۔ وہ زبان بکوند کہ مکی مگر اس کی نظرسں کہہ رہی تھیں۔ ”خالد مجھ اکیلی کو الزام نہ دو۔ یہاں ہم صرف میری مرضی نہیں، ہم دونوں کی مرضی تھی۔ اگر ہم نے کوئی جرم یا گناہ کیا ہمارے جرم یا گناہ گار ہیں۔“

حسن نے کہا۔ ”خالد! تیری دونوں باتوں سے بھجتی ہے۔ تم دونوں ہی اس بات کے کہ ہو۔ زیدہ میری بہن ہے۔ میں اس سے سوال جواب کروں گا مگر تمہاری ماں کا ہے کہ وہ تمہارا محاسبہ کرے۔“

انے دونوں کے درمیان آکر کہا۔ ”میں سمجھ گئی۔ تم دونوں بات نہ بڑھاؤ۔ جو پاس پر مٹی ڈالو۔ میں زیدہ کو اپنی بہن بناؤں گی۔“

زیدہ نے شرما کر منہ پھیر لیا۔ خالد نے پریشان ہو کر کہا۔

”اگر میں اپنی شادی کا فیصلہ آپ کروں گا۔“

”بھڑک رہی فیصلہ کرو۔“ ماں نے کہا۔

”مگر ذرا صبر سے کام لیں۔ پہلے میں احسن سے تمہاری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

حسن نے کہا۔ ”میں تیار ہوں۔ باتیں کرنے کے لیے یہ گھر مناسب ہو گا یا ہم باہر آئیں؟“

انے سمجھایا۔ ”گھر کی بات گھر ہی میں ہونا چاہیے۔ میں صوفیہ اور زیدہ کو لے کر

لاہن کی توہین برداشت نہ کر سکا۔ اس نے اچھل کر خالد کے سینے پر ایک لات مار دی۔ خالد لڑکھڑاتا ہوا پیچھے صوفہ پر جا گرا۔ پھر صوفہ کے ساتھ دوسری طرف الٹ گیا۔ ان چلاٹنگ لگا کر اس پر آیا اور اسے اپنے نیچے دبوچ کر اس کے منہ پر گھونسا مارتے ہوئے نکلا۔

”بلد خوف تیری، بمن بھی ایک کھوٹا سکھ بن گئی ہے۔“

”تو جوت بوتا ہے اپنی بمن کی بے حیائی چھپانے کے لیے میری بمن پر کچھ اچھا لگا رہا ہے۔“

”یہ کتنی ہی اس نے احسن کو اپنے اوپر سے اچھا لگا دیا۔ وہ الٹ کر فرش پر آیا تو خالد اس پر سوار ہوتے ہی تباہ توڑ گھونٹے مارنے کے بعد نکلا۔“

”میں تجھے اچھی طرح سمجھ گیا ہوں میں تیری بمن سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔ اس اب تو بارہا ہر جا کر میری بمن کو بدنام کرے گا مگر میں تجھے یہاں سے زندہ نہیں جانے دوں گا۔“

اس نے جب کہ احسن کی گردن دبوچ لی۔ احسن کے ہاتھوں میں بھی اس کی گردن پکڑ لی۔ دونوں زور لگانے لگے۔ دونوں شدہ زور تھے کوئی کسی سے کم نہیں تھا۔ کبھی احسن ہاتھ اٹھا کر اسے گرا دیتا تھا کبھی وہ احسن کو زیر کر دیتا تھا۔ اس نے فیصلہ کرنے کے لیے آدھ بائیں جانب دھکا دیا اور فیصلہ بازوں کی قوت سے ہو رہا تھا۔ دونوں کے منہ اور ناک سے راتے لگا تھا۔ آنکھیں وحشیوں کی طرح ابلی پڑ رہی تھیں اور کپڑے تار تار ہو رہے تھے۔

دھرم منٹ کی لڑائی میں وہ دونوں نڈھال ہو کر لڑکھڑانے لگے۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر ایک دوسرے پر حملہ کرنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ اب صرف زبان چل رہی تھی۔ احسن نے اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

”تم مجھے ہو کہ گھر سے باہر جا کر ملازمت کرنے والی لڑکیاں بد چلن ہو جاتی ہیں۔ میں ان کی طرح نہیں چاہتا۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جہاں ہمارے قدم پہنچتے ہیں وہاں لڑکیوں کو ہراساں کرنے میں پڑ جاتی ہے۔ تم نے اپنی صوفیہ کو برسوں سے اس گھر کی چار دیواری کے نیچے لٹائی کی طرح سنبھال کر رکھا تھا مگر میرے قدم یہاں پہنچ گئے۔ دیکھ وہ شوکیس

پڑوسن کے ہاں تو وہ گھٹنے کے لیے چلی جاتی ہوں اتنی دیر میں تم دونوں آپس میں کھڑا کر لو۔ آؤ لڑکیو! میرے ساتھ چلو۔“

وہ صوفیہ اور زیدہ کو لے کر ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی خالد نے آگے بڑھ کر دروازے کو بند کر دیا مگر چٹنی نہیں چڑھائی۔ پھر وہاں سے پلٹ کر نکلا۔

”احسن! شادی بیاہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ شادی کے بعد مرد ہمیشہ کے لیے ایک عورت کے ساتھ بندھ جاتا ہے لہذا خوب سوچ سمجھ کر کسی کو اپنا بنانا چاہیے۔ پلانہ بتاؤ کہ تم نے صوفیہ کو کس حد تک شریک حیات کے قابل سمجھا ہے۔“

احسن نے جواب دیا۔ ”مگر وہ شریک حیات بننے کے قابل نہ ہوتی تو آج میں لڑکھڑاتا نہ آتا۔“

”تم رشتہ مانگتے نہیں۔ سو بے بازی کے لیے آئے ہو۔“

”یہ بھی درست ہے لیکن سو بے بازی کے لیے بھی پہلے یہ ضروری ہے کہ سواہاں آجائے۔ لہذا میں نے پہلے صوفیہ کو پسند کیا ہے۔ اس کے بعد حالات سے مجبور ہو کر چلا۔ کاسودا کر رہا ہوں۔ اب تم بتاؤ۔ کیا زیدہ کو اپنی شریک حیات نہیں بناؤ گے؟“

”میں اسے اپنی بیوی بناؤں گا جس کا چال چلن اچھا ہوگا۔ تمہاری بمن ہر روز گھر سے باہر ٹیکسری میں کام کرنے جاتی ہے۔ آج سے چار دن پہلے وہ میرے ساتھ یہاں آئی تھی اس سے پہلے وہ نہ جانے کتنوں کے ساتھ۔۔۔۔۔۔“

بات مکمل ہونے سے پہلے ہی احسن نے اس کے منہ پر ایک لٹا ہاتھ رید کرنا ہوئے کہا۔

”بس۔ اس سے آگے میری بمن کو گالی نہ دے۔ ہم مردوں کی یہ پرانی عادت ہے کہ جب کسی لڑکی کو بدنام اور ذلیل کرتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ خود بھی اس کے ساتھ ذلت کی پستیوں میں گر چکے ہیں۔“

خالد نے جواباً ایک گھونسا اس کے منہ پر جماتے ہوئے کہا۔

”مرد ہر حال میں شریف کہلاتا ہے۔ عورت ایک ذرا سی لغزش کے بعد فاش لڑکی ہے۔ ہر شخص ایک گھر اور چمکتا ہوا اسکے چاہتا ہے اور تمہاری بمن ایک گھر دار ہے۔“

”ہرے کیا ہو گیا تم لوگوں کو؟ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟“

موند ڈرتی ہوئی احسن کے پاس گئی۔ زبیدہ خالد کے پاس پہنچ کر اپنے دوپٹے سے اپنے چہرے کے لہو کو پونچھنے لگی۔ وہ دونوں تھوڑی دیر تک قہقہوں کے شور میں اپنی من کھپاتے رہے پھر احسن نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ خالد نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے لگے۔

”فصل ہو گیا۔ ہم ٹوٹے ہوئے دلوں اور ٹوٹے ہوئے شیشوں کے میجا بنیں گے۔“

”نہ شیشہ گری ہمیں آواب زندگی سکھا دے۔۔۔۔۔“



خالی ہے۔ کالج کی گزیا ٹوٹ چکی ہے۔“

خالد نے غصہ سے کہا۔ ”غافل نہ کرو۔ اگر تم سچے ہو تو ثبوت پیش کرو۔“

”میں گواہ پیش کر سکتا ہوں اور وہ گواہ تمہاری ماں ہے۔ وہ صوفی کو میرے پاس بھڑا کر پڑوسن کے ہاں گئی تو اچانک بجلی ٹپل ہو گئی اور ہم بیس منٹ کے اندر چہرے میں ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔“

خالد نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر ہونٹوں کو سختی سے بھیجنے لیا۔ احسن نے کہا۔ ”اگر تم ڈھٹائی سے انکار کرنا چاہو تو کر سکتے ہو مگر حقیقت نہیں بدلے گی۔ ہم نہیں شکن نہیں، شیشہ شکن ہیں۔ عزت کے شیشوں کو توڑتے ہیں معاشرے کے ایک گوشے میں ہم کسی کی ہمن کو درغلا کر لے جاتے ہیں تو دوسرے گوشہ میں کوئی ہماری ہمن کو لے جاتا ہے۔ ارے اب تو اس شرمناک سچائی کو تسلیم کر لو۔“

خالد ڈنگا گاتے ہوئے قدموں سے شوکیس کے پاس گیا۔ اور لڑکھڑا کر گر پڑا اور شوکیس سے نیک لگا کر بیٹھ گیا۔ احسن بھی قریب آکر شوکیس کا سہارا لیتے ہوئے فرش پر ڈانوا ہو گیا اس کے بعد کہنے لگا۔

”تھک کر گر جانے سے بات نہیں بنے گی۔ اگر تم سچائی سے انکار کرو گے تو ہم دونوں کی ہمیں اپنے اپنے گھروں میں بیٹھی رہ جائیں گی۔ اندھیرا اور بڑھے گا، برائی اور پھیلے گی۔ ہم برائی کو ختم نہیں کر سکتے مگر اسے اپنی حد تک روک سکتے ہیں۔ ہم نے جن شیشوں کو توڑا ہے، انہیں اپنے طور پر جوڑ سکتے ہیں۔ ان کی میچائی کر سکتے ہیں۔“

خالد نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”ہاں۔ ایک بار صوفی نے کہا تھا کہ دل ہو یا کالج کی گزیا، انہیں توڑنے کے بجائے

سنبھال کر رکھنے کا نام زندگی ہے۔“

اسی وقت ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا۔ بوڑھی ماں، صوفیہ اور زبیدہ کمرے میں داخل ہوتے ہی گھبرا گئیں۔ صوفیہ اٹھنے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے دو شوکیس کے پاس خالد اور احسن کے چہرے اپنے اپنے لمبو میں بھیک رہے تھے۔ ان کے لباس تار تار ہو چکے تھے اور بالکل ہی پاگل نظر آ رہے تھے۔ پھر وہ دونوں ہی پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگے۔ ماں نے قریب آکر پریشانی سے پوچھا۔

## جزیرے کی چاندنی

محبت کی ایک ایسی دردناک کہانی  
جسے آپ آنکھوں سے نہیں  
زبانوں سے نہیں، صرف دل  
کی دھڑکنوں سے پڑھیں گے۔



ہاں سے کھڑا جاتے ہیں۔ وہ پاگل ہے، پاگل کے منہ کون لگتا ہے۔ وہ آپ ہی دوڑتا اور آپ ہی کرتا ہے۔ ریت میں دھنستا جاتا ہے اور اٹھتا جاتا ہے پھر لو کھلا کر ادھر ادھر اہے بکھ بکھ میں نہیں آتا ہے تو سپیاں اور گھونگھے اٹھا اٹھا کر نئے جزیرے کی باہل بھٹکتا ہے جیسے رجو اور تراب کو نشانہ بناتا ہو یا چاند پر خاک اڑا رہا ہو کسی کا نہیں بگڑتا وہیں ٹھک ہار کر اوندھے منہ گر پڑتا ہے۔

## جزیرے کی چاندنی

ہم نما جزیرہ ساحل سے دور ہے۔ دراصل وہ جزیرہ نہیں ہے سوگز کے رقبے میں ہوئی ایک چٹان ہے جو سمندر کی پتیلی پر ابھرتی ہے۔ جب سمندر شانت ہوتا ہے تو ہر سکون دہتی ہیں تو چاندنی راتوں میں پتیلی پر ابھرتی ہیں چشتیاں سمندر میں ڈال دیتے اور اپنی غورنوں اور بچوں کے ساتھ وہاں جا کر زندگی کی کچھ خوشیاں چرا لیتے ہیں ایک بے کے ساتھ چنے بولتے ہیں اور سمندر اور انسان کے صدیوں پرانے رشتوں کے بات گاتے ہیں۔

ایسا کوئی نہیں ہوتا لیکن کبھی کبھی جو اربھاء کے وقت لہرس غضب ناک ہو جاتی ہیں۔ رات کی بلندی تک اڑتی اور بھرتی ہوئی آتی ہیں اور اس چٹانی جزیرے کو تھوڑی دیر لے لگ جاتی ہیں۔

طرا اور پھیرے سمندر کے مزاج کو سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کب جو اربھانا کی ہاں جزیرے کو لے ڈوبتی ہے اور کب لہرس شانت ہو کر انہیں خوشیاں منانے کے جزیرے میں آنے کی اجازت دیتی ہیں۔

اس وقت بھی سب کے دل دھڑک رہے ہیں۔ لہرس رفتہ رفتہ بلند ہو رہی ہیں اور جزیرے کی اونچائی کو چھو رہی ہیں۔ رجو جوں کی توں اپنے تراب کے شانے سے سر ٹپ رہے۔ سمندر غرا رہا ہے، تراب اپنی رجو کی آنکھوں میں جھانک رہا ہے اور چاندنی

جہاں پر رکھی ہوئی کشتی ایک پھری ہوئی لہر کی زد میں آکر الٹ گئی ہے اور وہ لہرو محبت لہا لہا کو جھجھوٹی ہوئی دوسری طرف چلی گئی ہے۔

لہرو کجاواہیں آجا۔ اب کوئی تیرے پیار کے راستے کا پتہ نہیں بنے گا۔ تراب تو ہاں سمندر کے مزاج کو سمجھتا ہے۔ ضد نہ کر، اپنی محبت کو لے کر آجا۔ اب یہ دینا

جب پورے چاند کی رات ہوتی ہے اور دودھیا چاندنی میں بیٹھتی ہوئی سمندر کی لہریں ساحلی چٹانوں سے ٹکرانے لگتی ہیں تو بستی کے لوگ حیرانی اور عقیدت سے اس نئے جزیرے کی جانب دیکھتے ہیں، جہاں وہ دودھیلی ہوئی رو میں آج بھی آکر ملتی ہیں اور بچے والوں کی نگاہوں کے سامنے کبھی یقین کی طرح مستحکم اور کبھی گمان کی طرح نیم نم ہونے جھلکتی جھلکتی رہتی ہیں۔

کوئی بانکا جوان مایہ گیر ہاتھ اٹھا کر انگلی کے اشارے سے کہتا ہے۔  
”وہ دیکھو تراب نظر آ رہا ہے۔ وہ چٹان پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ تراب ہے۔“

کوئی البیلی پھیرن اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہے۔  
”ہاں میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ رجو اس کے شانے سے سر نیچے بیٹھی ہوئی ہے اگر کھلی ہوئی زلفیں ہوا میں لہرا رہی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو محبت سے دیکھ رہے ہیں۔ چاندنی آہستہ آہستہ ان کی آنکھوں میں اتر رہی ہے۔“

”یہ جھوٹ ہے“ منگو جھٹکا ہے۔ اس لیے جھٹکا ہے کہ رجو اس کے ہاتھ سے اپنے گم گئی ہے جیسے اناڑی پھیرے کے ہاتھ سے پھیلی ترپ کر نکل جاتی ہے۔ سب اسے ہاتھ سمجھتے ہیں اور وہ جھج پھانگوں کی طرح جھٹکا ہے۔

”تم سب جھوٹے ہو۔ رجو کا نام لے کر مجھے جلاتے ہو۔ ستاتے ہو۔ میں جانتا ہوں۔“  
مرچکی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس چٹان سے اس نے چھلانگ لگائی۔ میری آنکھوں کے سامنے ڈوب گئی تھی۔ وہ مرچکی ہے۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ بھاگ جاؤ۔

وہ ساحلی ریت پر لڑکھڑاتے ہوئے دوڑتا ہے۔ انہیں مارنے کے لیے ہاتھ اٹھا رہا ہے۔

اہلِ دالے کے لیے نکل جاتے تھے۔ صبح ہوتے ہی وہ پھلیوں سے بھری ہوئی کشتیاں لڑا لہیں آتے تو ساحل پر اچھا خاصا میلہ لگ جاتا تھا۔ شہر سے آنے والے پھلیوں کے تھیلے بڑے ٹرکوں میں آتے تھے۔ پھلیوں کا سودا ہونے انھیں تولنے اور ٹرکوں میں لے کے دوران بڑی گھما گھمی رہتی تھی۔ پان سکرٹ، چائے اور شربت وغیرہ کی عارضی دکانیں کھلیا کرتی تھیں۔ شہر کے لوگ کھرے دام دے کر چیزیں خریدتے اور مزدوروں کو محض اجرتیں دیا کرتے تھے۔ رجو کی چچی بھی دوسری عورتوں کے ساتھ مزدوری کرتی تھیں۔ انھیں کامل اشاکر ٹرکوں پر لادنا پڑتا تھا۔

اس کا چچا جب سو کر اٹھتا اور اپنی جھکی سے باہر آتا تو اس وقت ساحل دیران ہو جاتا۔ رات پر گاڑیوں کے سپروں کے نئے نئے نشانات رہ جاتے تھے۔ دور پھیلنے والے بچے دریا کی اہلوں سے کھیلنے رہتے۔ کسی جگہ رجو لڑکے اور لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی ریت کے دھڑے بناتی رہتی اور جھکی کے باہر اس کی چچی پھلیوں میں نمک بھر کر انیس دھوپ میں لپکتی تھی۔ روز کا یہی معمول تھا۔ اس کی چچی محنت کرتی تھی اور چچا بیٹھ کر کھاتا تھا۔

رجو کا ایک چچا زاد بھائی تھا۔ وہ بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اس کی چچی غریبہ تھا کہ اگر حضرت لال شہباز قلندر اس کی نہ سنتے تو بیٹا کبھی پیدا نہ ہوتا چونکہ وہ فلاں مانگا ہوا تھا اس لیے اسے منگو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

رجو سے اس کی کبھی نہ بنتی تھی وہ نفرت سے کہتی تھی۔

منگو بھاننے والے کو کہتے ہیں تو بھیک منگا ہے۔

وہ اس کی چچی سمجھتی نہ کرتا۔

”بھیک منگو تھی جو میرے گھر میں رہتی ہے اور میرے گھر میں کھاتی ہے۔“

وہ بچپن ہی سے بڑی حساس تھی کبھی چچی بھڑکتی اور چچا سے مارا تو اسے اپنی بد نصیبی اور خیال کا احساس ہونے لگتا تھا۔ منگو ان کا بیٹا تھا اسی لیے اس کی ہر شرارت قابلِ معافی نہ تھی کہ اس کی بیٹی نہیں تھی اس لیے سب ہی اس پر اپنا غصہ اتارتے تھے ایسے وقت وہ منہ باندھ کر زب کے پاس آکر بیٹھ جاتی تھی اور اسے اپنا دکھڑا سناٹے لگتی تھی۔

”جب میں چچی کی طرح بڑی ہو جاؤں گی تو میں بھی مزدوری کروں گی۔ اپنا کھانا خود کھاؤں گی۔ ان کی ہانڈی میں جھانکنے تک نہیں جاؤں گی۔ اوندھ اور اساکھلاتے ہیں اور دنیا

والے تجھے کچھ نہیں کہیں گے۔

گمراہ دونوں خاموش ہیں اور سمندر بول رہا ہے۔ گرج گرج کر بول رہا ہے۔

اہلوں کے دوسرے ریلے میں کشتی کے پرچے اڑ گئے ہیں۔

لہریں اونچی اور اونچی ہو رہی ہیں اور ان کے سروں پر بکھر رہی ہیں۔ پانی کے جھپٹل اور شفاف بوندوں کی جھاروں میں ان کا وجود جھل جھل ہو رہا ہے۔ چاندنی میں بھگ رہا ہے اور لہروں میں پھسپ رہا ہے۔

لہریں بلند ہو گئی ہیں۔ اتنی بلند ہو گئی ہیں کہ وہ چٹانی جزیرہ کسی آڑھے سے منہ میں ڈال گیا ہے۔ اب کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ دیکھنے والوں کی سانسیں چند ساعت کے لیے رک گئی ہیں۔

لہریں دایاں جاری ہیں اب جزیرہ بھکاری کی پھلی ہوئی ہتھیلی کی طرح خالی ہے۔ ہار چمک رہا ہے، چاندنی دیران جزیرے پر بھٹک رہی ہے انھیں تلاش کر رہی ہے۔ کہاں ہوں؟

چاند کے نیچے چاندنی اور سمندر کی تہ میں محبت ہے۔

دیکھنے والوں کے سر جھک گئے ہیں۔ اب وہ آہستہ آہستہ بوجھل قدموں سے واپس جا رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں خواب ہیں اور دلوں میں یقین ہے کہ اگلے صبح چور ہویں گا چاند کھلے گا تو زاب اپنی رجو کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر پھر اس جزیرے میں آئے گا ضرور آئے گا۔

سمندر تو انسانوں کو بہا کر لے جاسکتا ہے لیکن محبت کو کبھی نہیں ڈبو سکتا۔ اگلے ماہ۔۔۔ ہاں اگلے ماہ۔۔۔



بچے عام طور سے پہلے اماں اور ابا بولنا سیکھتے ہیں لیکن رجو کی زبان پر پہلے چچا اور چچا کا نام آیا کیونکہ جب اس نے آنکھ کھولی تو اماں باپ مر چکے تھے اور زبان کھولی تو پکارنے کے لیے صرف چچا اور چچی ہی رہ گئے تھے۔ بہتی کے دوسرے لوگوں کی طرح اس کا چچا بھی غریب تھا۔ غریب اس لیے بھی تھا کہ محنت سے جی چراتا تھا۔ رات کو اونیوں کی ہنگ میں رہتا تھا اور صبح دیر تک سو رہتا تھا۔ دوسرے پھیرے آدھی رات کو کشتیاں لے کر سمندر

بھری باتیں سناتے ہیں۔“

”تم ایک دہلی پتلی کمزور لڑکی ہو، تم سے مزدوری نہیں ہوگی۔ جب میں اپنے باپ کی طرح بڑا ہو جاؤں گا تو سمندر میں مچھلیاں پکڑنے جاؤں گا پھر وہ مچھلیاں بیچ کر اتنے سارے پیسے لاکر تمہیں دوں گا۔ تم میرے لیے کھانا پکاؤ گی؟“

”ہاں پکاؤں گی۔“

”میرے گھر میں رہو گی؟“

”ہاں رہو گی۔ تم میرے چچا اور چچی کی طرح مجھے مارو گے تو نہیں؟“

”کبھی نہیں۔ کیا میں نے آج تک تم سے کبھی لڑائی کی ہے؟“

”نہیں۔ تم بہت اچھے ہو۔“

وہ سب بچپن کی باتیں تھیں۔ دس برس کی رجو یہ نہیں جانتی تھی کہ ان باتوں کے پیچھے پیار کی کتنی محاسن ہے۔ وہ محض چچا اور چچی کے ظلم سے اور اپنی بیٹی کے دکھ سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ایسے وقت تراب ہی اس کو ایک بھر دور اور مہربان نظر آتا تھا۔ تراب کی یہ بھڑادی اور اس سے بڑھتا ہوا میل جول منگو کو برا لگتا تھا۔ وہ اپنی ماں سے شکایتیں کرتا تھا کہ رجو اس کے ساتھ نہیں کھیلتی اور ہمیشہ اس سے لڑتی جھگڑتی رہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بچپن ہی سے اس پر سختی ہونے لگی کہ وہ تراب کی جھکی کی طرف نہ جایا کرے اگر تراب کھیلنے کے لیے آئے تو اسے منگو کو بھی اس کھیل میں شریک کرنا چاہیے۔

تراب پندرہ برس کا ہوا تو اپنے باپ کے ساتھ سمندر میں جانے لگا۔ رجو تھوہریں کی ہوئی تھی دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی ہلکی پھلکی مزدوری کرنے لگی تھی۔ تراب سمندر سے واپس آتا تو وہ اس کی کشتی سے ڈوگری میں مچھلیاں بھر کر ٹرک میں لادنے کا کام کرتی۔ اس کے ساتھ مل جل کر جال کو دھوپ میں پھیلاتی، جال کی کوئی ڈور کمزور ہو جاتی تو اسے درست کرنے بیٹھ جاتی۔ تراب کا باپ اسے دوسروں سے زیادہ پیسے اور زیادہ مچھلیاں دیا کرتا تھا آہنی بڑھنے دیکھ کر چچی اس سے محبت سے پیش آنے لگی۔ کچھ ہی دنوں میں کا پلٹ گئی اب وہ منگو کو باتیں سنایا کرتی تھی کہ وہ باپ کی طرح گھنٹوں سے صبح مزدوری کرنے کے بجائے ٹرک والوں سے باتیں کرنا ہے اور ان سے سکرےٹ ٹانگ کر بیٹا ہے۔ منگو کو مامی گیری کے پیشہ سے نفرت تھی۔ سمندر کی غضب ناک لہروں سے کھینا

لہرات چڑھ جاتے رہتا اور مچھلیوں کی بساند میں زندگی گزارنا اسے بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ لڑکی بننا چاہتا تھا وہاں آنے والے شہریوں کی طرح اچھے اچھے کپڑے اور جوتے پہننا ہوتا تھا۔ یہی سنے دیکھتے دیکھتے ایک روز وہ بستی سے چپ چاپ چلا گیا۔ ماں نے سمجھا کہ بیٹا لڑکی بن چکا ہے۔ ماں نے اسے شام تک بھوک لگے کی تو آپ ہی واپس نہ لے گا۔ شام ہو گئی رات گزر گئی۔ دوسرے دن بھی بیٹے کی صورت نظر نہ آئی تو اس نے دبا ہوا شروع کر دیا۔ بستی والے بھی حیران تھے کہ وہ اچانک کہاں غائب ہو گیا ہے؟ پھر ایک ٹرک ڈرائیور نے اسے بتایا کہ منگو اس کے ساتھ اس وعدے پر کراچی گیا کہ دوسرے دن پھر اس ٹرک میں واپس آجائے گا مگر کراچی پہنچ کر وہ ٹرک ڈرائیور سے ملنے سے بغیر کہیں چلا گیا اور جاتے جاتے ڈرائیور تک سیٹ کے نیچے سے اس کے ججے ہوئے پچاس روپے چرا کر لے گیا ہے۔ اس کی ماں نے چھاتی پیٹ کر رونا شروع کیا۔

میرے بچے کو کھی ڈھونڈ کر لاؤ، میں ہر ماہ تمہیں دس روپے دے کر تمہارے پچاس روپے لو کر دوں گی۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔

”مائی میں اپنے روپے کے لیے خود ہی اسے تلاش ہوں مگر وہ بہت بڑا شہر ہے۔ یہ جو نورد کچہری ہو، وہاں اس سے بھی بڑا شہر ہے، سمندر میں چھپی ہوئی مچھلیوں کو پکڑنا آسان نہ کرنا پڑے گا۔“

رجو نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ اللہ کرے وہ ہمیشہ کے لیے کہیں گم ہو جائے اور کبھی اسے جیسے جیسے دن مینے اور سال گزرنے لگے اسے یقین آتا گیا کہ اس کی دعا قبول نہیں ہے۔ منگو ابھی کا راستہ بھول گیا تھا یا وہ بڑا آدمی بننے میں مصروف تھا۔ اس عرصے میں اس کی چچی اپنے بیٹے کا انتظار کرتے کرتے اس دنیا سے چل بسی۔

نئی برسوں کے دوران رجو آہستہ آہستہ چودھویں کے چاند کی طرح مکمل ہو گئی۔ اب وہ اپنی چچی کی طرح محنت کرتی تھی۔ بستی کے لوگ برسوں پہلے کی دہلی پتلی سی رجو بن چکے تھے۔ عمر کے اس نئے موڑ پر اس کا روپ رنگ کھڑا جا رہا تھا۔ جب وہ لہلوں سے بھری ڈوگری اٹھا کر چلتی تو اس کے جسم میں آپ ہی آپ لہروں کا سالوچ اور اٹھنا۔ محنت ایسی جاذب نظر تھی جیسے وشال سمندر کے خزانے چھپائے پھر رہی ہو۔

کی گلی میں تاش کھیننے والے نوجوانوں میں سے کوئی نوجوان ترپ کا پتہ پھینک کر  
 لہ زب ہمارے ہاتھ میں ہے اور جیت تراب کی ہو رہی ہے۔ آج رجو اس کے ساتھ  
 لگا کر پڑے پر گئی ہے جسکی کچھ بھی کہو۔ وہ برا خوش نصیب ہے ہم رجو پر جان دیتے ہیں  
 اور اس پر جان دیتی ہے۔“  
 کی درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے بوڑھوں میں سے کوئی چلم کا کش لگا کر کہتا۔

بے جانی ہے۔ ان کا کیا رشتہ ہے کہ وہ اتنی آزادی سے گھومتے پھرتے ہیں کبھی  
 ٹھکی کر جاتے ہیں کبھی ساحل پر گھومتے ہیں اور کبھی چٹانی جزیرے پر جاتے ہیں یہ تو کھلی  
 پاجانی ہے انہیں دیکھ کر ہمارے جوان بچے بھی سنکے گئیں گے۔

اس کی باتیں سن کر کچھ لوگ تائید میں سر ہلاتے تھے اور کچھ لوگ رجو اور تراب کی  
 بات کرتے تھے۔ ان کی حمایت کرنے میں بھی ایک مصلحت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ رجو  
 اور تراب ایک دوسرے سے محبت کریں مگر شادی نہ کریں شادی سے پہلے شہر و شکر  
 جانے والوں میں اکثر تنزیاں پیدا ہو جاتی ہیں، ایک دوسرے سے بے زاری بڑھ جاتی  
 ہے اگر رجو تراب سے بے زار ہو گئی تو کسی دوسرے چاہنے والے کے نصیب جاگ  
 جائے گا۔

لیکن بیمار آخر بیمار ہی ہوتا ہے، مچھلی کا بیمار نہیں ہوتا کہ گاہک بدلتے جائیں۔ رجو  
 اپنی زندگی کی تمام سائیں تراب سے منسوب کر چکی تھی اسی لیے تراب کی کشتی کے سوا  
 کسی دوسرے کی کشتی پر مزدوری کے لیے نہیں جاتی تھی۔ جب وہ کشتی لے کر جال ڈالنے  
 کے لیے نکل جاتا تو وہ سیدھی لالہ کی دکان پر آتی اور اس کے دروازے پر دستک دیتی۔ روز  
 بھر معمولی خاص کی دستک سنتے ہی لالہ کی بیوی بیڑی ہوتی ہوئی دروازہ کھولتی۔

اچھی کھنت نیند حرام کرنے جب ساری بھتی سوجاتی ہے جب ہم دکان بند کر دیتے  
 ہیں بی بی اسے تمباکو خریدنا یاد آتا ہے۔ اری تراب سے کیوں نہیں کہتی وہ دن کو خود ہی  
 اُڑا پنے لیے تمباکو خرید لیا کرے گا۔ رجو جواب دیتی۔ نہیں چاہتی! وہ خود سے خریدے گا  
 بہت زیادہ تمباکو پینے کی عادت ڈالے گا۔ میں تو حساب سے خریدتی ہوں اور حساب سے  
 لے بیٹے دیتی ہوں۔ دیکھو تا جب وہ سمندر سے آتا ہے تو کس بری طرح ہانپتا رہتا ہے۔  
 لہر رات لمبوں سے جنگ کرتے رہتا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ میں مانتی ہوں کہ وہ فولا دے

سمندر کے سینے پر جال پھینکنے والے نوجوان پھیرے اب اس پر اپنی نگاہوں کے جال بکے  
 لگے۔ شرے آنے والے پیواری اور ٹرک ڈرائیور گھوم بھر کر تراب کی کشتی کی جانب  
 آتے تھے اور رجو سے باتیں کرنے یا کچھ دیر تک اپنی آنکھیں سینکنے کا بہانہ تلاش کرتے  
 رہتے تھے۔ کسی میں اتنی جرات نہیں تھی کہ کوئی کھل کر اس کے سامنے اپنے دل کا پتہ  
 کہہ دیتا کیونکہ اس بے سارا لڑکی پر تراب کی نگاہوں کا پھرو تھا اور اس کے دل پر کچھ  
 سے اس جیلے کی محبت نقش ہوئی آئی تھی۔

تراب نے جوانی میں خوب اونچا اور بھرپور قد نکالا تھا۔ اس کا سینہ چٹان کی طرح ہوا  
 اور سمندر سے کھیننے والے بازو فولا دی طرح مضبوط تھے۔ رجو کی طرح اس کا رنگ ملا  
 نہیں تھا، سانولا تھا۔ جب وہ مچھلیوں سے بھری کشتی کھینچے ہوئے ساحل پر آتا تو پہلے  
 اس کا بدن تانبے کی طرح چمکنے لگتا تھا۔ مسلسل چپو چلائے کی وجہ سے اس کا سالن ہر  
 لگتا تھا۔ سینہ دھوئنی کی طرح چمکا رہتا تھا اور جسم سے مچھلیوں کی بسانہ آتی رہتی۔

شرے آنے والے ناک بھوں چڑھا کر رجو کی پسند پر تنقیدیں کرتے رہتے تھے۔  
 اپنی اپنی پسند اور اپنے اپنے دل کی دھڑکنوں کا فیصلہ ہوتا ہے۔ کوئی ہیرا پسند کرتا ہے اور  
 ننگر۔ سنا ہے انہی سنگروں نے مل کر تانبہ کی گود میں محبت کا ایک تاج عمل بنایا ہے۔  
 رجو پھول تھی اور تراب کا تاج پھول کو نہیں پہنتا بلکہ دیکھنے والوں کی آنکھوں  
 کھٹکتا ہے۔ ایک نوجوان پھیرے شاکر نے رجو کے چچا کو اپنی مٹھی میں لینے کی کوشش کی۔  
 ”چاچا! رجو کو مجھے دے دو، میں تمہارے بڑھاپے کا بوجھ اٹھاؤں گا۔“

ایک شاکر ہی نہیں تھا کچھ اور بھی نوجوان اور بوڑھے تھے جو رجو کے چچا کا  
 برداشت کرنے اور ہر رات اس کے لیے لیون کا کوڑھ میا کرنے کے لیے ہمدرد تیار  
 مگر چچا رجو کا محتاج تھا اس کی کمائی پر پل رہا تھا لہذا اس کی پسند کے خلاف کوئی فیصلہ  
 کر سکتا تھا۔

رجو اور تراب کے پیار کا چرچا بھتی کی ہر گلی اور ہر گھر میں تھا۔ کوئی موت  
 پر دسوں میں بیٹھ کر کہتی ”بھی گھنٹہ بھر پہلے میں نے رجو کو نہ کھا ہے وہ تراب کے ساتھ  
 ایک ساحل کے موڑ کی طرف جا رہی تھی۔ ہائے دونوں ایک دوسرے کو کھتا چاہتے  
 انہیں دیکھ کر مجھے اپنی جوانی یاد آ جاتی ہے۔“

علو بنے نہ دیتی۔“

تراب نے پاپ سے ایک کش لیا پھر دھواں چھوڑنے کے بعد کہا۔ وہ واقعی طور پر ڈوبتا ہے اگر اصرار آتا ہے۔ وہ جزیرہ ہمیں سکھاتا ہے کہ محبت چٹان کی طرح اٹل ہو تو کبھی نہیں ڈوبتی۔ وہ واقعی ہے تو حالات کی لہروں میں شرابور ہو کر ٹکھڑا آتی ہے پہلے سے زیادہ شفاف اور کھلی میں جھلکتی ہے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے تراب۔ میری بڑی آرزو ہے کہ کبھی چاندنی رات میں وہاں جاؤں تاکہ نکلے یہ سینہ کی لہریں پاگل ہو جاتی ہیں ایسا کیوں ہوتا ہے؟

یہ قدرت کا کرشمہ ہے چاند کی کشش سے لہریں اس کی جانب بلند ہوتی ہیں لیکن زمین کش زیادہ ہے اس لیے وہ لہریں پھر نیچے آجاتی ہیں۔ لہریں ٹھنک کھلتی ہیں۔ چاند اور انہیں کھلنے سے کھینچ رہے ہیں۔ کھیل ہی کھیل میں ہمارے پیار کا وہ جزیرہ ڈوب رہا ہے۔ سوچا ہوں کہیں ہماری محبت بھی طوفانی لہروں میں نہ گھر جائے میں کل ہی اسے چاکا کے پاس جاؤں گا اور ان سے کہوں گا کہ ہماری شادی کی تاریخ بنی کر دیں۔“

رجو نے فطرت سے اس کے بازو کو تھام لیا۔ اسی وقت ایک بہت اونچی لہر چٹخ چلی آئی اور اس نے پیار کے اس جزیرے کو حرف غلط کی طرح نگاہوں سے مٹا دیا۔

رجو اپنے محبوب کے فیصلہ پر خوشی سے مسکرا رہی تھی اور اندر ہی اندر سمندر کی مائل و گہرا رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک وہاں کھڑے رہے اور دھیرے دھیرے پیار بھری باتیں کرتے رہے پھر وہ اپنی جھگیوں کی طرف واپس جانے لگے۔ ان کے سروں پر صاف و نہ نیلگوں آسمان کا سایہ تھا۔ قدموں تلے ٹھنڈی ریت چبھی ہوئی تھی۔ چاند رات کی آوازوں کے قریب جھٹکنے سے روک رہا تھا۔ تراب نے رجو کے ہاتھ کو ایسی مضبوطی اور ناکھٹے سے تھام رکھا تھا جیسے ملاح اپنے چوڑا کو اور ٹھیکہ دار جال کھینچنے کی ڈور کو تھامے۔ وہ رجو کو اس کی جھلی تک پہنچانے جا رہا تھا۔

ان کے سامنے ایک دہلا پتلا سا آبی اپنی دونوں ٹانگیں پھیلانے اور دونوں ہاتھ کر پر لٹائی شان سے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے دھاری دار چٹوان اور پھولدار فیض پسنی ہوئی۔ اس کی کھال سے خریدہ ہوا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ رجو کا کلیجہ دھک سے رہ گیا وہ

پھر بھی اسے زیادہ تہہ کا نہیں پتا چاہیے اس لیے میں اسے روکتی ٹوکتی رہتی ہوں۔ وہ اچھا ہے چاہی! میری ہر بات مان لیتا ہے، میری خوشی کو اپنی خوشی سمجھتا ہے، تم کو اچھی طرح جانتی ہو تم نے تو اسے گود میں کھلایا ہے۔“

”اے! رجو تو بولتی ہے تو بولتی چلی جاتی ہے۔ اری میں نے تو تجھے بھی گود میں کھلایا ہے۔ میں تم دونوں کو اچھی طرح جانتی ہوں دونوں ہی پاگل ہو۔ لے لے تمہا کو کی پڑا۔ اے! دکان بند کرنے سے پہلے ہی یہ زیادہ باندھ لیتا ہے کہ نہ جانے تو کس وقت آجھکے گی۔“

لالے کی بیوی ٹھیک ہی کہتی تھی۔ دوسرا پاگل تراب تھا۔ وہ بھی کسی رات اپنے دوست روضہ کے ہاں پہنچ جاتا روضہ کے آگن میں نیلے کے پھول کھلتے تھے اس کی بیوی ان پھولوں کو کبھی گہرے کی صورت میں اور کبھی ہار کی صورت میں گوندھ کر رکھتی تھی دروازے پر دستک سنتے ہی وہ بیڑیا پاتی ہوئی آتی۔ آگیا ہماری نیند حرام کرنے۔ ہزار بار کہتا کہ شام کو آکر پھول لے جایا کر۔ مگر دل غم میں تو مہوسہ بھرا ہوا ہے۔ تراب جواب دیتا ہے یہ بات کہیں ہے بھابی۔ آج رجو ذرا ناراض ہو گئی تھی مناتے مناتے یہ وقت ہو گیا ہے سے جلدی آیا کروں گا۔

تو جھوٹ کہتا ہے رجو کبھی ناراض نہیں ہو سکتی۔ روضہ کی عادت مردوں کو ہوتی ہے تاکہ ہم ہاتھ جوڑ کر انہیں منائیں اور ان کی خوشامد کریں مگر تجھ سے اب بحث کن کرے! یہ لے کجرا۔ آج اسے رجو کے ہاتھوں میں نہ پسانا۔ اس کے جوڑے میں لگانا نیلے کی یہ سفید کلیاں اس کے سیاہ بالوں میں خوب کھلیں گی۔

اس کی بھابی نے جپتے ہوئے وہ کجرا اسے دیا۔ پھر دعائیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دروازے کو بند کر دیا۔ وہ پورے چاند کی رات تھی۔ تراب رجو کو لایا ہوا تمباکو ایک بے ڈھنگے پائپ میں رکھ کر سلگا رہا تھا۔ رجو کے جوڑے میں نیلے کی سفید کلیاں مسک رہی تھیں رات خاموش تھی۔ چاند مسکرا رہا تھا اور وہ دونوں ساحل پر کھڑے ہوئے دور اس چٹانی جزیرے کو دیکھ رہے تھے جو لہروں کی مدد میں گہرا ہوا تھا۔

رجو نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا ”کیسی غصہ ناک لہریں ہیں کتنی بے دردی سے اس جزیرے کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہیں، ہم تاروں بھری رات میں وہاں جاتے ہیں جزیرہ ہمارے پیار کا شاہد ہے میرے بس میں ہوتا میں اسے طوفانی لہروں سے بچا لیتی۔ کبھی

منگو نے دانت پیٹتے ہوئے تراب کو دکھا۔ پھر رجو سے کہا ”چھاتو تم میرے باپ کا  
ایون کھلا کر اس کے ساتھ رنگ رلیاں مٹانے جاتی ہو۔ کیا تمہیں ہماری عزت کا راز نا  
خیال نہیں ہے؟“  
تراب نے غصہ سے کہا۔  
”غصوں باتیں نہ کرو منگو۔ رجو سے میرا رشتہ طے ہو گیا ہے تمہارے باپ سے  
منگوری دی ہے کل میں یہاں آکر شادی کی تاریخ مقرر کی کہوں گا۔“ اونہ! اس نے غارت  
سے کہا۔



”وہ ایونی بوڑھا کون ہوتا ہے منگوری دینے والا۔ میری ماں نے بچپن ہی میں مجھ سے  
کہہ دیا تھا کہ یہ میری بہو بنے گی۔“  
رجو نے اس کی طرف تھوکتے ہوئے کہا۔  
”ارے جا۔ بڑا آیا مجھ سے شادی کرنے والا۔ چور بد معاش، کل صبح وہ ڈرائیو  
گا اور تیری گردن پکڑے گا جس کے پچاس روپے چرا کر ہٹا گیا تھا۔“ منگو قہقہہ لگا۔  
لگا۔

اس کے روپے میں نے بہت پہلے دے دیئے ہیں۔ تراب جیسے مجھیرے کی طرح  
غریب نہیں ہوں۔ ہر ماہ سیکڑوں روپے کھاتا ہوں۔ کراچی شہر کا اے دن بس ڈرائیو  
اس وقت میری جیب میں دو ہزار روپے ہیں اتنے روپے کبھی تیرے باپ نے بھی نہ  
دیکھے ہوں گے۔ وہ ہاتھ بچا کر بولی۔  
میرے باپ نے نہیں دیکھے ہیں تو تیرے باپ نے کب دیکھے ہیں جا کر پوچھ لے  
سے۔ اس نے ایونی کی گولیوں کے سوا دنیا میں کچھ دیکھا ہی نہیں ہے تو کس رشتے پر  
باپ کا نام لے رہا ہے؟

تراب نے کہا ”رجو تم اس بے وقوف کے منہ نہ لگو۔ میں نے جیسے چاہا تھا کہ  
جنگل میں اس لفظ کے ساتھ رہو۔ چلو میرے ساتھ چلو۔ رجو کا ہاتھ پکڑ کر  
نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”فہو“ رجو کا ہاتھ چھوڑ دو۔ دیکھو تراب میں تم سے جھگڑا  
چاہتا۔ ورنہ تم نہیں جانتے میں بہت خطرناک آدمی ہوں۔“  
تراب نے غارت سے ہنسنے ہوئے کہا۔

”یاد پی اور کیا پی کا شربہ۔ ایک ہاتھ رکھ دوں گا تو زمین سے اٹھ نہیں سکے گا  
نہ تو راستہ روک کر دیکھ لے۔ میں رجو کو اپنے دست و منہ کے ہاں لے جا رہا ہوں  
نہ تک یہاں رہے گا رجو وہاں بھاگی کے ساتھ رہا کرے گی۔“ یہ کہہ کر وہ رجو کو ساتھ  
لے جانے لگا۔ منگو غصہ سے مٹھیاں جھنجھٹتے ہوئے پئی بے بسی سے تراب کے فولادی جسم  
اور کھاتا کہ اس کے ساتھ ٹکرانے کے نتیجے میں شکست اور شرمندگی کے سوا کچھ  
امکن نہ ہو گا۔ اس گنوار کو شہری جھکنڈوں سے مات دی ہو گی۔

بہن والوں کے لیے دو سراون بہت سی دلچسپ اور ہنگامہ پرور تھا۔  
رجو اور تراب کے دشمن خوشی کا اظہار کر رہے تھے کہ منگو واپس آ گیا ہے۔ تراب کی  
بہن کرنے والے اور رجو کی بھلائی چاہنے والے منگو کو نفرت سے دیکھ رہے تھے وہ شہری  
میں اینڈ آؤٹا پھر رہا تھا اور جب سے بڑے بڑے لوٹ نکال کر دکھاتے ہوئے کہہ  
تھا۔

”جب ہے اس بہن میں کسی کے پاس سو روپے کی ریز گاری نہیں ہے اب میں اتنے  
بٹ رکھ کر یہاں کیسے زندہ رہ سکتا ہوں اسی لیے تو میں یہاں نہیں آ رہا تھا مگر کجنت  
و کا خیال مجھے پہنچ لایا ہے۔ اے موسیٰ! تجھے یاد ہو گا میری ماں رجو سے میری شادی کرنا  
تھی۔ اے بابا تو نمازی ہے، دو سروں کو بھی نماز پڑھانا ہے تو جج جج کہہ دے میری ماں  
نہجے سے بھی کہا تھا کہ میرا اور رجو کا نکاح تو ہی پڑھائے گا۔“ ہاں تو ٹھیک کہتا ہے۔  
ی اور نمازی بابا نے اس کی تائید کی۔  
و بہن میں پھر رہا۔ ایمان والوں کو ایمان کا واسطہ دتا رہا۔ ضرورت مندوں کے  
ہاں میں دو چار روپے رکھتا گیا اور ایک سیاسی لیڈر کی طرح تمام لوگوں کو اپنے حق میں  
دینے کے لیے کانہ کرتا رہا۔ چھوٹی سی بہن میں کچھ ایسی ہی فضا قائم ہو گئی جیسے کوئی  
بلاست الیکشن ہونے والا ہو، صبح شام رجو، تراب اور منگو کے چرچے ہونے لگے۔  
پیرا میں، گلیوں میں، ساحل پر، مسند پر، بننے والی کشتیوں پر یہی ذکر تھا۔  
”رجو تراب کو چاہتی ہے تراب ہی سے شادی ہو گی۔“ رجو منگو سے منسوب تھی منگو  
نے ٹائی ہو گی۔

ان کی باتیں سن کر تھوڑی دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔ تراب کے حاجی آپس میں کھسر  
 لہنے لگے۔ منگو کے حاجی طنزیہ انداز میں مسکراتے تھے۔ ان کے منگو نے پی  
 سی سی جی چال چلی تھی۔ تیرہ برس کا احسان چکا ناچوں کا کھیل نہیں تھا۔ ایک بوڑھا  
 لہوے کی کوشش کر رہا تھا اور جس نے ایک بار جو سے شادی کا پیغام بھی بھیجا تھا  
 اس کے منہ سے کالیاں بھی سن چکا تھا۔ وہ منگو کی اس بات پر بڑا خوش ہوا۔ اس نے  
 راز داڑھی سرھلاتے ہوئے کہا "بچوں کی پرورش کی جائے تو ان سے حساب نہیں لیا  
 لیکن جو اپنی نہیں رہی، وہ حکم کھلا پرانی بن گئی ہے لہذا کسی بھی پرانے غصے کو کچھ دیا  
 ہوا اس سے دام وصول کیے جاتے ہیں۔ منگو ٹھیک کہہ رہا ہے جو اس کی ماں کی  
 ماں بپ تک وہ تیرہ برس کا قرضہ ادا نہیں کرے گی اس وقت تک تراب سے  
 نہیں کرے گی۔"

لہوے کے قرضہ ادا کرے گی؟" رمنو نے پوچھا "منگو آخر چاہتا کیا ہے؟ وہ صاف  
 کہہ دے اگر وہ روپے چاہتا ہے تو تراب ہزار دو ہزار ابھی دے سکتا ہے۔"

لہوے جواب دیا "کیا میری ماں نے اتنے برسوں میں صرف دو ہزار روپے بچھے  
 ہیں؟ اور اصل کے ناخن لو۔ ماں نے جو روپے روپے خرچ کیے وہی روپے میرے  
 اکلے آؤج میں خرچ جا کر ایک نئی عیسی قسطوں پر حاصل کر لیتا۔ ایک عیسی قسطوں  
 مارنے کے لیے کم از کم پندرہ بیس ہزار روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب تم لوگ  
 ہزار دو حساب کرو اگر ماں نے ہر ماہ روپے کے لیے سو روپے خرچ کیے ہیں تو اس  
 تیرہ برس میں پندرہ ہزار روپے ہو جاتے ہیں لاؤ نکالو پندرہ ہزار اور روپے کو لے

لہوے والے نے کہا "جے رام رام، ہم بھی قرض لیتے دیتے ہیں مگر کبھی یہ نہیں  
 لیا کبھی سے پالنے میں جو رقم خرچ کی گئی ہے اس رقم کو قرض کے طور پر وصول  
 کر لیں جو روپے کو پالنے والی اس کی چاچی تھی کیا رشتہ داری میں قرض وصول کرو  
 لے جواب دیا۔"

لہوے داری ہوتی تو میں کبھی یہ بات نہ اٹھاتا۔ جو خود ہی رشتہ توڑ رہی ہے اس لیے  
 رشتہ جوڑنے سے پہلے اسے قرض ادا کرنا پڑے گا۔ صلہ صفائی کا یہی ایک راستہ

"نہیں ہوگی کبھی نہیں ہوگی۔"

"ضرور ہوگی۔ منگو کے راستے میں آنے والا سر پھل دیا جائے گا۔" دونوں طرف کی  
 پارٹیاں لائیاں اور داؤ لے کر ایک دوسرے کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئیں۔ ایک پارٹی  
 نے کہا۔

"جو تراب کے دست کے ہاں نہیں رہے گی۔ اسے اپنے چچا کی جگہ میں رہنا ہوگا۔  
 دوسری پارٹی نے جواب دیا "جس جگہ میں منگو رہتا ہے وہاں جو نہیں رہے گی جب تک  
 کہ شادی کا فیصلہ نہ ہو جائے۔"

منگو کے لوگوں نے کہا "اگر وہ منگو کے ساتھ جگہ میں نہیں رہے گی تو پھر تراب کی  
 کشتی پر بھی مزدوری کے لیے نہیں جائے گی جب تک کہ شادی کا فیصلہ نہ ہو جائے۔" دوسری  
 کے بوڑھے ان کے درمیان آگئے "ٹھہرو ٹھہرو۔ آپس میں خون خراب نہ کرو۔ رو کالو  
 پنجایت کرے گی۔ ہم بوڑھوں نے دنیا دیکھی ہے، ہم جو فیصلہ کریں گے وہ سب کے لیے  
 قابل قبول ہوگا۔"

"کیسے قابل قبول ہوگا۔" ایک نے کہا "جو تراب کو چاہتی ہے اس لیے فیصلہ  
 کے حق میں ہوگا۔"

منگو نے آگے بڑھ کر کہا۔  
 "تم سب یہ دیکھتے ہو کہ جوانی میں جو نے تراب کو پسند کیا ہے۔ یہ نہیں دیکھ کر  
 بچپن سے میری ماں نے اس لڑکی کی پرورش کی ہے اس کے لیے خون بہینہ ایک لیا ہے  
 تاکہ اسے اپنی بونہا کر سکے۔ تم سب میری مرحوم ماں سے نا انصافی کر رہے ہو۔" تراب  
 نے آگے بڑھ کر جواب دیا "ہم تمہاری ماں کا احسان مانتے ہیں لیکن لڑکی کو حق پہنچتا ہے کہ  
 وہ اپنی آئندہ زندگی گزارنے کا فیصلہ اپنی مرضی سے کرے۔"

منگو نے غصے سے ہاتھ جھٹک کر کہا "تو پھر جاؤ رو کویا کر لے جاؤ مگر اس سے پہلے  
 میری ماں کے خون بہینہ کا حساب کرنا ہوگا۔ اگر جو ہماری ہوتی تو میں کبھی فیروں کی طرف  
 حساب نہ مانتا۔ اس نے تین برس میرے باپ کو اپنی کمائی کھلائی ہے مگر میری ماں نے نو  
 برس تک اسے کھلایا ہے، کپڑے پہنتا ہے جس دھکے تیاری میں اس کے لیے راتیں جاگتا ہے  
 دواؤں کے دام دیتے ہیں ان سب احسانات کی قیمت چکا سکتے ہو تو پھر لے جاؤ رو ک۔"

دہن قرض ادا کرنے سے پہلے تراب نے رجو سے شادی کرنے کی کوشش کی تو میرے  
 کوہ اور بڑل نہیں ہیں یہاں دنگے فساد ہوں گے لوگ زخمی ہوں گے مارے  
 گئے ایک لڑکی کے لیے یہاں جھگیاں جلتی ہوئی نظر آئیں گی۔“  
 اپنی کی عورتیں سم گئیں۔ انہیں اپنا ساگ لٹا اور جھگیاں جلتی ہوئی نظر آرہی تھی  
 نے ایک بوڑھے نے کہا ”اس ہستی میں کبھی فساد نہیں ہوا۔ ہم ایک لڑکی کے لیے  
 ہکڑوں کو برباد عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم نہیں کر سکتے۔ منگو اپنی ماں کی خرچ کی  
 باب رقم نامک رہا ہے مگر بہت زیادہ نامک رہا ہے صلح صفائی کے لیے دونوں فریق  
 سے کام لیں۔ منگو اپنی رقم میں کچھ کمی کرے اور تراب اس کی ادائیگی کے لیے  
 تیار ہو جائے اس طرح بات بنے گی۔“

منگو نے تراب کی جانب دیکھا اس نے سوچا کہ اگر وہ اپنے مطالبہ میں کچھ کمی کرے گا  
 اس کی مجلس پکڑنے والے کے پاس اتنی رقم نہیں ہوگی جس کے عوض وہ رجو کو  
 لے اس نے کہا۔

”جی بات ہے۔ بوڑھے کہہ رہے ہیں اس لیے میں ایک ہزار کم کیے دیتا ہوں  
 ہماری زندگی میرا یہ احسان رہے گا۔“ رجو نے عورتوں کی بھڑے نکل کر کہا ”میں  
 تمہارے احسان پر۔ میں چاچی کے احسان کا بدلہ چکاؤں گی۔ میں ساری زندگی  
 بھڑی کروں گی اور ایک ایک پیسہ جوڑ کر ہندہ ہزار تیرے منہ پر ماروں گی۔“

”جی طرح سوچ لے رجو۔“ منگو نے کہا ”جب تک تو قرض ادا نہیں کرے گی اس  
 تک تراب سے نہ شادی کر سکے گی نہ مل سکے گی اور نہ اس سے بات کر سکے گی۔ مجھ  
 پر توڑ کر اس سے رشتہ جوڑنے کے لیے پہلے تجھے چندہ ہزار کی رقم جمع کرنی ہوگی اور  
 باک پیسہ جوڑتے جوڑتے بوڑھی ہو جائے گی۔“ تراب نے کہا ”تو رجو کو تنہا کیوں  
 رہے میں نے اپنی جھگی کی جگہ ایک پکا مکان بنانے کے لیے اب تک تین ہزار روپے  
 بچائے یہ روپے میں رجو کو دوں گا۔ اور روز کی آدھی کمائی اس کے لیے بچایا کروں  
 تراب کے دوست رمنو نے کہا ”میرے پاس ایک سو تیس روپے ہیں میں بھی اپنی  
 باک حصہ رجو کے لیے بچایا کروں گا۔ اگلے چار ماہ تک پانچ سو روپے دینے کے

قابل ہو جاؤں گا۔“

لالہ نے آگے بڑھ کر کہا ”میری کوئی اولاد نہیں ہے۔ میں نے اور میری جتنی زب  
 اور رجو کو گود میں کھلایا ہے۔ آج ان بچوں پر چڑا آئی ہے تو میں بھی ان کی سمانوں گامی  
 اپنی جمع پونجی سے انہیں دو ہزار روپے دوں گا۔“ نمازی بابا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا  
 ”میں بارہ برس سے یہاں ایک چھوٹی سی مسجد بنانے کے لیے ہر ایک کے سامنے ہاتھ بٹایا  
 ہوں اور پیسے دو پیسے بھی سے لیتا رہتا ہوں۔ اب تک میں نے ساڑھے چار سو روپے جمع  
 کیے ہیں۔ سچ کہتا ہوں ابھی بیٹھے بیٹھے میرے دل میں الہام سامانزل ہوا ہے کہ انسان ہر ایک  
 ہوئی آفات کو دور کرنے کے لیے چندہ کیا جاتا ہے خدا کے لیے چندہ جمع کرنے کی ضرورت  
 نہیں ہوتی۔ خدا کسی مسجد کا محتاج نہیں۔ رجو بیٹی ایک گھر کی اور ایک گھر والے کی عطا  
 ہے میری مخالفت کرنے والے ہزار باتیں مجھے سنائیں گے مگر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ مجھ  
 کے لیے چھت ڈالنے سے پہلے بیٹی کے سر پر آجمل ڈالوں گا۔“

رجو کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے سب لوگ لالہ اور نمازی بابا سے متاثر ہو کر  
 ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ رجو اور تراب نے محبت کی خمی اور لالہ  
 دھرم اور نمازی بابا کا مذہب اس محبت کے ستار پر آکر مل رہے تھے۔ تراب اور رجو  
 حمایتی بھی اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کچھ نہ کچھ دینے کے وعدے کر رہے تھے۔ منگو  
 اس کے حمایتی غرا کر اٹھیں دیکھ رہے تھے وہیں وہ مطمئن تھے کہ اتنی ادا کے باوجود وہ  
 تراب کو چندہ ہزار تک پہنچنے کے لیے ابھی کئی برس تک محنت کرنی پڑے گی۔

دوسرے دن سے محنت شروع ہو گئی وہ سب ایک نئی لگن سے اورتے حوصلے  
 دن رات محنت کرنے لگے۔ دوسری طرف منگو کے آدمی ان کے حوصلے پست کرنے کی  
 میں تھے۔ تراب اور اس کے ساتھی زیادہ سے زیادہ چھلیاں پکڑنے کی کوشش کرنے  
 دشمن چوری چھپے کبھی ان کے جال کے تاروں کو ڈھیلا کر دیتے تھے اور کبھی لکڑیوں  
 نقصان پہنچاتے تھے۔ وہ بھی اس طرح کہ کسی کو ان کی دشمنی کا ثبوت نہ ملے۔

ایک بار تراب اور اس کے ساتھیوں نے آمدنی بڑھانے کے لیے پھجلیوں کے  
 بڑھائے تو منگو کے ساتھیوں نے دام گرا دیے ان کے درمیان اچھی خاصی سیاہی پڑی  
 بازیاں چل رہی تھیں۔ دن پر دن گزر رہے تھے رجو بھی زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے کے



نہیں ہیں مگر اب نہ بہت دور تھا اتنی دور کہ شاکر کی کشتی سے ایک ننھے کھلونے کی طرح  
انٹھالاس کی نگاہوں کی گرمی بھی رجو تک نہیں پہنچتی تھی۔

اسے اس دیکھ کر شاکر نے کہا ”میں تمہارا دکھ سمجھتا ہوں مجھے اپنے دل کی بات کہو۔  
انٹھالاسم تراب تک پہنچاؤں گا کسی کو اس بات کی خبر نہیں ہوگی۔“ ایک ہمدرد کوپاکر  
نے اپنے دل کی بات کہہ دی کہ تراب سے کو ایک بار مجھ سے مل لے۔ ایک بار ملنے  
کی لالچا لکڑی کا اگر دشمنوں نے دیکھ بھی لیا تو کیا ہو گا۔ وہ ہمیں پھانسی پر تو نہیں چڑھا  
بلکہ شاکر نے اطمینان دلایا کہ کوئی انہیں نہ دیکھ سکے گا وہ ایسا انتظام کرے گا کہ کسی  
نزد نہ ہوگی۔ آج رات وہ سب سمندر پر جائیں گے۔ وہ تراب سے کہے گا کہ تھوڑی دیر  
لے لے چٹائی زیرے پر چلا جائے۔ اس کے جانے کے بعد وہ کشتی لے کر ساحل پر آئے  
اور کو اس میں بٹھا کر چٹائی زیرے پر اس کے محبوب کے پاس پہنچا دے گا۔

روئے احسان مندی سے اسے دیکھا ”یہ بہت اچھی تدبیر ہے شاکر۔ تم بہت اچھے ہو  
بائیس میں زندگی بھر تمہارا احسان نہیں بھولوں گی۔“

اس میں احسان کی کیا بات ہے۔ میں اس لیے تمہارے کام آ رہا ہوں کہ تمہارا دکھ  
سے دیکھا نہیں جاتا ہے۔ آج رات تم ساحل کے اس موڑ پر میرا انتظار کرنا۔ جب تمام  
بے سمندر پر چلے جائیں گے تو میں کشتی لے کر وہاں آؤں گا میں اپنی طرف سے پوری  
کوشش کروں گا کہ کسی کو اس ملاقات کا علم نہ ہو تم بھی احتیاط برتنا اپنے سائے سے بھی  
دارم کہماں جا رہی ہو۔“

روئے کے لیے وہ دن گزارنا مشکل ہو گیا۔ وہ بڑی بے چینی سے سورج غروب ہونے کا  
فکر کرتی رہی۔ رات آئی تو جھکی سے نکلنے کی تدبیر سوچتی رہی۔ تدبیر اسی وقت کام آئی  
بائیس بیابا عشاق کی نماز پڑھ کر سو گئے۔ وہ دبے پاؤں جھکی سے نکلی۔ اندھیری رات تھی  
بات کار میں تھا کہ کوئی دیکھ لے گا۔ بلا سے دیکھ لے۔ آج وہ ساری بندشیں توڑ کر  
بیاں صرف ایک بار اپنے محبوب سے ملنے کا مصمم ارادہ کر چکی تھی۔ ساحل پر کشتی تیار  
نہ تھاکر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔

”تم بہت دیر کر رہی۔ تراب تمہارا انتظار کرتے کرتے کہیں بائیس نہ ہو جائے۔  
بائیس“ وہ بیٹھ گئی۔ شاکر کشتی کو لوہوں کے اتار چڑھاؤ پر کھینچ کر لے جانے لگا۔ جب

زیادہ سے زیادہ محنت کر رہی تھی اب اس کا کام رمنو کی کشتی پر ہوا کرتا تھا کیونکہ زاب  
سے ملنے اور اس سے باتیں کرنے پر پابندی لگادی گئی تھی وہ دونوں دوری سے ایک  
دوسرے کو دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتے تھے۔ رات کو منگو کا کوئی جاسوس ساحل پر نظر  
رہتا تھا کہ وہ چوری چھپے بھی نہ مل سکیں۔

رمنو کی بیوی روز شام کو بیٹے کی کلیاں گوندھ کر رجو کو دیتی اور رجو لالہ کی دکان سے  
تمباکو کی پڑیاں لا کر رمنو کو دیتی کہ وہ اسے تراب تک پہنچا دے اور تاکید کر دی کہ زیادہ  
تمباکو نہ پئے کلیجہ جل جاتا ہے۔ پیسے جمع کرنے کے لیے اپنے کھانے پینے میں کمی نہ کرے  
نہیں تو میں بھی بھوکے رہ کر پیسے جمع کروں گی۔

دونوں ایک دوسرے سے دور تھے اور جتنے دور تھے اتنے ہی اور زیادہ قریب ہونے  
چارے تھے یعنی جسمانی طور پر دور تھے مگر محبت بھرے پیغامات انہیں قصودات کی دکانوں  
قریب لے آئے تھے۔

پھر منگو نے اعتراض کیا کہ تراب پچھلی رات رمنو کے ہاں رجو سے ملنے گیا تھا۔  
سراسر جھوٹ تھا رجو اور تراب ایک دوسرے کے سائے کو بھی چھو کر نہیں گزرے تھے  
لیکن فیصلہ کرنے والوں کو منگو کی بات پر اس لیے یقین آ گیا کہ رمنو تراب کا گروہ دست غا  
اور دوستی کا حق بھالنے کے لیے وہ اپنے دوست کو رجو سے ملنے کا موقع فراہم کر سکتا تھا۔  
رجو کو نمازی بابا جیسے ایماندار آدمی کی سرپرستی میں دے دیا گیا اور وہ دوسرے دن سے شاکر  
کی کشتی پر کام کرنے لگی۔ جس رمنو سے تراب کے پیغامات ملتے تھے اس کا بھی سامنا  
چھوٹ گیا تھا۔

یہ سب کچھ منگو کی جھنجھالی ہوئی کارروائیاں تھیں۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ صرف پچھ  
ماہ کے عرصے میں وہ دس ہزار روپے تک پہنچ گئے ہیں۔ تراب اور رجو نے بھی اپنی کلیاں  
دیکھ کر منگو کے خلاف کوئی جوابی کارروائی نہیں کی۔ اب صرف پانچ ہزار کی بات نہ لگتی تھی  
تراب نے سوچا کہ چند ہزار روپے ہوتے ہی وہ رقم منگو کے منہ پر مارے گا رجو سے شکلی  
کرے گا۔ اس کے بعد یہاں منگو کا رونا دھونا کر دے گا۔

دیے اب رجو سے جدائی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ پہلے تو یہ بات تھی کہ تراب  
کوئی نہ کوئی پیغام مل جاتا تھا اور وہ اپنے دل کو سمجھا لیتی تھی کہ وہ ایک دوسرے سے زیادہ

اللہ کی یاد کے میں کہتی ہوں رک جاؤ۔“  
 چننے لگی۔ منگو نے دانت پیستے ہوئے کہا ”ہم تمہیں زندہ کب چھوڑنا چاہتے ہیں“  
 اے احمق نہیں ہیں کہ تمہیں بستی والوں سے شکایت کرنے کے لیے یہاں سے واپس  
 لے جائیں۔ آؤ مرنے سے پہلے ایک بار ہمارے پاس آ جاؤ۔“

دوڑنے لگی بھر میں فیصلہ کیا کہ ان سے رحم اور ہمدردی کی توقع کرے گی تو پھر ان کے ہمراہی آجائے گی اور عزت کی موت نہیں مرے گی۔ یہ فیصلہ کرتے ہی وہ دوڑتی ہوئی ایک گاڑی کی چٹان پر پہنچ گئی۔ وہ دونوں تیزی سے دوڑتے ہوئے اسے پکڑنے آ رہے تھے۔ اس ہلکے کران کی جانب دیکھا اور آخری بار اپنے محبوب کو پوری قوت سے چیخ کر آواز دیا۔

١٢٣٤٥٦٧٨٩

پھر سمندر کی سطح پر جھپاک کی زوردار آواز آئی اور پانی بلندی پر اڑتا ہوا دور تک بکھرتا ہوا ٹھوڈی دیر کے لیے ایک گرداب بنا، ذرا اچھل سی ہوئی پھر سمندر شانت ہو گیا۔

”ہرے روز ہستی کے مرد عورتیں بوڑھے اور جوان سب ہی حیرانی سے رجو کو بوجھتے تھے۔ اور پریشانی سے اسے تلاش کر رہے تھے ہستی کی ایک ایک جھلکی کے اندر جا کر اُنکا ہر شاید کسی وجہ سے جھپی بیٹھی ہو۔ لوگ میلوں دور تک اسے تلاش کرنے لگے تھے۔ اپنی موجودہ پریشانیوں سے گھبرا کر تنہائی اور سکون میں تلاش میں نکل گئی ہو لیکن وہ یہ نظر نہیں آئی۔“

ٹارکاسا سا ساتھ مگر منگو ڈھٹ ہوا تھا۔ اس نے الزام لگایا کہ تراب نے اسے کھوایا ہے۔ کہیں لے جا کر چھپا دیا ہے تاکہ چند ہزار نہ دے پائیں۔ اس الزام کو لوگوں نے غلط نہیں کیا کیونکہ وہ علی الصباح مچھلیوں سے بھری کشتی لے کر ساحل پر آیا تھا جس پر تھا کہ وہ تمام رات سمندر میں جال پھینکتا رہا ہے پھر جبکہ دس ہزار جمع ہو چکے تھے پھر ہزار چھیچہ اند تک جمع ہونے والے تھے ایسے میں تراب کوئی بے ایمانی نہیں

زب کے ساتھیوں نے منگو پر الزام لگایا کہ اس نے رجو کو عتاب کیا ہے ان کا الزام

لہر س کشتی کو سمندر کی طرف دھکیلتے لگیں تو وہ بھی کشتی پر آیا اور پتو ار چلا کر اس کا لہر چٹائی جزیرے کی طرف موڑنے لگا۔ رجو کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا تقریباً سات لاکھ بعد وہ اپنے ترازب سے ملنے والی تھی۔ اس نے دور ساحل کی جانب دیکھا اندھیر سا بستی اور جنگلیاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں اس پاں طرف سمندر کا پانی دکھائی دے رہا تھا۔ چٹائی جزیرہ زیادہ دور نہیں تھا۔ چاند کی روشنی میں لہر سے صاف نظر آتا تھا لیکن وہ چھپ کر جا رہے تھے اس لیے ایک لمبا پکر کاٹ رہے تھے آدھے گھنٹے کے بعد کشتی جزیرے کے کنارے سے لگ گئی۔ دور ایک چمچر بیٹھا ہوا ترازب ساحل کی طرح نظر آرہا تھا۔ رجو کشتی سے چھلانگ لگا کر کنارے پر آئی اور بے اختیار اے پکار ہوئی دوڑنے لگی۔

”زباب زباب“ قریب پہنچ کر وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ وہ منکوتا تھا۔ اس نے اپنے لگا کر کہا ”اچھا تو تم زباب سے ملنے آئی ہو۔ آؤ مجھ سے ملو۔“ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھنے لگا۔ رجو پلٹ کر کشش کی طرف بھاگی مگر وہاں شاکر راستہ روکے کھڑا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا ”یہ میری خوش نصیبی ہے کہ تم نے دوست سمجھ کر میرے ساتھ آئی ہو۔ آؤ اب دوست بن کر رہیں۔“

وہ دونوں سے کترا کر پیچھے ہٹنے لگی "خبردار۔ میرے قریب نہ آنا جھوٹے دکاؤں کا لوگ سمجھتے ہو کہ اس تماشائی میں، میں تم سے ڈر جاؤں گی؟ میں اپنی جان دے دوں گی کہ تمہیں قریب نہیں آئے دوں گی۔" ہم بھی جان کی بازی لگا کر میں آئے ہیں۔ منگو نے تم سمجھتی ہو کہ چندہ ہزار لے کر میں تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گا، تراب بیت جائے گا اور ہمارا جاؤں گا۔ میں لخت بھیجتا ہوں ایسے چندہ ہزار پر جسے حاصل کرنے کے بعد مجھے کھانا پڑے اور بہتی دالوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں، تمہیں صرف تمہیں۔ آج تم میری ہونگی یا پھر اس سمندر کی۔ میں پیشہ کے سوا جوئی۔"

یہ کہتے ہی وہ راجو کی طرف لپکا۔ راجو بھاگنے لگی۔ دوسری طرف سے شاکرات کیبر لگا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر ان کے ہاتھ آگئی تو عزت کی سلامتی ناممکن ہو جائے گی۔ وہ بھاگ ہوئی دوسرے کنارے پر چلی گئی اور ہاتھ اٹھا کر بولی "ٹھسرو" رک جاؤ۔ آگے بڑھو گئے۔



”سنا ہے جو نامراد وہ کر اس دنیا سے جاتے ہیں ان کی روحیں سدا بھٹکتی رہتی ہیں۔“  
 ”ہاں۔ ہن۔ میں نے بھی سنا ہے۔ میری دادی اماں آنکھوں دیکھا واقعہ سنا کئی  
 تھیں۔ دادی اماں کی جوانی کی بات تھی کہ ایک عورت اپنے خاوند کی تلاش میں نکل  
 تن حمارن کچھ کے میدان سے گزر رہی تھی۔ دادی اماں بتاتی ہیں کہ وہ بہت بڑا رنگین  
 علاقہ ہے۔ تمام دن سورج ایسے جلاتا ہے جیسے سوانیزے پر آگیا ہو۔ وہ بے چاری پیاس کی  
 شدت سے بے حال ہو گئی۔ رنگین تھا کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ پاؤں میں  
 چھالے پڑے تھے زبان خشک ہو کر نالو سے چپک رہی تھی وہ دھپڑھٹنے سے پہلے ہی بے  
 دم ہو کر گر پڑی۔ ایسی گری کہ پھر نہ اٹھ سکی۔

شام کو ادھر سے گزرنے والے ایک قافلے کے تو میوں نے اس کی لاش کو وہیں دفن  
 کر دیا۔ دادی اماں اسی طرف کی رہنے والی تھیں۔ انہوں نے دیکھا ہے کہ وہ رات کو ان  
 کے گاؤں سے گزرتی تھی۔ کسی سے سامنا ہو جاتا تو اس سے پانی مانگتی تھی اور اپنے خاوند کا  
 پتہ پوچھتی تھی۔

تمام عورتیں اپنی سانسیں روک کر بڑی حیرت سے وہ کہانی سنتی تھیں پھر اس کی تائید  
 میں کہتیں ”ہاں بے چاری پیاسی مر گئی تھی اسی لیے اس کی روح جانی مانگتی تھی۔“

”تو بے چاری رجو بھی پیاسی تھی۔ خدا کرے وہ زندہ ہو اور کسی پیاسی روح کی طرح  
 بھٹکتی نہ ہو۔“ سب ہی انہوس کا اظہار کرتیں اور ایسی باتیں کرتیں کہ وہ باتیں رجو کے  
 لیے دعائیں بن جاتی تھیں۔ منگو اس بستی والوں سے بے زار ہو گیا تھا وہ جہاں سے گزرا  
 تھا وہاں رجو اور تراب کا تذکرہ سنائی دیتا تھا اس لیے جنبہ کر اس نے واپس شہر جانے کا  
 فیصلہ کر لیا۔ اپنے دو چار دوستوں کو اس نے اچھی خاصی رقم ادھار دے دی تھی۔ وہ اسی  
 انتظار میں تھا کہ رقم وصول ہوتے ہی وہاں سے چلا جائے گا۔

ایک رات لالہ دکان بند کر کے سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی بیوی ایک چوکی پر  
 بیٹھی گیتا کا پائٹھ کر رہی تھی۔ اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ وہ دونوں چونک کر  
 دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔ چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ اس دستک کو وہ برسوں سے پہچانے  
 تھے۔ ہزاروں در کلکٹائے جائیں جب بھی وہ رجو کی مخصوص دستک کو پہچان لیتے اور وہ  
 پہچان رہے تھے۔

”لالہ واپس آگئی ہے؟“ لالے کی بیوی نے حیرت سے پوچھا۔ لالہ جواب دینے کے  
 بجائے سے چلا ہوا دروازے تک آیا اور اس کے دونوں ہٹ کھول دیئے۔ باہر کی نیم  
 لالہ کھڑی ہوئی تھی اس کے جسم پر وہی مخصوص لباس تھا۔ پنڈلیوں تک لہراتا ہوا  
 راجیٹ سے اوپر بلاؤز اور پتلے لمبے کی اوڑھنی گردن کے اطراف دونوں شانوں پر  
 ڈال دی ہوئی لہرائی تھی۔

”جی رجو! تو کہاں چلی گئی تھی۔ آندر آجا۔“ لالے کی بیوی نے اسے اندر آنے  
 کے لیے کہہ دیا۔ چپ تھی۔ ایک پتھر کے مجسمے کی طرح خاموش کھڑی تھی۔ اس کا دایاں  
 ناک کی طرف اٹھا ہوا اور ہتھیلی یوں پھیلی ہوئی تھی جیسے کچھ مانگ رہی ہو۔ لالہ نے  
 ناک کو بھرے لمبے میں کہا ”بیٹی ہم سمجھتے ہیں تو اپنے تراب کے لیے تمباکو لینے آئی  
 فلام کس زبان سے کہیں کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔“ اس کی بیوی نے کہنی  
 ہلا کر کہا ”کیوں اس کا دل توڑنے والی بات کرتے ہو؟ کیا ثبوت ہے کہ وہ اس  
 نہیں ہے۔ جیسے یہ گئی تھی ویسے ہی وہ بھی گیا ہے اور میں تو کہتی ہوں کہ وہ بھی آیا  
 ہی تو یہ اس کے لیے تمباکو لینے آئی ہے۔ آجا بیٹی وہ کھڑی بیٹھ کر باتیں کر پھر تمباکو  
 بٹل جانا۔“

ہاں سے مں نہ ہوئی جون کی توں ساکت کھڑی رہی۔ اس کی ہتھیلی اب تک پھیلی  
 تھی۔ ان دونوں کو کچھ عجیب سا محسوس ہوا جس لڑکی کی زبان قہقہے کی طرح چلتی تھی وہ  
 نہ بالکل خاموش کھڑی تھی۔ نہ بولتی تھی نہ حرکت کرتی تھی۔ سب سے عجیب بات  
 کہ وہ بالکل نہیں جھپک رہی تھی خالی خالی نظروں سے ایک طرف دیکھے جا رہی تھی۔  
 لالہ نے کہا ”میں سمجھ گئی تراب بھی اس کے ساتھ آیا ہے، کہیں اس کا انتظار  
 آگیا ہے، ابھی ہمارے پاس نہیں بیٹھ گئی۔“ ٹھہر جائیں تمباکو لے کر آتی ہوں۔“

دکان کا اندر دینی دروازہ کھولنے چلی گئی۔ لالہ نے اپنی بیوی کی طرف محوم کر کہا  
 ”ابھی تمباکو نہ نکالو۔ پہلے یہ تراب کو بلا کر لائے گی پھر اسے اس کے مطلب کی چیز  
 بہہ اتنے دنوں کے بعد آئے ہیں کیا کھائے پئے بیٹا ہی چلے جائیں گے؟“ یہ کہہ کر وہ  
 ہلکام ہونے کے لیے دروازے کی طرف پلٹا مگر وہاں کسی کا وجود نہ تھا۔ دروازے  
 ان خالی تھی اور باہر دور تک اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا ”ارے وہ چلی

ملنے اس سے کہا ٹھہرو۔ میں تمہارے دوست کو جگاتی ہوں۔ وہ تمہارے ساتھ  
 لڑو لے آئے گا۔ جب تک وہ نہیں آئے گی میں پھول نہیں دوں گی۔ یہ کہہ کر میں  
 اپنے گئی اور جب روضہ کے ساتھ واپس آئی تو وہ یہاں نہیں تھا۔ کیا پتہ پھول نہ  
 بنی دجہ سے ناراض ہو کر چلا گیا ہو، روضہ سے ڈھونڈنے کے لیے اس کی جھکی کی طرف  
 ہے۔

اس کی باتیں ختم ہوتے ہی روضہ واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ تراب وہاں نہیں ہے۔  
 ”ہو وہ دونوں کہاں چلے گئے؟“ تمام لوگ اپنی اپنی لالٹینیں لے کر چاروں طرف پھیل  
 نہ بہتی میں، بہتی کے باہر، اور ساحل پر دور دور تک انہیں تلاش کرتے رہے۔ انہیں  
 اپنے دیتے رہے اور رات کے سناٹے میں اپنی ہی آوازوں کی بازگشت سنتے رہے پھر  
 نہ کے بچنے پر تھک ہار کر اپنی اپنی جھکیوں میں آکر سو گئے۔

مکان کی حماقتیں پر ہنس رہا تھا۔ وہ تراب کے متعلق واثق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ  
 زندہ ہے یا مر چکا ہے لیکن رجو کو سمندر کے کمرے پانی میں ڈوبتے ہوئے اس نے اپنی  
 ٹھوس دیکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔

دوسرے دن بستی کے لوگ سو کر اٹھے تو انہیں رات کی باتیں خواب نظر آنے  
 لگیں۔ تراب کو سمندر پر جاتے سب نے دیکھا تھا۔ مگر اسے اور اس کی کشتی کو واپس آتے  
 نے نہیں دیکھا تھا اس کی کشتی کے ٹوٹے ہوئے تختے ہٹا چکے تھے کہ اب وہ کبھی واپس  
 نہیں آئے گا۔ روضہ کی بیوی باہل ہے جو اس کی واپسی کا قصہ سن رہی ہے۔ اسی طرح لالہ کا  
 باہل کیا ہے رات کو نیند کی حالت میں نہ جانے کسے دیکھ کر رجو کو پکارا ہوا گھر سے نکل  
 باہر۔

لوگ مختلف باتیں کرنے لگے۔ کچھ لوگوں کو یقین تھا کہ وہ دونوں زندہ ہیں۔ لیکن پھیل  
 رات بستی میں آکر کہاں غائب ہو گئے تھے؟ کیوں روپوش ہو گئے تھے؟ اس کی وجہ سمجھ میں  
 نہیں آ رہی تھی اس لیے کچھ لوگ ان کی باتوں کو جھٹلا رہے تھے۔ پھر ہر رات ان کا انتظار  
 رہا۔ جب وہ ایک بار آئے تھے تو دوسری بار بھی آسکتے تھے۔ رجو اپنے تراب کے لیے  
 لہا لگتے اور تراب اپنی رجو کے لیے بیلے کی کلیاں مانگنے ضرور آتا۔ لالہ کی بیوی پڑیاں  
 اڑھ کر تیار رکھتی تھی۔ روضہ کی بیوی سرشام ہی بیلے کی کلیاں ہار اور گھر کے کی صورت

گئی۔ رجو رجو۔ ”دروازے سے باہر اگر اندھیرے میں وہ اسے آوازیں دینے لگے۔  
 اس کی بیوی لالٹین اٹھا کر تیزی سے چلتی ہوئی آئی ”وہ آج نہیں تو کل تراب کے  
 ساتھ یہاں آجائی۔ تم نے تمہا کو دینے سے انکار کر دیا اور وہ ناراض ہو کر چلی گئی۔“ لالہ  
 نے اس کے ہاتھ سے لالٹین لے کر کہا۔ وہ زیادہ دور نہیں مگنی ہوگی میں ابھی اسے بلا کر آ  
 ہوں۔ وہ لالٹین ہاتھ میں اٹھائے اسے آوازیں دیتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ رات کے  
 سناٹے میں ”رجو رجو“ کی آواز دور تک لہراتی جا رہی تھی۔ جھکیوں سے لوگ اٹھنے لگے  
 سوئی ہوئی بستی جاگنے لگی ”کون؟ رجو کو پکار رہا ہے؟“

”لالہ کی آواز ہے۔“ مرد باہر نکل آئے۔ عورتیں دروازوں جھانکنے لگیں۔ ذرا ہی دور  
 میں یہ خبر پھیل گئی کہ رجو لالہ کے دروازے پر تمہا کو مانگنے آئی تھی۔ پھر کتنی ہی لالٹینیں  
 جھکیوں سے نکل آئیں۔ کسی نے کہا وہ روضہ کے ہاں مگنی ہوگی۔ چلو وہاں دیکھ لیتے ہیں۔  
 سب کے سب اسی طرف جانے لگے۔ لالہ انہیں تفصیل سے رجو کے آنے اور  
 جانے کا واقعہ سن رہا تھا۔ جب وہ روضہ کے مکان کے سامنے پہنچے تو اس کا دروازہ کھلا ہوا  
 اور اس کی بیوی اندھیرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ  
 ہوئی بولی ”کیا مل گیا؟ تراب مل گیا؟“

”تراب! نہیں تو۔ ہم تو تراب کو نہیں رجو کو ڈھونڈنے آئے ہیں۔ کیا وہ یہاں نہیں  
 آئی ہے؟“

”نہیں، یہاں ابھی تراب آیا تھا۔ دروازے پر دستک سنتے ہی میں پہچان گئی کہ وہ  
 تراب ہے۔ روضہ سو رہا تھا میں نے اسے اٹھانا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ وہ کھٹنے کے بعد  
 سمندر پر جانے والا تھا۔ میں نے خود ہی اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہ یہاں چو کھٹ کے باہر کڑا  
 ہوا تھا اور اپنا ہاتھ پھیلا کر مجھ سے کچھ مانگ رہا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ اپنی رجو کے لیے  
 کی کلیاں مانگنے آیا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اتنے دنوں سے کہاں تھا؟ اسے  
 مرہ سمجھ رہے ہیں۔ وہ اس طرح باہر کیوں کھڑا ہے، اندر کیوں نہیں آتا؟ اپنی بیگمانی سے  
 باتیں کیوں نہیں کرتا؟

مگر وہ خاموش رہا۔ ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہ نکلا۔ میرے دماغ میں بات لگا کہ  
 شاید وہ رجو کو ڈھونڈ کر لے آیا ہے جیسی بیلے کی کلیاں مانگ رہا ہے۔

لالے کی بیوی نے چیخ کر کہا ”رجو بیٹی آجا“ واپس آجا۔ اب کوئی حیرے پیار کے راتے کا پتھر نہیں بنے گا۔“ نمازی بابائے ذرا آگے بڑھ کر آواز دی ”تراپ تو بچپن سے سمندر کا مزاج کو سمجھتا ہے خد نہ کر، رجو کو لے کر آجا۔ اب یہ دنیا والے تجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ مگر وہ دونوں خاموش تھے اور سمندر گرج رہا تھا اس وقت جزیرے کے ساحل پر رکھی ہوئی



لہاں نہیں ہوتا جسے وہ بچے کو پستانا کر موت کے سرد ہاتھوں سے تمام عمر بچاتی رہیں۔  
لے کر صرف دعا کہیں ہوتی ہیں۔

”تدایا میرے بچے کو قیامت کی عمر لگ جائے۔ زندگی اسے کبھی ٹیڑھی نظر سے نہ  
یکے اور موت ہمیشہ اسے طرح دے جائے۔ خدا یا۔۔۔“

ابا یک ہی جواز کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ کچھ ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے جواز کا موٹر  
بلائی ہو رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی ماں باپ کے دل و دماغ کو جھٹکے لگنے لگے۔ انہوں نے  
گرا کر اپنے جانی کو دیکھا۔ بیٹا بہت خوب صورت تھا۔ والدین کی جان سے زیادہ قیمتی تھا  
لگے والے کسی کی قدر و قیمت نہیں سمجھتے۔ جواز کا موٹر تیار ہو چکا تھا۔ اس تیار کو رہ کر  
کافی کے جھٹکے لگ رہے تھے اور جواز دائیں بائیں ڈول رہا تھا۔ پھر کھڑکی کے شیشے کے پار  
نما آسمان گردش میں آ گیا۔ پانچ برس کے جانی کے لیے وہ عجیب تماشا تھا کہ جن سفید  
بالوں کو وہ پکڑنا چاہتا تھا وہ اوپر تلے ڈوبے ابھرتے جا رہے تھے۔ کیا موت اسی طرح جھولا  
جانی آتی ہے؟

ہاڑی وہ عمودی سیاہ چٹان یوں کھڑی تھی جیسے انگلی دکھا رہی ہو ”خبردار! میری طرف  
نہ نہ کون جانتا ہے کہ تم ٹوٹ جاؤ گے یا میری انگلی ٹوٹ جائے گی۔ خبردار! آگے نہ  
جھٹ۔“

مگر وہ عمودی سیاہ چٹان گویا ایک مقناطیس تھی۔ جواز اس کی طرف کھینچا جا رہا تھا جیسے  
چٹان کی طرف جاتی برہا پے کی طرف اور برہا پا موت کی طرف کھینچا جاتا ہے۔ لیکن  
بلاتوا بھی کچھ تھا۔ کیا موت بچپن کے حسن کو اور ماں کے دودھ کے چٹھارے کو بھی نہیں  
چھوڑتی؟

کیا بگڑی زور کا دھماکہ ہوا۔ ایسا زوردار دھماکہ آسمان کے چٹھنے سے نہیں ماں کی چھاتی  
پڑے ہوتا ہے۔ کون جانتا ہے کہ بعد شوق بچے کی سالگرہ منانے والوں پر کیا گزری؟  
ہلائی مغرور بلندی پر چند لٹھوں کے لیے قیامت برپا ہوئی۔ پھر ایک دم سناٹا چھا گیا۔ سیاہ  
لوہی چٹان کی ”خبردار“ کہنے والی انگلی ٹوٹ چکی تھی۔



بالو دکان کے اندر کھلونوں اور کتابوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ اس کی ماں دکان

## مستاک واپسی

طیارے کی کھڑکی کے باہر صاف و شفاف بادل دھوئیں کی طرح مل کھاتے ہوئے گزر  
رہے تھے۔ پانچ برس کا جانی کھڑکی کے شیشے کو اپنی ننھی انگلیوں سے یوں لوج رہا تھا جیسے  
اڑتے ہوئے بادلوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ بیچارہ تو ایک نا سمجھ بچہ تھا بڑی عمر کے  
سمجھ دار لوگ بھی ہر اس چیز کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کی دسترس سے باہر ہوتی  
ہے۔

وہ ایک فلائنگ کلب کا طیارہ تھا۔ اس میں صرف ایک پائلٹ اور تین مسافروں کے  
لیے گنجائش تھی۔ ایک مسافر تنہا جانی تھا باقی دو مسافر اس کے ممی اور ڈیڈی تھے۔ بہت  
آدمیوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے جانی سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی  
پانچویں سالگرہ کی خوشی میں اسے ہوائی جواز کی سیر کرائیں گے۔ سو وعدہ وفا ہو رہا تھا۔

ماں اپنے بیٹے کی مظانہ حرکتوں کو دیکھ کر قربان ہو رہی تھی۔ مستاک جذبے  
مسکراتی ہوئی آنکھیں یوں ہلکی ہلکی سی تھیں جیسے مسرتوں کے جام لبریز ہو کر جھٹکے کو تیز  
ہوں۔ باپ کی آنکھوں سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ ایک طویل مدت کے تھا دینے والے  
انتظار کے بعد وہ پیارا سا بچہ ان کی گود میں آیا تھا۔ سب ہی بچوں کے ذہن میں یہ جنس  
ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا میں یا اپنے والدین کی گود میں کہاں سے آئے ہیں؟ یہ بہت ہی مشکل  
سوال ہے۔ دنیا کی کوئی ماں اور کوئی باپ آج تک اپنے بچے کو صحیح جواب نہ دے سکا۔ اس  
یہ کہہ کر ٹال دیا کہ تم اللہ میاں کے پاس سے آئے ہو۔

لیکن جانی کے متعلق اس کے والدین خود نہیں جانتے تھے کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟  
ایسے ہی وقت خدا کی دین کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ وہ بانجھ عورت کی گود میں بھی پھول لکھاتا  
ہے۔ جانی کی ممی اپنے کھلے ہوئے پھول کو دیکھ کر خوشی سے کھلی جا رہی تھی۔ اس نے جانی  
کو گرم سوٹ پہنا دیا تھا کہ ہلکی سی سرد ہوا بھی اسے نقصان نہ پہنچائے۔ ماں کے پاس ایسا



”سکراتا ہوا دکان کے شوکیس کے پاس آگیا۔ بانو ایک گاہک سے منٹ رہی تھی۔  
”ہٹا گیا تو اس نے کیپٹن سے پوچھا ”فرمائیے۔“

اس نے دکان کے باہر پورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔  
”میں پورڈ پر لکھا ہوا ہے کہ ایک روپے میں کوئی بھی چیز خریدی جاسکتی ہے۔“ اس  
بانو نے چہرے پر نظرسے بتاتے ہوئے پوچھا ”کیا کوئی بھی چیز؟“

”جی ہاں۔ کوئی بھی۔۔۔“ وہ کہتے کہتے چونک گئی۔ کیپٹن اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا پھر  
اسے جب سے ایک روپیہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

بانو کو بیٹھا بیٹھا سا خطرہ محسوس ہوا۔ اس کی امی اسے نصیحتیں کرتی رہتی تھیں کہ وہ  
لٹا لٹے ٹکٹوں اور لچھے دار باتوں سے خود کو بچا کر رکھے۔ ایک بار وہ فریب کھا چکی ہے  
اسی فریب کے آئینہ میں اجنبی مردوں کا چہرہ دیکھنا چاہیے۔ لہذا بانو نے اس ایک  
بانو کو قبول کرنے کے بجائے ٹھکرتے ہوئے پوچھا۔

”تپ یہ تو بتائیں خریدنا کیا چاہتے ہیں؟“

”اب سے حسین چیزیں۔ اگرچہ یہ انمول ہے، دنیا کے سارے دولت مند اس کی  
درا نہیں کر سکتے۔ یہ ایک روپیہ تو میں اس دکان کے اصول کے مطابق دے رہا  
ہوں۔“

بانو کا دھڑکتا ہوا دل کہنے لگا ”واقعی یہ مرد لچھے دار باتیں کرتے ہیں۔ ایک بات کے  
لئے مطلب کی دوسری بات کہہ جاتے ہیں۔ آئیے اس کی بے باکی پر مجھے غصے کا اظہار  
ہے مگر میرا دل کیوں دھڑک رہا ہے؟“

اس نے ایک دم سے گھبرا کر ماں کو آواز دی۔ ماں حیرتی سے چلتی ہوئی آئی ”کیا بات  
ہو؟“

بانو نے بولنے سے پہلے کیپٹن نے کہا۔

”میں آپ کی بیٹی کو یہ روپیہ دے رہا ہوں۔ میاں سے کچھ خریدنا چاہتا ہوں۔“  
بانو اس کی بے باکی پر لوٹ گئی۔ ماں نے محبت سے چپکارتے ہوئے کہا۔

”نیا تم پریشان کیوں ہو گئیں؟ آئیے جو رنگ رہے ہیں وہ دے دو۔“

”مہ گرائی مجھے ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ آپ پوچھ لیں یہ کیا چاہتے

کے باہر رعمانی سیل کا پورڈ لگا رہی تھی۔ پورڈ پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

”صرف ایک روپے میں آپ اپنی پسند کی کوئی بھی چیز خرید سکتے ہیں۔“

لوگ آ رہے تھے اور اپنی پسند کی چیزیں خرید رہے تھے۔ ایک بری فوج کا کیپٹن ٹھٹھا  
ہوا وہاں پہنچ گیا۔ فوج کی وردی میں وہ بہت ہی اساتھ نظر آ رہا تھا۔ اس نے بانو کی بڑائی  
ماں سے کہا۔

”ماں جی یہ جنگ کا زمانہ ہے، فوجی گاڑیاں میاں سے کسی وقت بھی گزر سکتی ہیں اور  
آپ نے دکان کا سامان میاں راستے تک پھیلادیا ہے۔ پلیز! یہ سامان اپنی دکان تک محدود  
رکھیں۔“

ایسا کہتے وقت اس کی نظرسے بھٹکتی ہوئی دکان کے اندر گئیں پھر بانو پر ٹھہر گئیں۔  
گلابی رنگ کے لباس میں گلابی گلابی سی لگ رہی تھی۔ آئیے اسے نظرسے ملنے ہی وہ گلابی  
سے سرخی مائل ہو گئی۔ اجنبی نگاہوں کی دھوپ رنگ حسن کا مزاج بدل رہی ہے۔ اس کی  
ماں آئیے اسے معذرت چاہ رہی تھی اور وعدہ کر رہی تھی کہ وہ جلد ہی تمام سامان راستے  
ہٹالے گی۔ آئیے اسے مسکرا کر کہا۔

”ماں جی! کوئی بات نہیں۔ جب فوجی گاڑیوں کے گزرنے کا وقت آئے گا تو میں آپ  
کو تادیوں گا۔ ابھی آپ اطمینان سے دکانداری کریں۔“

”آئیے نرم کتنے اچھے ہو۔ کتنے مہربان ہو۔ آؤ میری دکان سے کوئی چیز پسند کرو۔“

اس نے دو بار بانو کی طرف نظرسے دوڑاتے ہوئے کہا۔

”بے شک پسند کروں گا لیکن قیمت ادا کروں گا۔ میں رشوت پسند نہیں کرتا کیوں کہ  
میں خدا سے ڈرتا ہوں۔“

بوڑھی عورت نے حیرانی سے پوچھا۔

”اوہ آئیے اس کا نام مسلمان ہو؟“

”الحمد للہ لیکن آپ کو حیرانی کیوں ہے؟“

”اس لیے کہ تم ہندوستانی فوج کے سپاہی ہو۔“

اس نے ہنستے ہوئے کہا ”تو کیا ہوا۔ بھارتی سینا میں مسلمان سپاہی بھی ہوتے ہیں۔ یہ

دیکھ ہم سب کا ہے۔“

بے گھر والوں کو ڈر میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آج رات آپ میرے ساتھ  
ٹوٹی ہوئی چلیں گی۔“

”نہیں بیٹے۔ یہ تکلف نہ کرو۔ میں تمہیں فضول خرچی کی اجازت نہیں دوں گی۔“  
”آپ بڑی خوب صورتی سے میری دعوت کو ٹھکرا رہی ہیں۔“

”تم غلط سمجھ رہے ہو۔ ماں اپنے بچوں کا دل کبھی نہیں توڑتی۔ میں اپنے گھر میں  
ٹوٹا کا اہتمام کروں گی۔ شام کو چھٹی ہوتے ہی یہاں چلے آتا۔ میرا گھر یہاں سے دور  
نہ ہے۔“

”اٹوئی! ابو! آگرسٹ! تین برس کے بعد میں ایک گھر میں باقاعدہ سا لنگر مناؤں گا۔ یہ  
بل ٹھکے آپ ہی کے دم سے مل رہی ہیں۔“

بانو نے ذرا سر گھما کر اسے دیکھا۔ اتنے بڑے آئینے کے چہرے پر بچوں جیسی خوشیاں  
کھلے اختیار مسکرانے لگی۔ کیپٹن نے اچانک اس کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔  
اسی سرگھما کر بے کام کے کام میں مصروف ہو گئی۔

کیپٹن کے دل نے کہا ”وہ مارا۔“  
بانو کے دل نے کہا ”ہائے میں مر گئی۔ کہیں وہ میری مسکراہٹ کا مطلب غلط نہ سمجھ  
پرکرا ہو گا؟“

دواؤں کا چارہ تھا۔ ماں نے پوچھا ”بیٹے تم کوئی چیز خریدنے والے تھے خالی ہاتھ کیوں  
ہے ہو؟“

اس نے پلٹ کر بانو کو دیکھا۔ پھر ماں کو دیکھ کر کہا۔

”میں نے یہاں سے انمول چیز خریدی ہے اور وہ ہے محبت۔“

بانو کا دل دھک سے رہ گیا۔ جیسے محبت کے ایک لفظ نے دھکا مارا ہو۔ جوانی کی شاہراہ  
باز آتا جاتا ہجوم ہو تو کہیں نہ کہیں سے ضرور دھکا لگتا ہے اور دھکا مارنے والے  
اپنا دلی سے گزر جاتے ہیں۔ بانو نے ذرا سنبھل کر دیکھا تو وہ جا چکا تھا۔

اس کی ماں بظاہر چپ چاپ کھڑی اور جھل ہونے والے سپاہی بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔  
اس کی نظریں دائیں طرف ایک آئینے پر بھی تھیں جس میں بانو دکھائی دے رہی  
ہو۔ سوچ رہی تھی اور الجھ رہی تھی۔ بیٹی کو اچھے دیکھ کر ماں کے احساسات دکھنے لگے۔

ہیں؟“

وہ کاؤنٹر سے ہٹ کر دکان کے دور افتادہ حصہ میں چلی گئی پھر خود کو دوسرے کاسٹلٹا  
لگا کر اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ مگر کان اس کی آواز پر لگے رہے وہ کہہ رہا تھا۔

”ماں جی! کیا میں آپ کو امی کہہ سکتا ہوں؟“

ماں کی ہاتھیں کھل گئیں ”ضرور میرے سپاہی بیٹے! تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟“

”میرا کوئی نہیں ہے میں اتنی بڑی دنیا میں بالکل تنہا۔“

اتنا کہتے کہتے اس کا لہجہ شیشہ دل کی طرح ترش گیا۔ ماں کے دل سے آگ لگی۔ بانو کے

دل نے کہا ”سچا رہ!“

پہلے پل درو کے رشتے اسی طرح ہمہ رو بہتے ہیں۔ پہلے کسی اجنبی دل کے غلام  
جھانک کر دیکھا جاتا ہے پھر محبت اس دل کے خالی کیسٹ میں اپنی آواز دیکھا دیکھتی ہے۔

ایسا سوچتے ہی بانو چونک گئی۔ ”ہائے! یہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ کوئی اس دنیا میں  
ہے توجہ اور ہمدردی کا مستحق ہے تو ہوا کرے۔ میرے دل نے جو زخم کھائے ہیں ان کے

لیے اب میرے پاس آنسوؤں کا مرہم بھی نہیں ہے۔ میں روتے روتے تھک گئی ہوں۔  
اب میں کوئی نیا روگ نہیں لگاؤں گی۔ اب اس کی باتیں نہیں سنوں گی۔“

وہ نگاہیں چرا سکتی تھی، منہ پھیر سکتی تھی مگر اپنے کان بند نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کہہ رہا  
تھا۔

”امی! آپ کی صورت ہو بسو میری امی جیسی ہے۔ بالکل ایسا ہی متا کا نور ہے آپ  
کو دیکھتے ہی بے اختیار امی کہنے کو جی چاہنے لگا۔“

ماں نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا ”آج سے میں تمہاری امی ہوں۔ دکان کے  
اندروں میں تمہیں دودھ پتی کی چائے پلاؤں گی۔“

وہ دکان کے اندر تو کیا، دل کے اندر جا کر بیٹھنا چاہتا تھا۔ اس نے بانو کو چور نظروں سے  
دیکھتے ہوئے کہا۔

”امی ابھی میں ڈیوٹی پر ہوں، شام کو فرصت ملے گی۔ میں آپ کو بتاؤں کہ آج میری  
پیدائش کا دن ہے۔ میں باپوس تھا کہ تمہاں طرح سا لنگر مناؤں لیکن اب آپ کی ممتا نے

تمہائی کا دکھ سمیٹ لیا ہے۔ میں آپ کو اور آپ کی صاحب زادی کو۔ میرا مطلب ہے

لکرا رہا تھا۔ سپاہی جانتا ہے کہ مورچہ کہاں بیٹنا چاہیے۔ اس نے بانو کو شرعاً تھکراتے لڑکھڑکاتے۔

”تمہاری سہمی ہوئی، جھجکی ہوئی اور شرابی ہوئی ادا میں بتا رہی ہیں کہ تم کنواری اور لہوئی ہو اور مجھ سے پہلے کسی نے تمہارا راستہ نہیں روکا ہے۔“

بانو کیوں لگا جیسے سپاہی اپنی بدوق کی گولی سے اس کے سینے کو داغ رہا ہے۔ وہ جلدی سے ہل۔

”میں نے آپ کے انتظار میں دکان ابھی تک بند نہیں کی۔ آپ کو خوراہاں جانا ہے۔“

”میں جان بوجھ کر دکان کی طرف نہیں گیا۔ میں نے سوچا دعوت کے سلسلے میں کچھ کانے کے لیے تمہاری امی گھر جائیں گی تو دکان میں آکر تم سے دل کی بات کہوں گا مگر وہ بچن میں رہ گئیں اور تم شاید گھر جارہی ہو چلو یوں بھی کام بن رہا ہے تم ناراض تو نہیں۔“

وہ ناراض کیوں ہوتی؟ اسے تو اپنی قدر و قیمت کا اندازہ ہو رہا تھا وہ راستے کے کنارے بے انتظار کر رہا تھا جیسے اپنی تقدیر کا راستہ دیکھ رہا ہو۔ جیسے اپنی وردی پر اسے تمغہ کی طرح لٹکا ہوا ہو۔ ایسے میں کوئی لڑکی ناراض نہیں ہوتی۔ صرف رونا اعتراض کرتی ہے۔

”آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“

”میں نے آج تک کسی لڑکی سے دل کی بات نہیں کی۔ میں نہیں جانتا کہ کیسے کہنا ہے؟ کس طرح ابتدا کرنی چاہیے۔ عام سا طریقہ یہ ہے کہ اجنبیت دور کرنے کے لیے ملتانہادف کر لیا جاتا ہے تمہارا نام تو مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ ایران میں کنواری لڑکیوں کو کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔“

پھر وہی کنواریوں کی بات اس نے کہہ دی۔ بانو نے تیزی سے قدم آگے بڑھا دیئے تاکہ اسے آگے نکل جائے۔

”بھئی اتنی تیزی سے نہ چلو۔ کیا مجھے اپنے ساتھ چلنے کا حق نہیں دو گی؟ کم از کم میرا ہونچہ بوجھ بھی کام آئے گا۔“

”میں آپ کا نام پوچھتا ہوں مگر تمہیں۔ آپ انہیں بتا دیں۔“

جوانی کی ایسی کڑی دھوپ میں لڑکیاں محبت کی چھاؤں تلاش کرتی ہیں اور بانو محبت کی چھاؤں میں جل گئی تھی۔ اس فکر مند ہو گئی کہ اب کیا ہو گا۔ بیٹی پھاڑ جیسی جوں کی گھڑاے گی؟ کیا ہمیشہ شادی کے خیال سے سہم جایا کرے گی؟

وہ زیادہ دیر تک نہ سوچ سکی۔ آتے جاتے ہوئے گاؤں نے اس کا دھیان ہٹا کر طرف سے ہٹا دیا۔ شام ہوتے ہی بلیک آؤٹ کی وجہ سے دکانیں جلد بند ہو جاتی تھیں اس لیے اس بیٹی بھی دکان بڑھانے لگیں۔ اس نے کہا۔

وہ ابھی تک نہیں آیا۔ میں بھی عجیب ہوں۔ اسے بیٹا بنایا مگر اس کا نام پوچھتا ہوں۔ مگر تم نے پوچھا تھا بانو؟

”اہل نہیں تو میں بھلا کیوں کسی کا نام پوچھوں؟“

”ایسا نہ کہو بیٹی۔ سب ہی مرد آصف کی طرح نہیں ہوتے۔ یہ لڑکا اچھا ہے پھر اکل اکیلا ہے۔ اسے ہماری محبت ملے گی تو یہ کبھی ساتھ نہیں چھوڑے گا۔“

”اسی ہم دکاندار ہیں۔ یہاں گاؤں کے لیے آتے ہیں اور وہ آکر جا چکا ہے۔ اب آپ دکان بڑھا سکیں۔“

”نہیں بانو! میں کچھ دیر اس کا انتظار کروں گی۔ تم گھر جا کر سالن اور بریانی تیار کرو۔ میں برتھ ڈے ٹیکے لے آؤں گی۔“

وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتی ہوئی دکان سے باہر نکل آئی۔ باہر رعایتی سیل کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس نے سوچا ”میں کابیس نہیں چلنا ورنہ مجھے بھی رعایتی شرط پر کسی کے ساتھ چلا کر دیتیں۔ یہ بھی کوئی بات ہے دو گھڑی کی جان پہچان میں دعوت کا انتظام کر رہی ہیں اس کی سالگرہ منانے والی ہیں۔“

ماں پچھلے دو برس سے کسی بھی خبر اور کماؤ پر ت شریف زادے کو ایسی نظروں سے دیکھتی آ رہی تھی جیسے وہ اس کی بانو کے لیے پیدا کیا گیا ہو۔ لیکن ہندوستان میں مسلمان لڑکے کہاں رہ گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا سب کے سب پاکستان چلے گئے ہیں۔ کسی نے نہیں سوچا کہ بانو جوان ہوگی تو اس کا کیا بنے گا؟ اسی لیے جب کوئی مسلمان لڑکا بھولے سے نظر آ جاتا تو اس پر واری صدے ہونے لگتی تھی۔

بانو راستے کے کنارے ٹھٹھک گئی۔ وہ فوجی وردی میں لمبوس چند قدم کے فاصلے پر کھڑا

”آپ باتیں کرتے کرتے کتنی دور آگئے ہیں، آپ کو امی کے پاس جانا چاہیے۔“  
 چلا جاؤں گا اور انہیں اپنا نام بھی بتا دوں گا کہ میرا نام سرتاج حسین ہے مگر تم چاہو تو  
 باتیں کر سکتی ہو۔“

”سرتاج۔ یہ لفظ تو بڑا ہی محبت پرور اور پائیدار ہوتا ہے۔ عورت کا محافظ ہوتا ہے،  
 ناپاکت و آبرو اور مستقبل کا ضامن ہوتا ہے۔ مگر یہ لفظ پان کی پیک کی طرح بانو کے  
 دل پر اور دل کے لمبوں میں گھل گیا۔ اسے آصف یاد آیا جو سرتاج بن کر آیا تھا اور سر کی  
 دھڑلج کر لے گیا تھا۔ وہ کیپٹن سرتاج حسین سے دور بھاگتی چلی گئی۔ اچھا ہوا کہ مگر  
 نے آیا تھا۔ وہ مکان میں گھسے ہی دروازہ بند کر کے دیکھنے والے کی نظروں سے چھپ

سرتاج حسین دور کھڑا تھوڑی دیر تک بند دروازے کو دیکھتا رہا اور یہ سوچ کر مسکراتا  
 ہوا کہ اس نے اپنے نام سے فائدہ اٹھا کر سرتاج والی بات خوب کہی۔ شادی اور سرتاج کے  
 نام کی کنواری نہیں شرابی۔ اسی لیے وہ شراب کھاگ گئی۔ انسان کبھی کبھی خوش فہمی  
 کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ وہ مسکراتا ہوا دکان کی طرف واپس چلا گیا۔

بانو دروازے کے پیچھے کھڑی ایسے مرد کے خیال سے کانپتی رہی جو شوہر بن کر آتا ہے  
 رمل کے نام پر سب کچھ لوٹ کر چلا جاتا ہے۔ اس کے پاؤں کا پربہ تھے، سر چکرا  
 اٹھ کر اٹھ اور وقت ہوتا تو وہ چولے کے پاس کبھی نہ جاتی، بہتر جا کر گر پڑتی اور خوب  
 ہن پھوٹ کر رونا شروع کر دیتی لیکن ماں نے آج رات پھر ایک مہمان کے لیے دستر  
 بخانی کھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ شرافت کے دائرے میں۔ جوان بیٹیوں کو اسی طرح نگاہوں  
 نہانے بچایا جاتا ہے۔ ماں کے سر سے اپنا بوجھ ہٹا کر کرنے کے لیے باورچی خانے میں  
 پلٹے گئی جیسے خود کو چولے میں جھونکتے جارہی ہو۔



گنبد طیارے کے پائلٹ سے رابطہ قائم نہیں ہو رہا تھا۔ کنٹرول ٹاور کے ریڈیو  
 پر آخری بار اسے کال کیا پھر ایس ہو کر اس نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور ٹریفک  
 کنٹرول کے نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا۔

”میں انہیں بتاؤں گا۔ پھر وہ تمہیں بتائیں گی۔ پھر تم اپنے دل کو بتاؤ گی پھر تمہارا دل  
 اپنی دھڑکنوں کو بتائے گا۔ کسی کا نام تھانے پکری میں بھی اتنا نہیں گھومتا جتنا تم گھمانا چاہتی  
 ہو۔“

بانو کو بے اختیار ہنسی آئی۔ وہ اپنی شبیدگی برقرار نہ رکھ سکی۔ اپنے ہنسنے لکھنا  
 لبوں کو ہتھیلی کی آڑ میں چھپا کر بولی۔  
 ”آپ بہت زیادہ بولتے ہیں۔“

”بہت اکی مرطے پر لڑکیاں شرابی ہیں۔ اس لیے خود بولنا چاہیے۔ اس کے بعد وہ  
 بولنے کا موقع نہیں دیتیں۔“  
 ”آپ کو لڑکیوں کی دوستی کا خاصا تجربہ ہے۔“

”ہاں میں نے دو بار قسمت آزمائی کی مگر قسمت میرے صبر کو آزما تی رہی۔ پہلی بار میں  
 نے محبت کی گمروہ میری ہم مزاج نہیں تھی۔ اس لیے میں نے اسے چھوڑ دیا۔ دوسری بار  
 لڑکی میرے معیار کے مطابق تھی مگر اس نے مجھے چھوڑ دیا۔“ اس نے بانو کو دیکھتے ہوئے کہا  
 ”پتہ نہیں تیسری بار کیا ہو گا۔“  
 بانو نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا ”بار بار دھوکہ کھانے سے بہتر ہے کہ کسی سے  
 خالص محبت کی توقع نہ کی جائے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ کیپٹن نے کہا ”ہم ٹریفک کے جھوم سے گزرتے ہیں یہ جاننے  
 ہوئے بھی کہ کبھی نہ کبھی حادثہ پیش آئے گا ہم راستوں پر چلنا چھوڑ تو نہیں دیتے۔ ہم  
 جانتے ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کو محبت کا فریب دیتا ہے پھر بھی ہم کسی نہ کسی سے  
 محبت کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ نہ ہو تو دنیا میں گولے بارود اور فوجی وردی کے سوا کچھ نہ  
 رہے۔“

بانو کے دل نے تائید کی ”ہاں محبت کے بغیر ہر خوشی کھوکھلی سی لگتی ہے۔ کسی کو بار  
 سے کچھ دیئے اور کچھ لیے بغیر رہنا نہیں جاتا۔ اسی لیے محبت ہماری زندگی میں موت کی طرا  
 اتل ہے، ضرور آتی ہے اور بڑی خوب صورتی سے مارتی رہتی ہے۔“

وہ محبت کے مارے اندر ہی اندر مرنے لگی۔ اس کے دل نے کہا ”یہ آنسو کچھ اور  
 بولے۔ کم از کم اپنا نام ہی بتا دے۔ نام نہیں بتائے گا تو پھر کس نام سے خیالوں میں آئے

کھل کے درمیان انسانی جسم گڈے گزریں کی طرح اوندھے سیدھے پڑے ہوئے تھے۔  
 ہاتھ ایک مرد تھا، ایک عورت تھی اور مرد کے قدموں کے پاس ایک بچہ نظر آ رہا تھا۔  
 بالواسطے سے سمجھنی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ بچہ ہے یا بچی؟ وہ جو بھی  
 تھیں اسے دیر تک نہ دیکھ سکا۔ کیونکہ اتنا بڑا اس کا اپنا بچہ بھی تھا۔ تصویر کو دیکھتے ہی اس  
 لڑکھنے لگا تھا۔ اس نے مرہی آواز میں کہا ”سب کے سب مر چکے ہیں۔“  
 اس نے فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔ پھر کسی سے کہنے لگا۔

”بہت ہی المناک حادثہ ہوا ہے۔ ایسے حادثہ میں کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکتا۔ اب ان  
 کھل کو دہاں سے لانے کا مسئلہ ہے کیونکہ وہ عمودی چٹان بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔“  
 وہ فون پر گفتگو کر رہا تھا اور سارجنٹ محمد بشیر کے آر پار ان تصویروں کو دیکھ رہا  
 ایک بار کی وہ چونک کر اچھل پڑا اور چیخ کر بولا۔

”ہر اسے دیکھیے۔ یہ۔ یہ اس تصویر کو دیکھیے بچہ زندہ ہے۔“

کیپٹن کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ کر گر پڑا۔ اس نے بھی جواباً حیرت سے چیخ کر پوچھا  
 بالوائی بچہ زندہ ہے؟“



چولے کی آنچ دو طرفہ تھی۔ ایک طرف سالن پک رہا تھا۔ دوسری طرف بانو پک رہی  
 تھی۔ اس کے داغ کے چولے پر آصف کی یادیں ابل رہی تھیں۔ ایسا تو ہوتا ہے کہ ایک  
 ماں جاتا ہے تو دوسرا اس خالی دل کے آنگن میں آجاتا ہے۔ آج سرتاج حسین آ رہا  
 تھا۔ اسی طرح آصف بھی آیا تھا بلکہ وہ عشق و محبت کے مراحل سے گزر کر نہیں بلکہ  
 بے سارے انداز میں دلہانوں کے گھونگھٹ تک پہنچ گیا تھا۔

بہارنے گھونگھٹ کے پیچھے سے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ ماں نے پہلے ہی سمجھا دیا تھا  
 کہ بچی! امرو کی صورت شکل نہیں دیکھی جاتی۔ بس یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں کا  
 ٹھیکہ اور پرائی نظموں سے بچا کر رکھ سکتا ہو۔ وہ جیسا بھی ہو آخر مجازی خدا ہوتا  
 ہے۔“

ماں نے آصف کو بیٹی کے لیے پسند کیا تھا اس لیے شادی سے پہلے صفائی پیش کر دی  
 تھی کہ آصف بہت زیادہ خوب صورت نہیں ہے اور بد صورت بھی نہیں ہے۔ وہاں ہر

”ہیلو“ میں کنٹرول ٹاور سے ریڈیو آپریٹر بول رہا ہوں۔ فلائنگ کلب سے ایک چارٹرڈ  
 کیے ہوئے طیارے ایف سی ون ٹوا نو کا پائلٹ خاموش ہے، بار بار کال کرنے کے باوجود  
 جواب نہیں مل رہا ہے۔ اس طیارے کو فوراً تلاش کیا جائے۔“

دوسری طرف سے کنٹرول سینٹر کے کیپٹن نے پوچھا۔

”اس طیارے سے آخری بار کب رابطہ ہوا تھا؟“

”صبح ساڑھے نو بجے۔ اس وقت وہ شمال کی طرف یہاں سے پچیس میل کے فاصلے  
 تھا۔“

”ٹھیک ہے۔ ابھی ایک پارٹی اسے تلاش کرنے کے لیے روانہ کی جائے گی۔“

اس گفتگو کے میں منٹ بعد ایک طیارہ شمال کی جانب پرواز کر رہا تھا۔ وہاں سے فاصلہ  
 زیادہ نہ تھا۔ جلد ہی اسے سرچ پڑل کے پائلٹ نے اس سیاہ عمودی چٹان کی ٹوٹی ہوئی اٹلی  
 دیکھ لی۔ پھر طیارے میں بیٹھنے والے سارجنٹ کو اطلاع دی۔

”ہم جائے حادثہ کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ کیمرے تیار رکھے جائیں۔ میں عمودی  
 چٹان کے اطراف دو چکر لگاؤں گا۔ میرا خیال ہے دو راونڈ کافی ہوں گے۔“

سارجنٹ کا جواب ملتے ہی پائلٹ ایک دائرہ کی صورت میں طیارے کو موڑنے لگا۔  
 کیپٹن آنکھوں سے دوربین لگا کر دیکھنے لگا۔ چٹان کی وسیع آغوش میں ایک ٹوٹا ہوا ٹکڑا ہوا  
 طیارہ نظر آ رہا تھا۔ کیپٹن نے دوربین سے نظریں ہٹا کر دوسری کھڑکی کی جانب دیکھا وہاں  
 سارجنٹ کیمرے پر جھکا ہوا تصویریں اتارنے میں مصروف تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اتنی  
 طیارے کے پر خفے اڑ گئے ہیں۔ کیا انسانی جسم سلامت ہوں گے؟“

اس کا جواب تصویروں سے مل سکتا تھا۔ پینتالیس منٹ کی پرواز کے بعد جب وہ  
 کنٹرول سینٹر میں واپس آئے تو سارجنٹ فوراً ہی تصویروں کو ڈیولپ اور اطلاع کرنے  
 ڈارک روم میں چلا گیا۔ کیپٹن بے چینی سے ادھر ادھر شہلے لگا۔ بے چینی اس قدر تھی کہ  
 بار بار سکرٹ کے لمبے لمبے کس لگا رہا تھا۔ ایک وقت آتا ہے کہ انتظار کی گھڑیاں  
 ہو جاتی ہیں لہذا وہ گھڑیاں بھی گزر گئیں۔ سارجنٹ ڈارک روم سے باہر آیا پھر اس نے کیا  
 تصویریں سامنے میز پر پھیلا دیں۔

کیپٹن محمد بشیر شیشہ اٹھا کر باری باری ان تصویروں کو دیکھنے لگا جہاز کے ٹکڑے ہوئے

تپ مڑیں۔ آپ کو اپنی محنت مزدوری سے میرے اخراجات پورے کرنے بابا بھرم کی بات نہیں ہے کہ آپ امی کی دکان پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں۔

تم نکلے شرم نہ دلاؤ۔ شرم تمہیں اتنی چاہیے۔ بتاؤ میرے لیے جیز میں کیا لائی ہو؟  
نہی مطالبہ نہیں کیا۔ اب بات نکلی ہے تو بولنا پڑتا ہے۔ تمہاری ماں بوڑھی ہو چکی  
نہی اکل اللہ کو پیاری ہو جائیں گی۔ پھر ان کی دکان تمہاری ہوگی اور تمہاری ہر چیز  
ہوئی ہے۔

ہر لائی سے دیدے پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھتی رہ گئی۔ حیرانی اس بات کی تھی کہ جیسا  
نہی سوجانہ تھا ویسا اس کا شوہر تھا۔ دکان کو اپنی بیوی کا جینز سمجھ رہا تھا اور اس کی  
نارے کا خواب دیکھ رہا تھا وہ صرف تین وقت کھانا اور اس کے ساتھ سونا جانتا تھا۔  
بابا کام اسے نہیں آتا تھا۔ وہ ایک دم سے پھٹ پڑی۔

تپ میری امی کے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اللہ کرے آپ کو موت آجائے۔  
سلام ہو تاکہ آپ ایسے ناکارہ کام چور اور مطلب پرست ہیں تو میں کبھی شادی نہ  
دور ہو جائے میری نظروں سے۔

ہر بڑبڑ کیے بغیر اطمینان سے منگلتا ہوا بابا ہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی بانو کے سر  
پل کر گیا اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ آخر اپنے سساک سے کچھ تو لگاؤ پیدا ہو جاتا  
نکل پھار پڑا ہی کیوں نہ ہو، سر کو ڈھانپ تو دیتا ہے۔ دنیا والے اسے سر سے تنگی تو  
کہہ سکتے تھے میں وہ بھول گئی تھی کہ مجازی خدا خواہ کیسا ہی ہو اس کی شان میں  
نہیں کرنی چاہیے۔ اب وہ چلا گیا تو غصہ دھیم پڑ گیا اور غلطی کا احساس ستانے لگا۔  
ت کو دکان بند کر کے آئی تو اس نے تسلی دی۔

مٹی گھبراؤ نہیں وہ آجائے گا۔ اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ محنت سے چار  
انگہ ہے۔ یہاں مفت کی روٹیاں ملتی ہیں اس لیے وہ ضرور آئے گا۔

گھر رات کو نہیں آیا۔ صبح بانو، دکان کھولنے جایا کرتی تھی اس روز نہ جاسکی۔ اس  
کہہ رہا تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ ماں اس کی پریشانیوں کو سمجھ کر خود ہی دکان داری کے  
بابا کی۔ دپہر کو جب وہ روٹیاں پکا رہی تھی تو وہ بھوکا پاسا اگر باورچی خانے میں بیٹھ  
اے دیکھ کر بانو کیوں لگا جیسے وہ اپنا کوئی نہیں ہے مگر گھر کا ایک سامان ہے جو گم

وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ پتا نہیں کب ہندو مسلم فسادات شروع ہو جائیں اور ہندو  
غٹھے بانو کو اٹھا کر لے جائیں۔ ماں چھاتی جیتی رہ جائے گی کوئی عزت بچانے والا نہ ہوگا۔  
اگر اس کی شادی ہو جائے تو گھر میں ایک مرد آجائے گا۔ اس بات کا اطمینان رہے گا کہ  
غٹھے بے باکی سے حملہ نہیں کریں گے۔

حالات ایسے تھے کہ بانو کسی آئیڈیل کا تصور نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی خواہوں کے  
شہزادے کا انتظار کرنے کے لیے سال دو سال جوانی کی وہ بلیز پر بیٹھی رہ سکتی تھی۔ آئے دن یہ  
خبریں سننے میں آتی تھیں کہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں مسلمانوں کے خون سے  
ہولی مچھلی جا رہی ہے۔ ان کے شہروں میں آگ اور خون کا یہ کھیل کسی بھی وقت کھلا  
جاسکتا تھا۔ اسی گھبراہٹ اور افزائش تفریق میں وہ دلہن بن کر آصف کی پناہ میں آئی۔

آصف ایک دلا پتلا سانو جوان تھا۔ صورت اچھی تھی نہ بری، کوئی بھی جوان لڑکی  
اسے محبوب کے روپ میں نہیں، صرف شوہر کے روپ میں قبول کر سکتی تھی۔ بانو نے بھی  
اسے قبول کر لیا۔ شادی کے بعد ایک ماہ تک وہ گھر میں پڑا رہا۔ تین وقت کھانا تھا ہر  
ڈکارس لیتا ہوا باہر تفریح کے لیے نکل جاتا اور رات کو واپس آکر محبت کے فرائض ادا کرتا  
تھا۔ ایک دن بانو کی ماں نے نوک دیا۔

”بیٹا! مرد محنت کرتے اچھے لگتے ہیں۔ تمہیں کوئی کام کرنا چاہیے۔“  
”ماں؟ اس دہس میں مسلمانوں کو کام کہاں ملتا ہے۔ یہاں کی بھوک جتنا میں  
جیسوں کی تعداد زیادہ ہے۔“

”ایسا نہ کو بیٹا! یہاں کروڑوں کی تعداد میں مسلمان ہیں۔ آخر وہ کسی نہ کسی طرح  
سے زندگی گزار رہے ہیں۔“

”پتا نہیں کس طرح گزار رہے ہیں، مجھے کوئی راستہ بھانپ نہیں دیا۔ اس لیے آپ کا  
داماد بن کر یہاں آ گیا۔ آپ کی دکان اچھی چل رہی ہے۔ اللہ دے رہا ہے تو مجھ جیسے ایک  
بندے کو بٹھا کر کھلانے میں کیا نقصان ہے؟“

اس کی باتیں سن کر بانو کو بہت غصہ آیا۔ اس کی ماں اپنے داماد سے یہ نہیں کہہ سکتی  
تھی کہ وہ ان پر بوجھ بنا ہوا ہے مگر ایک بیوی اپنے شوہر سے لڑ سکتی تھی۔ ماں کے جانے کے  
بعد اس نے کہا۔

ہونے کے بعد مل گیا ہے۔ اسے خوشی ہوئی لیکن غصہ دکھانا بھی ضروری تھا۔ اس نے اپنے سے دوستوں کا چھاپہ اس کے آگے بٹھادیا۔ ہانڈی سے سامن نکال کر دیا۔ اس طرح غصہ کی دکھایا اور اس کی خاطر تواضع بھی کی۔ پھر طنز بھی کیا۔

”جس کے ساتھ رات گزار کر آئے ہو کیا اس نے روٹی نہیں کھلائی۔“

اس نے ایک لقمہ چباتے ہوئے کہا۔

”میں نے رات اسٹیشن کی سرائے میں گزار دی ہے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا۔ ہوا پیاسا تمہیں یاد کرتا رہا۔“

بانو کا دل بھر آیا۔ بیچارہ کل سے بھوکا تھا۔ وہ اس سے محبت کرتا ہو یا نہ کرتا ہو مگر بھوک پیاس کے وقت مجھے یاد کرتا ہے، کسی نہ کسی طرح میرا محتاج ہے۔ بیچارہ دوست کھالیا کرے گا تو کون سا بوجھ بن جائے گا۔ کم از کم نام تو ہو گا کہ اس گھر میں ایک ملازم رہتا ہے۔“

یہ سوچ کر وہ محبت سے سمجھانے لگی ”آپ کیسے ملازمت کے لیے پریشان نہ ہوں۔ میں صبح سے دوپہر تک دکان میں بیٹھتی ہوں، میری جگہ آپ دکان سنبھالا کریں۔ اپنی خوش ہو جائیں گی کہ آپ کو مزد داری کا احساس ہو گیا ہے۔“

آصف راضی ہو گیا۔ بانو تین دن تک اس کے ساتھ دکان پر جاتی رہی۔ اسے ہم چیزوں کی قیمت اور گاہکوں سے نمٹنے کے کر سکتا ہی رہی۔ جتنا اس نے سکھایا۔ آصف نے اس سے کچھ زیادہ ہی سیکھ لیا۔ آئے دن موقع پا کر گلے سے روپے چرانے لگا۔ بانو کی ہلکے کا وزن خوب سمجھتی تھی اس نے سمجھ لیا کہ دکان کی آمدنی میں کچھ ہیرا پیمیں ہوتی ہے مگر ساس اور داماد کے رشتہ کی لاج بھی رکھتی تھی اس لیے اس نے روزانہ دو چار روپے کی چوری برداشت کر لی۔ بانو کو بھی سمجھا دیا کہ آصف کو شرمندہ نہ کرو۔ سمجھ لو کہ وہ گلے میں سے اپنا جیب خراج نکال لیا کرتا ہے۔

ماں بیٹی بڑی مصلحت سے کام لے رہی تھیں مگر چور کا حوصلہ بڑھنے لگا۔ رندہ رشتہ چلا کہ وہ نشہ کیا کرتا تھا۔ کنگال ہونے کے بعد نشہ چھوٹ گیا۔ اب پھر جیب میں خاصی رقم رہنے لگی تو اس نے وارو پینا شروع کر دی۔ اس پر ماں بیٹی کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ایک رات بانو نے اسے خوب ستائیں۔

”میں شرم نہیں آتی۔ شراب پی کر گھر آتے ہو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم شرابی بن چکے ہو اور بے غیرت ہو۔ تمہاری بیوی بن کر رہنے سے بہتر ہے کہ میں بیوہ بن جاؤں۔ اگر تمہیں موت نہیں آتی ہے تو تمہیں جا کر ڈوب مرو۔ مرنے کا حوصلہ نہیں بنانے سے پہلے اس گھر سے چلے جاؤ۔“

بھونکی کی حالت میں بیوی کی کھری کھری باتیں سنتے سنتے سو گیا۔ آدھی رات کے ڈھکیا اپنی بد نصیبی کا دکھڑا روتے روتے سو گئی۔ صبح ماں کے چپٹے چلانے سے اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

”اف کماں ہے؟“

بانو اس کا بستر خالی نظر آیا۔ ماں نے کہا۔

”میں معلوم ہے کہ میں نے دکان کا نیا اشاک خریدنے کے لیے پانچ ہزار روپے لئے دو روپے نہیں ہیں۔ ذرا تم اپنی الماری تو دیکھو۔“

بانو الماری کے پاس گئی تو وہ کھلی ہوئی تھی جس دراز میں اس کے زیورات رکھے تھے اب وہاں ایک تہ کیا ہوا کاغذ نظر آ رہا تھا اس نے کھول کر پڑھا لکھا تھا۔

بانو یکدم اب تم میری بیوی نہیں ہو۔ تم نے کہا تھا کہ مجھ جیسے کی بیوی بننے کے بیوہ بن کر رہنا چاہتی ہو۔ مجھ میں مرنے کا حوصلہ نہیں ہے اس لیے بہ ہوش و حواس بلا تونے کر جا رہا ہوں۔ میری تلاش فصول ہے۔ فقط آصف۔“

ظان بنا دے پڑتے ہی بانو پکرا کر گرنے لگی۔ ماں نے بڑی مشکل سے اسے سنبھال کر باہر پھر دیاں سے بھاگی بھاگی محلے کی لیڈی ڈاکٹر کو بلا لائی۔ اس نے ڈاکٹر کو یہ نہیں بتایا کہ کسی قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ پچھلی رات تک وہ سناگن تھی اور اب اس کا سانس نہ رہا ہے۔ اجاڑنے والا گھر سے نقدی اور زیورات بھی سمیٹ کر لے گیا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر کو صرف اتنا ہی بتایا کہ پچھلے دو دنوں سے بانو علیل تھی، آج بستر سے اٹھ کر گر پڑی۔

لیڈی ڈاکٹر نے اس کی نبض دیکھی پھر اسے ادھر ادھر ٹٹول کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”خبرائے کی بات نہیں ہے ماں جی! تمہاری بیٹی ماں بننے والی ہے۔“

ان پندرہ لمحوں تک گم صم کھڑی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ خبر سن کر اسے

بچاتے ہوئے کہا۔

”اب ان تصویروں کو ذرا غور سے دیکھیں۔“

کچن محراب شیشہ ہاتھ میں لے کر توجہ سے دیکھنے لگا۔ سارجنٹ کی آواز اس کے بلبلاتری تھی۔

”ہمارے طیارے نے عمودی چٹان کے دو چکر لگائے تھے۔ یہ تصویر پہلے راؤنڈ لائی گئی تھی۔ اس تصویر میں بچہ بے حس و حرکت پڑا ہوا ہے۔ دوسرے راؤنڈ میں یہ لاری گئی تھی، اس میں بچے کے ہاتھ پاؤں ذرا اٹھے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ وہ ہاتھ ٹھک رہا ہے۔“

بچوں کے جس ہاتھ میں تصویر تھی، وہ ہاتھ کانپنے لگا۔ بچہ ہاتھ پاؤں جھٹک رہا تھا یعنی دلی کے لیے لڑ رہا تھا۔ کیپٹن کا دل تڑپ تڑپ کر کہہ رہا تھا کہ اس کا اپنا بچہ بارہ ہزار پینٹی پر پہنچ کر ہاتھ پاؤں ہلاتے ہوئے سگنل دے رہا ہے ”پپا آؤ مجھے بچاؤ۔۔۔“ وہ بچہ صرف کیپٹن کو نہیں، ابھی ساری انسانیت کو تڑپانے والا تھا۔ اس نے فون کا اٹا کر نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا۔

حس کیپٹن ہری رام بول رہا ہوں۔ طیارے کو جہاں حادثہ پیش آیا ہے وہاں ایک بچہ ہے وہاں فوراً امدادی پارٹی روانہ کرو۔ مجھے بلا تاخیر یہ رپورٹ ملی چاہیے کہ بچے کا کیا ہے۔“

بچہ دینے کے بعد کیپٹن نے فلائنگ کلب سے رابطہ قائم کیا۔

”حس کیپٹن ہری رام کنٹرول سینٹر سے بول رہا ہوں۔ آپ فوراً تفصیلی رپورٹ پیش کہ کس شخص نے طیارہ ایف سی ون نو او نو چارٹر کیا تھا؟ طیارے میں کتنے افراد تھے؟ ایک بچہ بھی تھا؟ اس کا تعلق کس سے ہے؟“

اس کے بعد وہ کسی تیسری جگہ نمبر ڈائل کرنے لگا مگر اب وہ تیار نشان نہیں تھا۔ راہوں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹیلی فون کی کھینیاں جھج رہی۔ ہر فون کی جھج و پکار کے پیچھے جو لوگ تھے ان کے دماغوں کی اسکرین پر صرف ایک ہی تھا جو دو لاشوں کے پاس پڑا ہوا زندگی کو پکار رہا تھا۔

○☆☆○

خوش ہونا چاہیے یا اپنا سر پینٹا چاہیے۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ بیٹی ماں بننے والی تھی افسوس کا مقام یہ تھا کہ وہ ایک چور کی اولاد کو جنم دے گی۔

بانو کو ہوش آنے کے بعد لیڈی ڈاکٹر اسے بھی خوش خبری سنا کر چلی گئی۔ وہ طلاق کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ خزاں میں پھول نہیں کھلتے اگر کھلتے بھی ہوں تو خوشبو سے خالی ہوتے ہوں گے۔ بانو بھی ایسے وقت ماں کی متا سے اور بچے کی خوشبو سے خالی رہی۔ بھوکی بات۔ دگی کہ کبھی متا جو ش میں آئے گی ابھی تو اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی کوئی مہ پر نہیں بلکہ بھاگنے والے چور کے نقش قدم ہیں۔

اس روز ماں بیٹی نے دکان نہیں کھولی مگر میں تمام دن چپ چپ سی رہی۔ بانو حلقہ عورت بن کر اپنی توہین محسوس کر رہی تھی۔ یہ خیال اسے مار رہا تھا کہ پاس پاس کی سائیکس اب اسے اپنے پاس نہیں بٹھائیں گی کیونکہ وہ ساگ کی دلیز کے بار پر پھینک دی گئی تھی۔ اب اس کی ساری حیثیت قابل فخر نہیں تھی۔ ایسا سوچتے وقت وہ خود کو ایک خوب صورت بچے کے تصور سے ہلانے کی کوشش کرتی رہی۔ اپنے دل کو سمجھاتی رہی کہ اس دنیا میں کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ صرف اپنے جگر کا گلزار ہی اپنا ہوتا ہے۔ وہ اپنے بچے کے سارے زندگی گزار دے گی۔

دوسری طرف ماں سوچ رہی تھی کہ بانو اپنی پہاڑی جوانی کیسے گزارے گی؟ صرف بڑھاپا ایسا ہے جو اولاد کے سارے گزرتا ہے ورنہ جوانی کسی جوانی کا ہاتھ تھا ہے بغیر آنے نہ بڑھے تو کہیں نہ کہیں ٹھوکر کھا جاتی ہے۔ لہذا اس بچے کو پیدا نہیں ہونا چاہیے اگر پیدا ہو جائے تو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ ایک تو یہاں مسلمان لڑکوں کا قحط پڑا ہوا ہے اگر کوئی باؤ کے حسن سے متاثر ہو کر آئے گا تو اسے بچے والی دیکھ کر واپس چلا جائے گا۔ بانو تو آئندہ بھی ماں بن سکتی ہے لیکن گود میں ایک بچہ رکھ کر سہاگن نہیں بن سکتی۔

ماں نے دل پر جبر کرتے ہوئے اور دونوں مٹھیاں سختی سے پیچھتے ہوئے فیصلہ کیا۔  
”وہ بچہ زندہ نہیں رہے گا۔“

○☆☆○

”ہاں وہ بچہ زندہ ہے۔“

میز پر گیلی تصویریں بکھری پڑی تھیں۔ سارجنٹ نے دو عدد تصویریں اٹھا کر کیپٹن کی



ہوتے ہیں۔ لیکن وقت بڑا سنگدل ہوتا ہے وہ ایک ہی جھٹکے میں ماں کو بھی سنگدل بنا رہا ہے۔ ایک رات بانو دردِ زہ سے تڑپ رہی تھی اور باہر قیامت کا شور مچا تھا۔ بہت سے "ہر ہر مادیو" کی آوازیں آرہی تھیں اور محلے والے جواباً "اللہ اکبر" کے نعرے لے رہے تھے۔

لوے محلے میں وہی ایک گھر ایسا تھا جہاں کوئی مرد نہیں تھا، کوئی محافظ نہ تھا۔ ماں نے عالم میں کبھی بانو کے پاس بیٹھ جاتی تھی، کبھی بھاگی بھاگی دوسرے کمرے میں جا کر ٹاٹا کھول کر دیکھتی تھی۔ باہر جو انسان تھے وہ دردِ زہ سے بن گئے تھے۔ نہ عورتوں کی عزت و فائدہ انسانی زندگی کی کوئی قیمت تھی۔ پانی کی طرح لو بہایا جا رہا تھا۔

ماں کو واپس آنے میں دیر ہوئی تو وہ درد سے تڑپتی اور کراہتی ہوئی بستر سے اٹھ گئی۔ باہر والے کر دیوار تک پہنچ گئی پھر اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر کا منظر دیکھا تو اسے ہچکچاہٹ گئی۔ ایک وحشی دردِ زہ ایک نوزائیدہ بچے کو فضا میں اچھال کر نیزے کی اتنی بلکہ اتنا اس سے زیادہ وہ کچھ نہ دیکھ سکی۔ ایک دم سے جھک کر فرش پر گر پڑی۔

ماں اپنی بیٹی کی چیخ سن کر دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی تو اب بانو تنہا نہیں تھی اس کے پاس فرش پر ایک نوزائیدہ بچہ خون میں لتھڑا ہوا بیچ رہا تھا۔ باہر دردِ زہ لوہا کر زندگی چھین رہے تھے، اندر ایک ماں اپنے لوہے کے چھینٹوں سے ایک ننھے انسان کو مار رہی تھی۔ وہ مارے دہشت کے یہ بھول گئی تھی کہ دردِ زہ کیا ہوتا ہے اور وہ نہ کہ کرب سے کیسے گزر گئی۔ اسے ایک ہی منظر یاد تھا کہ بچہ نیزے پر اچھالا جا رہا تھا۔ منظری حالت میں چھیننے لگی۔

"اے چھپاؤ! میرے بچے کو بچاؤ۔ وہ ظالم اسے چھین کر لے جا رہے ہیں۔ وہ بچے کو مار ڈالیں گے۔"

اس کی ماں نے بچے کو کپڑے میں لپیٹ کر سینے سے لگایا۔ پھر روتے ہوئے بولی۔

"محباب تو خدا ہی ہماری مدد کر سکتا ہے۔ اس دن کے لیے سمجھاتی تھی کہ اسے جہنم بہ مذہب دردِ دل کی اس دنیا میں ہم اپنی حفاظت نہیں کر سکتے پھر اس بچے کو کہاں لے جائیں گے؟"

باہر ایک مکان دھڑا دھڑا چل رہا تھا اس کے دہکتے ہوئے شعلوں کا عکس کھڑکی کے

آٹھ ماہ سے وہ بچہ بانو کے وجود میں چھپ کر کوشش بدل رہا تھا۔ وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر سوچتی رہتی تھی۔

"میرا بچہ کیسا ہوگا؟ اپنے باپ کی طرح یا میری طرح؟"

ماں نے بار بار سمجھایا "وہ جیسا بھی ہو" اسے اپنے دل سے نوج کر پھینک دو۔ نہیں سمجھاتے سمجھاتے آٹھ ماہ گزر گئے۔ اگر تم پہلے ہی ماں جانتیں تو وہ بچہ آسانی سے ضائع ہو جاتا۔ اب بھی وقت ہے بانو اپنے آپ پر رحم کرو۔"

"امی کیا آپ ہوش و حواس میں نہیں ہیں؟ کیا آپ میرے بچے کی قاتل بننا چاہتی ہیں؟"

"نہیں بیٹی! میں تم دونوں کی بھلائی چاہتی ہوں۔ تمہاری بھلائی اس میں ہے کہ تم پہلے جیسی بن جاؤ۔ ہم یہ مکان فروخت کر کے کسی دوسرے شہر چلے جائیں گے۔ کوئی یہ نہ جان سکے گا کہ کبھی تم سماگن بنی تھیں اور ایک بچے کو جنم دیا تھا۔ بچے کی بھلائی اس میں ہے کہ وہ کسی فلاحی ادارے میں پرورش پائے۔"

"نہیں امی! میں اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم کے ایک حصے کو کاٹ کر نہیں پھینک سکتی۔ میں اس معصوم سے جدا ہونے کا تصور نہیں کر سکتی۔"

"تم کبھی آصف سے بھی جدا ہونے کا تصور نہیں کرتی تھیں۔ مگر اب اس کے لیے صبر کر لیا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ بچے کے لیے بھی صبر آجائے گا۔"

"آپ ضد کیوں کر رہی ہیں۔ میں اب شادی نہیں کروں گی، بس دیکھ لی مرہ کی ذات۔ ایک نے مجھے داغ لگایا ہے، دوسرا کوئی آئے گا تو مجھے داندھار کہہ کر طعنہ دے گا۔ آپ ایسا باتیں نہ کریں ورنہ میں گھر سے چلی جاؤں گی۔"

ماں ڈر کر خاموش ہو گئی کہ کہیں بیٹی سے بھی ہاتھ نہ دھو بیٹھے۔ وہ مستہ کو سمجھ رہی تھی۔ جیسے وہ اپنی بیٹی کی آئندہ زندگی سنوارنے کے لیے دن رات پریشان رہتی تھی اسی طرح بیٹی اپنی مستہ سے مجبور تھی اور خیال ہی خیال میں بچے کو سینے سے لگا کر رہتی رہتی تھی۔ یہ نہیں سوچتی تھی کہ ایک بچے کی وجہ سے اس کی جوانی غارت ہو جائے گی۔

جب وہ بانو کو سمجھا کر تھک گئی تو یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ وقت کی کوئی ٹھوکر ہی اسے سمجھائے گی۔ یہ آج کل کے بچے اپنی من مانی کرتے ہیں بزرگوں کے تجربات کو بکھر

انہوں نے آکھیں بیچ لیں۔ پھر ایک طویل سانس اس طرح چھوڑی جیسے اندر سے ہاتھ باہر نکال رہا ہو۔ خالی تودہ ہو گئی تھی اب لٹنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اب باہر آئی قاتل اس کے دروازے پر نہیں آسکتا تھا۔ اب وہ ایک مفلس کی طرح آرام کرتی تھی۔

دوسری صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس پاس کا ماحول ایسا خالی، ایسا بے نظر آیا جیسے اتنی بڑی کمان بدلتی ہوئی آخری کپڑا بھی اتار لیا گیا ہو۔ ماں سامنے کھڑی تھی اس کی جھکی جھکی لڑکی کہہ رہی تھیں کہ اس نے ایک معصوم بچے کو اس کی ماں سے جدا کر دیا ہے۔ بانو گھول میں پھر آنسو آگئے اس نے پوچھا۔

میرا دل کہاں ہے؟ میرے بیٹا ہوا تھا؟  
”اب بالک آشرم میں۔۔۔“

”بالک آشرم؟“ بانو جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی ”آپ میرے بچے کو ہندوؤں کے ہاں کیوں چھوڑ گئی ہیں۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے امی؟“  
میں مجبور تھی بانو! مسلمانوں کی ہستی ویران ہو رہی ہے۔ یتیم خانے میں مگی تودہ خالی کونے پر اے گئے، باقی بھاگ گئے۔ یتیم خانہ کے کرنا دھرتا بھی نہیں تھے۔ میرے بات آئی کہ انسان، انسان کا دشمن ہوتا ہے، گمراہ مذہب کا دشمن نہیں ہوتا۔ ہم نفرت اور دشمنی نہیں سکھاتا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ جس دھرم کے چند لوگ بچے کو مار ڈالنا چاہتے ہیں وہ بچہ فی الحال اسی دھرم کی پناہ میں محفوظ رہ سکتا ہے۔ انہوں نے تک ماں کو دیکھتی رہی پھر روتے ہوئے بولی۔

”اب نے بچے سے صرف اس کی ماں کو نہیں اس کے ایمان کو بھی چھین لیا۔ کیا ایسا جنت آپ کے دل سے بھی ایمان نکل گیا تھا؟“  
”نہی ٹھننے دو۔ میں نے حالات سے مجبور ہو کر خدا کے بھروسے پر ایسا کیا ہے۔ خدا کے ساتھ تودہ آشرم میں بھی صاحب ایمان رہے گا۔“

”اب رہے گا امی۔ آپ مجھے بھلا رہی ہیں۔“  
”اب بھلاہو سمجھ کر صبر کرو“ اب یہاں سے چلنے کی تیاری کرو۔ ہم اس شہر میں نہیں آئے۔

راستے بانو کے چہرے پر پڑ رہا تھا جیسے خود اس کا چہرہ جل رہا ہو، اس کا دل سنگ رہا ہو۔  
”تھر تھرائی ہوئی آواز میں بولی۔“

”اے کہیں بھی چھپا دیجئے۔ اسے لے کر ماں سے بھاگ جائیے۔ میں صرف اپنے بچے کی سلامتی چاہتی ہوں۔ آپ میری فکر نہ کریں مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔“

”نہیں بانو! تم اپنے بچے کی سلامتی چاہتی ہو اور میں تمہاری سلامتی کے لیے زندہ ہوں۔ اب بھی وقت ہے، میری بات مان لو۔ میں اس بچے کو ایسی جگہ پہنچا دوں گی جہاں اس پر کوئی آج نہیں آئے گی۔“

”کہاں؟“ بانو نے دھڑکنے والے دل سے پوچھا۔  
”کہیں بھی یہ نہ پوچھو۔ اپنے دل پر پتھر رکھ لو۔ تم اسے کبھی نہیں دیکھ سکو گی مگر یہ خدا کی سلامتی رہے گا۔“

”تن۔۔۔ نہیں میں اپنے بچے۔۔۔۔۔۔“  
اس کا انکار اس کے حلق میں ایک گڑبگڑ کے قریب ایک کرخت آواز نکلی۔  
دی۔ پھر شعلوں کی روشنی میں ایک سکھ کا غنی چہرہ نظر آیا۔ اس کا کندھا سا لوہے کا بچھا ہوا تھا۔ وہ ”ست سری اکال“ کہتا ہوا کھڑکی کے راستے سے کمرے میں آنا چاہتا تھا۔ اسی دن اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ کسی نے اس کی پشت پر خنجر گھونپ دیا تھا۔ وہ کھڑکی پر الٹ کر ہار کر پڑا۔ ماں نے دوڑ کر کھڑکی کو اندر سے بند کر دیا اور روتے ہوئے بولی۔  
”بانو! تم خود غرض ہو۔ یہ ممتا نہیں بچے سے دشمنی ہے۔“

وہ بھاری انداز میں چیخنے لگی۔

”میں خود غرض نہیں ہوں، میں اپنے بچے کی دشمن نہیں ہوں۔ اسے لے جائیے“  
ابھی لے جائیے۔ میں اس کی جدائی برداشت کر لوں گی مگر یہ الزام نہیں اٹھاؤں گی کہ ماں کی محبت ہی بچے کو مار ڈالتی ہے۔“

ماں تیز قدموں سے چلتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی تاکہ اب بچے کی تواضعی بانو کے کان میں نہ پڑے۔ تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ باہر کا ہنگامہ سرد پڑتے ہی وہ بچے کو یتیم خانے میں چھوڑ آئے گی۔  
بانو کمرے کے فرش پر تھپڑی ہوئی تھی۔ جب بچہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے

آشرم میں کیوں چھوڑے گی۔“

”میں اجس کا کوئی باپ نہ ہو اس کا کوئی دھرم نہیں ہوتا۔ وہ بچہ اس بوڑھی کا نہیں بلکہ اس کی کسی جوان بہن یا بیٹی کا ہوگا۔“

بوڑھی ملازمہ کی یہ بات میرا کے دل کو لگ گئی کہ جس کا باپ نہ ہو اس کا کوئی مذہب نہیں ہوگا۔ واقعی دنیا کا ہر مذہب مرد کے نام سے پچایا جاتا ہے۔ محمد احمد رام ایٹور اور بھگوان جی ہاموں والے کسی باپ کے جائز بچے کا مذہب سمجھ میں آجاتا ہے۔ یہ مرد کے بچے فخر کی بات ہے اور یہ بھی بڑے فخر کی بات ہے کہ اس کے ناجائز بچے کا مذہب ہم میں نہیں آتا۔ جب کہ وہ اپنی سوسائٹی میں بیٹا دروازے نمازی کی باتیں کر رہا ہو گا یا نہ ہو گا۔ اس کی موت کے سامنے ڈھنڈوت کر رہا ہو گا یا مسیح کے بت کے سامنے سینہ پر صلیب کا نشان بٹا رہا ہوگا۔ کیا مذہب یا دھرم کا تقدس اسی طرح قائم رہ سکتا ہے؟

میرا نے پوچھا ”جو بچہ تمہارے دروازے پر پڑا ہوا تھا کیا اسے آشرم میں رکھ لیا گیا؟“

”ہاں یہ آشرم ایسے ہی بچوں کے لیے ہے۔“

”مگر آشرم کے کھاتے میں بچے کے باپ کا نام اور دھرم کیا لکھا جائے گا؟“

”میاں بچوں کے ماں باپ کے نام نہیں لکھے جاتے کیونکہ یہاں آنے کے بعد بچوں کے نام کے تمام رشتے ناطے ٹوٹ جاتے ہیں اور وہ بچے ہمارے دھرم کے ہو کر رہ جاتے۔“

”ہاں جب کوئی غلط نہ رہے تو بچے کسی بھی دھرم کی گود میں جاسکتے ہیں۔ ماں باپ کو یہاں سے اعتراض کرنے کا حق نہیں رہتا۔“

میرا نے تھکے ہوئے انداز میں آنکھیں بند کر لیں مگر دوسرے ہی لمحہ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سامنے کمرے کا دروازہ کھل گیا تھا۔ کھلے ہوئے دروازے کے اندر ایک عورت کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے بال کھڑے ہوئے تھے۔ بدن پر ایک کالا لباس تھا اور اس کے آس پاس دو سپاہی کھڑے ہوئے تھے ان کے پیچھے ایک ایسے ایکٹر نظر آ رہا تھا۔

میرا نے اس قیدی حسینہ کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ بھارتی فلموں کی سب سے مشہور

اتاتھ بالک آشرم کے ایک کمرے میں اٹھائیس برس کی ایک حسین عورت کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے بال شانوں تک ترشے ہوئے تھے۔ سیاہ رنگ کے ماتھی بلاؤز اور اسکرٹ میں اس کے حسن کی چاندنی کھل رہی تھی۔ اس کا نام میرا تھا۔

میرا روزنامہ سندیس کے صفحہ اول کی رپورٹر تھی۔ اخبارات کے حلقے میں وہ بہت ہی تیز طرار سمجھی جاتی تھی۔ لیڈروں اور سیاستدانوں کے راز اڑا کر انہیں اپنے اخبار کی زینت بنادیتی تھی۔ بڑے بڑے لوگ اس سے خوف زدہ بھی رہتے تھے اور غار بھی کھاتے تھے۔ لیکن اس روز میرا تیزو طرار نظر نہیں آ رہی تھی اور نہ ہی بالک آشرم سے کسی بچے اور اس کی ماں کا کوئی راز چر ا اخبار میں شائع کرنے کی غرض سے آئی تھی۔

وہ خود ایک رازین کر اس آشرم میں پہنچی تھی اور بار بار اس دروازے کو دیکھ رہی تھی جس کے پیچھے پنڈت جی کسی سے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ وہ اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ کتنے ہی آرام سے بیٹھو پر انتظار کانٹنے کی طرح جھمتا ہے۔ اس لیے وہ کمر پہلو بدل رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد آشرم کی بوڑھی ملازمہ اس کے پاس آئی تو وہ جلد سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ملازمہ نے کہا۔

”بیٹھو بیٹی۔ بیٹھ جاؤ۔ ابھی ذرا دیر ہے پنڈت جی خود ہی تمہیں بلائیں گے۔“

وہ بیٹھ گئی۔ ملازمہ نے سامنے ایک گکڑی کی چوکی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کیسا کج لک ہے۔ مائیں اپنے بچوں کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ آج سویرے میں آشرم کا دروازہ کھول رہی تھی۔ میں نے دیکھا ایک بوڑھی عورت ایک ننھے بچے کے ہمارے دروازے پر رکھ کر جا رہی ہے۔ میں نے اسے پکارا تو وہ بھاگتی چلی گئی۔ مجھے۔۔۔ کی بتا رہی ہے نہیں تو میں دوڑ کسا سے پکڑ لیتی۔“

میرا نے وقت گزارنے کے لیے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”تم نے اس عورت کو اچھی طرح دیکھا تھا؟“

”جی ہاں میں نے اسے دیکھا تھا۔ اس کے ماتھے میں سیندر نہیں تھا یا تو وہ (یہ وہ) ہوگی یا بھرم مسلمان۔“

”ایسے وقت جب کہ ہندو مسلم فسادات ہو رہے ہیں۔ ایک مسلمان عورت اپنے

”مجھے پنڈت گردھاری لال کہتے ہیں۔ بیٹی ہم جان بوجھ کر کسی دوسرے دھرم کے بچے  
 ہاں نہیں رکھتے۔ ہاں کوئی مجبوری ہو تو دوسری بات ہے۔ اب یہی دیکھو کہ آج  
 بے سوچے کوئی بوڑھی عورت ہمارے دروازے پر ایک بچے کو چھوڑ کر چلی گئی۔ ایسی  
 نہیں ہم بچے کو کہیں پھینک نہیں سکتے۔ بھگوان کسی کو اتنا کٹھور نہ بنائے۔“  
 بھوانے قدرے مایوس ہو کر پوچھا۔

”ٹپا آپ میرے بچے کو نہیں رکھیں گے؟ میں، میں ایک عیسائی ہوں۔“  
 ”بیٹی! تم اپنے دھرم کے انوسار اپنی عیسائی مشنری میں بچے کو رکھ سکتی تھیں۔ میں یہ  
 باپ بھوں گا کہ تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ روزنامہ سندیس کے ایڈیٹر سودیش مکرجی نے  
 باگرم پر راتھنکا کی تھی کہ ہم تم سے کچھ نہ پوچھیں، تمہارے بچے کو ہندو سمجھ کر  
 لیں۔ میں تم سے صرف یہ پوچھنے کے لیے بلایا گیا ہوں کہ بچے کا دھرم بدل جائے تو  
 لاکار نہیں ہوگا؟“

”میں یہ بات میری سمجھ میں آگئی ہے کہ ہر مذہب میں تھوڑے بہت شیطان ہوتے  
 مان کے پیچھے اگر کسی بھی مذہب کی پناہ میں آکر انسان بن سکیں تو یہ بڑی بات ہوگی۔  
 لاکار نہیں ہے۔“

”میں میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اب میرے من میں یہ بات کھٹکتی نہیں رہے گی کہ  
 نے کسی کے بچے کو اپنی اچھا سے اپنے دھرم میں شامل کر لیا ہے۔ اب تم جاسکتی ہو۔“  
 بھوجا جانے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ نہ سکی۔ وہ چٹکی پاتی ہوئی بولی۔

”مجھے بول لگ رہا ہے جیسے میں اپنی آؤمی جان یہاں چھوڑ کر جا رہی ہوں۔“  
 اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پنڈت گردھاری لال نے کہا۔

”تم بڑی دھیرج والی ہو۔ اتنی خاموشی سے آنسو بہا رہی ہو۔ دوسری مائیں تو یہاں گود  
 کرتے دھڑاڑیں مار مار کر روتی ہیں۔ ابھی تم نے ایک ماری کو اسی طرح چیتنے  
 کے اور روٹے دکھا ہوگا۔“

”البتہ میں سر ہلا کر بولی۔“  
 ”ہاں بیٹو رانی کی آنکھ اور میرا دل دونوں ساتھ ساتھ دو رہے تھے۔ میں، میں یہاں  
 جانے سے پہلے آہ آخری بار اپنے بچے کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس آشرم میں یہ میرا

اداکارہ بیٹو رانی تھی۔ دیش کے تمام فلمی رسالے اور نوجوانوں کے تمام بیوروں میں اس کی  
 تصویروں کی بغیر مکمل نہیں ہوتے تھے۔ اب وہ قیدی کے لباس میں اور آشرم کے پس منظر  
 میں ایسی تصویر بنی ہوئی تھی جسے وہ خود اپنی زندگی کے کسی بھی خوب صورت کمرے میں لگا  
 پسند نہ کرتی۔ ایسی تصویریں تو صرف تقدیر کے بے حس کیمرے ہی اتارتے ہیں۔

اس کے پیچھے کھڑے ہوئے پولیس انسپکٹر نے کہا۔  
 ”تم رک کیوں گئیں آگے بڑھو۔“

بیٹو رانی چونک کر آگے بڑھ گئی۔ اس کے بوجھل قدموں سے پتا چل رہا تھا کہ کئی  
 قیامت سے گزر رہی ہے اور اپنے پیچھے اپنی زندگی کا اہم سرمایہ چھوڑ کر جا رہی ہے۔ وہ اپنے  
 چلتے رک گئی۔ جنونی انداز میں اپنی سرکوانکار میں ہلانے لگی۔

”نہیں نہیں۔ میں اسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ میرا لعل، میرا بچہ مجھے داہیں  
 کر دے۔“

وہ پلٹ کر واپس کمرے کی طرف بھاگنا چاہتی تھی مگر سپاہیوں نے پکڑ لیا۔ پھر انکڑ  
 کے حکم پر اسے کھینچ کر باہر لے جانے لگے۔ میرا کالج بک خانے لگا۔ ایک ماں کو اس کے بچے  
 سے جدا کیا جا رہا تھا۔ ایسا تو کوئی قانون نہیں ہے کہ عورت کے جسم کے کسی حصے کو کان کر  
 یا نوچ کر اس سے الگ کر دیا جائے۔ پھر وہ قانون کے محاذ اس جنم جلی کو زبردستی کمال لے  
 جا رہے تھے۔ اگر بیٹو رانی نے پاپ کیا تھا تب بھی دنیا کی کسی قانونی کتاب میں یہ نہیں لکھا  
 ہے کہ بچے کو اس کی پاپن ماں سے جدا کر دیا جائے۔ پھر یہ قصہ کیا ہے۔ دوسروں کے  
 رازوں کو ٹٹول کر کامیابی بنانے والی میرا نے سوچا۔ اس المناک منظر کے پیچھے ایک ماں اور  
 اس کے بچے کی دردناک داستان ہے اس داستان کو کریدنا چاہیے۔

بعض اوقات زندگی اتنی فرصت نہیں دیتی کہ دوسروں کی زندگی میں جھانک کر دکھا  
 جاسکے۔ میرا کا دھیان بٹ گیا۔ پنڈت جی نے دروازہ کھول کر کہا۔

”بیٹی میرا اندر آ جاؤ۔“

میرا سر جھکا کر دروازے کے پاس آئی۔ پھر پنڈت جی کے سامنے سے گزرتی ہوئی  
 کمرے میں آکر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ پنڈت جی نے دروازے کو بند کرنے کے بعد بڑے  
 دوسری طرف ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

کڑوا سیڑگی عمارت کے باہر اخبارات کے رپورٹوں اور فونوگرافوں کی بھیڑ لگی تھی۔ کچن ہری رام اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا سکرٹ کے کش پر کش لگا رہا تھا۔ میز کے بائیں طرف فلائنگ کلب کا لائسنس آفیسر رپورٹ پیش کر رہا تھا۔  
 ”مرا آج پندرہ ستمبر ہے۔ دو دن پہلے آج کے لیے طیارہ چارٹر کرایا گیا تھا۔ چارٹر نے اگلے کام ہمیش چند پٹنی تھا۔ وہ ہمیش اسٹیل ملز کے مالک تھے۔“

کچن رام نے پوچھا۔

”ہمیش چند آج فلائنگ کلب میں کب آئے تھے؟“

”مجھ پوئے نوبچے۔“

”ان کے ساتھ اور کتنے لوگ تھے؟“

”ان کے ساتھ ان کی دھرم پتی اور پانچ سال کا ایک لڑکا تھا۔“

”اب کیسے کہہ سکتے ہیں کہ لڑکا پانچ برس کا تھا؟“

”ہمیش چند اس لڑکے کو گود میں اٹھا کر طیارے کی طرف جاتے ہوئے اسے پیار دے تھے اور کہہ رہے تھے کہ آج وہ اپنے بیٹے کی پانچویں سالگرہ منا رہے ہیں۔“

”ان کا پتا کیا ہے؟“

”وہ کلکتہ سے آئے تھے۔ دارجلنگ میں ان کا ایک کالج ہے، تن سنگ روڈ پر۔“

”تھے میں سارجنٹ دروازہ کھول کر اندر آیا اور کیپٹن کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔“

”سر، بلی کا پڑا پس آگیا ہے۔ اس عمو دی چٹان کے آس پاس بہت سی چٹانیں ابھری ہیں اس لیے وہاں بلی کا پڑ لینڈ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی رپورٹ ہے کہ بچہ حرکت کر رہا ہے۔ بلی کا پڑنے کیبل اور کھانے پینے کی چیزیں بھیجنی گئی ہیں۔“

اس کی بات ادھوری رہ گئی کھلے ہوئے دروازے سے تمام رپورٹ اور فونوگراف دفتر میں آئے تھے اور انہوں نے طرح طرح کے سوالات شروع کر دیئے تھے۔ کیپٹن نے زیادہ ہر سوال کا جواب دیا۔

”طیارہ فلائنگ کلب سے چارٹر کیا گیا تھا۔“

”اسٹیل مل کے مالک کو رپتی ہمیش چند پٹنی گریاں گزارنے کے لیے دارجلنگ آئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی دھرم پتی اور ان کا بیٹا تھا۔ حادثے میں ہمیش چند اور ان کی

آخری دن اور آخری خواہش ہے پھر یہاں کبھی نہیں آؤں گی۔“

”بیٹی! خواہش کبھی آخری نہیں ہوتی جب تک سانس چلتی رہتی ہے ایک کے بعد دوسری خواہش چلتی رہتی ہے۔ میں تمہارا دل نہیں توڑوں گا مگر تمہارے ایڈیٹر سروسز کمپنی جب بچے کو ہسپتال سے لے کر یہاں آئے تھے تو انہوں نے کہا تھا کہ تم نے بچی کی صورت نہیں دیکھی ہے۔“

”ہاں! کمپنی کا خیال تھا کہ بچے کی صورت دیکھ کر میری متاثرہ لگے گی۔ پھر میں اسے چھوڑنے کا ارادہ بدل دوں گی مگر اب تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ میں آپ سے وعدہ کر لی ہوں کہ اسے دور سے ایک نظر دیکھ کر چلی جاؤں گی۔“

”مگر بیٹی! تم اپنے بچے کو کس طرح پہچانو گی۔ صبح سے اب تک یہاں چار بچے آچکے ہیں ان میں سے ایک لڑکی ہے باقی تین لڑکے ہیں تم اپنے بیٹے کو کیسے پہچانو گی؟“

”آں؟ میرا سوچنے لگی۔ میں کیسے پہچانوں گی؟ کیا میرا بچہ مجھے دیکھتے ہی پکارے گا؟ یہ کیسا احمقانہ خیال ہے؟“

پنڈت گردھاری لال نے کہا۔

”میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا مگر مجبوری ہے، تینوں لڑکے ہم رنگ اور ہم عمر ہیں تینوں کا نام دین چندرہ ستمبر ہے۔“



ملنے بنی کو بڑے کرب سے دیکھا پھر قریب آکر محبت سے اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

”بیٹی! بچے اپنی ماؤں کو اماں یا امی کہتے ہی ہیں لیکن تمہارا کوئی بچہ تھا اور نہ ہے۔ میں تمہارا بچہ بنایا ہے کہ دو برس پہلے کی بانو کو مار ڈالو۔ تم نے نیا جنم لیا ہے۔ اگر شادی کی پہلی لگی تو تم پہلی بار دلن ہوگی۔ سرتاج تمام راستے تمہاری باتیں کرتا آیا ہے۔ جاؤ وہ لڑکھا ہوگا۔“

وہ منہ ہاتھ دھونے کے لیے غسل خانہ کی طرف چلی گئی۔ اس کے دل پر ایک عجیب سا زخم ماضی ستا رہا تھا اور مستقبل کی سرستیں اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ ماں بار بار بتاتی تھی کہ جو بچے دیکھ کر چلے ہیں وہ آگے ٹھوکر کھاتے ہیں۔ وہ بچہ جسے ماں کی بد نصیبی نے وہ دوبارہ واپس نہیں آئے گا۔ اگر وہ پھر سے ساکن بنے گی تو پھر اس کے آگے بچے نہیں بنے ہوں گے۔

اس سے خوشگوار زندگی گزارنے کا سبق پرصاحتی تھی اور یہ بھول جاتی تھی کہ پچھلا فیض یاد دیتا ہے۔ کوئی بھی تخلیق کار اپنے پہلے فن پارے کو کبھی نہیں بھولتا۔ دس سال پہلے بننے کے بعد بھی بانو اپنی پہلی تخلیق کو کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔

جب وہ منہ ہاتھ دھونے کے بعد لباس بدل کر آئینے کے سامنے آئی تو کچھ دیر تک پاپ کو دیکھتی رہ گئی۔ آئینے میں جو بانو تھی وہ بالکل کورے کانڈ کی طرح تھی۔ جیسے ایک اس پر کسی نے اپنا نام نہیں لکھا تھا اور نہ ہی اس کانڈ پر کبھی کسی بچے کی تصویر لگائی تھی۔ اسی لیے تو سرتاج بے اختیار اس کی طرف کھینچا چلا آیا تھا۔ بانو کو اس کی بات نہ آئی۔

”تم چاہو تو مجھے سرتاج کہہ سکتی ہو۔“

وہ آئینے کے سامنے شرمائی۔ اس نام کے سائے میں شادی کا پیغام تھا۔ سرتاج کا پیار والو کہہ رہا تھا کہ تمام مرد آصف کی طرح سنگدل اور بے حس نہیں ہوتے۔ وہ بھول کو اپنی طرح اٹھاتے ہیں اور آخری سانس تک زندگی کے خوب صورت گلدان میں سجا کر لے جاتے ہیں۔ وہ سوچنے لگی ”ہائے ایسی محبت اور مسرت اب تک کہاں تھی۔ اتنی دیر سے بنا لگی ہے؟“

جتنی ہلاک ہو چکے ہیں۔ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر صرف ان کے پانچ سالہ بچے کی زندگی کے آثار پائے گئے ہیں۔ آج چند رہے سچے اور وہ زندگی اور موت کے درمیان سا لنگھ کا لنگھ گزار رہا ہے۔“



سالن کے چلنے کی بو آئی تو بانو چونک گئی۔ اسے ہوش آیا کہ وہ باورچی خانے میں چولہے کے سامنے کھڑی ہوئی ہے اور تھوڑی دیر بعد کیپٹن سرتاج حسین اپنی سالگرہ منانے اس کے گھر آئے والا ہے۔

سوچ کی رفتار، آواز کی رفتار سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ وہ سوچتے سوچتے چلک جھپکتے ہی دو سال پیچھے آصف کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اس کی بیوی بن گئی تھی۔ پھر ایک بچے کو جنم دے کر واپس باورچی خانہ میں آگئی تھی تاکہ سرتاج حسین کے لیے بریانی اور سالن تیار کر سکے۔

تنہائی میں ماضی کی طرف دیکھتے ہی بچے کا خیال دل میں کچھ کے لگانے لگتا تھا۔ دماغ میں طرح طرح کے سوالات ابھرتے تھے ”وہ کہاں ہوگا۔ اب پورے دو برس کا ہو گیا ہوگا۔ دو برس کے بچے“ اماں اماں“ کہنے لگتے ہیں۔

اسی وقت اسے اپنی ماں کی آواز سنائی دی۔

”بانو کیا سوچ رہی ہو؟ کھانا تیار ہو گیا؟“

”اے! جی ہاں سالن ذرا جل گیا ہے مگر کھانے کے قابل ہے۔“

”اچھا میں دیکھ لیتی ہوں تم منہ ہاتھ دھو کر لباس بدل لو۔ میں اسے ساتھ لے لگی ہوں وہ ذرا تنگ روم میں بیٹھا ہوا ہے۔“

”کون؟“ بانو نے بے خیالی میں سوال کیا۔ حالانکہ وہ سمجھ گئی تھی۔

”یہ تو کیا تم اتنی جلدی بھول گئیں؟ وہی فوجی افسر جانتی ہو اس نے مجھے اپنا نام کہا

بتایا ہے! اس کا نام سرتاج حسین ہے۔ جلدی جاؤ بیچارہ برسوں سے تمہارے زندگی گزار رہا ہے۔

اسے احساس دلاؤ کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہے۔“

وہ وہاں سے جانے لگی پھر یک بیک پلٹ کر بولی۔

”اسی آپ کو تو معلوم ہو گا دو برس کے بچے اماں کہنے لگتے ہیں۔“

ہن کل کر سامنے آجائے تو کیا ہوگا؟ کیا دوسری بار طلاق ہوگی؟ یہی سوچ کر اس کا دل  
اڑھاتا۔

وہ ساکن بن کر مسرتوں کے جھوم میں خوف زدہ تھی۔ بعض اوقات انسان کو ایسے ہی  
نے دکھانے والی خوشیاں ملتی ہیں۔ ایسی خوشیاں خدا نہیں دیتا بلکہ انسان خود خریدتا  
۔ ایک دوسرے سے لین دین کے موقع پر اگر ایک اپنا سب کچھ دے کر بھی کچھ چھاپتی  
ہے یہ پناہ سرتیں حاصل کرنے کے باوجود سب سب کی زندگی گزارتی ہے۔

سوچے سوچے انتظار کی گھٹیاں ختم ہو گئیں۔ گھونگھٹ کے پیچھے سے کچھ دکھائی نہیں  
آ رہا تھا پھر بھی وہ سمجھ گئی کہ سرتاج حسین ساگ کے کمرے میں آیا ہے۔ اسے  
نے کاجو تجربہ تھا اس کے مطابق اور زیادہ مٹ کر بیٹھ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کے تمام  
انف کی طرح ایک ہی انداز میں ریکارڈ کی مانند بولتے ہیں اور گھونگھٹ اٹھاتے ہی اپنا  
نہا ملانے لگتے ہیں۔ لیکن جب سرتاج نے اس کے قریب بیٹھ کر اور اس کے ہاتھ  
اپنا ہاتھ رکھ کر بولنا شروع کیا تو بانو کا تجربہ غلط ہو گیا کہ تمام دلہا اپنی خواہشات کو اہمیت  
دیتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ سہمی ہوئی دلہن کی دلجوئی کرتے ہیں۔ اسے دائمی محبت اور  
ایک شخص کا یقین دلاتے ہیں۔

سرتاج حسین کا انداز ایسا تھا کہ بانو کا دل خود بخود اس کی طرف کھینچا چلا گیا۔ اس کے  
دل و دماغ میں جو خوف سایا ہوا تھا وہ آپ ہی آپ دور ہو گیا۔ بعض مرد ساحر ہوتے ہیں،  
ان لیے تو وہ حرمزہ ہو گئی تھی۔ اسے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کب اور کیسے اپنے سرتاج کی  
آنکھ میں چلی گئی۔ تب سرتاج نے کہا۔

”تم مجھ میں ہو اور میں تم میں ہوں۔ ان حسین لمحات کے بعد ہمارے  
دہان کوئی پردہ نہیں رہے گا۔ میں پہلے ہی تمہیں بتا چکا ہوں کہ تم سے پہلے میری زندگی  
بمبار لڑکیاں ابھی ہیں۔ اگر تمہاری زندگی میں مجھ سے پہلے کوئی آیا ہو تو مجھ سے نہ  
بہاؤ۔“

بانو کے دل کی دھڑکنیں ایک دم سے تیز ہو گئیں۔ جو خوف مٹ گیا تھا وہ یکبارگی اس  
کا اندر زلزلے کے سے جھٹکے پہنچانے لگا۔ وہ ہزار ضبط کے باوجود کانپنے لگی۔ وہ اپنی  
دانت میں اپنی کوئی کمزوری ظاہر نہیں کر رہی تھی لیکن بعض باتوں کا رد عمل بے اختیار

سوچ کی نگری میں ہمیشہ دیر ہو جاتی ہے۔ اسے احساس ہوا کہ وہ آئینے کے سامنے بیٹھ  
دیر سے سوچ میں کھڑی ہے۔ سرتاج ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھا ہوگا۔ وہ تیزی سے چلی  
ہوئی اپنے کمرے سے باہر آئی۔ ڈرائنگ روم کے دروازے تک پہنچ کر اس کی تیز رفتاری  
برقرار نہ رہی۔ شرم و حیا نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ وہ دروازے کے ایک ہٹ کو تمام  
دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ڈرائنگ  
روم میں نہیں بلکہ سرتاج کے دل کے کسی گوشے میں قدم رکھنے والی ہے۔  
اسی وقت پتا چلا کہ وہ کمرے میں تنہا نہیں ہے۔ اسے امی کی آواز سنائی دے رہی  
تھی۔

”بیٹا بانو بڑی شرمیلی ہے۔ وہ اس طرح نہیں آئے گی میں اسے بلا کر لاتی ہوں۔“  
”نہیں امی! آپ نہ جائیں۔ میں آپ سے ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں مگر رات لگتا ہے  
کہ آپ ناراض ہو جائیں گی۔“

”بیٹے کیسی باتیں کرتے ہو۔ جب تمہیں میٹا کہا ہے تو تمہاری کسی بات پر ناراض کیے  
ہو سکتی ہوں۔ تم بلا جھجک کہو۔“

”امی بات یہ ہے کہ میری شرافت کی گواہی دینے کے لیے میرا کوئی عزیز یا رشتہ دار  
نہیں ہے۔ اگر آپ مجھے شریف اور ایماندار سمجھتی ہیں تو بانو کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے  
دیں۔ میں اسے اپنی عزت بنا کر ہمیشہ اس کی عزت کروں گا۔“

اچانک ہی بانو کے کانوں میں شہنائیاں گونجنے لگیں۔  
لگا ہوں کے سامنے آتش بازیاں چھوٹنے لگیں۔

ایک ماہتابی تیزی سے سرسراہٹ آسمان کی بلندی کی طرف جانے لگی۔  
اس کے ساتھ ہی وقت کا پچھی تیزی سے پروں کو پھر پھڑپھڑاتا ہوا اڑتا چلا گیا۔  
ایک ماہ گزر گیا۔

وہ دلہن کا سر جو اپنے گھونگھٹ کا لے ساگ کی جج پر بیٹھی تھی۔ گھونگھٹ کے  
سائے میں ہر کنواری کا دل گھبراتا ہے کہ پتا نہیں اب کیا ہونے والا ہے۔ لیکن وہ کنواری  
نہیں تھی۔ کلی سے پھول یا لڑکی سے عورت بننے کے بعد کنوارے گھونگھٹ میں جچی  
بیٹھی تھی۔ کیا پردہ اٹھنے کے بعد بھی وہ اپنے سرتاج سے چھپی رہ سکے گی؟ اگر چھپ نہ سکے

نہا کی طرف تھی۔ تھوڑی دیر تک دونوں کے درمیان بڑی پرسرا سراسی خاموشی رہی۔  
ایک سگریٹ کا ایک کش لگا کر دھواں چھوڑنے کے بعد پھٹنے لگا۔

وہ کسی پرسرا رہا تھا۔ بانو پر یا اپنے آپ پر؟ پھٹنے کی کوئی وجہ تو ہوگی۔ بغیر کسی وجہ کے  
نہا گل پھٹتے ہیں۔

میں بھی کیسا نادان ہوں کہ اپنے سامنے کے ہر انسان سے یہ توقع کرتا ہوں کہ وہ  
دل چاہی سے میرے سامنے آئے۔ یہ سراسر حماقت ہے ہر انسان کا اپنا ایک ماضی،  
پنہ دراز اور اپنا غرور ہوتا ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کے ذاتی معاملات کی  
لٹائیں کرے۔

اس نے پھر سگریٹ کا ایک کش لگا لیا۔ اندھیرے میں سگریٹ کی آگ دیکھنے لگی۔ بانو  
ایں لگا جیسے وہ اس کے سلگتے ہوئے دل کو چھوٹ رہا ہو۔ آخر اس نے کہا۔

”بانو! میں یہ نہیں سمجھتا کہ تم نے مجھ سے کچھ چھپایا ہے۔ اگر چھپایا ہے تو پھر ہمیشہ  
ہائے رکھنا۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری انا کو نہیں نہ پہنچے۔ تم میری عزت ہو اور تمہاری  
بے رکھنا میرا فرض ہے۔“

بانو اس کی محبت اور شرافت کا یہ انداز دیکھ کر ترپ مٹی۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ  
یہاں اس کے قدموں سے لپٹ جائے اور اپنے ماضی کی ایک ایک بات اسے بتائے۔  
رہن کون سی بات؟

وہ تو سوچ رہا ہو گا کہ اس کی دلہن کی زندگی میں پہلے بھی کوئی آچکا ہے۔ وہ زیادہ سے  
بہا اسے کنواری نہیں سمجھ رہا ہو گا لیکن اتنی دور تک نہیں سوچ سکتا کہ وہ ایک بچے کی  
ماں بن چکی ہے۔ یہ درست ہے کہ عورت سرتاج جیسے شوہر پر اپنی جان بھی قربان  
لائی ہے مگر عورت کی جوانا ہوتی ہے اسے نہیں نہیں پہنچائی۔ اپنے دل کی بات خود کبھی  
بہا کی نوک تک نہیں لاتی۔ بانو کے ساتھ بھی یہی عورت کی مجبوری تھی جسے وہ خود سمجھ  
تھی۔ اپنے خیر کو نہیں سمجھا سکتی تھی۔

وہ قیامت کی رات کسی طرح گزری گئی تھی۔ دوسری صبح ناشتے کی میز پر ماں موجود تھی اور  
ماں خاموشی سے بیٹی اور داماد کے چروں کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سرتاج اپنی عادت  
مطابق ہنس بول رہا تھا بانو کچھ چپ چپ سی تھی لیکن سرتاج کی کسی کسی بات پر شرم

ہوتا ہے۔ اس پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔ سرتاج چند لمحوں تک انتظار کرتا رہا کہ شاید وہ جہاں  
کچھ بولے گی پھر وہ خودی بولا۔

”تم لرز رہی ہو۔ میں سمجھ گیا۔ میں پہلا شخص ہوں جو تمہاری زندگی میں آیا ہوں۔ یہ  
تمہارے بدن کی کنواری کپکپاہٹ ہے۔ میں سمجھ گیا۔ بالکل سمجھ گیا۔“

بانو کیوں لگا جیسے وہ طنز کر رہا ہے مگر وہ تو پیار کر رہا تھا اس کی سامانوں کے راتے دل  
میں اتر رہا تھا۔ جس بات کا جواب وہ نہ دے سکی تھی، سرتاج اس بات کو اس کی اداسی میں  
ڈھونڈ رہا تھا۔ کوئی ضروری نہیں تھا کہ سرتاج سراغ رسا بن گیا ہو۔ بانو کے دل کا چر رہا  
سوچ رہا تھا۔ حالانکہ سب ہی شوہر اپنے حقوق کے مطابق ایسے وقت سراغ رسا بن کر بار  
سے تفتیش کرتے ہیں۔

کرے میں گہری تاریکی تھی۔ اس تاریکی میں وہ اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔  
اس لمحے کچھ احساسات تھے کہ وہ آپریشن تھیٹر کے بیڈ پر پڑی ہوئی ہے۔ اسے جھوٹ کا  
سرطان ہو گیا ہے اور سچائی کے نشتر سے اس کا آپریشن کیا جا رہا ہے۔ کیا واقعی دنیا میں کوئی  
ایسا اسپتال ہے جہاں سے جھوٹ کی میڈیکل رپورٹ حاصل کی جاسکتی ہو؟

”نہیں“ بانو نے بڑے حوصلے سے سوچا۔ ”کوئی میرے جھوٹ کو نہیں پکڑ سکتا۔ اس  
کے باوجود میں نے فیصلہ کیا تھا کہ محبت کرنے والا شوہر ملے گا تو اس سے کچھ نہیں چھپاؤں  
گی مگر انہی نے مجھے اس بچے کی قسم دی ہے (جو نہیں ہے اور ہے) انہوں نے التجا کی ہے کہ  
اب میں کسی پر اعتماد نہ کروں۔ سرتاج خواہ کتنا ہی شریف، ایماندار اور محبت کرنے والا  
شوہر ہو وہ ایک باسی دلہن کو کبھی بدواشت نہیں کرے گا۔“

وہ بڑی قیامت کی رات تھی۔ گزرتا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اندیشے تھے کہ دل میں مگر  
کر رہے تھے اور اس کے چاروں طرف کی تاریکی اسے دلا سے دے رہی تھی کہ اسے  
پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ رات کی تاریکی میں اور ماں کے پیٹ میں ہر بات چھپ جاتی  
ہے۔

رات کے پچھلے پھر سرتاج اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ پھر اس کے پٹ کھولنے کے بعد  
ایک سگریٹ سلگانے لگا۔ بانو نے سمجھتے ہوئے کروٹ بدل کر اس کی جانب دیکھا۔ کوئی  
کے باہر تاروں بھرے آسمان کے پس منظر میں وہ ایک سائے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس کی



اچھے وقت شوہر سے وفا کرتے کرتے ایک نہی سی دیوار حائل ہو جاتی تھی۔ اگر بچہ  
بچوں کے سامنے ہو تو اسے چھوڑ کر شوہر کے سینے سے لگا جاسکتا ہے مگر لگا ہوں سے  
بچوں کو تو ازدواجی محبت کے درمیان وہ عورت کو بیوی کے بدلے صرف ماں بنا کر رکھ دیتا  
ہے۔ بچوں کو یہ متاثری ہو سکتی ہے۔

ایک برس اور گزر گیا۔ پندرہ ستمبر کی صبح بانو کی آنکھ کھلی تو اسے سب سے پہلے یاد آیا  
زیلے سے بچھڑے ہوئے پورے پانچ سال گزر چکے ہیں۔ اگر وہ آج موجود ہوتا تو صبح ہی  
عاش کی پانچویں سالگرہ کی تیاری شروع ہو جاتی۔ محلے کے بچوں کو مدعو کیا جاتا گانے  
بنا کر پروگرام ہوتا۔ میرا بیٹا تمام بچوں کے درمیان شہزادہ نظر آتا۔ کیسا ہنگامہ ہوتا۔ یہ  
نور نہیں سے بھر جاتا۔

اس کی نظر گھڑی پر گئی، نو بج گئے تھے۔ وہ ہڑباز کر اٹھ بیٹھی اب اسے سرتاج کا خیال  
بنا کر آیا ہوتا تھا کہ وہ صبح دیر تک سوئی رہتی تھی اور سرتاج ناشتہ کیے بغیر دیوٹی پر چلا  
آتا۔ وہ بستر سے اٹھ کر اپنی کوتاہیوں کا احساس کرتی ہوئی مکان سے باہر لان میں آتی  
مخال سے کہ شاید وہ ابھی لان میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہو مگر وہ نہیں تھا۔ ٹھیک نو بج کر  
بائٹ پر اسے ایک طیارے کی آواز سنائی دی۔ وہ سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔  
وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ چھوٹا سا طیارہ زندگی کے ایئر پورٹ سے پرواز کرنا آیا ہے اور  
نئے دن دسے پر لینڈ کرنے والا ہے۔

اس کے دل نے دھڑک دھڑک کر یہ نہیں بتایا کہ اس طیارے میں ایک پانچ برس کا  
ماسافرا اپنی پانچویں سالگرہ منا رہا ہے۔

وہ نئے پانچ برس کا ایک لڑکھا ایک ایک کانے کی طرح جھپٹتا رہا تھا۔ اس کے خون  
ابلی نہیں آیا کہ اس کے خون کا ایک چھینٹا اس کی نگاہوں کے سامنے سے پرواز کرتا  
نہا ہے۔

باراٹھا تک اس کے دل میں درد سا محسوس ہوا۔ وہ سمجھ نہ سکی کہ یہ درد کون سے  
بازو سے آیا ہے وہ دونوں ہاتھوں سے سینے کو تھام کر مکان کے اندر چلی گئی۔



زیر عمو اخبارات سے پہلے ریڈیو پر نشر ہو جاتی ہیں۔ دیس کے تمام ریڈیو اسٹیشن

کر مسکرا دیتی تھی۔ ماں کو اعتماد ہو گیا کہ بات بن گئی ہے۔ جب داماد خوش ہے تو بانو کی  
قسمت بھی خوش ہے۔ بانو تو اپنی عادت سے مجبور ہو کر چپ چاپ سی رہتی ہے۔

پھر دن، ہفتے اور مہینے گزرنے لگے۔ سرتاج نے پھر کوئی ایسی بات نہیں چھیڑی جو بانو  
کے دل پر بوجھ بن جاتی۔ وہ تو پہلے دن سے ہی اس کا دیوانہ بن گیا تھا اور اس کی دوا کی  
بدستور قائم تھی۔ مشکل یہ ہے کہ انسان کو کسی کروٹ قرار نہیں ملتا۔ بانو کے دل سے  
خوف اور اندیشے دور ہوئے تو وہ سرتاج کی دیوانہ وار محبت سے گھبرانے لگی۔ وہ اپنے  
خلوص اور محبت سے عظمت حاصل کر رہا تھا اور وہ تھی کہ آپ اپنی ہی نظروں سے گزری  
جا رہی تھی۔

ایک سال بعد سرتاج نے اس کے لیے دو بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ روم کا چھوٹا سا  
مکان بنایا اور اس کے ہاتھ میں مکان کی چابی دے کر کہا۔

”یہ تمہارا گھر ہے“ اس کا دروازہ اپنے ہاتھوں سے کھولا اور اپنی محبت سے اس گھر کو  
جنت بنا دیا۔“

اپنے مکان کا پہلا دروازہ کھولتے وقت بانو کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ایک وہ آصف  
تھا جو گھر لوٹ کر چلا گیا تھا ایک یہ سرتاج تھا جس نے اپنی محنت کے کاڑھے بیج سے جنت  
کا وہ چھوٹا سا تاج محل بنایا تھا۔ کیا وہ اس گھر کو اس کے لیے جنت بنا سکتی تھی؟ مگر کیسے  
بنا سکتی تھی؟ اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی پہلا خیال اس کے دل میں ہی آیا کہ اگر وہ  
بچے آصف کا نہ ہوتا، سرتاج کا ہوتا تو وہ اسے بانسوں میں لے کر اس نئے مکان میں قدم  
رکھتی۔ پھر اس کے اور سرتاج کے درمیان کوئی جھوٹ اور بے اعتمادی نہ ہوتی۔

جب دو برس گزر گئے تو سرتاج نے ایک رات اسے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا۔  
”کیا بات ہے کیا ہمارے اس چھوٹے سے گھر میں ایک ننھا سا پھول نہیں کھلے گا؟“  
بانو اس کے سینے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔

”ہیں کیا کہوں۔ یہ تو خدا کی دین ہے وہ جب چاہے گود میں پھول کھلا دے۔“  
ایسا کہتے وقت اس کا حلق خشک ہو گیا۔ اس کی نظریں سامنے دیوار سے لگے ہوئے  
کیلنڈر پر گئیں۔ کیلنڈر پندرہ ستمبر کی تاریخ بتا رہا تھا۔ اس کا دل جیسے حلق میں آکر دھڑکنے  
لگا ”وہ خدا یا! اب تو میرا لعل چار برس کا ہو گیا ہو گا۔ وہ ابھی کیا کر رہا ہو گا؟“

ایک ہاڑی کے دامن میں تھا۔ جب داس دیو کاٹھ کے احاطے میں داخل ہونے لگا تو بنے احاطہ کا دروازہ کھولا اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھیں روتے روتے سوچ گئی تھیں۔  
ہاس سے پوچھا۔

”تمہارا کام کرتے ہو؟“

”ہاں صاحب! میں یہاں کامی ہوں مگر آج یہاں کی پھلوری اجڑ گئی ہے۔“

”ادواہ کیا دل کو لگنے والی بات کہی ہے۔ تمہو میں اسے لکھ لیتا ہوں۔“

اس نے ٹوٹ بک میں لکھنے کے بعد کہا۔

”تم اس کہے سے نیک لگا کر آسمان کی طرف یوں حسرت بھری نظروں سے دیکھو جیسے بن جانی کے جہاز کے بغیر ننگا ہو گیا ہو۔ ہم تمہاری یہ تصویر اخبار میں چھاپیں گے۔“

پھر اس نے اپنے فوٹو گرافر سے کہا کہ وہ تصویر اتارنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اسی دیکھا کہ آواز اس کی طرح گونج گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا وہ بلاؤ ز اور اسکرٹ اپنے شانے سے ایک گیمہ لٹکا کے کھڑی تھی۔ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”سزا دے دیو۔ ایک مالی کو ادکار بنانے سے تمہارے اخبار کی مانگ نہیں بڑھے گی۔  
ان کے پیسے کو فاق نہ بناؤ۔“

داس دیو نے بات ٹالنے کے لیے مسکرا کر کہا۔  
”چھاتو تم پہنچ گئیں۔ مگر کیا بات ہے؟ آج تم کچھ کھوٹی کھوٹی سی لگ رہی ہو۔ بھی بے کی تیر پڑی ماؤں کو اداس کر سکتی ہے اور تم تو ابھی کنواری ہو۔“

بیا کے دل کو ایک دھچکا سا لگا کہ وہ کنواری مریم ہے۔ کوئی اس کی مٹکا کو نہیں سمجھ بہت اس پانچ سالہ جانی کی خبر سن تھی اس کا دل بے طرح گھبرا رہا تھا۔ وہ اپنے بچے کا حساب لگا چکی تھی۔ اگرچہ وہ نہیں جانتی تھی کہ جانی وہی بچہ ہے۔ وہ سوچ بھی لگتی تھی کہ ایک کروڑ پتی سیٹھ کا بچہ اس کے اپنے خون کا پردہ ہو سکتا ہے۔ وہ تو ایک بچے کا درد اپنے دل میں لے کر وہاں آئی تھی اور اپنے روزنامہ کے لیے صحیح مامل کرنا چاہتی تھی۔

ہا کی جواب دینے بغیر کاٹھ کے دروازے کی طرف جانے لگی۔ داس دیو اس سے بڑھ کر چلتا ہوا کال نیل تک پہنچ گیا پھر اس کاٹھ دبانے کے بعد ہوا۔

پانچ سالہ جانی کے متعلق خبریں سن رہے تھے۔ طیاروں کو حادثات پیش آتے رہتے ہیں۔ حادثات میں مرنے والوں پر افسوس بھی کیا جاتا ہے پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان حادثات کو بھلا دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ خبر سن کر ہر ماں باپ کا دل دھل گیا کہ ایک پانچ برس کا بچہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر بے یار و مددگار پڑا ہے۔ یہ خبر سن کر کوئی ماں ایسی نہیں تھی جس نے اپنے بچے کو فوراً ہی سمجھ کر سینے سے نہ لگالیا ہو۔

ڈیلی ایوننگ ٹیلی گرام کے ایڈیٹر نے ریڈیو سوچ کو آف کرتے ہوئے اپنے رپورٹروں سے کہا۔

”داس دیو! اپنے فوٹو گرافر کے ساتھ فوراً دار بٹنگ پہنچو۔ وہاں پہنچ کر جانی کا ٹکڑا تصویر لو۔ کاٹھ کے اندر پہنچ کر اس بچے کے خالی بستر کی بھی ایک تصویر اتار دو۔ وہاں جو لوگ ہوں ان کے بیانات لے کر ایک معصوم بچے کے متعلق ایسی لرزہ خیز کہانی بناؤ کہ پڑنے والوں کے دل دھل جائیں۔ یہ سنہری موقع ہے ہمارے اخبار کی اشاعت بڑھ جائے گی۔“

”میں سمجھتا ہوں باس! جب تک دھماکہ خیز خبریں شائع نہ ہوں اخبار ہاتھوں ہاتھ نہیں بکے گا۔“

ایڈیٹر نے کہا ”صرف دھماکہ خیز سچی باتوں سے کام نہیں چلتا۔ ان خبروں میں ٹک مرچ اور دوسرے مسالے لگانے پڑتے ہیں۔ مثلاً ہم جانی کے خالی بستر کی ایک تصویر شائع کریں گے اور اس کے نیچے لکھیں گے کہ اس آرام دہ بستر پر ماں کی لوریاں سننے والا جانی بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر پتھری پڑ چکا ہے۔ ہمارے دیس کی کوئی ماں اپنی لور کی آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچا سکتی۔ کوئی یہ کیسا نڈر اسٹنٹ ہو گا؟“

”غضب ہو جائے گا باس! ایسی باتیں بڑھ کر تمام مائیں چیختے لگیں گی۔“

”یہ تو پوائنٹ ہے۔ جب عورتیں چیخیں گی اور ضد کریں گی تو ان کے بچے بچا ہمارا اخبار خریدنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ بس اب جلدی سے جاؤ! ایسا نہ ہو کہ روزنامہ سندیس کی میرا تم سے پہلے وہاں پہنچ جائے۔ کوشش کرو کہ وہ شیطان کی خالہ تم سے پہلے کوئی خاص معلومات حاصل نہ کر سکے۔“

”ایسا ہی ہو گا باس! وہ کتنی ہی چالاک ہو مجھ سے بازی نہیں لے جائے گی۔“

ایسا ہی ہوا۔ سب سے پہلے داس دیو اپنے فوٹو گرافر کو لے کر دار بٹنگ پہنچ گیا۔ جانی

”بیٹی! تم بہت اچھی ہو۔ عورت ہی عورت کے دکھ درد کو سمجھتی ہے۔ آؤ اندر جاؤ۔“

داس دیو اس سے پہلے ہی کمرے میں پہنچ گیا۔ اس نے پوچھا۔

”ماں جی! آپ کانپچے کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔“

”میں اس گھر کی ملازمہ ہوں۔ مگر ایک ماں کی طرح دن رات جانی کو گود میں کھلایا۔ میں اس کا انتظار کر رہی تھی کہ وہ جانی کو ہوائی جہاز کی یہ کراڑی سی کراڑی سی جانی کے بعد آتے ہی ہوں۔ اس وقت میں نے ریڈیو لگایا تو یہ محسوس خبر سنائی دی۔ اپنے کانوں سے سن کر بھی یقین نہ آیا۔ بیٹی یہ خبر بھولی نہیں ہو سکتی؟“

”نہیں ماں جی!“ میرا نے کہا ”یہ خبر بھولی ہوئی تو ہم یہاں نہ آتے۔ آپ کیا کر کے ایک ایک تصویر ہمیں دے دیں۔ کیا آج جانی کی سالگرہ منائی جا رہی تھی۔“

”ہاں یہ دیکھو کل رات ہی یہ بڑا برتھ ڈے ٹیک منگوا دیا گیا تھا۔“

ملازمہ نے آگے بڑھ کر ایک میز پر سے کپڑے کو ہٹایا۔ وہاں ایک بڑا سا برتھ ڈے رکھا ہوا تھا۔ فونو گراف اس کی تصویر اتارنے لگا۔ خوب صورت سے ٹیک پر واضح فٹس ”پندرہ ستمبر“ لکھا ہوا تھا۔ میرا سالگرہ والی بات جانتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ ان کی تاریخ ہے لیکن ٹیک پر ”پندرہ ستمبر“ کی تحریر دیکھ کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کا دل ٹیک میں اس کا بچہ چل چل کر پوچھنے لگا۔

”بیٹی! آپ میری سالگرہ نہیں منائیں گی؟ دیکھیے نا؟ میرا برتھ ڈے ٹیک تیار ہے۔ کیا آپ میری سالگرہ نہیں منائیں گی؟“

ایک بچہ اندر ہی اندر اسے جھجھوڑ رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اب کچھ ہونے ہے اس نے اپنے آپ کو ٹٹولا کہ کیا ہو سکتا ہے؟ پانچ برس پہلے تو وہ اندر سے مریچکی مارنے کے بعد اور کون سا الیہ اسے رلا سکتا ہے؟

انسان جو سوچ بھی نہیں سکتا وہی اس کے آگے آتا ہے۔ وہ چپ چاپ کھڑی ٹیک پر کھڑی آج کو کھٹکے جا رہی تھی۔

”میں بارہ سال سے ملازمت کر رہی ہوں۔ پانچ برس پہلے میں سینٹھ اور سینٹھانی کے فونو جانی کو لانے لگی تھی۔“

”میرا! یہاں کوئی تیسرا اخبار رپورٹر نہیں ہے آؤ ہم دونوں آپس میں سمجھوتہ کر لیتے ہیں یہاں سے جو معلومات حاصل ہوں گی وہ معلومات ہم آپس میں بانٹ لیں گے یعنی معلومات کا جو حصہ میں شائع کروں گا وہ تم نہیں کرو گی اور جو حصہ تم شائع کرو گی وہ میں نہیں کروں گا۔“

میرا نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہا۔

”مجھے منظور ہے لیڈرز فرسٹ کے اصول کے مطابق پہلے میں کہتی ہوں کہ جانی کی تصویر میرے اخبار میں شائع ہوگی۔ سمجھوتے کے مطابق تم اس کی تصویر شائع نہیں کرو گے۔“

داس دیو نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جانی تو اہم موضوع ہے۔ اس کی تصویر تمام اخبارات شائع کریں گے۔“

میرا نے کہا ”اس طرح جانی کے متعلق جتنی خبریں ہوں گی وہ سب ہی اہم ہوں گی لہذا فضول سمجھوتے بازی سے پرہیز کرو۔“

اتنے میں دروازہ کھل گیا۔ ایک بوڑھی ملازمہ نے ساڑھی کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کون لوگ ہیں؟“

داس دیو نے اپنے فونو گراف سے کہا کہ آنسو پونچھتی ہوئی اس عورت کی فورا تصویر اتاری جائے۔ فونو گراف نے کمرے کی آنکھ سے دیکھا۔ اسی وقت میرا اس بوڑھی عورت کے بالکل قریب آکر اپنے رومال سے اس کے آنسو پونچھنے لگی۔ کمرے کا کابن دہنے کے بعد فونو گراف کو پتا چلا کہ میرا بھی تصویر میں چلی آئی ہے۔

داس دیو نے جھلا کر کہا۔

”یہ کیا حرکت ہے؟ کیا ابھی آنسو پونچھنا ضروری تھا؟“

”ہاں! داس دیو! ہم پہلے انسان ہیں بعد میں رپورٹر ہیں۔ ایک دہی عورت کے آنسو پونچھ کر اسے تسلی دینے کے بعد ہم اپنا کام کر سکتے ہیں۔“

بوڑھی ملازمہ نے اس سے متاثر ہو کر کہا۔

”لانی مگنی تھیں؟“ داس دیو نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

”یعنی آپ اسپتال یا میسٹرنی ہوم سے اسے لانی مگنی تھیں؟“

”آں؟“ ملازمہ نے ایک ذرا ہچکچانے لگی اور اپنے دونوں بازوؤں کو گود لینے کے انداز

میں یوں نکتے لگی جیسے بچے کو اٹھائے بہت دور سے لاری ہو۔ پھر وہ حسب عادت بڑھانے لگی۔

”اس کے پالنے والے تو سورگ باشی ہو گئے اب یہ بتانے سے کیا فرق پڑے گا کہ وہ اسپتال سے لایا گیا تھا یا آشرم سے۔“

یہ بات میرا کے سینے میں گولی کی طرح لگی۔ وہ ایک دم سے لڑکھڑا کر صوفہ پر گر پڑی۔ اس سے بے خبر داس دیو نے چٹکی بجا کر کہا۔

”وہ مارا۔ یہ خبر بڑی دھماکہ خیز ہوگی کہ وہ بچہ لے پالک ہے۔ اگرچہ حادثے میں اس کا باپ اور اس کی ماں مر چکی ہے۔ اس کے بعد بھی اسے جہنم دینے والی ماں کیس زندہ ہوگی۔

اف اس خبر سے کیسی سنسنی پھیل جائے گی۔“

مگر کیسی سنسنی اور کیسے کرب سے مگروری تھی یہ میرا کا چہرہ بتا رہا تھا۔ اس کے داغ میں آندھیاں چل رہی تھیں ”میرا بچہ۔۔۔ میرا بچہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر بے یار و مددگار پڑا ہوا ہے۔ میں ابھی جاؤں گی۔ ساری بلندیوں کو گرا کر اسے سینے سے لگا لوں گی۔“

وہ غرغھراتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اسی وقت داس دیو نے کہا۔

”میرا! میں تم سے زیادہ فاسٹ ہوں۔ دیکھ لیتا یہ خبر سب سے پہلے میرے اخبار میں آئے گی۔“ پھر اس نے ملازمہ سے پوچھا ”جانی کو کس آشرم سے لایا گیا تھا؟“

”جلپانی گوڑی کے بالک آشرم سے۔“

ملازمہ کی بات سن کر میرا کو مکمل یقین ہو گیا کہ وہ بچہ اسی کا ہے۔ اس نے داس دیو کا بازو تھام کر کہا۔

”نہرو۔ داس دیو! میری ایک بات مان لو۔ ہم میں سے کسی کو یہ خبر شائع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ بچہ لے پالک ہے۔“

”کیوں؟“ داس دیو نے ہنسنیں سیڑ کر پوچھا۔

”اس لیے کہ وہ بچہ ایک کمزور پتی سیٹھ میس چند کے نام سے بچانا جاتا ہے۔ اگر تم

برائے کر گے تو اس معصوم بچے سے ایک باپ کا نام چھن جائے گا۔ آئندہ کے لیے اس اقامت گیر تباہ ہو جائے گا۔“

”میرا! مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔ تم یہ خبر میرے پاس روک کر خود پناہ میں شائع کرو گی۔ اپنی یہ چالاکی اپنے ہی پاس رکھو۔“

وہ تیزی سے چلتا ہوا باہر جانے لگا۔ میرا نے اسے آواز دی۔ داس دیو نے دروازے

پر ہٹ کر میرا کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے فونو گرافر سے کہا کہ وہ اس گھر سے جانی کی بد تصویر حاصل کرے پھر اس نے بوڑھی ملازمہ سے پوچھا۔

”ماں جی! مجھے یقین ہے کہ آپ جانی کی اصلی ماں کو جانتی ہیں۔ کیا آپ مجھے اس کا پتا

دیں گی۔“

میرا نے جلدی سے کہا۔

”ماں جی! کچھ نہیں جانتیں۔۔۔ یہ کچھ نہیں بتائیں گی۔“

بوڑھی عورت نے تاکید کی ”یہ سچ ہے بیٹا! آشرم والوں نے جانی کے ماں باپ کا پتا

ان سے انکار کر دیا تھا۔“

”میں اچھی طرح سمجھتا ہوں میرا! ماں جی کو تمہارا اشارہ مل گیا ہے لیکن میں نے کبھی

ولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ میں آشرم سے معلومات حاصل کروں گا۔“

یہ کہتے ہی وہ کوئی جواب سننے بغیر کانچ سے باہر گیا۔ ڈاک خانہ وہاں سے زیادہ دور

نہ تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا وہاں پہنچا۔ پھر ٹرک کال کے ذریعے اپنے ایڈیٹر سے باتیں

لے لگا۔ اس نے ایڈیٹر کو بتایا کہ وہ میرا کے مقابلے میں کتنی تیز رفتاری اور ذہانت سے

ہم کر رہا ہے۔ فونو گرافر شام تک اہم تصویریں لے کر دفتر پہنچ جائے گا۔ اس نے وہ دھماکہ

خبر بھی سنا دی کہ جانی لے پالک لڑکا ہے اور اب وہ آشرم کی طرف جارہا ہے تاکہ جانی

کامل ماں کا سراغ لگا سکے۔

لے کر اترتا کی ہوگی۔ اسی لیے آپ مجھے اس بچے کی ماں کا نام اور پتا نہیں بتائیں گے  
ہاں بارہ ماہ والے آدمی نہیں ہوں۔ جب یہ خبر میرے اخبار میں چھپے گی کہ پہاڑ کی چوٹی  
پر ہے وہ پندرہ ستمبر کو پیدا ہوا تھا اور پہاڑ کی گڑھی کے بالک آشرم سے مہیش چندر اور  
لیکٹی کی گود میں پیدا ہوا تھا تو جانتے ہیں کیا ہو گا؟ وہی ہو گا جو میں چاہتا ہوں۔ اس بچے کی  
لہاں جہاں بھی ہوگی۔ وہ اخبار پڑھتے ہی سات پردوں سے نکل کر اپنے بچے کی طرف  
لے گی۔ اور نہ میرا نام داس دیو ہے داس دیو۔“

وہ بڑے گھمنڈ سے پاؤں پختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ میرا نے مایوسی سے کہا۔

”یہ نہیں مانے گا۔ اس کی نادانی سے ان دو ماؤں تک یہ خبر پہنچ جائے گی۔ یہ میں جانتی  
ہاں ان کے دلوں پر کیا گزرے گی۔ میرے اندر تو ایسی تڑپ اور بے چینی ہے کہ میں کچھ  
پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جانا چاہتی ہوں۔“

”دیر ج رکھو بیٹی! بھگوان سے بچے کے لیے پراختیا کرو، وہی تم تین عورتوں کی لاج بھی  
لے گا۔ پتا نہیں وہ دو عورتیں کہاں ہیں۔ ان میں سے ایک نے اپنے بچے کو آشرم کے  
اوپر پھوڑ دیا تھا یعنی اپنے آپ کو چھپا لیا تھا مگر اب بچے کی پتا سن کر وہ چھپی نہ رہ  
سکتی۔“

”دوسری کو میں پہچانتی ہوں۔ اس کا نام یسورانی ہے۔“



یسورانی جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے کھڑی ہوئی خلا میں ایک تک دیکھ رہی تھی۔ یہ  
ن کی بہت پرانی عادت ہے کہ جب وہ اپنے اندر جھانکتا ہے تو بے اختیار خلا میں  
رہنے لگتا ہے۔ اسی طرح یسورانی خلا میں گھورتی ہوئی جیل کی آہنی سلاخوں سے نکل کر  
ہاں اس دور میں پہنچ گئی جب وہ کنواری کینا کھلاتی تھی۔

اما پتا نے اس کا نام یسودھار رکھا تھا۔ بھگوان کرشن کنیا کو جنم دینے والی ناری کا نام  
یسودھار تھا۔ اس ناطے سے یسورانی کے ماں باپ نے اپنی بیٹی کو پوتر اور بھگوان بنانے  
لے اس کا نام یسودھار رکھا۔ جب وہ پچھت پر پانی بھرنے کے لیے جانے لگی تو ایک دن  
ہاں ایک شریر نوجوان نے غلیل چلا کر پانی سے بھری ہوئی اس کی گالگر توڑ دی۔ یسودھار  
غبر سے کہا۔

پنڈت گردھاری لال سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے داس دیو کو دیکھتے ہی کہا۔  
”داس دیو! میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ ایک معصوم اور مظلوم بچے کا کیریر تباہ نہ کرو  
کسی ماں پر کچھ نہ اچھا لو۔ کیا تمہاری کوئی ماں نہیں ہے؟“

”فضول باتیں نہ کرو میرا! میری ماں ایک آورش ناری ہے۔“  
”تو پھر اس آورش ناری سے جا کر پوچھو کہ وہ تمہارے جیسے سپوت کو کسی عورت  
ذات کی توہین کرنے کی اجازت دے سکتی ہے یا نہیں؟ اپنا نام کرنے اور اپنا اخبار بیچنے کے  
لیے آدمی کو اتنا نہیں گرتا چاہیے۔“

داس دیو نے اسے ناگواری سے دیکھتے ہوئے پنڈت جی کو مخاطب کیا۔  
”شریمان! آپ دھرم کی بات کریں۔ ایک لے بالک بچہ جو اپنے ماں باپ سے محروم  
ہو چکا ہے اس بچے کو اس کی اصلی ماں تک پہنچانا کیا ہمارا کرتو (فرض) نہیں ہے؟“  
”ہاں بیٹے! پنڈت جی نے کہا ”مجھے خوشی ہے کہ تمہارے جیسے نوجوان اپنے کڑو  
سمجھتے ہیں لیکن تم اس آشرم کے دستور کو نہیں جانتے۔ یہاں جو بچے آتے ہیں ان کی ماؤں  
کے نام کسی کھاتے میں لکھ کر نہیں رکھے جاتے کیونکہ ایسی ماؤں سے اولاد کا رشتہ بیشک کے  
لیے ٹوٹ جاتا ہے اور جو چیز ٹوٹ جاتی ہے اسے سنبھال کر نہیں رکھا جاتا۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ داس دیو نے کہا ”ہم آپ جب دفتر کھول کر بیٹھتے ہیں تو چھوٹی  
سے چھوٹی چیز کا حساب رکھتے ہیں پھر یہ کیسے یقین کیا جاسکتا ہے کہ ماں اور بچے کا حساب  
یہاں نہیں رکھا جاتا ہے۔“

”میرے بیٹے ان باتوں کو سمجھنے کے لیے ایک عمر چاہیے اس دنیا میں چھوٹی سے چھوٹی  
اور بڑی سے بڑی چیزوں کی گنتی ہو جاتی ہے مگر آدمی اپنے لہو کی بوند کا حساب نہیں رکھتا۔  
ایسے ہی لہو کے چھیننے اس آشرم میں آتے ہیں۔ اگر مرد اپنے باپ (گناہ) سے انکار نہ  
کرے تو کوئی عورت اپنے بچے کو میاں نہ لائے۔ اب اگر میں بولتا جاؤں تو بات بہت دور  
تک جائے گی۔“

”آپ مجھے ٹانے کے لیے یہ سب کچھ کہہ رہے ہیں۔“

”بیٹے جو صبح تھوہہ میں نے کہہ دیا۔“

”نہیں شریمان! میں بچہ نہیں ہوں کہ بمل جاؤں۔ میرا نے عورت ذات کی لاج

”نہرے من میں سامنے ہو اس لیے چلی آئی۔ میرے اس طرح آنے کی لاج رکھ  
مل دھرنے سمجھ لیا کہ دال نہیں گلے گی۔ اس نے پوچھا۔  
”ہم کس طرح ایک ہوں گے۔ تیرا باپ اونچی ذات کا برہمن ہے اور میں ذات کا  
رائی ہوں۔ ہماری شادی نہیں ہو سکے گی کیا میں سارا جیون تجھے دکھتا اور ترستار ہوں  
”

اس نے بڑے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے برہمنیت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ایسے  
آٹھ گھنٹوں میں وہ انکار نہ کر سکی ہوئے ہوئے کانپنے لگی۔ پہلی بار اسے معلوم ہوا کہ کوئی  
بڑے تو عورت ساری کی ساری پکڑیں آجاتی ہے۔ مل دھرنے اس کے نازک سے  
لپٹے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

”جن دن کہ مجھ سے شادی کرو گی۔ ہم مندر میں جا کر بھگوان کے سامنے ایک  
ایں گے۔ پھر ہمارے بیچ ذات پات کی کوئی دیوار نہ ہو گی۔“  
”تم میں سوچ کر بتاؤں گی۔“ وہ ہاتھ چمڑا کر بھاگ گئی۔

وہ دونوں شش و پنج میں مبتلا رہی۔ بوڑھے ماما پتا کی بدنامی سے ڈرتی رہی لیکن  
ن کے ترازو میں بوجھنے کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ جوانی کا لہڑا ہمیشہ بھاری پڑتا ہے۔  
یہ دن وہ بوجھنے کے لیے مندر گئی وہاں لگن منڈپ نہیں تھا۔ اس نے ہونے والے بچی  
ماتھ مات پھیرے نہیں لگائے صرف بھگوان کو شاکستمان کر ملی دھر کو اپنا پتی مان

اس کے بعد اسے پتا چلا کہ وہ مل دھرنے کے ساتھ کتنی مضبوط زنجیر میں بندھ گئی ہے۔  
اسے بچی سمجھ کر اس کی انیہا کاپالن کرنا اس کا دھرم ہو گیا تھا۔ ایک رات مل دھرنے

”ہم کب تک چوری چوری کھلیاں میرے لٹتے رہیں گے۔ میری بات مانو یہاں سے بہینی  
بل۔ میں پورا بہینی گھوم آیا ہوں۔ تم اتنی سندر ہو کہ فلم کہنی میں تمہیں کام مل جائے  
یہاں بہینی کی حوالہ میں تم نے راوہا کا جو سوانگ رچایا تھا اسے دیکھ کر میں دعوے سے  
رکھوں کہ تم کامیاب ہیروئن بن جاؤ گی۔ پھر ہمارے پاس اتنی دولت ہو گی کہ تم اس

”تو نے گا کر تو ڈی پانی گرا دیا۔ ساڑھی بھگوا دی۔ مجھے ستا کے تجھے کیا ملا؟“  
نوجوان نے مسکرا کر کہا ”کرشن کنہیا بھی اپنی راوہا کو اسی طرح ستایا کرتے تھے۔“  
”مگر میں راوہا نہیں ہوں۔ میرا نام یثودھا ہے۔“

”کسی ماں کا نام یثودھا ہو تو اچھا لگتا ہے۔ تیری جیسی جوان چنچل اور الیلی نار مز  
راوہا کے روپ میں اچھی لگتی ہے۔“

یہ بات یثودھا کے من میں بیٹھ گئی۔ اسے احساس ہو گیا کہ وہ دنیا کی جوان آنکھوں  
میں سامنے کے لیے جوان ہو گئی ہے۔ اس رات وہ دیر تک بستر پر کدوئیں بدلتی رہی۔ اس  
نوجوان کی نگاہوں کی گرمی کبھی اس کا یہ پملو اور کبھی وہ پملو جلاتی رہی۔ دوسرے دن  
پچھتے پر نوجوان نے کہا۔

”میرا نام مل دھرنے ہے۔ آج رات جب چاند ڈوب جائے گا تو میں تیرے مکان کے  
پچھواڑے کھلیاں میں انتظار کروں گا۔“

اس کی ہر بات انکارے کی طرح چور جندوں کو چھو لیتی تھی۔ رات آئی تو وہ اپنے  
جذبات سے لڑنے لگی کہ کھلیاں میں نہیں جائے گی۔ یہ بری بات ہے۔ واقعی یہ باتیں بری  
ہوتی ہیں۔ کوئی بھی سیدھی سادی شرمیلی ہی لڑکی خود کبھی بے شرمی کی طرف نہیں جاتی۔  
جوانی کا مقناطیس جبراً اسے اپنی طرف کھینچتا ہے اس کنواری نے سوچا۔

راوہا بھی شام سانورے سے ملنے جاتی تھی۔ اگر اس میں کوئی برائی ہوتی تو بھگوان  
خود کبھی ایسا نہ کرتے۔ ان کی مرلی کی تان سمجھاتی ہے کہ پریم بھاؤ تاسے کوئی نہیں بچ سکتا۔  
پریم ایسی شکتی ہے جو راوہا کرشن کے روپ میں پو جی جاتی ہے۔“

جب چاند ڈوب گیا تو کھلیاں میں یثودھا کا حسن طلوع ہو گیا۔ دنیا کے تمام ماں باپ  
اپنی جوان بیٹیوں کے آگے پھمن رکھنا کھینچتے ہیں کہ بیٹیاں اس حیا اور حفاظت کی لکیر سے  
باہر قدم نہ نکالیں لیکن پریم شکتی اسے کھینچ کر لے گئی تھی۔ اس سے یثودھا نے یہ نہیں  
سوچا کہ پریم اور باپ کے بیچ ناخن برابر فاصلہ ہوتا ہے۔ بھاؤ تاس میں ڈوب کر یہ فاصلہ کیسے ختم  
ہو جاتا ہے یہ پتا نہیں چلتا۔ پھر بھی وہ بڑی سہمی ہوئی تھی۔ مل دھرنے فاصلے کو پانا چاہتا  
کتر گئی۔

”نہیں مل دھرنے! اگر تم یہاں سے پہلے مجھے ہاتھ بھی لگاؤ گے تو میں اپنی نظروں سے گر جاؤں

کا صاحب نہیں کر سکو گی۔“

وہ ہر رات اسے سنانے پہنے دکھانے لگا۔ کچھ سہنوں کی رنگینیاں تھیں اور کچھ اپنے بچی کا حکم تھا کہ بہن چلے۔ یہاں رہے گی تو ماں باپ زبردستی دوسری جگہ شادی کر دیں گے لہذا وہ مل دھر کے ساتھ بہن پہنچ گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ بے حد حسین تھی۔ چہرے کے نقوش ایسے چمکے اور ایسے جاذب نظر تھے کہ نظریں جذب ہو کر رہ جاتی تھیں۔ پریہات پر ڈاکٹرنز کے مالک پنالال نے اسے دیکھا تو منہ سے رال نکھ گئی۔ وہ مل دھر کو دوسرے کمرے میں لے جا کر دیر تک باتیں کرتا رہا۔ پھر مل دھر نے واپس آکر خوش خبری سنائی۔

یہودھا! تم بہت کچی ہو سیٹھ پنالال تمہیں اپنی فلم میں ہیروئن کا رول دے رہے ہیں۔ اب تم ایک بہت خوب صورت کوشھی میں رہو گی۔ تمہارے پاس کار ہو گی، نوکر ہوں گے پنالال کی پانچ فلموں میں کام کرنے تک تمہیں براہ میں ہزار روپے ملیں گے۔“

یہودھا حیرانی سے سختی رہی کہ سنے کس طرح جج ہو رہے ہیں۔ دوسرے ہی دن وہ ہوٹل سے اپنا سامان لے کر مل دھر کے ساتھ اپنی کوشھی میں آئی۔ اس کوشھی کا ایک کوا فلم کے دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اسی زمانے پنالال بھی صبح سے رات گئے تک وہاں رہتا تھا اور یہودھا سے فلمی رول کی سیرسل کراتا تھا۔ سیرسل کے دوران مل دھر باہر چلا جاتا تھا کیونکہ پنالال کا اعتراض تھا کہ وہ اپنے بچی کے سامنے سمجھتی اور شرابی ہے۔

پنالال اسے سمجھانے لگا کہ اگر وہ تمہاری میں شرماے گی تو کیرے کے سامنے کام نہیں کر سکے گی۔ مگر شرم تو ایک فطری جذبہ ہے وہ بعض اوقات جھلا کر سوچتی کہ ایسا کام نہیں کرے گی لیکن پانچ سال کا ایگر منٹ ہو چکا تھا۔ مل دھر نے کہا۔

”تم کام چھوڑ دو گی تو پنالال کا لاکھوں روپے کا نقصان ہو گا وہ تمہیں جیل تک پہنچا دے گا۔ ذرا عقل سے کام لو۔ جیل میں جانے کے بدلے عزت اور شہرت حاصل کر لو۔“

پانچ سال کے ایگر منٹ نے اسے مجبور کر دیا تھا اور مجبوری کے وقت عقل سے کام لینا پڑتا ہے اس لیے وہ مل دھر کی عقل کے مطابق کام کرنے لگی۔ ایک ماہ بعد فلم کے ایک ایسے سین کا سیرسل تھا جس میں دین ہیروئن کو دھوکے سے شراب پیا کر اس کی

ناوٹ لیتا ہے۔ پنالال نے اسے سمجھایا کہ اب اسے ایک گلاس میں شربت پلایا جائے گا اور وہ پینے کے بعد ایسی ایکٹنگ کرے گی جیسے جج شراب پی لی ہو۔ یہودھا نے

”میں ایک شرابی عورت کی ایکٹنگ کیسے کروں گی۔ میں کیا جانوں کہ شراب پی کر کیسا ہے۔“

”تم فکر نہ کرو۔“ پنالال نے کہا ہے کہ یہ آہستہ آہستہ تم سب کچھ سیکھ جاؤ گی۔ اب تو معمولی سی چیز ہے تم ڈرہی کر بھی مرنے کی کامیاب اداکاری دکھا سکو گی۔ چلو اب اگلاس کی شراب کو ایک سانس میں پی جاؤ۔“

یہودھا نے گلاس کو اٹھایا۔ مگر چند ٹھونٹ پینے کے بعد اسے ابکاٹی سی آنے لگی۔ حلق

لگا۔ پنالال نے ذرا جلدی سے کہا۔

”شربت کو میں نے جان بوجھ کر ذرا کڑوا رکھا ہے تاکہ تم خود کو جج شراب پیتی ہوئی

دیکھ کر۔ اسی لیے کہتا ہوں کہ ایک سانس میں پی جاؤ۔“

شراب ہوا زہر، پہلی بار پینے وقت ایک سانس کی مدت بھی بہت ہوتی ہے۔ دوسری

ز میں گلاس خالی ہو گیا مگر سر میں آندھیاں سا گئیں۔ ساری دنیا اس کے چاروں طرف

انے لگی۔ اس وقت جو کچھ اس پر گزر رہی تھی اسے وہ فلم کا سین سمجھ رہی تھی کیونکہ

اس میں جو کچھ ہوتا ہے وہ فلموں میں دہرایا جاتا ہے اور فلموں کے ذریعہ جو کچھ سکھایا جاتا

ہے، زندگی میں اس کی سچی سیرسل ہوتی ہے۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ شام مل دھر آیا تو وہ

ہاتھوں سے لپٹ کر روتے ہوئے صاف صاف کہنے لگی۔

”اب میں آپ کے قاتل نہیں رہی۔ جس پنالال کو تم دیوتا کہتے تھے اس نے دیویوں

مجھے سلا دلا ہے۔ میں آپ سے مارے شرم کے آنکھ نہیں ملا سکتی۔ میں مر جاؤں

مل دھر نے اسے قدموں سے اٹھا کر سینے سے لگایا۔

”میری جان! اتنی ذرا سی بات پر رو رہی ہو۔ پہلے ہی چانس میں پانچ فلموں کی ہیروئن

بننے کے لیے ہر طرح کی قربانی دینی پڑتی ہے۔“

جب میں محنت کرتی ہوں، میں کماتی ہوں، میں اپنی پرورش آپ کرتی ہوں، سب کچھ  
 لڑی کرتی ہوں تو پھر تمہارا یہاں کیا کام ہے؟ میں ایک کتے کو پال سکتی ہوں، تمہیں نہیں  
 پال سکتی۔ سیٹھ پنلال اگر مجھ سے دوستی رکھنا چاہتے ہو تو اس بے غیرت کو ابھی یہاں سے  
 لے دو۔“

یثودھا کے اس حکم کے بعد مری دھردودھ کی مکھی بن گیا۔ پنلال کے آدمیوں نے  
 بچل سے بچل کر کوشی کے باہر پھینک دیا۔ اس کے ایک ہفتے بعد فلم کی چلیٹی شروع  
 پانڈو پنلال نے کہا۔

”یثودھا جیسا نام بہت پرانا ہے تمہارا کوئی ماڈرن قسم کا نام ہونا چاہیے۔“  
 یثودھا نے کہا۔

”ہاں یثودھا بہت ہی پوتر (مقدس) نام ہے۔ میرے ماما پتا اس نام کے سائے میں  
 ایک شریف لڑکی بنانا چاہتے تھے۔ آہ میرے بھاگ (غیب) میں یہ دن لکھے تھے چلو  
 بالکل بد معاش قسم کا نام رکھ دو۔“  
 پنلال نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اب تم زہریلی باتیں کرنا سیکھ گئی ہو۔ اب تمہاری اداکاری میں گمراہ رنگ آئے گا۔  
 برا خیال ہے تمہارا نام رانی ہونا چاہیے۔ تم فلم دیکھنے والوں کے دلوں پر راج کرو گی۔“  
 ”صرف رانی نہیں، میرے اپنے نام کا بھی کچھ حصہ ہونا چاہیے۔ تاکہ میں اپنے آپ  
 باور رکھ سکوں۔ یثورانی کیسا نام ہو گا۔“

”بہت خوب صورت، بس آج سے تمہارا نام یہی ہے۔“

یثورانی اپنے نام کے ساتھ ساتھ بدل گئی۔ دو ماہ بعد فلم کی شوٹنگ شروع ہو گئی۔ آٹھ  
 ماہ بعد وہ فلم مکمل ہو کر ریلیز ہوئی تو دس کے کونے کونے میں یثورانی کے نام کا ذکر ہونے لگا  
 تمام کوڑ پتی فلم ساز اس کے دروازے پر آنے لگے لیکن وہ پانچ سال تک پنلال کی  
 زخمی۔ پنلال اب اسے ہر ماہ ایک لاکھ روپے دے رہا تھا اور وعدہ کر رہا تھا کہ دوسری فلم  
 بنوے گی اس سے شادی کر لے گا۔ اگرچہ اب پنلال سے بھی زیادہ دولت مند لوگ  
 اس سے شادی کی تمنا کرتے تھے لیکن یثورانی نے سوچا کہ جو اس کی عزت تک پہنچ چکا ہے  
 ایک سو کی ہو کر رہے تو بہتر ہے اس لیے وہ دوسری فلم کے ریلیز ہونے تک پھر ایک

یثودھا نے چونک کر سر اٹھایا پھر حیرانی سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ  
 مری دھریہ بات سنتے ہی غیرت کے جوش میں پنلال کو قتل کر دے گا یا پھر اپنی دھرم پتی کا  
 ہاتھ تمام کر ساری دولت اور جھوٹی عزت و شہرت کو ٹھوکریں مار کر اسے گاؤں واپس لے  
 جائے گا لیکن اپنے پتی کی بے غیرتی دیکھ کر جیسے ایک جھکے سے اسے عقل آگئی کہ وہ اس کا  
 پتی کب تھا؟ لگن کہاں ہوا تھا؟ اس بھگوان کے سامنے جو پتھر کا بنا ہوا تھا۔ اگر اس پتھر کے  
 سینے میں دل ہوتا تو وہ اسے ٹھوکریں کھانے سے پہلے ہی بچا لیا۔ مگر یہ بے غیرتی اوپر سے نیچے  
 تک ہے۔ بھگوان نے بڑی خاموشی سے اسے مری دھریہ بے غیرت جھولی میں ڈالا۔ مری  
 دھریہ نے اسی طرح پنلال کی گود میں اسے ڈال دیا۔ ایسے وقت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ  
 بھگوان اور انسان دونوں کا عمل ایک جیسا کیوں ہوتا ہے؟

اس روز وہ مری دھریہ سے کچھ نہ بولی۔ من ہی من میں کڑھتی رہی۔ دوسرے دن پنلال  
 آیا تو وہ بولی۔

”سیٹھ صاحب! دیگر منٹ کس سے ہوا ہے؟“

”تم سے۔۔۔“

”آپ ہر ماہ بیس ہزار روپے کس کے ہاتھ میں رکھیں گے؟“

”تمہارے ہاتھ میں۔۔۔“

”یہ کوشی اور کار کس کی ہے؟“

”تمہاری ہے میری جان!“

”جب میں تمہاری جان ہوں تو یہ دلال اس کوشی میں کیوں رہتا ہے؟ اسے دھکے مار  
 کر نکال دو۔“

یثودھا نے نفرت سے مری دھریہ کی طرف اشارہ کیا تو وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”یثودھا یہ کیا ہو اس کر رہی ہو۔ کیا تم ہوش میں ہو کہ تم نے اپنے پتی کا اپنا  
 (توہین) کیا ہے؟“

”میں ابھی ہوش میں آئی ہوں۔ تم میرے پتی کب تھے؟ اور تم کیا جانو کہ پتی کا کرنا کیا  
 ہوتا ہے؟ ارے بے شرم! مردہ ہوتا ہے جو ایک ہاتھ سے اپنی عورت کا ہاتھ پکڑتا ہے اور  
 دوسرا اٹھا کر اس کے لیے ساری دنیا سے لٹا ہے۔ مگر تم دلال ہو دلال! انکل جاؤ میرے گھر



”ایسا مطلب؟“ شیکھر نے چونک کر پوچھا۔

”کیا تم اسے اس جرم کی وجہ سے چھوڑ رہے ہو کہ وہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی  
ایزوبیڈا کی کمینہ بن ہے۔“  
”شیکھر! میں فضول باتیں نہیں کرنا چاہتا۔ اپنا آخری فیصلہ سناؤ۔ میری دو شرطیں  
کرتے ہو یا نہیں؟“

”میں یثورانی سے سچی محبت کرتا ہوں۔ اس سے ہر حال میں شادی کروں گا۔“  
”بڑے عزم سے یثورانی کے پاس چلا گیا۔ پنالال اطمینان سے اپنے گھر میں بیٹھ گیا۔  
انہیال تھا کہ ڈوبنے والے کو نکلنے کا سہارا کافی ہوتا ہے۔ یثورانی کو بھی فوری طور پر  
بچے کے لیے ایک باپ کی ضرورت ہے لہذا وہ شیکھر کو قبول کر لے گی لیکن رات کے  
یکے ملازم نے آکر اطلاع دی کہ یثورانی ملنے آئی ہے۔  
پنالال نے کہا۔

”ہاں کہہ دو سیٹھ صاحب گھر میں نہیں ہیں کل اگر ملاقات کرے۔“  
لام چلا گیا۔ پنالال ڈر گیا تھا کہ وہ ہنگامہ کرنے آئی تھی اور آسانی سے اس کا پوچھا  
پوڑے گی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ کچھ دنوں کے لیے سمجھی چھوڑ دے گا۔ جب وہ بار  
ر شیکھر سے شادی کر لے گی تو پھر واپس آجائے گا۔ ملازم نے واپس آکر بتایا کہ یثو  
رانی ملتی گئی ہے۔ اسے اطمینان ہو گیا کہ بلا ٹل گئی ہے۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ اپنے بیڈروم میں سونے کے لیے گیا تو وہ بلا وہاں موجود تھی۔ پنا  
ز شیکھر کو پوچھا۔  
”تمہارا کیسے آگئیں۔“

”ایسا بیڈروم میں، میں پہلے کبھی نہیں آئی۔ آج کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔“  
”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے آرام سے بیٹھو۔“  
”میں بیٹھنے نہیں، ہمارے تمہارے پچھلے گناہوں کا حساب کرنے آئی ہوں۔ ہوس  
ایسا تم اس دن کے لیے مجھے محبت کا فریب دے رہے تھے۔ تم لوگ اتنی بے شری  
رہی ہو کیسے کھاتے ہو؟ مٹی دھرنے مجھے تمہارے حوالے کیا اور اب تم مجھے شیکھر  
لے کر رہے ہو۔ کیا اپنی بیٹی اور بہن کے ساتھ بھی ایسا ہی کرتے ہو۔“

ازدواجی اور گھریلو زندگی کے خواب دیکھنے لگی۔

دوسری فلم ریلیز ہوئی مگر باکس آف پر کامیاب نہ ہوئی۔ ایسے ہی وقت یثورانی کو ہا  
چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس نے فون پر پنالال کو اطلاع دی کہ فوراً ہی شادی کر دو  
ہمارا بچہ ناجائز کہلائے گا۔ پنالال فلم کی ناکامی کے باعث سر پکڑے بیٹھا ہوا تھا اس نے  
جھلا کر جواب دیا۔

”میرے ایک کردار ڈوبے ڈوب رہے ہیں اور تمہیں شادی اور رنگ ریلوں کی سوج  
رہی ہے، ابھی میرے ساتھ بکواس نہ کرو۔“  
یثورانی نے غصہ سے کہا۔

”تم بکواس نہ کرو۔ جب میں ڈوب رہی ہوں تو تمہارے ڈوبنے کی پروا نہیں کروں  
گی۔ ہمارے ہونے والے بچے کو بدنامی سے بچاؤ۔ نہیں تو میں تمہارا پچھا نہیں چھوڑوں  
گی۔“

پنالال نرم پڑ گیا۔ کیونکہ یثورانی اب پہلے جیسی کمزور اور بے سہارا عورت نہیں  
تھی۔ کتنے ہی دولت مند ہاتھ اسے سہارا دینے کے لیے تیار تھے۔ ایک مشہور فلمی ہیرو  
چندر شیکھر اس سے دیوانہ وار عشق کرتا تھا۔ پنالال نے شیکھر سے ملاقات کی اور اس سے  
پوچھا۔

”میں یثورانی کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔ کیا تم اسے اپناؤ گے؟“

شیکھر نے ایک دم سے خوش ہو کر کہا۔

”میں دل و جان سے اسے اپناؤں گا۔ مگر مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اتنی حسین عورت کو  
میری خاطر چھوڑ دو گے۔“

”یقین کرو۔ میری دو شرطیں مان کر تم اسے حاصل کر سکتے ہو۔ پہلی شرط یہ ہے کہ  
تمہیں کل ہی یثورانی سے بیاہ کرنا ہو گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ تم میری اگلی فلم میں کام  
کرنے کا معاوضہ نہیں لو گے۔“

”مجھے منظور ہے۔“

”تو پھر جاؤ اور یثورانی کو یہ خوش خبری خود ہی سناؤ کہ تم اس سے بیاہ کر اس کے ہونے  
والے بچے کے باپ بن جاؤ گے۔“

[illegible]

ہنسے مگر اگیا ہے۔

”ہوائی جہاز کے حادثات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ یہ افسوس کی بات ہے مگر کوئی نئی بات نہیں ہے۔“

”نئی بات یہ ہے کہ بانو کہ ایک پانچ برس کا بچہ زندہ بچ گیا ہے اور بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھپا ہوا ہے۔“

بانو کا دل دھک سے رہ گیا۔ پانچ برس کی گنتی کے ساتھ ہی اپنے بچے کی جدائی تڑپانے لگی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اخبار کو دکھا۔ پہلے صفحہ پر جانی کی تصویر تھی بڑی ہی کی موتی دل میں اتر جانے والی تصویر تھی۔ بانو نے سوچا ”میرا بچہ بھی اتنا ہی بڑا ہو گا اور ایسا معصوم اور خوب صورت ہو گا۔“

سرتاج حسین نے کہا ”ذرا اگر گرم چائے پلا دو“ میں ابھی چلا جاؤں گا۔ پہاڑی کے پاس میں میری ڈیوٹی ہے۔ میرا خیال ہے بچے کو اتنی بلندی سے نیچے لانے تک ساری رات گزر جائے گی۔ ساری رات جاگنا ہو گا۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا۔ موسیقی کا پروگرام نشر ہو رہا تھا وہ چائے بنانے کے لئے کچن میں چلی گئی۔ اگر وہ اپنے ساتھ اخبار لے جاتی تو چائے تیار ہونے کے دوران وہ دھماکہ خیز معلومات حاصل کر سکتی تھی لیکن اخبار کی صرف ایک تصویر نے اسے دماغی میں پھنسا دیا تھا۔

جب وہ ایک کمرے پر چائے سے بھری ہوئی دو پیالیاں رکھ کر اپنے سرتاج کے پاس جانے لگی تو موسیقی کی آواز دور سے سنائی دے رہی تھی پھر اچانک ہی وہ آواز ٹھم گئی اور کسی مرد کی آواز سنائی دینے لگی۔

”یہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس ہے۔ چند منٹ کے لئے موسیقی کا پروگرام روک کر جانی کے متعلق تازہ ترین معلومات فراہم کی جارہی ہیں۔ سامعین! وہ بد نصیب جانی جو اپنے ہوا میں باپ کے قریب زندہ ہے، دراصل ایک لے پالک بچہ ہے۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اس کی تاریخ پیدائش۔۔۔۔۔“

بانو ایک دم سے ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ پندرہ ستمبر کی تاریخ سن کر اس کے ہاتھوں میں ہائے کی کڑے کانپ رہی تھی۔ ریڈیو کی آواز نے کہا۔

پندرہ ستمبر کی صبح طیارے کو حادثہ پیش آیا تھا۔ دن کے گیارہ بجے تک ریڈیو کے ذریعے یہ خبر ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گئی تھی۔ کوئی ایسا گھر نہیں تھا جہاں ایک مظلوم اور دہشت زدہ بچہ کا ذکر نہ ہو رہا ہو۔ کوئی دل ایسا نہیں تھا جو بچے کی سلامتی کے لئے دعائیں نہ مانگ رہا ہو۔ ملک کے کونے کونے سے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں کو فون کر کے یہ مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ اس بچے کے متعلق ایک ایک لمحے کی خبر شری جائے۔ لہذا ہر آدھے گھنٹے کے بعد ریڈیو کے ذریعہ یہ یقین دلایا جا رہا تھا کہ بچے کے سلسلے میں جیسے جیسے خبریں موصول ہوتی رہیں گی، انہیں عوام تک پہنچایا جاتا رہے گا۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ بچہ مر چکا ہو گا، کچھ لوگ یہ سوچ کر کانپ جاتے تھے کہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک نا سمجھ بچہ دھوپ اور رات کی سردی کا مقابلہ کیسے کرے گا؟ وہ حادثہ سے بچنے کے بعد رات کی تاریکی میں دہشت سے مرجائے گا۔ دوسرے ریڈیو سے یہ خبر سنائی گئی کہ ہیلی کاپٹر سے جانی کے لئے کھانے کا سامان اور کبل وغیرہ چھینکے جا رہے ہیں۔

تو وہ گھنٹے کے بعد پھر یہ خبر سنائی گئی کہ پولیس ”اسکاؤٹ اور فوجی فوجوان اس پہاڑی کے دامن میں کیپ لگا رہے ہیں۔ ریڈیو، ٹھکے اطلاعات اور اخبارات کے رپورٹر اور فوٹو گرافر بھی وہاں پہنچ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ فوری طور پر ہیلی کاپٹر کی جارہی ہے تاکہ رات کے وقت دور تک اس پہاڑی کو روشن رکھا جاسکے۔ اس کے باوجود وہ بجلی کی روشنی جانی کو بلندی تک نہیں پہنچا سکتے تھے۔

ساری خلقت نے حادثے کی یہ خبر سن لی تھی۔ صرف ایک بانو اس خبر سے بے خبر تھی۔ وہ صبح سے کچھ مظلوم سی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ ریڈیو آن کر کے کوئی گیتوں بھرا پروگرام سننے کو دل نہیں چاہا۔ اس لئے گھر کا ریڈیو خاموش پڑا رہا۔ شام کو پانچ بجے سرتاج حسین فوجی جیپ میں بیٹھ کر آیا تو اس کے ہاتھوں میں شام کا اخبار تھا۔ اس نے اخبار کو بانو کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”آج ریڈیو سنا تھا؟“

”نہیں، میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔“

”آج کی خبریں سن کر تمام انسانوں کے دل میں درد اٹھ رہا ہے۔ ایک طیارہ پہاڑی

اور اس فریب کو برداشت نہ کرے اور اسے طلاق دے دے۔

اور اسے پرکھڑی تھی۔ ایک طرف سرتاج کی رفاقت تھی، عزت آبرو اور خوشگوار مالی زندگی تھی۔ دوسری طرف پانچ برس سے چھڑے ہوئے لاپتہ بچے کا پیار اپنا پتا رہا۔ وہ اپنے دامن میں طلاق نامہ اور بدنامیاں لے کر اپنی متاکی تسکین کر سکتی تھی۔ بے زور اسی دیر میں فیصلہ کر لیا کہ سرتاج کو سیکڑوں بیویاں مل سکتی ہیں مگر ایک ماں نے ملا تو وہ بچہ پھر نہ مل سکے گا۔

سرتاج سمجھ رہا تھا کہ بانو کو کسی قسم کا ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ اس نے قہری دینے کے اے سینے سے لگایا۔ وہ ایک دم سے تڑپ کر الگ ہو گئی پھر رو رو کر کہنے لگی۔  
”آپ مجھے سینے سے نہ لگائیں، میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔ میں نے آپ کو دھوکا دیا۔“

”کیا دھوکا؟“

”میں آپ کی بیوی بننے سے پہلے۔ اے۔ ایک مطلقہ عورت تھی۔ یہ حقیقت میں ہے چھپائی رہی اب آپ جو چاہیں مجھے سزا دیں۔“  
بانو نے دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔ شاید طنز یہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پھر وہ ہنسنے لگا۔ شاید انوکھی حیات کی بے حیائی پر ہنس رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

”میں سپاہی ہوں اور سپاہی کسی علاقہ کو فتح کرنے سے پہلے اس کے جغرافیائی حالات کو جاننا ہوتا ہے۔ میں نے بھی تمہیں اپنی منکود بنانے سے پہلے معلومات حاصل کی ہیں۔ پتا چلا کہ تم ماں بنی پہلے۔ چھپائی گزری میں رہتی تھیں۔ وہاں جا کر مسلمانوں کے محلے پر چلا کہ آصف نام کے کسی شرابی جواری سے تمہاری شادی ہوئی تھی، وہ تمہارا گھر نہ کر اور تمہیں طلاق دے کر چلا گیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تم ایک بچے کی ماں بننے والی تھیں۔ اب بتاؤ وہ بچہ پیدا کنش سے پہلے ضائع کر دیا گیا یا۔“

”نہیں، نہیں وہ زندہ ہے۔“ وہ قدموں سے لپٹ کر روتی چلتی ہوئی بولی ”آپ مجھے مار لیں مگر میرے بچے کو ہٹاؤ اس خطرناک بلندی سے زندہ سلامت اتار کر لے آئیں۔“  
سرتاج نے حیران ہو کر قدموں سے لپٹی ہوئی بانو کو دیکھا۔ چشم زدن میں یہ واضح ہو گیا۔ بچہ پہاڑ کی بلندی پر ہے، اس کی ماں قدموں کی پستی پر بلک بلک کر رو رہی ہے اور

”اب ایک مقامی اخبار نے یہ انکشاف کیا ہے کہ سورگ باسی میٹل چند پٹری اور ان کی دھرم پتی نے اس بچے کو چھپائی گزری کے بالک آشرم سے حاصل کیا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی اصل ماں۔۔۔۔۔“

ایک زور کا دھماکہ ہوا۔ حالانکہ چائے کی پیالیاں گر کر ٹوٹنے سے دھماکہ نہیں ہوتا۔ سرتاج ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔  
”کیا ہوا بانو؟“

کیا ہوا؟ بانو کیسے بتائے کہ کیا نہیں ہوا۔ ایک ننھا سا بچہ اس کے سینے پر لائیں مار رہا تھا۔ ”ای، ای، ائی جان نے مجھے چھپائی گزری کے بالک آشرم میں چھوڑا تھا۔“  
وہ بچہ بانو کے دل کو اپنی نھنی ٹھیں میں مسل رہا تھا ”ای، ای، ای! آپ نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ دیکھیے تقدیر نے بھی مجھے کہاں لے جا کر چھوڑ دیا ہے۔ مجھے ایسی بلندی نہیں چاہئے، مجھے اپنی گود میں اتار لیں ای۔۔۔۔۔“

بانو نے متاسفے قابو ہو کر دونوں ہاتھ اپنے سینے کے اطراف یوں بھینچ لئے جیسے بچے کو نامعلوم بلندی سے اتار کر سینے سے لگا رہی ہو۔ ایسے وقت وہ بھول گئی تھی کہ اس کا سرتاج اس کے سامنے موجود ہے۔ یوں تو اس پاس کی اور بھی بہت ساری دنیا آباد تھی مگر اسے اپنے بچے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جس بچے کو اس نے جنم دیا تھا اور جس کی صورت اس نے بھی نہیں دیکھی تھی، اب اس بچے کے تصور کو جانی کی تصویر سے قائم کر رہی تھی۔

پھر وہ چونک گئی۔ سرتاج اس کے دونوں بازو پکڑ کر جھنجھوڑ رہا تھا ”بانو کچھ تو کہو یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا ہے۔“

وہ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ کر رونے لگی۔ اب اسے اپنی بے بسی کا احساس ہوا کہ وہ صرف ایک بچے والی نہیں، ایک شوہر والی بھی ہے اور اپنے شوہر سے اس گناہ بچے کا وجود چھپاتی آئی ہے۔ اب وہ کس طرح چھپا سکتی ہے؟ اگر اب بھی اپنی زبان بند رکھے گی تو بچے کے پاس کبھی نہیں پہنچ سکے گی اور اگر زبان کھولے گی تو سرتاج کے دل کو نہیں پہنچے گی۔ وہ اب تک اسے دل و جان سے چاہتا رہا۔ اپنی محبوب بیوی کا جھوٹ اور فریب سامنے آئے گا تو جنون کی حد تک محبت کرنے والے شوہر کا رویہ کیا ہو گا؟ ہو سکتا

پتھریوں اور سکیوں کے درمیان بتا رہی ہے کہ چودہ اور پندرہ ستمبر کی درمیانی شب کس طرح فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑک گئی تھی۔ غنڈے نوزائیدہ بچوں کو نیزوں پر اچھال رہے تھے۔ ان حالات میں بچے کو زندہ رکھنے کی خاطر آشرم میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ سرتاج نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر قدموں سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

”میں پورے تین سال سے انتظار کر رہا تھا کہ تم اپنی حقیقت بتاؤ گی۔ کبھی میں سوچتا تھا کہ تم جھوٹی اور خود غرض ہو۔ صرف اپنا مستقبل سنوارنے کے لئے تم نے مجھ سے شادی کی ہے۔ کبھی تمہاری قربت اور محبت سے پتا چلتا تھا کہ تم صرف مجھے چاہتی ہو مگر اس چاہت کے دوران کوئی کاٹنا سا ٹھکنا رہتا ہے۔ اگر کوئی رقیب کاٹنا کر سامنے آتا تو میں کبھی برداشت نہ کرتا۔ لیکن اب یہ سن کر اطمینان ہوا کہ ہماری محبت کے درمیان صرف ایک بچہ ٹھک رہا ہے اور ایک معصوم بچہ کسی کا دشمن نہیں ہوتا۔“

بانو نے خوشی سے لرزتے ہوئے کہا۔

”تو پھر آپ میری مدد کریں گے۔ میرے لعل کو زندہ سلامت میری گود میں پہنچائیں گے۔“

”بانو اس بچے کو صحیح سلامت پہاڑ کی چوٹی سے نیچے لانے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ اب میں ایک باپ بن کر اس بچے میں دلچسپی لوں گا۔ میں وہاں جا رہا ہوں۔ تم فوراً بلجائی گوڑی کے آشرم میں پہنچ کر یہ ثبوت حاصل کرو کہ وہ بچہ تمہارا ہے یعنی ہمارا۔“

”اوہ سرتاج! آپ انسان نہیں فرشتہ ہیں۔ آپ نے یہ کہہ کر مجھے ہمیشہ کے لئے فریاد لیا ہے کہ آپ میرے اس بچے کے باپ ہیں۔“

وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر خوشی سے رونے لگی۔



میرا جب پہاڑی کے دامن میں پہنچی تو وہاں ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا۔ ہزاروں آنکھیں پہاڑی بلندی کی طرف اس عمودی چٹان پر لگی ہوئی تھیں جہاں سے وہ بچہ نظر نہیں آسکتا تھا مگر ہزاروں دلوں میں ایک ہی مشترکہ حسرت تھی کہ وہ بخیریت نظر آجائے۔ اتنے بڑے ہجوم کو روکنے کے لئے دور تک موٹے موٹے رے پانڈھ کر مدد بنی کر دی گئی تھی۔ حد بندی کے اندر فوجی نوجوان کوہ پیادوں کی مدد کر رہے تھے۔ پہاڑ چڑھنے

میرا اس بچے کو دلوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ بھی آنکھوں سے دھیریں لگائے کوہ پیادوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بڑی بڑی سرخ لائٹ دور تک پہاڑ کو لائٹ کر رہی تھیں۔ داس دیو نے آنکھوں سے دھیریں ہٹاتے ہوئے کہا۔

”میرا! تم نے آج شام کا ہمارا اخبار پڑھا ہوگا اس سے اندازہ لگاؤ کہ ہم کتنی نذر نادی سے کام کرتے ہیں۔“

”رک کیوں گئے؟ کیا فوجی کیپٹن کی بیوی نے تمہاری کھوپڑی میں دھماکہ کر دیا ہے؟“  
 اس پر آنکھیں سکیڑ کر دوڑ جاتی ہوئی بانو کو دیکھ کر بولا۔

”نوب ہے۔ یہ تو محلے سے کیپٹن کی بیوی نہیں، صرف ایک اجڑی ہوئی ماں نظر آتی ہے۔“

میرا بھی سنجیدگی سے بانو کے متعلق سوچنے لگی کہ ایک کیپٹن کی بیوی یہاں پریشان کیوں آئی ہے۔ بچے سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ یہ تو مسلمان ہے اور بچہ ہندوؤں انہم سے آیا ہے۔ کیا ایک مسلمان ماں اپنے بچے کو ایسے آشرم میں چھوڑ سکتی ہے۔ چھوڑنے کی بات آئی تو یہ یاد آیا کہ کوئی عورت اپنے بچے کو آشرم کے دروازے پر لٹکی تھی۔ کیا وہ عورت یہی کیپٹن کی بیوی تھی؟ میرا سوچتے سوچتے ٹھک گئی۔ اس لئے ٹھک گئی کہ وہ بچے کو صرف اپنی ملکیت سمجھتی تھی۔ کسی دوسری عورت کو اس کا حقدار نہ تھیں۔ یہ سچی تھی۔ وہ ٹھکن مٹانے کے لئے ایک ریسٹورنٹ کی طرف چائے پلائی۔ اس پر بانو بھی اس کے ساتھ تھا اور اس سے کہہ رہا تھا۔

”تم عورت ہو کیپٹن کی بیوی سے دوستی کر کے بہت کچھ معلوم کر سکتی ہو۔“

میرا نے خشک لہجے میں کہا۔

”اگر میں معلومات حاصل کروں گی تو تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔“

”تم تو بے کار مجھے اپنا دشمن سمجھ رہی ہو اگر میں سچی خبریں شائع کرتا ہوں تو اس کے نہیں ناراض نہیں ہوتا چاہئے۔“

اگر سچی خبر سے کسی معصوم اور مظلوم کی زندگی تباہ ہو جائے تو اسے شائع کرنا اخلاقی ہے۔“

”کیا اس ناجائز بچے کو جنم دیتے وقت اس عورت کو اخلاقیات کا خیال نہیں آیا؟“

”میں کیا سمجھو گے کہ عورت کن حالات میں مجبور ہو جاتی ہے، کس طرح محبت کے نام پر جاتی ہے؟ اور کس طرح دوسروں کی ہمدردی میں لٹ جاتی ہے؟“

میرا کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیا تمہارا اپنا ایسا کوئی تجربہ ہے؟“

وہ چائے کا آخری گھونٹ پی کر جلدی سے اٹھ گئی۔ اس پر بانو نے اس کی دکھتی رنگ پر

میرا نے کوئی جواب نہیں دیا پھر وہ کہنے لگا۔

”میں اس یقین کے ساتھ آیا ہوں کہ ہمارا اخبار پڑھتے ہی بچے کی ماں ضرور آئے گی مگر اتنے بڑے جھوم میں صرف ایک عورت تم ہی نظر آ رہی ہو۔“

میرا نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوچا ”کیا میں بتاؤں کہ بچے کی ماں تمہارے سامنے کھڑی ہے؟ مگر نہیں جب تک یہ راز رہے بہتر ہے۔“

اس ماں کے دماغ کے کسی گوشے میں یہ بات تھی کہ پہلے بچے کا انجام دیکھ لینا چاہئے اگر وہ زندہ سلامت واپس آئے گا تو وہ کھل کر بچے کا دعویٰ کرے گی ورنہ بچے کے ساتھ ماں کے رشتے کو بھی دفن کر دے گی۔

اس کے سوچنے کے دوران اس پر بانو نے اچانک کہا۔

”آگئی جس کا انتظار تھا، وہ آگئی۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہی اس بچے کی ماں ہے۔“

میرا نے گھوم کر دیکھا۔ بانو بھیڑ کو چرتی ہوئی رے کی طرف آ رہی تھی۔ اس کا شلوار کرتا گرد آلود تھا۔ دوپٹہ ایک شانہ سے ڈھلک کر اس کے قدموں سے الجھ رہا تھا۔ چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں یوں جنونی انداز میں پھیلی ہوئی تھیں جیسے دل کی تمام دھڑکنیں آنکھوں کی دہلیز پر آکر پکار رہی ہوں ”میرے فعل رات ہو چکی ہے واپس آ جاؤ میں دروازہ بند کروں گی۔“

اس پر بانو نے کہا ”اس کی اجڑی ہوئی حالت بتا رہی ہے کہ یہ بچے کی ماں ہے۔ میں ابھی دھماکہ خیز معلومات حاصل کرتا ہوں۔ کل کا اخبار بھی ہاتھوں ہاتھ بکے گا۔“

بانو رے کے پاس آئی اور ذرا جھک کر حد بندی لائن کے اندر جانے لگی۔ ایک پولیس آفیسر نے اس کا راستہ روک کر کہا۔

”شرمیتھی جی! اندر آنا منع ہے۔ آپ باہر چلی جائیں۔“

بانو نے ہانپتے ہوئے کہا ”مجھے معلوم ہے۔ تم سامنے سے ہٹ جاؤ، میں کیپٹن سرنج حسین کی بیوی ہوں۔“

آفیسر فوراً ہی ادب سے ایک طرف ہٹ گیا۔ اس پر بانو بھی ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ میرا نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

انگلی رکھ دی تھی مگر وہ بھی باز آنے والی نہیں تھی۔ ہوٹل کے کاؤنٹر پر دو پیالی چائے کے پیسے ادا کرتے ہوئے بولی۔

”یہ تیری اور میرے اس بیٹے کی چائے کے پیسے ہیں۔“

پھر وہ داس دیو کی طرف پلٹ کر بولی۔

”میں کسی اخبار میں شائع نہیں کروں گی کہ تم میرے ناجائز بیٹے ہو۔“

وہ تیزی سے چلتی ہوئی ہوٹل کے باہر چلی گئی۔ داس دیو چند لمحوں کے لئے ساکت رہ گیا۔

پھر اس نے غصہ سے میرا کی جانب دیکھا لیکن غصہ نہ دکھاسکا۔ ٹھیک اسی وقت ایک بڑی سی ویگن کار ہوٹل کے قریب آکر رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر ایک بہت مشہور ہیرو ٹیکسٹر باہر آیا۔ پھر اس نے دوسری طرف کا دروازہ کھولا۔ اس دروازے سے اس مجمع کی تیسری عورت باہر آ رہی تھی۔

وہ سیاہ بارڈر کی سفید ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ سیاہ بلاؤز سے ابلے بدن کی چاندنی پھوٹ رہی تھی۔ ماتھے پر چند ناک ٹپا تھا۔ ریشمی جوڑے کے پس منظر میں اس کا حسین چہرہ

بجھا بھسا تھا۔ گاڑی سے باہر آتے ہی اس کی آنکھیں پھاڑ کی تاریک چوٹی سے جا لگی تھیں۔ وہ آنکھیں اپنی زبان بے زبانی سے کہہ رہی تھیں۔

”میرے کرشن، میرے مندلال، میرے ماکھن چور تیری بیٹھو دھا میا آگئی ہے۔ ایک عیاش نے یہ نہیں سوچا کہ ہمیں ماں بیٹے کے رشتے میں پرو کر وہ سماج کو اور دھرم کو کتنی

بڑی گالی دے رہا ہے۔ یہ تو صرف ماں کا خوصلہ ہوتا ہے کہ وہ اتنی بڑی گالی کو بڑے پیار سے دودھ پلاتی ہے۔ نیچے اتر آ میرے لال! میری گود خالی ہے۔“

داس دیو نے اسے دیکھتے ہی میرا کے قریب آکر کہا۔

”ارے یہ تو مشہور فلم انسٹار بیٹھو رانی ہے۔ میں نے سنا تھا کہ یہ کسی قتل کے کیس میں

سزا کاٹ رہی تھی۔ اتنی مصروف اداکارہ ایک بچے کو دیکھنے یہاں آئی ہے یقین نہیں آتا کہ یہ بچے کی ماں ہو سکتی ہے۔ میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔“

وہ تیزی سے چلتا ہوا بیٹھو رانی کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”میڈم! میں ایوننگ نیوز کا رپورٹر داس دیو ہوں۔ آپ نے آج شام کے اخبار میں

پڑھا ہو گا کہ وہ بچہ لے پانگ ہے یعنی اس کی اصل ماں اب بھی کیس زندہ ہوگی۔ مجھے یقین

ہے کہ وہ یہاں آئے گی۔ میں اس کی تلاش میں آیا ہوں۔“

بیٹھو رانی چند لمحوں تک اسے دیکھتی اور سوچتی رہی۔ پھر اس نے پوچھا۔

”آپ اس کی ماں کو تلاش کر کے کیا کریں گے؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے میڈم! میں اس عورت کی تصویر اور اس کا بیان شائع

دل گا۔“

”کسی عورت اور ایک معصوم بچے پر کچھ اچھا حال کر تم کتنے پیسے کمالو گے؟“

”آہ! ام میں تو سچائی۔۔۔“

وہ بات کٹ کر بولی ”سچائی کی بات نہ کرو۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ

ایک ایسی عورت بڑی کس طرح ہوتی ہے۔“ پھر اس نے ٹیکسٹر سے کہا۔

”ٹیکسٹر اس رپورٹر سے پوچھو کہ اس کے اخباری دفتر اور پولیس کی قیمت کیا ہے۔ یہ

خدا کا ہاتھ ہے اتنے نوٹ اس کے منہ میں ٹھونس کر منہ بند کر دو۔“

وہ اپنا پرس سنبھالتی ہوئی رے کی طرف جانے لگی۔ میرا تیز قدموں سے چلتی ہوئی

رے کے ساتھ ہو گئی پھر اس سے بولی۔

”بیٹھو رانی! میرا نام میرا ہے پہلے بھی ہمارا سامنا ہو چکا ہے شاید تم نے مجھے پہچانا

ہی؟“

وہ رک کر اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر انکار میں سر ہلا کر بولی۔

”میرے اتنے پرستار ہیں کہ میں ہر ایک کا چرویا د نہیں رکھ سکتی۔“

”میں تمہاری پرستار بن کر تمہارے سامنے نہیں آئی تھی۔ آج سے پانچ برس پہلے

وہ تبصری صبح ہم دونوں آشرم میں موجود تھیں اور ہم دونوں ایک ہی ارادے سے وہاں

آئی تھیں۔“

بیٹھو رانی نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔

”اب وہ میں سمجھ گئی۔ میں پڈت گردھاری لال سے مل چکی ہوں۔ انہوں نے بتایا ہے

کہ اس بچے کے تین دعویدار ہیں۔ ایک میں ہوں۔ دوسری تم نظر آ رہی ہو۔ کیا یہاں

نہی ابھی موجود ہے۔“

”ہاں یہاں ایک عورت اور ہے میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ تیسری دعویدار

ہوگی۔ بہتر ہے کہ ہم کہیں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں۔“

”نہیں، پہلے میں اپنے بچے کی خبروں کی۔“

میرا نے تصحیح کی ”پانچ نہیں، ہمارا بچہ۔ جب تک یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ وہ کس کا ہے اس وقت تک وہ ہم تینوں کا ہوگا۔“

یثورانی کو اس کی بات بری لگی۔ کیونکہ متنا خود غرض ہوتی ہے اپنی گود کے بچے کو دوسری گود سے منسوب نہیں کر سکتی لیکن متنا دوسری ماؤں کا درد بھی سمجھتی ہے۔ یثورانی کو تسلیم کرنا بڑا کہ فی الحال وہ تینوں کا مشترکہ بچہ ہے۔

میرا نے کہا ”صبح سے پہلے بچے کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہو سکے گا۔ کوہ پنا اجبت سنگھ اپنی ٹیم کے ساتھ روانہ ہو چکا ہے جب تک کوئی نئی اطلاع ملے ہم کہیں تھمائی میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“

یثورانی اس کے ساتھ اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے پوچھا۔

”اس بات کا فیصلہ کیسے ہو گا کہ وہ بچہ کس کا ہے؟“

”یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ جب میں نے اپنے بچے کو جنم دیا تو اس وقت میں غم

بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ میرے ایک ہمدرد دکانچی نے مجھے اس بچے کی صورت نہیں دکھائی کہ کہیں میری متا بچل نہ جائے۔ انہوں نے اسے آشرم میں پہنچا دیا۔ اگر میں اس کی صورت دیکھ بھی لیتی تو کیا پانچ برس کے بعد وہ صورت سے پہچانا جاسکتا ہے؟“

”نہیں“ یثورانی نے کہا۔ میں نے اسے جنم دینے کے بعد دیکھا تھا۔ آج اخبار میں اس کی تصویر بھی دیکھی، اب وہ پہچانا نہیں جاتا۔ پانچ برس میں بڑی تبدیلیاں آجاتی ہیں۔“

”کیا اس کے جسم پر کوئی واضح شناختی نشان تھا؟“

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

”اس بات کا میں نے خیال نہ رکھا۔ مجھے اس کی کوئی نشانی یاد رکھنی چاہئے تھی مگر میں قتل کے مقدمے اور بچے کے چھڑنے کے خیال سے اس طرح داغی پریشانی میں مبتلا رہی کہ بچے کے کسی شناختی نشان کی طرف دھیان نہ دے سکی۔“

وہ بولتے بولتے سوچنے لگی ”کاش کہ میں بچے کو آشرم میں نہ دیتی مگر وہ لوگ مجھے جین دلا چکے تھے کہ مجھے پھانسی ہو جائے گی۔ ان دنوں ٹیکسٹر بھی دیس سے باہر شرمگ میں

معروف تھا اور نہ میں بچے کو اس کے حوالے کر دیتی۔ اور جب وہ واپس آیا تو میری تقدیر نے اکی میرا ساتھ دیا۔ عدالت نے یہ کہہ کر مجھے بری کر دیا کہ پنالال کے ملازم نے مجھے پنالال سے ملاقات کے بغیر واپس جاتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ اس نے مجھے اس کو نجی میں نہیں دیکھا اور نہ ہی جائے واردات پر میری موجودگی کا کوئی ثبوت پایا گیا، محض شبہ کی بنا پر مجھے سزا نہیں دی جاسکتی۔

جینی سے رہا ہوتے ہی میں ٹیکسٹر کے ساتھ آشرم میں پہنچی تو ایک سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ پنڈت گردھاری لال نے یہ کہہ کر مایوس کر دیا کہ اس آشرم میں کسی کے بچے کی شناخت نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلے میں وہ تحریری کارروائی نہیں کرتے ہیں البتہ میرے یاد دلانے پر پنڈت جی کو یاد آگیا کہ چودہ اور پندرہ ستمبر کی درمیانی شب فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تھے۔“

میرا نے پوچھا ”یثورانی کیا سوچ رہی ہو؟“

”اں؟“ وہ چونک کر بولی ”پنے بچے کے لئے سوچ رہی ہوں۔ جو اب ہمارا ہو گیا ہے۔“

اسی وقت ان دونوں نے گاڑی کے باہر دیکھا۔ باہر تاریکی میں ایک عورت سائے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ میرا نے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ دروازہ کھول کر بولی۔

”تم کیپٹن سرناج حسین کی شریک حیات ہو۔ اندر آ جاؤ۔“

بانو نے گاڑی کے اندر آ کر دروازے کو بند کیا۔ پھر ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

”میرا نام بانو ہے۔ شاید میں اپنے بچے کی دو ماؤں سے مل رہی ہوں۔“

میرا نے اس سے بھی کہا کہ وہ اپنا بچہ نہیں ہمارا بچہ کہے۔ بانو نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”جو بچہ ازل سے میری گود میں لکھ دیا گیا ہے، میں اسے آخری سانس تک اپنا کہوں گی۔ تم دونوں بھی اسے اپنا کوگی تو میں اعتراض نہیں کر سکیں گی۔ سیدھی سی بات ہے وہ اپنا نہ ہونا اور اپنائیت نہ ہوتی تو ہم تینوں یہاں نہ آتیں۔“

یثورانی نے کہا ”تم ٹھیک کہتی ہو۔ اسے اپنا کہتے وقت اعتماد پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنا ہی ہے مگر اس طرح ہمارے درمیان جھگڑا پیدا ہو گا۔“



لے میرا نے اپنی کتاب زندگی کھولی۔ اس نے اعتراف کیا کہ وہ جذبات کی رو میں بہہ کر اپنی ایک عام سی غلطی کر بیٹھی تھی۔ اس کی داستان عام سی تھی مگر متا اپنی ذات میں اس درجہ رکھتی ہے۔ وہ بحالت مجبوری بچے کو جدا کر سکتی ہے لیکن اس کی محبت کو دل بے درجہ کر نہیں پھینک سکتی۔ اس نے داستان کے آخر میں کہا۔

”میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ دنیا والے میرے بچے کو ناجائز کہیں اور میں اپنا کیریر اپنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے بچے کو آشرم میں چھوڑ دیا۔“

بیٹورانی نے اپنی داستان کے آخر میں کہا۔

”ظلم کی ہیروئن کوئی اتنی نیک نام بھی نہیں ہوتی۔ میں بدنامیاں اٹھا کر بچے کو ضرور نئی مگر چھائی پانے کے خیال سے میں اپنے بچے کو آشرم جیسی محفوظ جگہ چھوڑنے پر مجبور ہوئی۔“

بانو نے اپنی داستان حیات سنانے کے بعد کہا۔

”مہ مجھے بدنامی کا ڈر تھا اور نہ ہی کوئی میرے بچے پر انگلی اٹھا سکتا تھا۔ میں آخر وقت اپنی ماں سے لڑتی اور ضد کرتی رہی کہ بچہ میری گود میں پرورش پائے گا۔ لیکن مذہب و دھرم کی آڑ لے کر خون کی ہولی کھیلنے والے درندوں نے میرے دل میں دہشت بٹھادی لہذا کسی محفوظ مقام پر نہ پہنچایا گیا تو ظالم اسے نیزوں پر اچھالیں گے۔“

یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تھوڑی دیر کے لئے گاڑی کے اندر سناٹا چھا بلا یہ سناٹا ان تین عورتوں کے اندر بھی تھا۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کو سمجھنے کے بعد ہر کسی کی گود سے بچے کو نہیں چھین سکتی تھی۔ کیونکہ پرانی گود کا درد اب اپنا ہی درد

میں ہو رہی تھی۔ وہ تینوں آنسو پوٹھتی ہوئی گاڑی سے باہر آگئیں۔ بانو انہیں حد نہ لائیں کے اس پار لے گئی اور اپنے سر تاج سے بچے کی باقی دواؤں کا تعارف کرانے لہ سر تاج حسین نے مسکرا کر کہا۔

”میں تم تینوں کو یہ خوش خبری سناؤں کہ اجیت سنگھ سے رٹائرمنٹ پر منتقل ہو چکی ہے“

بچے کو بحفاظت لے کر آ رہا ہے۔“

مارے خوشی کے ان تینوں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ بانو نے سر تاج کے بازو

”ہاں سمجھوتے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا ہے۔“

”بچہ متا کے بازار میں تین ماؤں کے درمیان نیلام بھی نہیں ہو سکتا۔“

”اس کے لئے لائری کی پرچی بھی نہیں اٹھائی جا سکتی۔“

”حضرت سلیمان کے دربار میں دو عورتوں نے ایک بچے کا دعویٰ کیا تھا۔ وہاں اصل ماں کے ساتھ انصاف ہو گیا تھا مگر ہم تین ماؤں کا فیصلہ کسی دربار میں نہیں ہو سکتا۔“

میرا نے کہا ”خود غرضی کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی اپنی صلاحیتوں اور طاقتوں کے بل پر اسے حاصل کریں۔ میرے پاس قلم کی طاقت ہے، میں اپنے بچے کو حاصل کرنے کے لئے دیس کے سارے اخبارات کو بھیجو ڈالوں گی۔“

بیٹورانی نے کہا ”میں ایک قلم میں کام کرنے کا معاوضہ چالیس لاکھ روپے لیتی ہوں۔ اس وقت میرے پاس سات کروڑ کا بینک بینکس اور دو کروڑ کی جائیداد ہے میں اپنے بچے کے لئے آٹھ کروڑ روپے داؤ پر لگا دوں گی اور سب جانتے ہیں کہ روپے سے بڑی کوئی طاقت نہیں ہے۔“

بانو نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر یقین مستحکم سے کہا۔

”میرے پاس بھی بہت بڑی طاقت ہے اور وہ ہے خدا۔۔۔“



رات پہاڑ بن گئی تھی۔ ان تینوں کی آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی۔ پتا نہیں وہ بچہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر آسمان کے پالنے میں سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا۔ زندہ تھا یا مر چکا تھا۔ اسی تشویش میں ماؤں کی نیند مر گئی تھی۔

میرا نے ہنستے ہوئے کہا ”ہم سب پریمی لکھی سمجھدار عورتیں ہیں۔ ہمیں جاہلوں کے انداز میں ایک دوسرے کو چیلنج نہیں کرنا چاہئے۔ اگر ہم سولت سے پر سکون ہو کر سوچیں تو شاید کوئی حل نکل آئے۔“

بانو نے کہا ”میرے خیال سے ہم تینوں اپنی اپنی داستان سنائیں۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کے دکھ درد کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔ جب ہمارا درد مشترک ہو گا تو ہم مشترکہ محبت کے جذبہ سے کوئی دانش مندانہ فیصلہ کر سکیں گے۔“

وہ راضی ہو گئیں۔ پھر رات گزارنے کے لئے باری باری اپنی داستان سنانے لگیں۔

بچے کی بھلائی کے لئے سوچنا چاہئے۔ کیا تم تینوں نے بچے کو بدنامی سے بچانے کے لئے انہم میں نہیں چھوڑا تھا؟

یثورانی اور میرا نے تائید کی۔ بانو نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”جی نہیں۔ بچہ میرے پاس عزت سے رہ سکتا تھا اور اب بھی اسے وہی عزت ملے گی۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں اپنے بچے کو نیزے کی لانی پر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کی لاشی کے لئے اسے چھوڑ دیا تھا۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو اب میں میرا اور یثورانی سے پرارتھا کرتا ہوں کہ وہ بچے کو ایسی جگہ رکھیں جہاں وہ ناجائز نہ کھلائے۔ بانو کا بچہ جائز تھا بلکہ ہے۔ اس لئے اسے بانو کے پاس رہنے دو۔ تم کبھی کبھی بانو کے ہاں جا کر ایک ماں کی حسرتیں پوری کر سکتی ہو۔ اگر تم دونوں نے میرے اس فیصلے سے انکار کیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ بچے کی عزت تمہیں باری نہیں ہے۔“

یہ کہہ کر پنڈت جی باہر چلے گئے میرا اور یثورانی تھوڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہیں۔ جب بانو ان کے قریب گئی تو وہ دونوں بانو کے سینے سے لگ کر رونے لگیں ان کی آنکھوں سے بننے والے آنسو ایک معصوم بچے کی بدنامی کو ہمیشہ کے لئے دھو رہے تھے۔

باہر اس دیو نے پنڈت جی کو دیکھ کر کہا۔  
”پنڈت جی! میں سب سمجھتا ہوں کہ اس گاڑی کے اندر کیا کچھڑی پک رہی ہے۔ بچی زہرے اخبار میں آکر رہی رہے گی۔“

”پنڈت گردھاری لال نے قریب آکر آہستگی سے کہا۔  
”میرے سچے صفائی بیٹے! ایک مسلمان عورت نے ہندو غنڈوں سے اپنے بچے کو محفوظ رکھنے کے لئے اسے آشرم میں چھوڑ دیا تھا۔ کیا یہ بچی خیر تم ہمارے دیس کے کسی اخبار میں لکھ کر سکو گے؟“

داس دیو کا لٹکا ہوا منہ تیار ہوا تھا کہ ایسی بچی خبروں کو اخباری زبان میں پڑھ بیٹھا کہتے

سے لگ کر کہا ”میرا بچہ!“

میرا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ”میرا بچہ!“

یثورانی پہاڑ کی بلندی کو نگاہوں سے چھو کر بولی ”میرا بچہ!“

جب سے دنیا آباد ہوئی ہے ”میرا اور تیرا“ کا جھگڑا چل رہا ہے مگر وہ تینوں ماں اپنے اندر لڑتے لڑتے تھک گئی تھیں اور یہ بات سمجھ میں آگئی تھی کہ آپس کے جھگڑے میں بچہ دنیا والوں کے سامنے تماشہ بن جائے گا۔

وہ سوچتی رہیں اور بچے کی واپسی کا انتظار کرتی رہیں۔ حد بندی کے باہر ہزاروں افراد بھی پہاڑ کی جانب تک رہے تھے۔ تقریباً چار گھنٹے کے بعد اجیت سنگھ اپنی ٹیم کے ساتھ بچے کو اپنی پشت پر باندھ کر صحیح سلامت بچے آگیا۔ وہ تینوں بے اختیار اس کی طرف دوڑنے لگیں گئیں۔ اب بچے کو کبل میں لپیٹ کر اسٹریچر پر لٹایا جا رہا تھا۔ تینوں ماں اس پر جھک گئیں وہ آنکھیں بند کئے لیٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ ایسا معصوم اور جاذب نظر تھا کہ ماؤں کے دل اس کی طرف پھینچے جا رہے تھے۔

فونی ڈاکٹر نے کہا ”آپ سب بچے کے پاس سے ہٹ جائیں“ اسے فوری طبی امداد کے لئے اسپتال پہنچانا ہو گا پلیز۔“

وہ تینوں ایک طرف ہو گئیں۔ حد بندی کے باہر کھڑے ہوئے داس دیو نے اپنی کھوپڑی کو سلالتے ہوئے سوچا ”یہ تین کا ہندسہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ کچھلی رات سے یہ تینوں ایک ساتھ نظر آرہی ہیں۔ اب اس میں شبہ نہیں رہا کہ ان میں سے کوئی ایک اس بچے کی ماں ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ان تینوں نے مل کر اس ایک بچے کو جنم دیا ہو۔“

یثورانی، میرا اور بانو کسی حتمی فیصلہ تک پہنچنے کے لئے پھر اسی گاڑی کی طرف جانے لگیں۔ گاڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر پنڈت گردھاری لال بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تینوں انہیں دیکھ کر خوش ہو گئیں جیسے وہ اصل ماں کی نشاندہی کرنے آئے ہوں۔ انہوں نے کہا۔

”اندرا گرو دروازہ بند کر لو اور مجھے بتاؤ کہ تم لوگوں نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

وہ تینوں اندر آ گئیں۔ دروازہ بند ہو گیا۔ میرا نے کہا۔

”ہم میں سے کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہے۔ آپ ہماری مدد کریں۔“

”بیٹی! صرف اپنی ممتا کے لئے سوچو گی تو کبھی فیصلہ نہیں ہو سکے گا۔ تم تینوں کو صرف

## کلی کا کفن

لو کو!

تم انشائی جذبوں کو لبو کا کفن  
اور پھول کے رشتوں کو خزاں کا کفن  
پہناتے ہو

اب آؤ

اور اس کلی کو ہوس کا کفن پہنا دو  
تمہاری تہذیب مکمل ہو جائے گی۔

اِس دھوکے میں رہا کہ وہ کسی دن میری بہن کا رشتہ مانگنے آئے گا مگر اُنہی دنوں بنگلہ دیش  
 ے مہاجرین کے قافلے آنے لگے۔ ان کی مصیبتوں میں کام آنے کے لیے صاحب  
 بیٹ لوگ روپے میسے کی امداد کے علاوہ لئے ہوئے خاندان کے افراد کو کہیں کام دھندے  
 ے لگانے لگے اور کہیں ان کا گھر سامنے لگے۔ فیم احمد بھی ایک مہاجر لڑکی کو اپنی بہن  
 بننے کے لیے برات لے کر ان کی بہن بنی ہوئی تھی۔

ہم سب کو مہاجرین سے بدردی ہے لہذا میں فیم احمد سے یہ نہ پوچھ سکا کہ بندہ پرورد  
 اپ میری بہن کی تقریض کیا کرتے تھے پھر ایک خانماں برباد لڑکی کی خانہ آبادی کیوں  
 کر ہے ہیں؟ ایسا پوچھتے وقت میں خود غرض کھاتا اس لیے چپ چاپ شریف احمد کو دلہا  
 ہارے اپنی عیسیٰ میں بٹھا کر اس لڑکی کے دروازے پر لے آیا جو میری بہن کی جگہ دلہن  
 بنی ہوئی تھی۔

ہم عیسیٰ والے یوں تو اپنی مرضی کی سواری بٹھاتے ہیں لیکن پولیس والوں کے سامنے  
 اور اپنے محلے والوں کے سامنے اپنی سن مانی نہیں کرتے کیونکہ محلے میں ہمیں رہنا ہوتا ہے  
 اور خالات میں ہم رہنا نہیں چاہتے۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں شریف احمد کی برات  
 کے ماتھ جانے سے انکار کر دیتا لیکن میں عیسیٰ ڈرائیور بھی تھا اور محلے کا براتی بھی۔ اس  
 لیے مجھے نکاح میں بھی شریک ہونا پڑا۔ مزید ستم یہ کہ نکاح پڑھانے والے قاضی صاحب  
 نے مجھے قاضی بنا کر دو دیو کیوں کے ساتھ لڑکی کے پاس ایجاب و قبول کی گواہی کے لیے بھیج  
 دیا۔

مجھے یہ اعزاز اس لیے حاصل ہوا کہ میں میٹرک پاس عیسیٰ ڈرائیور ہوں۔ انگریزی  
 ابھی طرح سمجھ لیتا ہوں اور اردو فصاحت و بلاغت سے بولا ہوں۔ محلے والوں پر میرا دور  
 بری بہن کا رعب طاری رہتا ہے کیونکہ وہ بھی ان دنوں فرسٹ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔  
 جب میں نکاح قبول کرائے عورتوں میں گیا تو وہ سائنلی سلونی بنگالی ڈشیرہ کھو کھٹ  
 ٹالے بیٹھی تھی۔ بنگال کے حسن کا سلوانا بن مشہور ہے۔ میں اس کا چہرہ تو نہ دیکھ سکا مگر  
 حائل ہاتھوں کی نزاکت اور ملاعت بتا رہی تھی کہ بدنامیگین حسن ہے۔ میں ابھی تک کنوارا  
 ہوں مگر عیسیٰ کے ایک ایک پرزے کی طرح عورت کے کل پرزوں کو سمجھتا ہوں میری  
 داستان حیات بتائے گی کہ ایک تجربہ کار عیسیٰ ڈرائیور بننے کے لیے عورت کو سمجھنا کتنا

## کلی کا کفن

کبھی کبھی میری عیسیٰ دلہن کی طرح سنورتی ہے اور اس دلہن کی آغوش میں دلہا سا  
 باندھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ آگے آگے بیٹھا ہے والے فلمی دھن سناتے جاتے ہیں اور آگے  
 پیچھے براتی اور دلہا کے رشتے دار پانچ پیسے اور دس پیسے لٹاتے رہتے ہیں۔ ایسے وقت یوں  
 لگتا ہے جیسے میں اپنی پچیس برس کی کنواری شمشاد کے لیے اس دنیا کے منگے بازار سے  
 ایک دلہا خرید کر لے جا رہا ہوں۔

برات ہمارے محلے شریف آباد سے چلی تھی اور اورنگی ساڑھے گیارہ گنہر پہنچ کر رکی  
 تھی جہاں مصیبت کے مارے لوگ بنگلہ دیش سے آکر نہا لے رہے تھے۔ برات کے دلہا کا  
 نام شریف احمد ہے۔ شریف احمد واقعی اسم باس می ہے۔ ہمارے محلے میں اس نے شرافت  
 کی مثال قائم کی ہے۔ وہ کبھی نظرس اٹھا کر جوان لڑکیوں کو نہیں دیکھتا۔ میرے کچے مکان  
 کے ٹھیک سامنے اس کا پکا مکان ہے۔ خود میری بہن شمشاد نے اس کی تعریف کی ہے کہ  
 شریف احمد بیٹہ اس کے سامنے سے سر جھکا کر گزر جاتا ہے۔

میں بچ کتا ہوں کہ اس کی حد سے زیادہ شرافت مجھے منگی پڑی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ  
 وہ دو سروں کی نظرس بچا کر میری بہن کو دیکھے، مجھ سے چھپ کر میری بہن کی محبت میں  
 گرفتار ہو جائے۔ آپ مجھے بے غیرت کہیں گے اور زیادہ کہیں گے تو مجھے بہن کا دلال کہہ  
 کر پکارتیں گے مگر ایسا کہنے سے پہلے آپ کو میری غریبی اور میرے کچے مکان کو دیکھنا ہوگا۔  
 میری بہن کی بروہتی ہوئی عمر کا حساب کرنا ہوگا۔ ان حالات میں لڑکی والے یہی چاہتے ہیں  
 کہ کوئی لڑکا ان کی لڑکی کی خوب صورتی اور خوب سیرتی دیکھ کر پھنس جائے۔ اگر چہانے  
 کے اس عمل کا نام دلالی ہے تو ہم سب اس سوسائٹی کے مذہب دلال ہیں۔

شریف احمد کا باپ فیم احمد بھی بہت زیادہ شریف اور غریب پرورد ہے۔ وہ اپنے بیٹے  
 کے لیے کسی غریب لڑکی کو بہو بنا کر لانا چاہتا تھا اور اکثر میری شمشاد کی تقریض کیا کرتا تھا۔

بانداری سے نہ سہی بے ایمانی سے ہی کہیں پہنچا دے، کسی کی دلمن بناوے اس دنیا میں  
بکچھ ہوتا ہے۔ تجھ سے کچھ نہیں ہوتا۔۔۔

میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ پہلے میں ایماندار تھا۔ میٹر کے مطابق پیسے لیا کرتا تھا۔ میں  
بتا تھا کہ ایماندار سے ٹیکسی چلا کر رکشیاں اعظم بن جاؤں گا۔ پھر میری سمجھ میں آ گیا کہ  
دنیا میں ایک کو نقصان پہنچائے بغیر دوسرا فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ دو وقت کی روٹی  
مانے کے لیے کسی نہ کسی کی جیب سے پیسہ نکالنا پڑتا ہے اگر میں کسی سواری سے کموں  
میٹر سے چلنے میں میرا نقصان ہے ایک روپیہ زیادہ دو تو وہ سیدھی طرح کبھی نہیں دے  
۔ اسے میرے نقصان کی پروا نہیں ہوگی کیونکہ لوگ صرف اپنے فائدے پر نظر رکھتے  
ہے۔ پھر میں کیوں نہ اپنا فائدہ دیکھتا؟

اس لیے میں نے میٹر تیز کر دیا۔ ایمان کا میٹر بہت سست ہے کیونکہ ایمان کا حساب  
ات کے دن ہوگا۔ ابھی جس قیامت کا سامنا ہے اس سے نجات حاصل کرنا ضروری  
ہے۔ کھانے، کپڑے، مکان کا کرایہ اور تعلیم کے اخراجات کے لیے ہر شخص بے ایمانی کا  
نیز چلا رہا ہے۔ یہ جتنی تیزی سے چلاتا ہے اتنی ہی تیزی سے منگائی بھی بڑھتی جاتی ہے  
رہن کی کنواری آپس بھی دل کو چھلی کرتی جاتی ہیں۔ اس لیے اب میں مسافروں کو  
دل میں لگا کر راستہ خراب ہونے کا بہانہ کر کے لمبے راستے سے لے جاتا ہوں۔ وہ  
پہ کھا کر مجھے خوشی سے زیادہ پیسے دیتے ہیں اور اپنی نادانی سے سمجھاتے ہیں کہ یہ دنیا  
پہ کھا کر ہی خوش رہتی ہے۔

اس طرح میں نے پانچ برس میں بہن کی شادی کے لیے نئے کپڑے، سونے کے  
پیرات اور جینز کا تھوڑا سا سامان جوڑ لیا ہے۔ لیکن اتنی بے ایمانیوں کے باوجود یہ سمجھ  
نہیں آتا کہ اپنی بہن کے لیے کس طرح بے ایمانی سے ایک دلہا خرید کر لے آؤں؟ اگر  
بیک دلہا کو چھانسنے کے سلسلے میں ذرا بھی بھول چوک ہوگی تو میں غیر مذہب دلال کہلاؤں  
گا۔

دارو کی آگ حلق سے اتارتے وقت میں ایسی بہت سی گہری باتیں سوچتا ہوں جو فلاح  
بہو کے اواروں اور سماج کے مصلحین کو سوچنا چاہیے۔ پہلے میں نے ایک ادھاپا۔  
بائے اپنی اٹھان تک نہیں پہنچا تو میں نے ایک پوا اور حلق میں اتارا۔ پھر سرور میں آکر

ضروری ہے۔

جب تک میں اپنی بہن کو دلمن بنا کر رخصت نہ کرتا اس وقت تک اپنے لیے دلمن  
نہیں لاسکتا تھا۔ فی الحال ایک رات کی دلمنوں کے ساتھ نہایت شرافت سے زندگی گزار رہا  
تھا۔

اس وقت بھی اس سانوی سلونی لڑکی کو دلمن بنے دیکھ کر ٹیکسی کے میٹر کی طرح میرے  
دل کا بے ایمان میٹر بہت تیزی سے چل رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کس طرح اس  
سے نکاح قبول کر لیا تھا۔ نکاح پڑھانے کے دوران صرف اتنا یاد ہے کہ اس دلمن کا نام  
زیب النساء عرف بیلا رانی تھا۔ مجھے صرف بیلا رانی یاد رہ گئی۔

رخصتی کے وقت جب بیلا رانی کو نیلے کی لڑیوں میں چھپا کر ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر  
بٹھا دیا گیا تو میں نے عقب نما آئینے کا رخ اس کی طرف پھیر دیا تاکہ تمام راستے اس کے  
سبک سے نمکین ہاتھ مجھے نظر آتے رہیں۔ اگر اس وقت شریف احمد میری بہن کو دلمن بنا کر  
لے جا رہا ہوتا تو میں آئینے کی پوزیشن نہ بدلاتا۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے وقت انسان کو  
کبھی غیرت مند بنا دیتا ہے اور کبھی بے غیرت۔ ویسے بھی مجھ جیسا تجربہ کار کنوارا ہر عورت  
کو اپنی بہن تو نہیں بنا سکتا؟

میں نے بیلا رانی کو اس کے سہاگ کی پہلی منزل تک پہنچا دیا۔ شریف احمد اور اس کی  
ماں دلمن کو سہارا دے کر اپنے گھر میں لے گئے۔ اس گھر کے سامنے میرا گھر تھا۔ شمشاد  
کھڑکی سے لگی ایک لڑکی کو دلمن بن کر اپنی منزل تک پہنچتے دیکھ رہی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ  
اس وقت اس کی نگاہوں میں کتنی حسرتیں ہوں گی اور دل میں کتنے طوفان اٹھ رہے ہوں  
گے۔ ایسے وقت میں اپنی بہن کا سامنا نہیں کر سکتا تھا اس لیے ٹیکسی اشارت کر کے دارو  
پہنچے چلا گیا۔

زندگی جب بہت زیادہ ٹھوکریں مارتی ہے تو شراب بھی پانی ہو جاتی ہے، سالانہ ہی  
نہیں ہوتا۔ ہوتا بھی ہے تو بہن کا اداس چہرہ نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ غم غلط نہیں  
ہوتا، صحیح ہو کر دل غم میں اور سکھ جھالیتا ہے۔ اس کی عرومیاں کتنی ہیں۔

”میرے ٹیکسی ڈرائیور بھائی! تو ہر مسافر کو اس کی منزل تک پہنچا دیتا ہے پھر بہن کو  
راستے میں کیوں چھوڑ دیتا ہے؟ کتنے ہی مسافروں کو تو میٹر تیز کر کے پہنچاتا ہے، مجھے بھی

”شیدے! تو جانتا ہے اب میں پہلے جیسی نہیں رہی۔ پہلے گاہک میرے پیچھے آتے اور مجھے منہ مانگی رقم دیتے تھے اب میں اندر سے کھوکھلی ہو گئی ہوں اور اوپر سے اجڑ گئی۔ اسی لیے دن کی روشنی میں نہیں نکلتی ہوں۔ رات کو برقعہ پہن لیتی ہوں تاکہ یہ چٹکے نہ لگال اور سوکھا ہوا جسم اچھی طرح نظر نہ آئے۔ کچھ تو کمرے میں اب سے چہرے پر نقی آجاتی ہے اور کچھ گاہک غسل کے اندر سے ہوتے ہیں۔ رات کو عموماً شراب کے نشے رہتے ہیں۔ ایسے وقت انہیں گدھی بھی حور پری نظر آئے اس طرح مجھے میرے جسمے رزق ملتا رہتا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ میرے قریب کھٹک آئی پھر میرے گھٹنے پکڑ کر بولی۔  
”رزق ملتا ہے پھر بھی ایک دو کافے ہوتے ہیں۔ رات کے مہمان اتنی رقم نہیں دے کہ میں اس میں سے پولیس والوں کو بھی دے سکوں اور ٹیکسی ڈرائیوروں کو ملے اور اس میں سے پولیس والے پھرتے ہوئے ہاتھوں کو کاٹ سکوں۔ آج میں تجھے بیس روپے نہیں دے سکوں گی شیدے۔“

وہ میرے بالکل قریب آگئی تھی۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ نشے کی حالت میں سوکھا ہوا اب بھی پر شہاب نظر آتا ہے۔ وہ مجھے دنیا کی سب سے حسین عورت نظر آرہی تھی۔  
”اب پی کر گندی ٹالیوں میں گرنے کے بجائے کسی سوکھی عورت کی پناہ میں گرنا بہتر ہوتا ہے میں نے اس سے کہا۔“

”میری ٹیکسی میں رہ جا۔ میں تجھے بیس روپے دوں گا۔“  
وہ خوش ہو کر بولی ”تیری بڑی مہربانی ہوگی تو اپنا ہی آدمی ہے۔ مجھے جلدی چھوڑ دے گا۔ ہول کی طرح پریشان نہیں کرے گا۔ مجھے جلدی واپس جانا ہے، میرا بچہ بہت بیمار ہے۔“

بچے کا ذکر آتے ہی میرا مڑ خراب ہو گیا کیونکہ دس دس کے نوٹ پھینکتے وقت مرد لڑکھاری اور اچھوتی عورت کا قصور کرتا ہے۔ میں نے بکڑ کر کہا۔

”تم سالی ٹیکسیا بن کر بچے کیوں پیدا کرتی ہو، میری ٹیکسی نے تو کبھی بچہ نہیں دیا۔  
اپنی کو صرف پیسے پیدا کرنے چاہئیں بچے نہیں۔ چل جا یہاں سے میں بیس پیسے بھی نہیں لے گا۔“

بے سری آواز میں غلیظ گیت گاتا ہوا ٹیکسی میں آکر بیٹھ گیا۔  
تھوڑی دور تک ڈرائیو کرنے کے بعد ایک برقعہ پوش عورت نے ہاتھ اٹھا کر ٹیکسی روکنے کا اشارہ کیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ فٹ پاتھ کی ٹیکسی ہے اور گاہک کی تلاش میں نکلی ہے۔ ایسی برقعہ پوش ٹیکسیاں میری آمدنی میں اضافہ کرتی ہیں اس لیے میں نے گاڑی روک دی اور فوراً میٹر کو آن کر دیا تاکہ معاملہ طے ہونے تک میٹر تیزی سے چلے جاتا رہا۔ اس نے نقاب الٹ کر گاڑی کے اندر جھانکتے ہوئے مجھے دیکھا۔ پھر خوش ہو کر بولی۔  
”ارے شیدے تو ہے؟“

ہاں میں شیدا ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ اس شہر کی تمام وہ عورتیں جو اپنی جوانی کا میٹر آن کر کے سواری کی تلاش میں نکلتی ہیں وہ مجھے پہچانتی ہیں اور میں انہیں پہچانتا ہوں اور ہم سب کو پولیس والے پہچانتے ہیں اور پولیس والوں کو حرام کی آمدنی پہچانتی ہے۔ اس طرح نہایت ایمان داری سے ہم عورت کی کمائی کو انصاف سے بانٹ کر منگائی کا مقابلہ کرتے رہتے ہیں۔

جب اس نے نقاب الٹا تو اس وقت نشے کے باعث میری کھوپڑی گھوم رہی تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا پھر جھومتے ہوئے پوچھا۔  
”کون زینہ؟ اری اتنی رات کو نکلی ہے۔ اگر کسی ایماندار پولیس والے نے پکڑ لیا تو سیدھی حوالات میں پہنچ جائے گی۔“

وہ ٹیکسی کا اگلا دروازہ کھول کر میرے پاس بیٹھنے ہوئی بولی۔  
”جو پولیس والے ایماندار ہوتے ہیں ان کی معلومات بھی محدود ہوتی ہیں۔ وہ مجھے نہیں پہچانتے کہ میں پیشہ کرتی ہوں۔ ایسوں کے سامنے تو مجھے اپنی گھروالی بنالینا۔ میں تجھے کیا سمجھاؤں؟ تو نے تو گھٹا گھٹا پانی پیا ہے۔ اس وقت کوئی بھانہ نہ کرنا۔ میں بہت پریشان ہوں۔ چل گاڑی آگے بڑھا، راستے میں کوئی نہ کوئی گاہک بچس ہی جائے گا۔“

میں نے ٹیکسی کے میٹر کی طرف دیکھا۔ ابھی تک ایک روپیہ دس پیسے بنے تھے۔ میں اتنی جلدی آگے بڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”اگر جلدی چلنا ہے تو پھر میں میٹر سے نہیں جاؤں گا۔ یہاں سے ٹھیل پاؤں تک جانے لے کے بیس روپے لوں گا۔“

لفٹ کر کھڑی ہو گئی اور پلٹ کر بولی۔

”وہ! میں تو بھول ہی گئی تھی کہ ابھی میں روپے کی قیمت چکانی ہے۔“

اس نے دوبارہ دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس سے پہلے ہی میں نے گاڑی نارٹ کی میئر بدلا اور ایک جھپٹکے سے ڈرائیو کرتا ہوا اس سے دور چلا گیا۔ عورت جب مکے روپ میں آتی ہے تو سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ میں بڑبڑاتا ہوا اور اسے گالیاں دیتا اپنے گھر کے دروازے پر آکر رک گیا۔

جب میں دروازہ کھول کر مکان میں داخل ہوا تو اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ شاد آگن میں چارپائی بجھائے اس پر چاروں شانے چت لیٹ ہوئی شریف احمد کے مکان دیکھے جارہی تھی۔ ہمارے آگن سے شریف احمد کے مکان کی اوپری منزل کا ایک کمرہ بالکونی نظر آتی ہے اور اس کی بالکونی سے ہمارا پورا آگن نظر آتا ہے۔ جب چاندنی ات میں شمشاد چارپائی بجھا کر لیٹ جاتی تھی تو میں سوچا کرتا تھا کہ شریف احمد اپنی بالکونی سے اسے دیکھ رہا ہو گا۔ پہلے پہل مجھے یہ بات ناگوار گزری تھی پھر حالات نے مجھے سمجھا دیا کہ پرانے ہاتھوں میں جانے والی ہر چیز کو شوکیس میں رکھ کر اس کی اہمیت بڑھائی جاتی ہے۔ اس حد تک اگر وہ میری بہن کو دیکھ لے اور میری بہن اسے دیکھ لے اور دنیا والوں کو لی خبر نہ ہو تو یہ بے شری نہیں ہے۔

مغرب وقت گزر چکا تھا۔ شریف احمد بیلا رانی کو بیاہ کر لے آیا تھا۔ اب شمشاد کے بارے میں تھی؟ اور ایسے دیکھ رہی تھی جیسے سکتے میں آگئی ہو۔ اسے بھائی کی موجودگی کا ناس بھی نہیں تھا۔ ہر بات اپنے وقت پر سمجھ میں آتی ہے اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب وہ شریف احمد کو نہیں دیکھ رہی ہے بلکہ داغ کی اسکرین پر بیلا رانی کو بالک کے مرحلوں سے گزرتے دیکھ رہی ہے۔

میں چپ چاپ سر جھکا کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ دوسری صبح شریف احمد کے باپ نعیم نے مجھے بلایا۔ دستور کے مطابق بیلا رانی کو اس کے میکے بھیجا جا رہا تھا۔ صبح سویرے ہی گاڑی کون برباد کرتا ہے۔ میں ٹیکسی لے کر نکلا تو اس وقت اچھے میسے دینے والی اہواں مل جاتی تھی۔ مکے والوں سے میسے کم ملتے ہیں۔ پھر بھی میں نے بیلا رانی کے لیے اس کے میکے جانا منظور کر لیا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ٹیکسی کی نیم تارک دنیا میں چند لمحوں کے لیے سب کچھ گم ہو گیا، صرف آنسوؤں کی جھلسا ہٹ رہ گئی۔ یہ جو شراب ہے مایہ ہمیں بہت کمزور بناتی ہے۔ پرانے آنسوؤں کی تہ میں اتار کر اپنے زخم کے حوالے سے بہت کچھ سمجھا جتی ہے۔ وہ بڑے کرب سے کہہ رہی تھی۔

”دودھ نہ گئے۔ میری چھاتی سے دودھ نہیں اترتا۔ بچے کو اوپری دودھ پلایا تو وہ بیمار ہو گیا۔ مجھے روٹی کے لیے پیسے نہیں چاہئیں۔ نئے کپڑے خریدنے کے لیے میں پرانا برقعہ اوڑھ کر نہیں نکلی ہوں اور نہ ہی اپنے جسم کو کھنڈ رہنا کر شیش محل میں رہنے کا خواب لے کر آئی ہوں۔ میں صرف بچے کی دوا کے لیے میسے حاصل کرنے آئی ہوں۔“

میں نے اس کے آنسوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے پتھر بننے کی کوشش کی اور سخت لہجے میں کہا۔

”تم سب عیاشی کے لیے نکلتی ہو۔ بھانٹ بھانٹ کے مردوں کے بغیر تم لوگوں کو نیند نہیں آتی مگر دوسروں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے اپنی محرومیوں کے افسانے ٹھونکتی ہو اور اس افسانے کو کلا ٹکس پر پہنانے کے لیے ایک نوزائیدہ دودھ پیتے بچے کو پیش کرتی ہو۔ یہ سب محض ڈراما ہے اور کچھ نہیں۔“

اچانک ہی وہ میرا کربان پکڑ کر مجھے جھینٹوٹنے لگی اور جھنجھلا کر کہنے لگی۔

”یہ ڈرامہ نہیں ہے، وہ بچہ دودھ اور دوا کے لیے بلک رہا ہے۔ وہ بچہ کس کا ہے؟ کسی حاجی کریم الدین کا ہے، کسی صنعت کار سیٹھ کا ہے یا کسی رئیس زادے کا ہے یا تیرے جیسے ٹیکسی ڈرائیور کا ہے۔ بے غیرت، بے مروت، تمہاری سمجھ میں یہ کیوں نہیں آتا کہ تم سب کے مشترکہ بچے کو دودھ پلانے کے لیے اپنے جسم کا کاروبار کر رہی ہوں۔ تم سب میرے وجود سے بھاگتی ہوئی ٹریفک کی طرح گزر جاتے ہو اور اس بچے کو چھوڑ جاتے ہو۔ کیا اس کے لیے دودھ کی ایک بوتل خرید کر نہیں دے سکتے؟“

میں نے جلدی سے میں روپے نکال کر دے دیئے۔ ایک فاحشہ کی زبان پر سنسکری قہقہی چلانے کے لیے میں روپے کافی ہیں۔ جو حقیقت ناقابل برداشت ہوتی ہے اسے دولت کی قہقہی سے کاٹ کر پیچیدہ دیا جاتا ہے۔ اس نے دس دس کے نوٹ لے کر اپنے سینے سے لگا کر پیچھے لیے اور ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اپنے بچے کی طرف جانے کے لیے نکلی۔

بہل کی تمام ایبوریٹس کیمائز کی طرف مٹی ہوئی تھیں۔ میں محلے کا ٹیکسی ڈرائیور ہوں اس لیے اس کی لاش میری ٹیکسی میں لائی گئی۔ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر ایک ہفتہ پہلے اس کی کورڈلین بنا کر لے گیا تھا اب اس ٹیکسی کو جنازہ بنا کر لے جا رہا تھا۔

محلے والے شریف احمد اور اس کے باپ فہیم احمد سے افسوس اور ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے۔ ان پر ایک ساتھ کتنے ہی غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ بیلا رانی سماگ کی دسویں بج اپنے میکے گئی تھی پھر پلٹ کر اپنے شوہر کے پاس نہیں آئی تھی۔ ہونے پہلے ہی لکھنؤ پر ان کو دیا تھا۔ اب ماں کی موت نے ہٹے ہٹے گھر کو اور بھی اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ فہیم احمد دو رو کر محلے والوں کو بتا رہا تھا کہ ہوسکتی تک چڑھی تھی۔ اس کی بیوی بڑے ارمانوں سے اسے ہوتا کر لائی تھی۔ وہ پہلی ہی رات شریف احمد سے کہہ رہی تھی کہ وہ ماں باپ سے الگ ہو جائے۔

کسی نے کہا ”ان مہاجرین نے پہلے مشرقی پاکستان کو الگ کیا۔ اب یہ لڑکی یہاں آکر اپنے والدین سے الگ کر رہی تھی۔ ان لوگوں سے ہمدردی کرنا فضول ہے۔“

فہیم احمد نے کہا ”ہم تو نیکی کرتے ہیں اور دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ میں نے تو چاہا تھا کہ ایک خاندان پر یاد لڑکی یہاں آکر سکھ چین کی زندگی گزارے گی مگر واقعی یہ مہاجر اپنی فطرت سے مجبور ہیں۔ اپنی الگ حیثیت بنانے کے لیے نہ ادھر کے رہتے ہیں نہ ادھر کے۔ ہمارا کیا بچا ایک دن وہ بری طرح بچھڑائے گی۔“

میں ان کی باتیں سن رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں فہیم احمد کو روٹے دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس نے میری بہن کی خوشیوں کو براد کیا تھا اور خود بری براد ہو گیا تھا۔ ظلم کرنے والے کو آنکھوں کے سامنے سزا مل جائے تو مظلوم کے دل پر ایک سکون حاصل ہوتا ہے۔

اس واقعہ کو چھ ماہ گزر گئے۔ شریف احمد نے بیلا رانی کو طلاق دے کر اس کے مہر کی رقم سو روپے ادا کر دی۔ میرے لیے پھر امید بندھ گئی۔ راستہ صاف ہو چکا تھا۔ اب اگر سے کسی دن بھی میری بہن کا رشتہ آسکتا تھا۔ شمشاد معمول کے مطابق روزانہ کالج جاتی تھی اور میں نے معمول سے زیادہ بے ایمانی شروع کر دی تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ لگائی جاتی رہے اور بہن کا رشتہ آئے تو محدود آمدنی رکاوٹ نہ بنے۔

جب وہ میری ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھی تو پچھلی رات کی طرح گھونگھٹ میں نہیں تھی۔ میں نے عقب نما آئینہ کا رخ اس کی طرف پھیر دیا۔ ہائے میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس سانوی لڑکی کا چہرہ کتنا دلکش تھا۔ آئینے سے گزر کر سیدھا محلے میں اتر رہا تھا۔ میں چند لمحوں تک دم بخود ہو کر اسے دیکھا رہ گیا۔ دستور کے مطابق شریف احمد کو بھی اس کے ساتھ جانا چاہیے تھا لیکن صرف اس کی ماں اس کے ساتھ جا رہی تھی۔ راتے میں میں نے محسوس کیا کہ شریف احمد کی ماں بہت خاموش اور بہت ادا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ہوسکتی ہی خوب صورت کیوں نہ ہو ساس پہلے ہی دن سے اسے ٹائپنڈ کر لے ہے اور کبھی خوشی کا اظہار نہیں کرتی۔ بیلا رانی کے میکے پہنچ کر شریف احمد کی ماں نے مجھے انتظار کرنے کے لیے کہا اور ہوسکو لے کر مکان کے اندر چلی گئی۔

میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد مکان کے اندر سے لڑنے جھگڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی لیکن بات سمجھ میں نہیں آئی کہ کس لیے جھگڑا ہو رہا ہے؟ ایک گھنٹے کے بعد شریف احمد کی ماں تھماواپس آکر ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ میں نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور اپنے محلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے عقب نما آئینہ میں دیکھا وہ اپنے دوپٹے کے آچھل سے آنسو پونچھ رہی تھی اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ وہ مجھے برسوں کی بیمار نظر آئی۔ میں نے پوچھا۔

”ماں جی! کیا بات ہے کیا پہلے ہی دن ہوسو سے جھگڑا ہو گیا ہے؟“

میرے سوال پر وہ چونک پڑی۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ ٹیکسی میں تنہا نہیں ہے۔ میں اسے دیکھ رہا ہوں کوئی اپنے گھر کے راز کسی غیر کو نہیں بتاتا۔ وہ میرے سوال کو ٹال گئی لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ ادھیر عمر کی خاتون ہر لمحہ مرنے جا رہی ہے۔



کبھی کبھی میری ٹیکسی جنازہ بن جاتی ہے۔ کیمائز میں ایک کشتی ڈوب گئی تھی۔ کتے ہی ڈوب کر مر گئے تھے اور کتے ہی ایسے تھے جنہیں جاں کنی کی حالت میں ایبوریٹس کے ذریعے اسپتال لایا جا رہا تھا۔ شریف احمد کی ماں پچھلے کئی دنوں تک اسپتال میں بیمار رہنے کے بعد مر گئی تھی۔ اس کی لاش گھر لانے کے لیے ایبوریٹس نہیں مل رہی تھی کیونکہ



بولتا ہوں۔ اپنی بہن کے بچیس برس کے چہرے کو نہیں بڑھ سکا تھا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ میرے آگن کے درخت میں جو پھل پک رہا ہے وہ پھٹنے پکٹنے کی دیوار کے باہر گرے گا۔

میں ہمیں سوچ میں ڈوبا اپنی بدنامی کے خیال سے کانپ رہا تھا اور ہر شریف آدمی کی لڑائی بہن کے دامن پر لگے ہوئے دھبے کو مٹانے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ اتنے میں دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں یوں چونک پڑا جیسے بدنامی دستک دے رہی ہو۔ جب رات خطرے میں پڑی ہو تو ہر دستک اور ہر آہٹ پر دل کا پتا ہے۔ میں نے دانت پیستے رہے شمشاد سے کہا۔

”خبردار اس کمرے سے باہر نہ لکنا میں ابھی آتا ہوں۔“ میں اسے غصے سے دیکھتا ہوا بل کرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آیا اور باہر کے دروازے کو کھول دیا۔ دروازے پر نعیم احمد کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ادھیڑ عمر کے قد اور ایک صحت مند آدمی تھے۔ ملی پیشانی کا ایک داغ بتا رہا تھا کہ وہ پانچوں وقت کے نمازی ہیں۔ اس وقت میں کسی انڈیا فرشتے سے ملنا نہیں چاہتا تھا لیکن انہوں نے بڑی شفقت سے مسکراتے ہوئے لہا۔

”بیٹے میں تمہاری مشکل آسان کرنے آیا ہوں۔“ ان کی باتیں سن کر مجھے یاد آیا کہ میں شمشاد کو ان کی ہوتا ہوا چاہتا تھا۔ اس وقت وہ اپنی فرشتہ بن کر آئے تھے۔ میں نے فوراً ہی انہیں کمرے میں لا کر بٹھایا۔ انہوں نے بیٹھتے رہے بڑی نرمی سے پوچھا۔

”کیا جوان لڑکیوں کو مارنے پینے سے مسائل حل ہو جاتے ہیں؟“ میں چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔ میں نے تو بڑی خاموشی سے شمشاد کی پٹائی کی تھی، یہی آواز میرے مکان کے دروازے تک بھی نہیں پہنچی تھی پھر انہیں کیسے پتہ چل گیا کہ شمشاد کو مار رہا تھا۔

انہوں نے مسکرا کر کہا۔

”بیٹے، میرا مکان بہت اونچا ہے اور بالکونی سے تمہارا آگن نظر آتا ہے۔ میں نے غلطاً کوئے کرنا دیکھا تو پہلے ہی سمجھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے لیکن تم غصے کی

ایک صبح وہ کالج نہیں گئی۔ میں کمرے سے نکل کر آگن میں آیا تو وہ آگن میں نکلے کے پاس بیٹھی تے کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

”کیا بات ہے شمشاد تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟“

میری آواز سننے ہی اس نے ہلٹ کر دیکھا۔ وہ اک دم سے گھبرا گئی تھی۔ اس کا چہرہ ایسا زرد پڑ گیا تھا جیسے برسوں کی تیار ہو۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل گھبرائے لگا۔ میں اس کے قریب آیا تو وہ اپنی مٹھی میں پکڑی ہوئی کسی چیز کو پشت کی طرف لے جا کر چھپانے لگی۔

”کیا ہے تمہارے ہاتھ میں؟“

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی ناکام سی کوشش کی لیکن میں نے جبراً اس کی مٹھی کھول دی۔ مٹھی کھلتے ہی آم کے اجار کا ایک ٹکڑا زمین پر گر پڑا۔

میں اک دم سے سائلے میں آ گیا۔ اب میں ایسا دان بھی نہیں تھا کہ بات کی تک نہ پہنچ سکتا۔ میں نے ایک زوردار ٹھپا چھریسید کرتے ہوئے پوچھا۔

”بول یہ سب کیا ہے؟ بے حیا، بے غیرت۔ کیا میں اس لیے تجھے کالج میں پڑھنے کے لیے بھیجتا ہوں؟“

اس کی خاموشی اور اس کے آنسوؤں نے میرے شے کی تصدیق کر دی۔ میں بے تحاشہ اسے مارنے پینے لگا۔ ان حالات میں بھائی ہو یا باپ بہت مجبور ہوتا ہے۔ ادنیٰ تواز میں گالیاں نہیں دے سکتا اور گالیاں دے کر بیٹی یا بہن کو خود اپنی زبان سے بدنام نہیں کر سکتا اس لیے میں خاموشی سے اسے مارتا رہا کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ وہ مار کھاتے کھاتے زمین پر گر پڑی، میں اسے گھٹینا ہوا کمرے میں لے آیا۔ وہاں لا کر میں نے اس سے پوچھا۔

”بتاؤ کہینہ کون ہے؟ میں ابھی اس کے پلے تجھے باندھ دوں گا۔ نہیں بتائے گی تو گلا گھونٹ کر بیٹھ کے لیے تجھے ختم کر دوں گا۔“

اس نے روتے روتے بتایا کہ وہ کالج کا ایک پروفیسر تھا۔ شاعری کی کتاب پڑھاتے پڑھاتے اسے خوابوں کی دنیا سے گزار کر اپنی خواب گاہ میں لے گیا۔ مگر اب وہ اس شہر میں نہیں ہے، ملازمت چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میں جو عیسوی ڈرائیور ہوں اور سڑک پر چلنے والی ہر عورت کا چہرہ

شادی کے ایک ماہ بعد شمشاد کا حمل ضائع ہو گیا مگر وہ خوش تھی۔ اس کا شوہر اور اس اسر نعیم احمد بھی بہت خوش تھے اور شمشاد کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ایک سال بعد پھر شمشاد کے پاؤں بھاری ہوئے۔ کچھ عرصے بعد اس نے ماں بن کر مجھے ماموں جان بنا دیا۔



کبھی کبھی میری ٹیکسی سراج کی کچرا گاڑی بن جاتی ہے اور شرکی جتنی غلیظ خواہشات بنی ہیں انہیں ایک جگہ سے سمیٹ کر دوسری جگہ لے جاتی ہے۔ تقریباً دو سال کے بعد ان نے زب النساء اسٹریٹ پر بیلا رانی کو دیکھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر ٹیکسی روکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اسے دیکھا تو پہلی نظر میں پہچان نہ سکا۔ گرمیوں کی مہکی سی شام تھی۔ وہ لے آسانی رنگ کی ساری میں آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا رہی تھی۔ اس کے ساری باندھنے کا راز اتنا خوب صورت تھا کہ بدن کے نشیب و فراز بناوت کے انداز میں ابھر آئے تھے۔ اس کے جوڑے میں پھولوں کی وہی مسک رہی تھی اور سانولی پیشانی پر سنہری ہندیا جگمگا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک خوبصورت نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ ٹیکسی رکتے ہی وہ دونوں پچھلی سیٹ پر لیٹ گئے۔ میں نے فوراً ہی عقب نما آئینے کا رخ اس کی طرف پھیر دیا۔ وہ آئینے پر ایک لڑکا لکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ بیٹھی بولی۔

”کہاں چلنا ہے؟“

اس کے ساتھ بیٹھی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”سوسائٹی۔ طارق روڈ۔“

میں نے ٹیکسی آگے بڑھادی۔ جب ٹیکسی کچھ دور نکل گئی تو میں نے نئے نوٹوں کی فراخ دلانی آواز سنی۔ ہم ٹیکسی ڈرائیوروں کی چار آنکھیں ہوتی ہیں۔ دو آنکھیں سامنے آنے کی طرف دیکھتی ہے اور باقی کی دو آئینے کے پیچھے کے مناظر دکھاتی ہیں۔ وہ سوسائٹی کے نوٹ اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔ بیلا رانی نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

”نہیں پورے پانچ سو۔“

اس نے سو کا ایک نوٹ اور بڑھا دیا۔ وہ ہاتھ جھٹک کر بولی۔

”میں کوئی فٹ پاتھ کی ٹیکسی نہیں ہوں، مجھ سے اس طرح سودے بازی نہ کرو۔“

حالت میں اسے مارنے لگے تو ساری بات میری سمجھ میں آئی۔“

ان کی باتیں سن کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ انہوں نے مجھے گھبراتے دیکھ کر کہا۔

”میں ایک شریف آدمی ہوں۔ تمہارا یہ راز بیش میرے سینے میں دفن رہے گا۔ بلکہ میں تمہاری بدنامی پر پردہ ڈالنے آیا ہوں۔ میں تمہاری شمشاد کو اپنی بیوی بنانا چاہتا ہوں۔“

مارے حیرت کے میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس دنیا میں ایسے فرشتے بھی موجود ہیں جو پرانے گناہ کا بوجھ اٹھا کر اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں بے یقینی دیکھ کر انہوں نے کہا۔

”میں تمہارا بزرگ ہوں۔ میں تم سے مذاق کرنے یا جھوٹ بولنے نہیں آیا۔ سارا محلہ جانتا ہے جو بات میری زبان سے نکل جاتی ہے وہ پتھر کی ٹیکری کی طرح جاتی ہے۔ آج شام کو میں چند شریف آدمیوں کے ساتھ قاضی صاحب کو لے کر آؤں گا اور شریف احمد کا کلاچ شمشاد سے بڑھا کر اور اسے اپنے گھر کی عزت بنا کر ماں سے لے جاؤں گا۔“

میں فرط عقیدت سے تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے قدموں سے لٹ کر رونے لگا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں زندگی میں کبھی نہیں رویا۔ اس وقت بھی آنکھیں پونچھنے کے لیے میں نے ہاتھ اٹھایا تو پتہ چلا کہ میری آنکھوں سے آنسو نہیں بہہ رہے ہیں میں صرف خوشی سے رونے کے انداز میں گڑگڑا رہا ہوں۔ میں بہت سنگدل ہوں۔ انسان کا کوئی جذبہ یا کوئی مصیبت مجھے کبھی نہیں رلا سکتی۔

پھر وہ آدمی کیسے رو سکتا ہے جس پر مصیبت آتے ہی اس مصیبت کا خوب صورت حل پیش کر دیا گیا ہو۔ میری مصیبت بڑی آسانی سے ٹل گئی۔ شمشاد دنیا والوں کی نظروں میں عزت آبد سے دلہن بن کر اسی رات شریف احمد کے ہاں چلی گئی۔ میں نے جو زیورات کپڑے اور جتنی نقدی بے ایمانی سے جمع کی تھی۔ وہ بے ایمانی سے بتائی دلہن کے جیز میں دے دی۔

اس کے بعد میں آزاد ہو گیا۔ اب اس بات کی فکر نہیں تھی کہ کسی ذمے داری کو پورا کرنے کے لیے مجھے دن رات ٹیکسی چلانا ہے۔ میں اپنی مرضی کے مطابق شہنشاہ بن کر ٹیکسی میں بیٹھتا تھا۔ دل چاہتا تو اپنی پسند کی سواری اٹھا لیتا ورنہ کسی ٹیکسی اڈے پر بیٹھ کر چرس کے سگریٹ پیتا رہتا۔

لال مبر کرنا چاہیے۔ فٹ پاتھ پر جو عورتیں آتی ہیں، پہلے ان کا ریٹ بہت اونچا ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ پتھر ہوتی جاتی ہیں اور ان کا بھاءو کرنے لگتا ہے۔ دو چار سال تک انتظار کرنے کے بعد وہ مجھے پچاس روپے میں مل سکتی تھی۔ اس وقت واقعی میں مبر کر لیا لیکن غیر شعوری طور پر وہ میرے دماغ میں کلبلائی رہی۔ جب ٹریفک کے ہنگاموں سے دور ات کی تنہائی اور خاموشی میں، میں نے سونے کی کوشش کی تو اس کا حنائی ہاتھ میری گاہوں کے سامنے چلا آیا۔ میں نے اس خیالی ہاتھ کو تھام کر پوچھا۔

”بی بی زیب التما عرف بیلا رانی۔ تمہیں شیدے ٹیکسی ڈرائیور کے نکاح میں بوجھ

نچا سو روپے دین مہنی شب کے حساب سے دیا جا رہا ہے۔ کیا تمہیں یہ غیر شرعی نکاح قبول ہے؟“

اس کی سریلی آواز سنائی دی ”قبول ہے۔ قبول ہے۔ قبول ہے۔“

پھر وہ دلہن بنی میرے پہلو میں آئی۔ میں اپنی یادداشت کے سارے اس کے چہرے کے نقوش کو دیکھنے اور چھونے لگا۔ اسے چھوتے وقت میرا سر گھوم رہا تھا، درود یار گھوم رہے تھے۔ نیلے کے پھولوں کے ساتھ اس بنگالی دوشیزہ کے بدن سے جو جینہ منک رہا تھا اس میں مچھلیوں کی بساند تھی۔ مجھے ابکاٹی آنے لگی۔ میرے پلٹ کرتے ہی سارے زاب پکنا چور ہو گئے۔ دراصل میں نے بہت زیادہ پینے کے بعد فرائی کی ہوئی پاپیٹ مچھلی کھائی تھی۔ اس مچھلی کی مناسبت سے بنگالی دوشیزہ یاد آ رہی تھی۔

بس اسی طرح وہ کسی نہ کسی بھانے یاد آتی رہی۔ دراصل عورت خود کو دور رکھ کر اپنی بہت بہت زیادہ بوجھا دیتی ہے۔ اس کے متعلق نہ سوچنے کے باوجود عموماً اس کا احساس ہونے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔ ایسے وقت مجھے ایک لومڑی کی طرح سوچنا چاہیے تھا اور گور کئے ہیں کمزور سر سے پاؤں تک ٹھنسی اور در رس بھری تھی۔ میں اسے کھنٹی کہہ کر دل کو جھوٹی لٹائیاں نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب تھوڑے تھوڑے پیسے بچاؤں گا۔ پانچ روپے جمع کرنے کے بعد اسے اپنے گھر لے آؤں گا۔

اس دن سے میں نے پیسے بچانے شروع کر دیئے۔ لیکن جو لوگ محدود آمدنی میں پیسے ہاتھ ہیں وہی میرے حالات کو سمجھ سکتے ہیں کہ بچانے ہوئے پیسے اکثر ناگہانی ضرورتوں کی ذرا ہو جاتے ہیں۔ چھ ماہ کے بعد جب میرے پاس ساڑھے تین سو روپے جمع ہو گئے تو میں

اس نے پانچ سو روپے پورے کر دیئے۔ بیلا رانی نے پانچوں نوٹوں کو تھکے کر کے پرس میں رکھ لیا۔ راستے میں اس نوجوان نے ٹیکسی رکوا کر وہسکی کی ایک بوتل خریدی پھر طابق روڈ کی ایک عمارت کے پاس پہنچ کر وہ نوٹوں اتر گئے۔

میری ٹیکسی خالی ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے سینہ دل سے خالی ہو گیا ہے۔ وہ شروع ہی سے میرے دل میں دھڑک رہی تھی۔ جب میں نے شریف احمد سے اس کا نکاح پر بھایا تھا اس وقت سے اس کا حنائی ہاتھ میرے دل پر رکھا ہوا تھا۔ آج دوسری بار اس نمکین ہاتھ کو ایک دوسرا شخص پکڑ کر میرے سامنے سے لے گیا تھا۔ ٹیکسی خالی ہونے کے بعد بیلا مکتی رہی۔

میں نے پلٹ کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا جیسے وہ واپس آگئی ہو۔ وہ نہیں تھی پچھلی سیٹ پر بیلا کے پھولوں کی بنی ہوئی دینی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھالیا پھر دونوں ہاتھوں پر رکھ کر اسے سو گھنٹے لگا۔ عجیب سی خوشبو تھی۔ میرا خیال ہے نیلے کے ساتھ بیلا کے بدن کا جینہ بھی سک رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ اور کئی ٹاؤن کے سنے علاقے سے زیب التما اسٹریٹ کے منگنے علاقے تک کیسے پہنچ گئی؟ وہ کیسے حالات تھے جنہوں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ بہت اونچی قیمت پر ہر رات پانچ سو روپے دین مر کے عوض بک سکتی ہے۔ یہ دین مہر پہلی بار شریف احمد نے مقرر کیا تھا۔ وہاں ایک رات رہ کر وہ سمجھ گئی تھی کہ یہی اس کی قیمت ہے۔

یہ سوچتے ہوئے میرا دل دھڑکنے لگا کہ کیا میں اس کی قیمت چکا سکتا ہوں؟ وہ میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ جب وہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آگئی تھی تو اگلی سیٹ پر بھی آسکتی تھی۔ لیکن میں اس کے لیے ایک مہینے میں بھی پانچ سو روپے جمع نہیں کر سکتا تھا۔ ٹیکسی کی قطبیں ادا کرنے میں اور آئے دن اس کی حرمت کرانے میں میری آمدنی کا تین چوتھائی خرچ ہو جاتا تھا۔ باقی حصے میں سے کچھ ٹریفک پولیس والے لے جاتے تھے اور کچھ نشے کی ضرورتیں لے جاتی تھیں۔ باقی پیسے کی آگ بجھانے میں خرچ ہو جاتا تھا۔ اس وقت بیلا رانی میرے لیے بہت مہنگی تھی۔ بہت اونچی تھی۔ میں ہاتھ اٹھا کر اسے جھونٹیں سکتا تھا۔

جسے ہم چھو نہیں سکتے۔ اس کے لیے دل زیادہ مچھلنے لگتا ہے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ

بچے کئی ماہ سے میں نے پانچ سو روپے جمع کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کی ہے۔ میں ساڑھے تین سو روپے تک جمع کر چکا تھا لیکن اچانک ہی بیماری نے مجھے توڑ دیا۔ اب میں دو سو روپے قرض دار بن گیا ہوں اس لیے اب میں تھیں خیالوں کی دنیا میں حاصل کرتا ہوں اور تب خیال کا ظلم ٹوٹتا ہے تو میں بڑی ذہنی آزمائشوں میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ کیا تم مجھے ان نبروں سے کسی طرح نجات دلا سکتی ہو؟

اس نے جواب دیا ”پہلے تم اپنا قرض ادا کرو پھر پانچ سو روپے جمع کرو۔ میں اتنے بڑے نم کے کسی بھی فٹ پاتھ پر مل جاؤں گی۔ ابھی مجھے پریشی کلب جانا ہے گاڑی آگے بھاؤ۔“

میں نے گاڑی آگے بڑھادی۔ مجھے اس کی صاف گوئی پر بہت غصہ آ رہا تھا لیکن بزنس انفریز ہے۔ اگر کوئی غریب آدمی میری ٹیکسی کو اکریہ کہے کہ وہ بیمار ہے اس کے پاس پیسے نہیں ہیں اور میں اسے اسپتال پہنچا دوں تو میں کبھی اسے لفٹ نہیں دوں گا کیونکہ ٹیکسی لفٹ دینے کے لیے نہیں کاروبار کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ وہ بھی لفٹ دینے کے لیے نہیں کاروبار کرنے کے لیے نکلی تھی۔ ایک کاروباری کی حیثیت سے مجھے اس کی بات کا برا نہیں ماننا چاہیے تھا مگر اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جا۔ نہ کہ مرد اپنی ناکامی برداشت نہیں کر سکتا۔

میں نے تہہ کر لیا کہ بہت جلد پانچ سو روپے اس کے منہ پر ماروں گا۔ اس کے لیے تین دن رات ٹیکسی چلانے لگا۔ وقت گزر گیا پیسے جمع ہوتے گئے اور ضرورتوں کے چور دروازوں سے نکلتے گئے۔ ہم سے اور آپ سے اگر پوچھا جائے کہ اتنی آمدنی کہاں جاتی ہے انہم اخراجات کا صحیح حساب نہیں بتا سکیں گے کیونکہ بہت سی ضرورتیں چوری چھپے آتی ہیں اور نقب لگا کر چل جاتی ہیں۔

سال کے بعد سال گزر گیا۔ وہ مجھ سے ملتی رہی اور چھڑتی رہی۔ تین سال کے بعد میرے پاس تین سو روپے جمع ہو گئے تھے۔ مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوش ہوئی کہ اس کا بلاؤ اک دم سے گر کر دو سو روپے پر آ گیا تھا۔ میں وقتی طور پر یہ بھول گیا تھا کہ جسوں کی نظر میں بھاؤ ہمیشہ گرتا ہے کسی بھی حالت میں اوپر کی طرف نہیں جاتا۔

وہ بچھلی سیٹ پر آکر بیٹھی تو میں نے اس کی طرف دیکھا وہ مرجھا گئی تھی۔ اس کے

اچانک ہی بیمار پڑ گیا۔ دکھ بیماری کے آگے کون رکاوٹیں کھڑی کر سکتا ہے وہ تو کسی وقت بھی آسکتی ہیں۔ میں چھ دن تک بیمار رہا۔ چھ دن تک ٹیکسی میرے دروازے پر کھڑی رہی۔ ایسا ہر ایک کے ساتھ ہوتا ہے کہ آمدنی رک جاتی ہے مگر ضرورتیں نہیں رکتیں۔ ٹیکسی کا مہاجن اگر ہفتہ واری قسط لے گیا۔ کچھ دواؤں اور انجکشنوں میں پیسے نکل گئے۔ بیماری سے اٹھ کر بہن کے گھر گیا تو بھانجی کی سالگرہ تھی اسے کھلونوں کا تحفہ دے کر واپس آیا تو ٹیکسی کا گیر بکس بیٹھ گیا تھا۔ جب اس کی مرمت کرانے کے بعد کمائی کے لیے نکلا تو اس وقت تک بچاؤ ہوئے ساڑھے تین سو روپے خرچ ہو چکے تھے اور میں دو سو روپے کا قرض دار بن چکا تھا۔ میں نے جھلا کر اپنی نقد پر کو پوری ایک درجن گالیاں دیں اور دل کو سمجھایا کہ اللہ میاں نے پیلا رانی کو میرے لیے پیدا نہیں کیا ہے۔ لیکن سمجھانے سے کیا ہوتا ہے جب میں ٹیکسی کے اوڑے پر آیا تو جو سب سے پہلی سواری ملی وہ پیلا رانی تھی۔

وہ دستور کے مطابق بچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ اس بار میں نے آئینے کا رخ نہیں بدلا۔ اس لیے کہ جو چیز حاصل نہ ہو اس سے کٹراؤ کی کوشش کرنا دانش مندی ہے۔ پیلا رانی نے اگلی سیٹ کی طرف جھکتے ہوئے آئینگی سے پوچھا۔

”آج تم نے آئینے کا رخ نہیں بدلا؟“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”تمہارے بھائی ہر خاموش رہتی ہے مگر وہ اپنے آپ سے گزرنے والوں کی ایک ایک حرکت کو سمجھتی ہے۔ جب میں شادی کی دوسری صبح اپنے میکے جا رہی تھی اسی وقت میں نے تمہاری شرازت کو بھانپ لیا تھا“ تم آئینے میں مجھے بار بار دیکھ رہے تھے۔ اس روز بھی زیب النسا اسٹریٹ پر جب میں بچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر آئی تو تم نے آئینے کا رخ میری طرف پھیر دیا۔ کیا میں غلط کر رہی ہوں؟“

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”تم درست کر رہی ہو۔ جب پہلی بار تم دلہن بنی بیٹھی تھیں اور جب میں پہلی بار ایجاب و قبول کے لیے تمہارے پاس آیا تھا تو اسی وقت سے تمہارے حنائی ہاتھوں نے میرے خیالات پر کاد دینے لگے کہ تم ان ہاتھوں سے آگے بھی بہت دور تک حسین ہو۔ جب بات کھل ہی گئی ہے تو میں صاف طور سے کہہ دوں کہ میں تھیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

لئے وہاں گا کہ دیکھو تمہیں شرافت کی زندگی راس نہیں آئی۔ جس شریف احمد کو تم ٹھکرا کر  
ہائی گئی تھیں آج میری بہن اسی شریف آدمی کی بیوی بن کر عزت کی زندگی گزار رہی ہے۔  
نہیں سمجھتا تھا کہ میری بہن میں اس کے دل میں نشتر کی طرح اتریں گی۔

دو گھنٹے بعد جب میں اسی فٹ پاتھ پر پہنچا تو وہ موجود نہیں تھی۔ میں ٹیکسی روک کر  
سانے والے ہوٹل میں چائے پینے چلا گیا۔ وہ میری ٹیکسی کو اچھی طرح پہنچائی تھی جب  
میں وہاں آئی ٹیکسی کا دروازہ کھول کر بیٹھ جاتی۔ چائے پی کر میں ہوٹل سے باہر آیا تو ٹیکسی  
بستور خالی تھی۔ مجھے اس پر بہت غصہ آیا کہ پتہ نہیں کہاں مرگئی ہے۔ میں وہاں سے  
جس کا ایک سگریٹ خریدنے کے لیے تھوڑی دیر چلا گیا۔

جب میں سگریٹ کے کش لگا تا ہوا واپس آیا تو ٹیکسی خالی تھی۔ مجھے بہت غصہ آیا۔  
میں نے چاروں طرف دور دور تک نظریں دوڑائیں۔ مزید ایک گھنٹے تک انتظار کرتا رہا مگر  
وہ نہیں آئی۔ میں جھنجھلا کر گھر واپس آیا۔ چرس کا نشہ گھر کی تنہائی میں مجھے تڑپاتا رہا اور  
میں تڑپ تڑپ کر اسے گالیاں دیتا رہا۔ دوسری صبح میں دیر تک سو تا رہا۔ جب دوسرے  
ٹیکسی لے کر سڑک پر آیا تو اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اب وہ میری ٹیکسی میں بیٹھنا بھی چاہے  
کی تو نہیں بٹھاؤں گا۔ اسے دوسری سے دھتکار دوں گا۔

رات کے نو بجے میں نے ٹیکسی کا میٹر باندھ دیا اور اسے دروازے کے سامنے کھڑی  
کر کے پینے کے لیے چلا گیا۔ رات کے ایک بجے واپس آیا تو گھر کا دروازہ کھولتے وقت  
ٹیکسی کا پچھلا دروازہ بھی کھل گیا۔ وہ نیم تاریکی میں کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اندھیرے کے  
اوجھلے سے پہچان لیا۔ میں جو اسے دھتکارنا چاہتا تھا اسے دیکھتے ہی سہم کر آگے بڑھا اور  
اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے ہوئے گھر کے اندر لاکر دروازہ بند کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری  
بہن کے سرال والے اسے دیکھ لیں۔ کمرے میں آنے کے بعد میں نے غصے سے پوچھا۔  
”کل تم نے مجھے دھوکہ کیوں دیا تھا؟“

”تمہارے جانے کے بعد مجھے تین سو والی ایک آسامی مل گئی تھی۔“  
”تم اس طرح سر جھکا کر کہہ رہی ہو جیسے بہت مظلوم ہو مگر میں سمجھتا ہوں کہ تم کتنی  
نار اور چال باز ہو۔ آج سے پانچ برس پہلے جب میں نے تمہاری آرزو کی تھی تو تم نے  
ناقص کاروباری انداز میں مجھے ٹھکرایا تھا۔“

باد جو باسی پھول کی اڑی اڑی سی رنگت ابھی باقی تھی۔ اس پر میک اپ کا سلیقہ ایسا تھا کہ وہ  
کانڈی پھول کی طرح کھل گئی تھی اور کسی ہڈی سینٹ کی نمک نے اس میں اچھی خاصی  
کشش پیدا کر دی تھی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی کہا کہ میرے پاس ایک سو روپے ہیں۔  
حالانکہ جیب میں تین سو روپے تھے۔ بھاؤ گر تار ہے تو اور گرانا چاہیے۔ مجھے اس کا وہ غور  
اب تک یاد تھا جب اس نے مجھے طنزیہ انداز میں پانچ سو روپے جمع کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ  
سر جھکا کر بولی۔

”مجھے دو سو روپے کی سخت ضرورت ہے میرا چالان ہو گیا ہے اگر صبح تک میں نے  
ڈیڑھ سو روپے تھانے میں نہیں پہنچائے تو وہ مجھے حوالات میں ڈال دیں گے۔“  
”اچھا تو پھر ڈیڑھ سو لے لو۔“

”مجھے مزید پچاس کی سخت ضرورت ہے میری لڑکی دوسری جماعت میں ہے۔ اس کے  
لیے نئی کتابیں خریدنی ہیں۔“

میں نے کہا ”اچھی بات ہے رات کے بارہ بجے اسی جگہ آکر ملنا۔ میں دو سو روپے لے  
کر آؤں گا اور تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔“

اس نے کہا ”ابھی دس بجے ہیں۔ اس وقت بھی رات ہے یہ دو گھنٹے کا انتظار میرے  
لیے عذاب بن جائے گا۔“

میں نے جیب سے سو سو کے نوٹ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔  
”میں پیسوں سے مجبور نہیں ہوں، محلے والوں سے مجبور ہوں۔ وہاں بارہ بجے کے بعد  
سناٹا چھا جاتا ہے۔ میں اسی وقت تمہیں وہاں لے جا سکتا ہوں۔ تم کبھی اس محلے کی عزت  
بن کر گئی تھیں۔ بہت سے لوگ تمہیں پہچانتے ہیں۔“

”میں کسی سے نہیں ڈرتی مگر تم اس محلے میں رہتے ہو تمہیں ڈرنا چاہیے۔ اچھی بات  
ہے میں دو گھنٹے تک انتظار کر لوں گی۔“

یہ کہہ کر وہ ٹیکسی سے اتر گئی۔ میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا  
تھا کہ جس گھر میں وہ بیاہ کر گئی تھی اب وہاں میری بہن رہتی ہے۔ چونکہ بہن کی سرال گھر  
کے بالکل سامنے ہے اسی لیے میں اسے چھپا کر اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا وہ  
گھنٹے بعد جب وہ میرے گھر آئے گی تو میں دو سو روپے اس کے منہ پر پھینک کر اسے بھی

میں نے حشرات سے کہا۔

”کلنا آج کل تم جنت میں زندگی گزار رہی ہو؟ خبردار اس مکان کو جہنم نہ کہنا کیونکہ وہ بنی بن کی جنت ہے۔ جہاں تم شرافت سے نہیں رہ سکیں وہاں میری بن عزت و آبرو زندگی گزار رہی ہے۔“

اس نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا پھر دھپ سے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے۔

”کیا تم نے اپنی بن کو وہاں بیاہ دیا؟ یہ کب کی بات ہے؟“

”جب تمہیں طلاق دی گئی تھی، اس کے چھ ماہ بعد میری بن اس گھر کی عزت بن بنی۔ اس کی شادی کو ساڑھے چھ برس گزر گئے ہیں۔“

”تعب ہے“ اس نے حیرانی سے کہا ”اب تک تمہاری بن کو بھی میری طرح فٹ فور آجانا چاہیے تھا۔“

”کیو اس مت کر۔ ذلیل کمینہ۔“

میں چیختے چیختے سنہیل گیا۔ رات کے سناٹے میں میری آواز بن کے سسرال تک پہنچ گئی۔ وہ تپنی سے مسکراتی ہوئی بولی۔

”تم سمجھ دار ہو۔ اچھا ہوا خود ہی غصے کو ضبط کر لیا۔ مجھے بھی افسوس ہے کہ میں نے اری بن کے متعلق ایسی بات کہہ دی۔ میں کیا کروں؟ میں بھی زخم کھائی ناگن کی طرح بنی ہوں اور جو بھی سامنے آجائے اسے ڈس لینا چاہتی ہوں۔ پہلے میں ایسی نہیں تھی۔

میں سمجھتی تھی کہ عورت کو صرف محبت ملتی ہے۔ نفرت بھی ملے تو وہ اسے محبت میں بدل دیتی ہے۔ بہت پہلے جب میں سولہ برس کی تھی تو میری زندگی میں ایک نوجوان آیا۔ وہ ان خوب صورت تھا۔ اسے دیکھ کر اس کی عبادت کرنے کو جی چاہتا تھا۔ میں اپنی خوش

نمی پر اک دم سے پاگل ہو گئی۔ اس کی خوبیوں اور اس کی شخصیت کے سامنے اپنی ذات کو اگرایا۔ محبت میں ایسا ہوتا ہے کہ عورت اپنے آپ کو مار کر صرف اپنے محبوب کی نصیحت کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ کچھ اور بننے کی تمنا نہیں کرتی۔ مگر بہت

محبت کا یہ پنا ٹوٹ گیا۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ چلا گیا۔ سات سمندر پار جانے کے بعد وہ کہاں گم ہو گیا، میں نہیں جانتی۔ لیکن اس وقت تک میری معصومیت میرا

میں نے محبت سے تو میری تمنا نہیں کی تھی۔ تم عورت کو مشین بنا کر یہ توقع کیوں کرتے ہو کہ اس کے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہو گا۔ کبھی میرے سینے میں دل دھڑکتا تھا، کبھی میں تمنا کرتی تھی کہ کوئی مجھے محبت سے اپنائے، کوئی مجھے ناٹم نیبل کے مطابق لٹے والا کھانا نہ کھجے۔ لیکن تم جیسے مرد نگاہوں کے انیسرے سے صرف عورت کے لباس کے اندر جھانکتے ہو۔ اس کے سینے میں کتنا خوب صورت دل ہے یہ کبھی نہیں سمجھتے۔ جب مجھے فٹ پاتھ پر لے آئے ہو تو پھر میرے کاروباری لمبے کارا کیوں ماننے ہو؟ یہ دیکھو میں کاروبار میں

تمنی دیانت دار ہوں۔ کل مجبور ہو گئی تھی، آج اس کی تلافی کے لیے آگئی ہوں۔ یہ نہ سمجھو کہ میں تمہارے عشق میں گرفتار ہو کر اپنی ضرورتوں سے مجبور ہو کر یہاں آئی ہوں، میں نے کاروباری مصلحتوں کو پیش نظر رکھا ہے اگر انکار کرو گے تو واپس چلی جاؤں گی۔“

اس کی باتیں سن کر میں نرم پڑ گیا۔ وہ درست کہہ رہی تھی۔ کاروبار میں انکار و اقرار کی تکرار ہوتی ہی رہتی ہے۔ مجھے برا نہیں ماننا چاہیے تھا۔ میں نے جیب سے دو سو روپے نکال کر اس کی طرف بڑھادیے۔ وہ روپے لے کر اپنے پرس میں رکھنے لگی۔ یہ وہی پرس تھا جسے میں نے پہلی بار زیب اتسا اسٹریٹ پر دیکھا تھا۔ شاید اس سے دو سال پہلے بھی یہ پرس اس کے ساتھ رہا ہو گا۔ جب سے وہ اس راستے پر آئی تھی وہ پرس بھی اس کے ساتھ آیا تھا اور اب اس کی طرح رفتہ رفتہ پرانا ہوتا جا رہا تھا۔ اس میں جو رنگ برنگے ٹکڑے ہوئے تھے وہ جگہ جگہ سے اکھڑ گئے تھے۔ آدی کی جیب ہو یا پرس وہ اپنی آملی کے مطابق ہلکا ہوتا اور مرجھاتا جاتا ہے۔

میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔ طرز کا موقع آئے تو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ میں نے طزیر انداز میں کہا۔

”یہ پرس شاید اس وقت بھی تمہارے ساتھ رہا ہو گا۔ جب تم پہلی بار دلہن بن کر اس سامنے والے مکان میں آئی تھیں؟“

اس نے پلٹ کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔ کھڑکی بند تھی لیکن چشم تصور میں وہ مکان نظر آیا جہاں وہ دلہن بن کر گئی تھی۔ اس نے نفرت سے ہونٹ سکود کر کہا۔

”اس مکان کی بات نہ کرو وہ جگہ جہنم سے بدتر ہے۔“

ہے۔ اس نے مجھے بہت پیار کیا۔ میں نے اب تک اپنی زندگی میں درد سے دیکھے تھے جو اورت کی مرضی کے خلاف اسے چھین لیتے ہیں مگر اس نے بڑی محبت سے میرے وجود کے لئے زورے کو حاصل کر لیا۔“

”پھر تم نے ایسی محبت بھری زندگی کو کیوں چھوڑ دیا؟“

اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں جانتی ہوں، تم سچ میں نہ بولو۔ صبح چار بجے تک میں اس کی آغوش میں رہی پھر وہ لسل کر کے نماز پڑھنے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میری ساس میرے پاس آئی اس نے اپنی محبت سے میرا ہاتھ تھام کر بڑی لجاجت سے کہا۔

”بیلا رانی، اب تم اس گھر کی عزت ہو اس لیے تمہیں بھی اس گھر کی عزت کا خیال رکھنا ہوگا۔ میرا بیٹا شریف احمد شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب سے وہ جوان ہوا تھا ہم اس کے لیے فکر مند تھے کہ گھر میں سو کیسے آئے گی۔ نہیں آئے گی تو لوگ میرے بیٹے کا مذاق اڑائیں گے کہ وہ شادی کے قابل نہیں ہے۔ میں کسی طرح اس کی شادی کرنا چاہتی تھی ہاں سمجھو کہ میں اس کی مردانگی کا بھرم رکھنا چاہتی تھی لیکن وہ تیس برس کا ہو گیا اور مسلسل شادی سے انکار کرتا رہا تو میرے خاوند نے ایک تجویز پیش کی۔ وہ تجویز ایسی تھی کہ بڑے بیٹے کی لاج رہ جاتی لیکن میں ایک عورت ہو کر اس تجویز کو کبھی پسند نہیں کر سکتی تھی۔ پہلے میرے خاوند نے مجھے بہت سمجھایا پھر مجھے اور میرے بیٹے کو مارنے بیٹھے لگا۔ میں اپنے اوپر قلم برداشت کر سکتی تھی لیکن آئے دن اپنے بیٹے کو لواتے جوتے کھاتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ ایک دن اسی طرح میرے بیٹے کو مار ڈالے گا۔ آخر میں نے مجبور ہو کر اس کی بات مان لی اور یہ شادی ہو گئی۔ ابھی تمہارے ساتھ جو رات گزار کر نماز پڑھنے کے لیے گیا ہے۔ وہ میرا خاوند فہیم احمد تھا۔“

میں لڑکھڑکیک بیک یوں پیچھے چلا گیا جیسے بیلا رانی نے مجھے زور کا طمانچہ مارا ہو اور اس کے ساتھ ہی میرے منہ پر تھوک دیا ہو۔ اس وقت میرا سر گھوم رہا تھا۔ شراب کے نشے میں تو گھومتا ہی ہے لیکن حالات کے حرای نشے نے میرے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ غاب یہ ہم سب کیسی حرای زندگی گزار رہے ہیں۔ فٹ پاتھ سے لے کر شریف گھرانوں کے آئینوں تک ہم کیسی دوغلی کرکٹیں کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنی نورانی پیشانی پر

کنوارا پن سب کچھ ختم ہو گیا تھا صرف محبت کی تلخ اور شیریں یادیں رہ گئی تھیں۔ میں نے سوچا تھا کہ انہی یادوں کے سہارے زندگی گزار دوں گی لیکن والدین میرے جذبات کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ جوان لڑکی بیانی نہ جائے تو وہ سوسائٹی میں سراٹھا کر نہیں چل سکتے۔ وہ میری شادی کی فکر کرنے لگے۔ انہی دنوں مشرقی پاکستان میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ میں نہیں جانتی کہ کون بنگالی اور کون بھاری ہے۔ اس ہنگامے میں جو لوگ میرے باپ کو قتل کر کے مجھے اٹھا کر لے گئے تھے ان کا تعلق انسان کی کسی قوم سے یا کسی ذات سے نہیں تھا۔ میرے والدین بھاری ہیں لیکن میں پیدا انٹی طور پر بنگالی ہوں کیونکہ بنگال میں میرا جنم ہوا ہے۔ اس ہنگامے میں ایک بار بنگالیوں کا پلہ بھاری ہوا۔ دوسری بار بھاریوں کا پلہ بھاری ہو گیا۔ جب مجھے بنگالی اٹھا کر لے گئے تو انہوں نے مجھے بھاری لڑکی سمجھ کر میری عزت کو کھلونا بنایا کیونکہ وہ میرے بھاری والدین کی مناسبت سے مجھے جانتے تھے۔ جب بھاریوں نے میری عزت لوٹی تو میں ان کی نظروں میں بنگالی تھی کیونکہ میں نے بنگلہ میڈیم سے تعلیم حاصل کی ہے۔ میں بنگالی زبان روانی سے بولتی ہوں اردو اچھی طرح بول نہیں سکتی۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر زور دیر کے لیے چپ ہوئی پھر آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا۔

”میں کسے الزام دوں؟ کوئی پاکستانی ہوتا تو میں اس کی طرف انگلی اٹھا کر اسے شرم دلاتی۔ وہاں سے یہاں تک میں نے یہی دیکھا کہ سب بنگالی، بھاری، پنجابی، سندھی اور سرحدی ہیں اور فٹ پاتھ کی دنیا میں یہ قومیں بھی نہیں ہیں، صرف دلال اور گاہک ہیں۔ پاکستانی کیسے سو رہے ہیں۔ میں کیسے بتاؤں کہ مجھے فٹ پاتھ پر کون لایا ہے؟“

میں نے کہا ”کوئی بھی لایا ہو لیکن جب تمہیں شرافت کی زندگی گزارنے کا موقع ملا تو تم نے لہسن بننے کے بعد بھی اس زندگی کو ٹھکرا دیا۔“

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔

”ہاں میں دلہن بنی تھی اس لیے کہ ہر عورت کے دل میں دلہن بننے اور پھر ہاں بننے کا ارمان ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک خیالی جنت کا خواب ہوتا ہے، میں اپنی آنکھوں میں ایک خواب سما کر اس سامنے والے گھر میں سہاگ کی بیچ پر آئی تھی۔ اس رات میرے خواب پورے ہو گئے۔ میں نے دیکھا میرا شوہرا دھیر عمر کا آدمی ہے مگر بہت محبت کرنے والا

لی تھا۔ بیلا رانی میرے قریب تھی۔ اس نے کہا۔

”میرے پاس اسپرہ کی دو نکلیاں ہیں انہیں کھاؤ۔“

پتہ نہیں اس نے وہ دو گولیاں مجھے کیسے کھلائیں۔ اس وقت مجھے بیلا رانی جیسی اورتوں کے پرس یاد آرہے تھے جن میں سی ٹیبلٹ ہوتی ہیں جن میں اسپرہ کی نکلیاں دتی ہیں جن میں خواب آور گولیاں ہوتی ہیں جن میں ان کے ہر زخم کا علاج ہوتا ہے۔ فاش کہ میری بہن کے پرس میں بھی کوئی ایسی ٹکلیہ ہوتی جسے نگل کر وہ بیش کی نیند سوجاتی ٹر میرے سوچنے سے میری بہن نہیں مر سکتی تھی اور میری دنیا کی بے حیائی نہیں مر سکتی تھی۔ اسے مارنے کے لیے مجھ جیسے لوگوں کو مرنے پڑے گا لیکن میں کیسے مر سکتا ہوں۔ اپنی زندگی کے عزیز نہیں ہوتی اگر مجھ جیسے لوگ اتنی جلدی اتنی آسانی سے مر جاتے تو بیلا رانی بسا پھول پیار کے گلہ ان میں سجنے کے بجائے سراج کے اکالہ ان میں نہ چلا جاتا۔

صبح تک میں بخار میں پھنسا رہا۔ بیلا رانی میرے پاس رہی حالانکہ اسے چلا جانا چاہیے تھا۔ جب اس کا خریدنے والا پیار تھا اور اسے اپنے استعمال میں نہیں لاسکتا تھا تو ایسی بورت میں ہمارے درمیان کوئی جھوٹا رشتہ بھی نہیں رہ جاتا تھا۔ وہ میرے گھر سے جاسکتی تھی لیکن اس وقت میں نے سوچا کہ وہ صبح تک رہ کر اور میری تباہی کی فرائض انجام دے کر وہ سو روپے وصول کرنا چاہتی ہے۔ دو سو روپے کی رقم بہت بڑی ہوتی ہے وہ صبح تک برے پاس رہ کر کہہ سکتی تھی۔

”سو روپے کے مطابق میں نے تمہارے ساتھ رات گزار دی ہے اب اگر تم مجھے ہاتھ دلاؤ گے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“

لیکن صبح ساڑھے چار بجے جب اذان کی آواز آنے لگی تو اس نے اپنا پرس کھولا اور اس میں سے دو سو روپے نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ہمارا سودا مکمل نہ ہو سکا۔ تم نے مجھ سے میری قیمت وصول نہیں کی اس لیے میں یہ دیکھ نہیں لے سکتی۔“

یہ کہہ کر اس نے سو سو کے دو نوٹ میرے سرہانے رکھ دیے اور پرس بند کر کے اپنی لہجہ سے اٹھتی ہوئی بولی۔

”ابھی اندھ رہا ہے مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ اگر نعیم احمد نے دیکھ لیا تو میرا کچھ

سجدوں کا داغ بنائے نماز پڑھنے بھی جاتے ہیں۔ اس وقت میری نگاہوں کے سامنے بیلا رانی نہیں شمشاد سہاگ کی بیچ پر بیٹھی ہوئی تھی اور ایک بچے کو گود میں کھلا رہی تھی۔

وہ کس کا بچہ ہے؟ چاروں طرف سے ایک ہی سوال گونج رہا تھا۔ وہ بچہ کس کا ہے؟ وہ بچہ کسے اپنا باپ کے گا؟ جو دادا ہے اسے باپ کے گا جو باپ ہے اسے سوتلا بھائی کے گا۔ جو بہو ہے وہ بیوی ہے جو بیوی ہے وہ سوتلی ماں بن گئی ہے۔ آغ تھو۔ ہم اس دنیا میں کیسے کیسے رشتوں کی کھجوریاں پکا کر کھاتے ہیں، ہضم کرتے ہیں اور ڈکار لے کر فخر کرتے ہیں کہ ہم انسان ہیں۔

میں چکر اکر گر پڑا۔ مجھے صرف اتنا ہوش ہے کہ بیلا رانی مجھے سہارا دے کر چارپائی پر لے آئی تھی۔ میں غصے، نفرت اور توہین کے احساس سے کانپ رہا تھا۔ میری نس نس میں شرارے سلگ رہے تھے۔ میری حالت ایسی تھی جیسے کوئی خود اپنے پیروں پر کھماڑی مار کر تکلیف سے تڑپ رہا ہو۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی بہن کو ایک مذہب چمکے میں بھیجا تھا اور اپنے ان ہی ہاتھوں سے اپنی بہن کے گاہک کا گریبان نہیں پکڑ سکتا تھا کیونکہ اس میں میری بہن کی بدنامی تھی وہ اپنے بچے کے ساتھ دنیا والوں کے سامنے تماشہ بن جاتی۔

میں سڑکوں پر ٹیکسی چلانے والا اور فٹ پاٹھ کی زندہ ٹیکسیوں کو اپنے منافع کی انگلیوں پر نچانے والا بھاری اپنی بہن کو اس سطح پر نہا پتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب اپنی انگلی گنتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ دو سڑکوں کا گلا کیسے کتنا ہے۔ اس وقت میں چاہتا تھا کہ کسی طرح میری آنکھ سے آنسو نکل جائیں اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے شروع کر دوں مگر نہ جانے آنسو میرے چہرے پر چھیلے وجود کے اندر کہاں چھپے ہوئے تھے۔ یہ کب جاگیں گے اور کب میری پکوں کی دلیز تک آئیں گے۔ میں زندگی کے ہر درد و کرب سے گزرتا ہوں مگر آنسو میری بے حیا آنکھوں میں نہیں آتے۔

جب آنسو نہیں نکلے تو اندر کا سارا غبار بخار کی صورت میں ابھر آیا۔ بیلا رانی نے مجھے چھو کر کہا۔

”تمہیں تو بخار چڑھ رہا ہے۔ کیا میں ڈاکٹر کو بلاؤں؟“

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ اس نے میرے جوتے اتار دیے اور دوسرے کمرے سے لٹاف لاکر مجھ پر ڈال دیا۔ لمحہ بہ لمحہ بخار تیز ہوتا جا رہا تھا اور میں بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ مجھے ہوش



”بس۔ مرد کی مردانگی یہیں تک ہوتی ہے۔ تم لوگ عورت کے سامنے صرف تھمائی کے مودیدان ہو۔ تھمائی سے باہر اسی عورت سے سامنا ہو جائے تو خدا یاد آجاتا ہے۔ تھارادو غلام بنوئی اللہ میاں کے پاس پناہ لینے گیا ہے۔“

وہ ہنستی ہوئی اور پرس جھلاتی ہوئی مجھ سے دور ہوتی چلی گئی۔ میں اتنی دیر بیٹھنے کی وجہ سے تھک گیا تھا، میڈیٹل ہو کر بستر پر گر پڑا۔ ایک رات کے بخار نے مجھے بہت کمزور بنا دیا تھا۔ نہیں میں غلط کہہ رہا ہوں اس دنیا کی زہریلی سچائی نے مجھے اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

مجھے بیلارانی کی زہریلی ہنسی پر غصہ نہیں آیا۔ میں فہیم احمد کو دیکھ کر جھلا گیا تھا۔ میرے جی میں آیا تھا کہ میں دوڑتا ہوا باہر جاؤں اور اس کا گلا دبا دوں۔ لیکن میرے ہاتھ بہت کمزور ہو گئے تھے کیونکہ میں نے ٹاڈا نشگی میں ان ہی ہاتھوں سے اپنی بہن کو اس کے ٹرٹ کدے میں بھیجا تھا۔ مجھے سنجیدگی سے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اب وہ ایسی شرمناک زندگی نہ گزارے گی۔ یہ فیصلہ کرنے کے لیے میں بہن کے دروازے تک نہیں جاسکتا تھا کیونکہ بہنراٹھ کر بیٹھنے وقت اب میرا سر چکرانے لگتا تھا۔

میں بہت دیر تک اندر ہی اندر کڑھتا رہا اور خیال ہی خیال میں فہیم احمد کو قتل کرتا رہا۔ آدھے گھنٹے کے بعد فہیم احمد زیر لب مقدس آیتیں پڑھتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر تھی اور میرے چہرے سے غصہ ظاہر ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

”تمہارے دیکھنے کا انداز بتا رہا ہے کہ بیلارانی تمہیں سب کچھ بتا چکی ہے۔“

میں نے غصے کی حالت میں حوک اڑاتے ہوئے کہا۔

”ہاں وہ مجھے بتا چکی ہے کہ تم کتنے بڑے شیطان ہو۔ مجھے بیماری سے اٹھنے دو، میں نہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

وہ ایک کرسی پر بیٹھنے ہوئے بولا۔

”اچھا ہی ہوا کہ تم بیمار ہو۔ نہ زیادہ جیج سکتے ہو نہ مجھ پر ہاتھ اٹھا سکتے ہو۔ اس طرح میں سکون سے کچھ باتیں کر سکوں گا۔ ابھی بیلارانی کو تمہارے گھر سے نکلتے دیکھ کر میں بہت پریشان ہو گیا تھا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ ٹیکسی ایک ایسا چور رہا ہے جہاں سے شرکار آدمی

نہیں بگاڑے گا اس کا سر میرے سامنے شرم سے جھکے گا بشرطیکہ اسے شرم آجائے لیکن تم اس کے سامنے سر نہیں اٹھا سکو گے کیونکہ وہ تمہارا اصلی بہنوئی ہے۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ مجھے فہیم احمد کا ڈر نہیں تھا۔ میں صرف محلے والوں سے ڈرتا تھا کہ کہیں کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ اس خیال سے میں نے اپنے بستر کے سرہانے کی طرف سے ذرا سا اٹھ کر لائٹ آف کر دی اور سرہانے کی کھڑکی کھول دی۔ کھڑکی پر پردہ پڑا ہوا تھا اور کمرے میں اندھیرا تھا۔ باہر سے کوئی مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا، میں باہر کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ اس وقت گلی ویران تھی صرف ایک کتا چل قدمی کر رہا تھا۔ لیکن جس وقت بیلارانی میرے مکان کا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور چند قدم آگے بڑھی اسی وقت سامنے میری بہن کے مکان کا دروازہ کھلا۔ فہیم احمد سر پر ٹوپی رکھتے ہوئے نماز پڑھنے کے لیے مسجد کی طرف جانے والا تھا۔ ہم دونوں کے مکان کے درمیان تقریباً بارگ کا فاصلہ تھا، اتنے قریب سے وہ بیلارانی کو دیکھتے ہی ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ بیلارانی بھی رک کر اسے دیکھنے لگی۔

پہلے تو فہیم احمد نے میرے گھر کے دروازے کی طرف دیکھا۔ اسے توقع تھی کہ شاید میں نظر آؤں گا۔ پھر اس نے کھڑکی کی جانب دیکھا میں تاریکی میں پردے کے پیچھے تھا اسے نظرنہ آسکا پھر اس نے محتاط نظروں سے اپنے چاروں طرف دیکھا جب اسے اطمینان ہو گیا کہ کسی طرف سے بدنامی نہ چھینٹا اڑ کر اس کے اجلے دامن تک نہیں آسکے گا تو وہ بیلارانی سے نظریں ملا کر اپنی مختصر سی ڈاڑھی پر ہاتھ بھیرتے ہوئے سنی خیز انداز میں مسکرائے لگا۔ بیلارانی کی پشت میری کھڑکی کی جانب تھی اس لیے میں اس کے چہرے کے تاثرات نہ دیکھ سکا۔ ویسے میرا خیال تھا کہ وہ نفرت کا اظہار کرے گی اور اس کبخت پر تھوک کر چلی جائے گی لیکن وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھے ایک ادائے ناز سے کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنی ساڑھی کا آٹھل ڈھلکا دیا پھر سینہ تان کر ایک ہاتھ سے پرس کو جھلاتی ہوئی نکلتی اور بل کھاتی ہوئی فہیم احمد کی طرف بڑھنے لگی۔

اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر فہیم احمد ایک دم سے بول کھلا گیا اور بدک کر مسجد کی طرف تیز قدموں سے جانے لگا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر بیلارانی وہاں سے پلٹ گئی پھر کھڑکی کے پاس آکر آہستگی سے بولی۔

تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کی باتیں میرے سینے میں خنجر کی طرح اتر رہی تھیں۔ میں جو کچھ کرتا رہا اب وہی میرے سامنے آیا۔ کیا اتنے شرمناک واقعے کے بعد مجھے عبرت حاصل ہو سکتی تھی؟

ہاں عبرت حاصل ہوئی لیکن میں کس طرح شرافت سے زندگی گزار سکتا تھا اور دوسروں کو گمراہی سے بچا سکتا تھا؟ کیا بیلارانی جیسی عورتیں میری ٹیکسی میں آکر بیٹھیں تو میں انہیں صحیحیسی شروع کر دیتا؟ نیک ہدایت دینے والے اس دنیا میں بہت ہیں لیکن نیکی بڑھی کیسں نہیں ہے۔ بیلارانی کو اپنی ٹیکسی میں نہیں بٹھاؤں گا تو اس کے لیے ہزاروں ٹیکسیوں کے دروازے کھلے ہیں، بیلارانی تو بے کر کے شریفوں کی دنیا میں آئے گی تو پھر کوئی شریف آدمی غیر شرعی دین مراد کر کے ایک عورت کی کمزوری سے فائدہ اٹھائے گا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے یہ بات میری سمجھ میں آگئی۔ میں آپ کو بھی سمجھاتا ہوں اور میں اس دنیا کے ہادی اور مصلحین کو بھی سمجھاتا ہوں کہ تم اب تک غلطی سے چوروں، بدعاشوں اور غلط کاروں کو سمجھاتے آئے ہو۔ دراصل تمہیں شریف آدمیوں کو سمجھانا چاہیے کیونکہ اس دنیا کی زیادہ سے زیادہ غلامتیں شریف گھرانوں کی دہلیز سے نکل کر فٹ پاتھ پر آتی ہیں۔

نعیم احمد جلد ہی شمشاد کو لے کر میرے پاس آگیا۔ شمشاد اپنے چار برس کے لڑکے کو اٹھائے دروازے پر آکر کھڑی ہو گئی مگر میرے کمرے کے اندر نہیں آئی۔ اس کا جھکا ہوا سر بارہا تھا کہ اسے تمام حالات کا علم ہو چکا ہے۔ میں نے اسے دیکھتے ہی غرا کر کہا۔

”شمشاد! تم اندر آؤ اور اس غیبیٹ کو باہر جانے دو اگر میں بستر سے اٹھنے کے قابل ہوتا تو اسے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیتا۔“

شمشاد اندر نہیں آئی۔ نعیم احمد باہر نہیں گیا۔ اس نے کہا۔

”شیدے“ تو احمق ہے، کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بیلارانی میری زندگی سے نکل کر کہاں پہنچا تھا؟ اس معاشرے میں نبی کون سی عزت ہے کہ تو اس عزت کا تھوڑا سا حصہ، بہن کو دے سکے گا؟ اگر حقیقت کی نظر سے دیکھے گا تو یہ شمشاد، بیلارانی کی سطح پر زندگی گزار رہی ہے۔ ایسے وقت عقل کی

ایک بار ضرور گزرتا ہے۔ ٹیکسی میں شریف عورتیں بھی سفر کرتی ہیں اور بازاری بھی۔ مجھے بہت پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ بیلارانی بازاری بن چکی ہے مگر تمہیں اپنی ٹیکسی میں اسے یہاں نہیں لانا چاہیے تھا۔“

”میں کسی کو بلائے نہیں جاتا سواریاں خود ہی ہاتھ اٹھا کر مجھے بلاتی ہیں۔ اچھا ہوا کہ وہ آگئی اور اس نے تمہارے شیطانی چہرے کو نگا کر دیا۔ اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو ابھی میری بہن کو یہاں لے آؤ۔“

”تمہاری بہن جہاں ہے“ اسے وہیں رہنے دو۔ اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔ تم مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ گے یا مجھے بدنام کرنا چاہو گے تو میرے ساتھ تمہاری بہن بھی بدنام ہوگی۔ شریف احمد ایک آہنی پردہ ہے جس کے پیچھے تمہاری شریف، بہن عزت سے زندگی گزار رہی ہے۔“

میں نے غصے سے چیخ کر کہا۔

”ایسی باتیں نہ کرو۔ میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔“

”شیدے! غصہ کرنے سے پہلے یہ سوچو کہ شادی سے پہلے تمہاری بہن ماں بننے والی تھی۔ اتنی بڑی دنیا میں ایک میں ہی ہوں جس نے تمہیں بدنامی سے بچایا ہے۔ اگر میں اس گناہ کی گھڑی کو اپنے گھر نہ لاتا تو کیا اس وقت بھی تم اسی طرح چیخ چیخ کر کہہ سکتے تھے کہ تمہاری بہن بدکار ہے۔ نہیں ایک بھائی اپنی زبان سے اپنی بہن کے لیے ایسی باتیں نہیں کہہ سکتا اور آج بھی تم ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔ اگرچہ وہ آج بھی بدکار ہے مگر کیا مٹھائی پر چڑھے ہوئے چاندی کے ورق کی طرح وہ چٹکی اور عزت دار زندگی گزار رہی ہے۔ اس عزت کی چٹک کے پیچھے وہ کیا ہے؟ میں کیا ہوں؟ وہ کیسی ہے؟ میں کیسا ہوں؟ یہ نہ دیکھو۔ تم کہیں اور کیسے کاشتہ کر لو گے تو یہ ساری دنیا تمہیں بڑی گھناؤنی نظر آئے گی۔“

”میں تمہاری ان فضول باتوں کو سمجھتا نہیں چاہتا۔ تم ابھی جاؤ اور میری بہن کو یہاں پہنچاؤ۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا بولا۔

”میں خوب سمجھتا ہوں کہ تم ٹیکسی چلائے وقت دوسروں کی بہنوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے ہو۔ انہیں ان کے گھر بھی واپس لے آتے ہو۔ میں بھی تمہاری بہن کو

ساری اٹھا کر آگے بڑھا تو لسیبلہ کے چوراہے پر چاروں طرف سے پولیس کی گاڑیوں نے میری ٹیکسی کو گھیر لیا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تین آدمیوں نے ٹیکسی سے نکل کر کھانے کی کوشش کی لیکن پکڑ لیے گئے۔ میری ٹیکسی کی اگلی اور پچھلی سیٹ کے درمیان ایک بڑا سا ٹیلا رکھا ہوا تھا۔ پولیس والوں نے جب مجھے بھی پھنکری پستانکی تو پتہ چلا کہ اس ٹیلے میں پس بھری ہوئی تھی۔ میں نے تھانے کی طرف جانے کے دوران بڑی بڑی قسمیں کھا کر تین دلائے کی کوشش کی کہ میں مجرم نہیں ہوں، ان لوگوں کو میں نے پہلے نہیں دیکھا جو پس کا ٹیلا لے کر کہیں جا رہے تھے۔

ٹیکسی ڈرائیور کب ایماندار اور شریف سمجھتے جاتے ہیں؟ کسی نے میری سچائی کا یقین نہیں کیا۔ تھانے کا انچارج اتنا ایماندار تھا کہ ان تین مجرموں کی بڑی سے بڑی رشوت بھی کام نہ آسکی، اس نے ہم سب کے باری باری بیانات لیے۔ جب میرے بیان دینے کے بارے آئی تو میں نے ٹیکسی کے ڈرائیور سے میٹرک کا سرٹیفکیٹ نکال کر بتایا کہ میں نے اس برس پہلے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا تھا۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ حالات مجھے ٹیکسی ڈرائیور کا ایک ایسی جگہ لے آئے ہیں جہاں صرف چوہدرہ معاش آتے ہیں۔ تھانے کا انچارج واقعی شریف آدمی تھا۔ وہ میری تعلیمی صلاحیتوں اور میری باتوں سے متاثر ہو گیا۔ اس نے کہا۔

”میں مانتا ہوں کہ مسافروں کو ٹیکسی میں بٹھانے سے پہلے ان کا سامان چیک کرنے کا دستور نہیں ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی میں بیٹھنے والے غیر قانونی چیزیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا رہے ہیں پھر بھی اکثر ٹیکسی ڈرائیور اپنے مجرموں کا ساتھ دیتے ہیں اور اپنی ٹیکسیوں کو جرائم کا اڈہ بناتے ہیں۔ اگر کوئی شریف آدمی تمہاری شرافت کی ضمانت دے گا تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ اس وقت تک تمہیں حالات میں رہنا پڑے گا۔ کوئی ایسا آدمی ہو تو مجھے اس کا نام اور پتہ بتاؤ، میں اسے یہاں لایاں گا۔“

میں سوچ میں رہ گیا کہ کس شریف آدمی کا نام اور پتہ بتاؤں۔ اس دنیا میں شریف آدمی نادر پتے ہوں گے لیکن میں زندگی کے جس ٹریفک سے گزرتا آیا ہوں وہاں کوئی شریف آدمی بھی نظر نہیں آیا۔ اب میں تھانے کے انچارج سے یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ جواباً

ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اپنی آنکھوں میں کوئی عیب ہو تو تاریک شیشوں کی عینک لگا کر اسے چھپایا جاتا ہے۔ اس طرح سیاہ چشمے سے گورے چہرے کا حسن بھی بڑھ جاتا ہے۔ ہر رانی کو چھپانے کے لیے ایک خوب صورت نقاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس محلے میں جو میری شہرت جو میری عزت ہے اس سے زیادہ خوب صورت نقاب حیرتی بہن کو نہیں مل سکتا۔ اچھی طرح سوچ لے تو شمشاد کو مجھ سے چھین کر اس کی زندگی برباد کر دے گا۔“

وہ جھوٹی عزت کا بھرم قائم رکھنے کے لیے بڑی عمدہ تجویز پیش کر رہا تھا۔ یہ بات ابھی گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں گئی تھی اگر میں خاموش رہتا تو یہ راز یہیں دفن ہو جاتا اور ہم سب سماج کے عزت دار افراد کی طرح پھر سے زندگی گزارنے لگتے۔ میں نے شمشاد کو سوالیہ نظروں سے دیکھا، وہ پہلی بار بولی۔

”مجھے اس راہ پر لانے والا ایک معلم، ایک پروفیسر تھا۔ جب تعلیم دینے والے ایسی راہوں پر لگا دیں تو ایک کے بعد دوسری راہیں کھلتی جاتی ہیں۔ مجھے دوسری راہ کا یہ رہبر ملا۔ یہ میرا مجازی خدا نہیں ہے۔ مجازی کا مطلب جھوٹا اور فرضی ہے تو پھر میرے جسم و جان کا جھوٹا خدا ہے۔ اس کے بعد میں کسی تیسرے کے ہاتھ میں نہیں جانا چاہتی۔ میں جہاں ہوں مجھے وہیں پڑا رہنے دو۔ یوں بھی اب میں صرف تمہاری بہن ہی نہیں ہوں اپنے اس بچے کی ماں بھی ہوں۔ یہ دنیا والوں کے لیے ناجائز سہی لیکن بچہ کبھی ماں کے لیے ناجائز نہیں ہوتا۔ میں اس بچے کی زنجیر سے فیم احمد کے ساتھ بندھ چکی ہوں۔ تم مجھے بھول جاؤ۔ ہو سکے تو یہ گھر اور یہ محلہ چھوڑ کر چلے جاؤ۔ میں نہیں چاہتی کہ اب ہماری نگاہیں ملیں۔ کم از کم بھائی بہن کی آنکھوں میں اتنی تو حیا ہو کہ وہ بدکار زندگی کے آئینے میں ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں۔“

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ حیا کی بات آئی تو مجھے خیال آیا کہ جب سے وہ دروازے پر آئی تھی اس نے ایک بار بھی مجھ سے آنکھ نہیں ملائی تھی اور تب یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ جنہیں ہم گناہ کار کہتے ہیں وہ ہمارے ہمارے سامنے لباس تو ضرور کھولتی ہیں لیکن حیا سے آنکھ نہیں کھولتیں۔ اتنی بڑی دنیا میں شرم اگر کہیں ہے تو صرف عورت کی آنکھ میں ہے۔



کبھی کبھی میری ٹیکسی جرائم کا اڈہ بن جاتی ہے۔ رات کے وقت میں گرو مندر سے

تھانے کے انچارج نے پوچھا ”تم کہاں رہتے ہو؟“

”اورنگی ایک نمبر میں۔“

”کیا کام کرتے ہو؟“

”مڑے پر پھل بیچتا ہوں۔“

اتنے میں ایک سپاہی نے تھانے کے انچارج سے کہا۔

”سزا اپ اس علاقے میں نئے آئے ہیں۔ یہ بیلارانی اس تھانے میں کئی بار آچکی ہے۔ یہ پیشہ کرنے والی عورت ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ اس نوجوان سے شادی کر چکی ہے۔“

تھانے کے انچارج نے گھور کر بیلارانی اور مصلح الدین کو دیکھا۔ بیلارانی نے جلدی سے کہا۔

”حضور! پہلے میں بری عورت تھی مگر خدا کی قسم میں چھ ماہ سے ایک وفاداری بیوی بن کر مصلح الدین کے ساتھ شرافت کی زندگی گزار رہی ہوں۔ اگر میں پہلے کی طرح ہوتی تو اتنی بری سے یہاں نہیں آتی۔ کیا میں نہیں جانتی کہ یہاں کے تمام سپاہی مجھے جانتے ہیں۔ میں میرا جھوٹ پکڑا جائے گا۔ چونکہ میں جھوٹی نہیں ہوں اسی لیے اپنے خاوند کے ساتھ آئی ہوں۔“

تھانے کے انچارج نے کہا۔

”یہ بڑی اچھی بات ہے کہ تم شرافت کی زندگی گزار رہی ہو لیکن ہم نہیں جانتے کہ تم اب تک مستقل مزاجی سے عزت سے زندگی گزارو گی۔ ابھی تم آنا نئی دور سے گزر رہی۔ مجھے افسوس ہے کہ ابھی تمہاری کوئی ضمانت یا کسی طرح کی یقین دہانی قابل قبول نہ لی۔ تم دونوں اگر شیدے کے کام آنا چاہتے ہو تو کسی ایسے شخص کو لاؤ جو اس معاشرے کا بننے علاقے کا معزز اور شریف انسان ہو۔“

میں نے سلاخوں کے پیچھے سے بیلارانی کو دیکھا۔ وہ مایوس ہو کر کبھی میری طرف اور مصلح الدین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مصلح الدین کی نگاہوں کی بے بسی بتا رہی تھی کہ میں نے بھی اس معاشرے میں کوئی معزز اور شریف انسان نہیں دیکھا ہے۔ یہ عجیب سی نہ ہے کہ کانٹوں کی زندگی میں پھول کا حسن ہوتا ہے۔ سائے کی زندگی میں سورج کی اجلی

یہی کہتا کہ آدمی خود شریف ہو تو اسے شریفوں کی صحبت مل جاتی ہے۔ میں نے کہا۔

”جناب! میں اس دنیا میں تھا ہوں۔ میرے دن رات کا زیادہ حصہ ٹیکسی میں بیٹھ کر یا سو کر گزرتا ہے۔ کراچی شہر میں کوئی شریف آدمی تمہارا اپنی فیملی کے ساتھ سال ڈیڑھ سال سے زیادہ ایک ہی کرائے کے مکان میں نہیں رہ سکتا۔ مالک مکان ہزار بہانوں سے اسے مکان خالی کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ مکان خالی کرانے کے لیے کبھی وہ اپنے مکان کو فروخت کرنے کا بہانہ کرتا ہے، کبھی بیرونی ملک سے اس کے رشتے دار آنے والے ہوتے ہیں، کبھی اس کی بیٹی کی شادی کے لیے مکان خالی کرنا پڑتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب تک ہم ایک مکان اور ایک محلے میں رہ کر وہاں کے شریف لوگوں سے تعلقات پیدا کریں اس وقت تک ہم مکان بدر اور محلہ بدر کر دیئے جاتے ہیں یا پھر وہ شریف لوگ حملہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں جو ہماری شرافت کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں، میں ضمانت کے لیے کے طلب کر سکتا ہوں؟ مجھے سوچنے کا موقع دیجئے۔“

مجھے رات بھر سوچنے کے لیے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ یہ میرے لیے بڑی شرم کی بات تھی کہ میں اتنی طویل زندگی میں ایک بھی شریف آدمی سے دوستی نہیں کر سکا تھا اگر دوستی اور تعلقات پیدا ابھی کیے تو اس نے اپنی شرافت کے پیچھے چھپی ہوئی زلالت دکھا دی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سے ایمان اور کون سی تہذیب کی کسوٹی پر شریف آدمی پہچانے جاتے ہیں؟

میں حوالات کی سلاخوں کو تھامے کھڑا تھا کہ اتنے میں بیلارانی آگئی۔ اس کے ساتھ ایک اچھا قبول صورت نوجوان تھا۔ اس نوجوان نے تھانے کے انچارج کو سلام کرنے کے بعد بیلارانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”جناب یہ میری بیوی ہے۔ میرا نام مصلح الدین ہے ابھی میں لیبیل چوک سے گزر رہا تھا تو شیدے ٹیکسی ڈرائیور کو آپ گرفتار کر کے لے جا رہے تھے۔ میری بیوی نے مجھے بتایا کہ شیدے بہت اچھا انسان ہے، اس نے ایک بار میری بیوی کو غنڈوں سے بچایا تھا۔ ہم اس خیال سے یہاں آئے ہیں کہ شاید ہم کسی طرح شیدے کے احسان کا بدلہ چکا سکیں۔ ہم غریب آدمی ہیں، روپے پیسے سے اس کی ضمانت نہیں دے سکتے لیکن جس طرح بھی ممکن ہو یہ یقین دلا سکتے ہیں کہ یہ شریف آدمی جس کا دھندا نہیں کرتا ہے۔“

ایک گلی کو آج بھی گلی فیم احمد کہا جاتا ہے۔ غرض کہ اس دنیا میں یک کام کر کے وہ مرنے کے بعد جنت میں جانے کے تمام اہم سرٹیفکیٹ حاصل کر چکا ہے۔  
اتنے اہم سرٹیفکیٹ دیکھ کر تھانے کا انچارج اس کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے پوچھا۔

”آپ شیدے کو کیسے جانتے ہیں؟“

فیم احمد نے جواب دیا ”شیدے کی سبکی، بن میرے بیٹے کی شریک حیات ہے۔ حالات نے اسے عیسائی ڈرائیور بنا دیا ہے ورنہ یہ شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے اسی لیے میں نے اس کی بہن کو بڑی عزت اہم کے ساتھ اپنی ہو بنایا ہے۔“

تھانے کا انچارج نے مطمئن ہو کر کہا۔

”یہ بات شیدے کو پہلے ہی بتانا چاہیے تھا کہ وہ آپ جیسی معزز ہستی کا رشتے دار ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بعض لوگ اتنے خوددار ہوتے ہیں کہ بہن اور بیٹی کے سسرال والوں کو تھانے پجری میں بلا کر زحمت نہیں دیتے ہیں بہر حال آپ شیدے کو ساتھ لے جائیں مگر اس کیس میں جب بھی شیدے کی طلبی ہو، اسے عدالت میں حاضر کرنا آپ کی ذمہ داری ہوگی۔“

فیم احمد نے ذمہ داری لے لی اور میں رہا کر دیا گیا۔ حوالات کے آہنی دروازے سے نکلنے وقت یہ عقدہ حل ہو گیا کہ اس معاشرے کے شریف آدمی صرف کیڑے سرٹیفکیٹ میں پائے جاتے ہیں۔

میں نے فیم احمد سے بات نہیں کی۔ تقریباً دو برس سے میں نے اس کی اور اپنی بہن کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ میں نے وہ محلہ ہی چھوڑ دیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ مجھ سے زیادہ کینہ آدمی مجھ سے زیادہ شریف بن کر میری ضمانت کے لیے آجائے گا۔ مجھے اس کا احسان نہیں لینا چاہیے تھا، اسی طرح حوالات میں رہنا چاہیے تھا مگر اس کج بخت نے تھانے میں آکر بھی بڑی معصومیت سے کہہ دیا تھا کہ میری بہن اس کے گھر میں ہے۔ ایسی صورت میں، میں اس کی رشتہ داری سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ تھانیدار کے سامنے میرے انکار کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔

میں فیم احمد کی ساتھ تھانے سے باہر اپنی عیسائی کے پاس آیا۔ وہاں بیلا رانی بچھلی

اور شفاف کر نہیں ہوتی ہیں۔ پھر ہم جیسے ذلیل انسانوں کی زندگی میں کوئی اچلے، بے داغ واسن والا شریف آدمی نظر کیوں نہیں آتا۔ آخر یہ شریف آدمی کہاں پائے جاتے ہیں۔  
بیلا رانی اور مصلح الدین وہاں سے اٹھ کر کسی معزز آدمی کی تلاش میں چلے گئے میں بیلا رانی کے متعلق سوچنے لگا۔ میں نے اسے کبھی غنڈوں سے نہیں بچایا تھا، وہ خواہ مخواہ میرے ہاتھ آکر وہ احسان کا بوجھ اٹھانے آئی تھی۔ میں سمجھ گیا اس نے صرف تھانیدار کو متاثر کرنے کے لیے جھوٹ کہا تھا۔ پتہ نہیں اس میں کہاں تک سچائی تھی کہ وہ مصلح الدین سے شادی کر چکی ہے۔

ایک گھنٹہ بعد میں نے سلاخوں کے پیچھے سے فیم احمد کو دیکھا۔ وہ ایک بغل میں قائل دیائے اور دوسرے ہاتھ میں ہاتھی دانت کے دستے کی ایک چھری پکڑے ہوئے تھا۔ بدن پر کفن کی طرح سفید لباس تھا جو اس کی شخصیت اور کردار کو اجلا اور بے داغ بنا رہا تھا۔ اس کی پیشانی کا داغ اور خضاب رسیدہ مختصر سی داڑھی اس کے شریف اور ایماندار ہونے کا سرٹیفکیٹ پیش کر رہی تھیں۔ وہ حسب معمول زیر لب مقدس آیتیں پڑھ رہا تھا۔ میں چیخ کر کہتا چاہتا تھا اس کی زبان سے ان مقدس آیتوں کو چھین لو، کلام پاک کو مذاق نہ بناؤ۔ کیا یہ ہدایات دینے والی کتاب ایسے ہی بے ایمان نمازیوں کے لیے اتاری گئی ہے؟

مگر میں کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ میری زبان کھلتے ہی اس کے ساتھ میری بہن بھی بدنام ہو جاتی۔ ویسے بھی کیا ہم سب اپنے جھوٹ کو ج ثابت کرنے کے لیے اور اپنی جھوٹی عزت کا بھرم رکھنے کے لیے خدا کی قسم اور کلام پاک کی قسم نہیں کھاتے ہیں؟ وہ بھی مقدس آیتوں کو کھارہا تھا۔

اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی۔ پھر تھانے کے انچارج کو سلام کرتے ہوئے مصافحہ کیا اس کے بعد ایک کرسی پر بیٹھ کر فائل کو کھولتے ہوئے کہا۔

”بندے کو شیخ فیم احمد کہتے ہیں۔ خاکسار اب سے بارہ برس پہلے اپنے محلے کالی ڈی ممبر اور اس کے بعد چیزیں رہ چکا ہے۔ یہ دیکھیے یہ ہیں کانڈات۔۔۔۔۔“

وہ فائل سے ایک ایک کانڈ نکال کر دکھانے لگا۔ وہ کانڈات بتا رہے تھے کہ وہ اپنے محلے کا سب سے عزت دار اور مخلص انسان ہے۔ اس نے چیزیں بننے کے بعد محلے میں پانی کے ٹکے لگوائے ہیں، پرائمری اسکول کھولا ہے مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا ہے۔ محلے کی

میرے منہ پر پھر ایک طمانچہ پڑا۔ بیلارانی کے ساتھ میری... بہن کا نام آ رہا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے ٹیکسی روک دی۔ پھر اپنا سرائیٹرنگ پر ٹیک دیا کیونکہ میرا سر چکر رہا تھا۔ جو بھی اٹے سیدھے رشتے قائم ہو چکے تھے میں انہیں کہاں تک جھٹلا سکتا تھا۔ میں ایک عزت دار بد معاش کا سالا کھلانے سے انکار کر سکتا تھا لیکن بیلارانی اس سچائی سے انکار نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی اور میری بہن کا بیٹا آپس میں سوتیلے بہن بھائی ہیں اور ایک ہی نعیم احمد کی اولاد ہیں۔

نعیم احمد نے ہم دونوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر التجائی۔

”خدا کے لیے مجھے جانے دو۔ میں یہاں سے رکشے میں چلا جاؤں گا۔ تم دونوں کے ساتھ بیٹھ کر مجھے شرم آتی ہے کہ میں اس دنیا کا سب سے ذلیل انسان ہوں۔ جو گناہ کر رہا ہوں اس سے توبہ نہیں کر سکتا۔ توبہ کروں گا تو شمشاد اور اپنے بیٹے سے رشتہ توڑنا ہو گا۔ رشتہ ٹوٹنے کے بعد شمشاد میرے گھر سے نکلے گی تو میں دنیا والوں کو کیا کہوں گا کہ میری بہو کہاں جا رہی ہے؟ کیوں جا رہی ہے؟ کس کا بچہ لے کر جا رہی ہے؟ خدا کے لیے تم دونوں میرا پیچھا چھوڑ دو۔ مجھے بے غیرت بن کر ٹیک نام رہنے دو۔“

میں نے دروازے کی طرف اسے زور سے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

”جا بھاگ یہاں سے۔ ذلیل کیٹے! نہ میری کوئی بہن ہے نہ تجھ سے میرا کوئی رشتہ ہے۔ تو صرف بیلارانی کی دھمکی سے گھبرا کر میری ضمانت کے لیے آیا تھا۔ جا اب یہ تجھے دھمکی نہیں دے گی۔“

وہ دروازہ کھول کر جانے لگا تو بیلارانی نے کہا۔

”دھمکی کیسے نہیں دوں گی؟ شیدے جب بھی عدالت میں تیری پیشی ہوگی۔ یہ الو کا بھاتا تیرے ضامن کی حیثیت سے ضرور آئے گا۔ نہیں آئے گا تو اس کی شرافت کی ایسی نمیں کر کے رکھ دوں گی۔“

”میں آؤں گا تو جب بھی بلائے گی میں چلا آؤں گا۔“ اس نے گڑگڑا کر کہا ”مگر تو میرے محلے میں نہ آنا خدا کے لیے میری عزت رکھ لیتا۔“

وہ عزت کی بھیک ان سے مانگتا رہا جو بے عزت تھے۔ میں نے ایک جھٹکے سے گاڑی اشارت کی اور اسے پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ بیلارانی نے کہا۔

سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ نعیم احمد میرے ساتھ سامنے والی سیٹ پر آگیا۔ میں نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے پوچھا۔

”بیٹا! تم اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ تم میری ہمدردی میں اب تک یہاں موجود رہیں۔“

بیلارانی نے خوشی سے لہک کر کہا۔

”ارے داد! میری کوشش کامیاب کیوں نہیں ہوئی اس شریف مرغے کو میں ہی تو پکڑ کر لائی ہوں؟“

میں نے حیرانی سے عقب نما آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا نعیم احمد کو تم بلا کر لائی ہو؟“

”ارے شیدے! تو نے بھی گھاس کھائی ہے۔ مجھ جیسی ٹیکسی کے بلانے سے بھلا کوئی شریف آدمی گھر سے نکل کر آ سکتا ہے؟ میں نے مصلح الدین کو قاصد بنا کر اس کے پاس پیغام بھیجا تھا کہ تیرا سالا شیدے حوالات میں ہے۔“

میں نے غصے سے کہا ”نیکو اس مت کر میں اس بد معاش کا سالا نہیں ہوں۔“

وہ بولی ”تیرے انکار کرنے سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی تو گرم کیوں ہوتا ہے چل تجھے سالا نہیں کہوں گی پہلے میری بات تو سن لے۔ تیرا بہنوئی نہیں۔۔۔ پھر مجھ سے بھول ہو گئی اسے تیرا بہنوئی کہوں گی تو پھر سالا بن جائے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ حرامی رشتوں کو دنیا والوں کے سامنے کن رشتوں سے پکارا جائے؟ میں یہ کہہ رہی تھی کہ یہ سالا نعیم تیری ضمانت کے لیے یہاں آئے سے انکار کر رہا تھا۔“

نعیم احمد نے عاجزی سے کہا۔

”کچھ بیلارانی! میں عزت دار آدمی ہوں، مجھے گالی نہ دے کیا تو سیدھی طرح بات نہیں کر سکتی؟“

”کیا تو سیدھی طرح تھانے آگیا تھا؟ میں نے مصلح الدین کے ذریعے دھمکی دی تھی کہ شیدے کی ضمانت نہیں لے گا تو میں تیری پارسائی کا پول کھول دوں گی۔ محلے والوں سے کہوں گی کہ وہ تیرے جوان بیٹے کا معائنہ کر انہیں اور اس حقیقت کو سمجھیں کہ بیلارانی اور شمشاد کی گود میں ایک ایک بچہ کہاں سے آیا ہے؟“

”شیدے! اتنی زندگی گزارنے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے زندگی گزاریں؟ کس سے محبت کریں اور کس سے نفرت کریں؟ کس کی عزت کریں اور کس کی بے عزتی کریں؟ میں نے جھٹلا کر فہم احمد کی جو بے عزتی کی ہے اس میں کھوکھلا پن ہے کیونکہ میں بالواسطہ اس کی عزت کرتی ہوں یعنی اس کی دی ہوئی بیٹی جو میرے پاس ہے میں اس بیٹی سے محبت کرتی ہوں۔ میں اس کے شریف خون کو بازار میں نہیں لاسکتی۔ وہ میری بھی بیٹی ہے، میں اسے عزت و آبرو سے دلن بنا کر رخصت کرنا چاہتی ہوں۔ سوچا جائے تو میں اس شیطان کی عزت کا بھرم رکھ رہی ہوں۔ سوچا جائے تو تو بھی سرباز ار اسے بہن کی خاطر گالیاں نہیں دے سکتا، دنیا والوں کے سامنے اس کی عزت کرنے پر مجبور ہے۔ ہم لوگ جو عزت والے نہیں ہیں، اسی طرح دوسروں کو عزت دے رہے ہیں۔“

عزت کی بات آئی تو مجھے خیال آیا کہ اب وہ بھی عزت کی زندگی گزارنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا بیچ بچ تو نے مصلح الدین سے شادی کر لی ہے؟“

”ہاں شادی تو ہو گئی ہے مگر بیچ بچ ہو گئی ہے یا نہیں؟ یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔“

”اس بات کا مطلب کیا ہوا؟“

”مطلب یہ ہوا کہ مصلح الدین کے ماں باپ مجھے بہو بنانے کے لیے راضی نہیں تھے۔ اس کا باپ بہت دولت مند ہے، پھلوں کا تھوک بیوپاری ہے۔ مصلح الدین مجھ پر جان دیتا ہے۔ جب اس نے ماں باپ کی بات نہیں مانی تو اسے گھر سے نکال دیا گیا۔ وہ میرے عشق میں ثابت قدم نکلا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اس میں یہ حوصلہ اس لیے بھی پیدا ہوا کہ میں نے برائے دھندے سے توبہ کر لی تھی۔ میں اپنی لڑکی مونا کے ساتھ ایک دو وقت کے فائے کرتی تھی مگر گاہک کی تلاش میں گھر سے نہیں نکلتی تھی۔ اگر ایک عورت اپنے مرد کے اعتماد کے مطابق پچھلے گناہوں سے توبہ کر لے اور آئندہ پارسا اور وفادار بن کر رہے تو مرد پورے غلوں، لگن اور تہدی سے اپنے گھر کی جنت آباد کر لیتا ہے۔ مصلح الدین اپنے گھر سے کچھ پیسے لے کر نکلا تھا۔ اس نے ان پیسوں سے پرانا ہڑہ خرید لیا اور فٹ پاتھ پر پھیل بچا کرنا ہے۔ ہم نے اور گئی میں ایک کمرے کا مکان کرائے پر لیا ہے اس گھر میں

میری بیٹی مونا کی معصوم باتیں ہیں اور میرے محنت کرنے والے مرد کا پیار ہے۔ ہائے شیدے! میں بیان نہیں کر سکتی کہ جب وہ دن بھر کی محنت کی کمائی لا کر میری ہتھیلی پر رکھتا ہے تو میں اپنی ہی نظر میں کتنی عزت واری ہو جاتی ہوں۔“

”میں نے تجھ سے یہی پوچھا کہ تو اس کی بیوی بن چکی ہے یا نہیں؟“

”ہاں ایمان داری سے بن چکی ہوں مگر کسی ایمان والے قاضی نے میرا نکاح نہیں پڑھایا۔ وہ کہتا تھا کہ پہلے اپنے ماں باپ کو یا کسی بزرگ کو ساتھ لاؤ مگر اس کے بزرگ فٹ پاتھ کی عورت کو اپنی بہو نہیں بنانا چاہتے تھے۔ ہم ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے قاضی اور مولوی کے پاس گئے لیکن سب یہی سمجھتے تھے کہ مصلح الدین مجھے کیس سے بھگا کر لایا ہے اور چوری چھپے نکاح پڑھانا چاہتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پہلے کورٹ سے اجازت حاصل کریں۔ جب اجازت مل جائے گی تو شرعی طور سے نکاح پڑھا دیا جائے گا۔ کورٹ میں جانے کے لیے وکیل کی ضرورت تھی اور وکیل کے لیے فیس کی ضرورت تھی ابھی مصلح الدین نے پھل بیچنے کا چھوٹا سا کاروبار شروع کیا تھا۔ اتنے پیسے فاضل نہیں تھے کہ ہم وکیل اور عدالت کے چکر میں پڑتے۔ جب ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو ہم تھک ہار کر گھر میں آ بیٹھے۔ میں نے ماں سے کہا۔

”مسلے! کیا یہ دنیا نہیں چاہتی ہے کہ میں شریف عورت بنوں؟“

وہ محبت سے بولا ”نہیں بیٹا! اللہ تعالیٰ جب اپنے نیک بندوں کا امتحان لیتا ہے تو انہیں ایسی ہی آزمائشوں سے گزرنے کے لیے چھوڑتا ہے۔“

”میں تو بڑی سے بڑی آزمائشوں سے گزر جاؤں گی۔ مجھے اپنی پروا نہیں ہے۔ تیری فکر ہے تو یہاں ایک ہی کمرے میں مجھ سے ذرا دور سوتا ہے۔ نہیں سوتا نہیں ہے، رات بھر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہتا ہے مگر نکاح سے پہلے میرے ساتھ سونا گناہ سمجھتا ہے۔ ایسے تو راتیں جاگ جاگ کر بیمار پڑ جائے گا۔ آوی کو اتنا بھی شریف نہیں ہونا چاہیے کہ کھانے کی پلیٹ سامنے رکھ کر بھوکے پیٹ کو نہیں بدلتا رہے۔“

”مگر بیٹا! کیا کھانا حرام ہوتا ہے۔“

”تو کسی طرح مجھے حلال کر دے۔“

وہ مجھے گہری لگن سے دیکھنے اور سوچنے لگا۔ اس کی نگاہوں میں مجھے حاصل کرنے کی

”اول ہونہ میں شادی کی پہلی ہی رات عورت کے پیسے اپنے زمرے رکھنا نہیں چاہتا۔ شرح محمدی کے مطابق انسان کی حیثیت دیکھ کر مہر کی رقم مقرر کی جاتی ہے۔ اس وقت میری حیثیت نقد رقم کی صورت میں نہیں بلکہ مال کی صورت میں یہ پھل وغیرہ ہیں ان میں سے کچھ پھل میں تیرے مہر کے لیے مخصوص کروں گا پھر تیرے حصے کے پھل جیسے جیسے فروخت ہوتے رہیں گے میں ان کے پیسے لاکر تجھے دیتا رہوں گا۔“

میں نے یہ بات منظور کر لی۔ پھر اس نے نکاح پڑھاتے ہوئے کہا۔

”بی بی زینب النساء عرف بیلا رانی! کیا تم مصلح الدین ولد معین الدین کو اپنے نکاح میں بوض ایک درجن مانگے، ایک سیر سیب اور دو درجن کیلے بطور مہر مہل قبول کرتی ہو؟ کو میں نے قبول کیا۔۔۔۔۔“

میں نے تین بار قبول کیا۔ اس نے میرا ہاتھ تمام کر مجھے وہاں سے اٹھایا اور اپنے بستر پر لاکر بٹھادیا۔ پھر اس نے اپنی انگلی سے اسٹین لیس کی انگوٹھی نکال کر میری انگلی میں پہنائی۔ اس کے بعد گھونگھٹ اٹھا کر میرا چہرہ دیکھا۔ مجھے پیار کیا اور مجھے اپنے سینے سے لگایا۔ اتنی لمبی عمر گزارنے کے بعد پہلی بار ایک سچے مروت نے مجھے زندگی کی سچی سرسٹیں دیں۔ خدا کی قسم یہ دنیا اسی لیے خوب صورت ہے کہ ابھی یہاں مصلح الدین جیسے اصلاح کرنے والے اور دولت کی ماری ہوئی عورتوں کو عزت دینے والے موجود ہیں۔

”شیدے! میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ دنیا والوں کی نظروں میں ہمارا نکاح ہو چکا ہے یا نہیں مگر میں مطمئن ہوں کہ اس نکاح کے بعد میں اپنی بیٹی کے ساتھ ایک شریف آدمی کی پناہ میں آگئی ہوں۔“

میں بیلا رانی کی باتوں سے اور مصلح الدین جیسے اصلاحی جذبہ رکھنے والے نوجوان سے بے حد متاثر ہوتا رہا۔ میں نے کہا۔

”بیلا! تو نے یہ اچھا کیا کہ مصلح الدین سے شادی کر لی۔ اس طرح تجھ سے زیادہ تیری بیٹی موتا کو تحفظ حاصل ہو گیا ہے۔ جب وہ جوان ہوگی تو مصلح الدین کی سرپرستی میں کوئی اسے غلط نظروں سے دیکھ نہیں سکے گا۔“

”میری موتا بہت اچھی ہے بہت خوب صورت ہے۔ ابھی چھ برس کی گزیا ہے، مجھے اسی کی فکر کھائے جاری تھی، اب تمام فکروں سے آزاد ہوں۔ میں مراؤں کی تب بھی

شدید خواہش تھی اس نے اپنی خواہش سے مجبور ہو کر کہا۔

”تجھے حلال کرنے کی ایک ہی ترکیب ہے کہ میں خود ہی دلہا اور خود ہی قاضی بن جاؤں۔ خداوند کریم ہمارے نکاح کا گواہ ہوگا۔ شرافت کی زندگی گزارنے کے لیے نیک نیتی سے جو کام کرو وہ خدا کو منظور ہوتا ہے۔ بول اس طرح نکاح قبول کرے گی؟“

”ہاں ہزار بار قبول کروں گی۔“

”ہزار بار نہیں، صرف تین بار“ قبول“ کہتا ہوگا۔ چل اب اٹھ کے وضو کر لے۔“

ہم دونوں نے وضو کیا۔ ہمارے کمرے کی ایک دیوار پر کعبہ کی سمت اللہ اور محمد کی طغریں لگے ہوئے ہیں۔ ہم اوجھڑ کر کعبہ کے پیٹھ گئے۔ مصلح الدین زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہے مگر اسے سورہ فاتحہ اور چاروں قل اچھی طرح یاد ہیں، انہیں پڑھنے کے بعد اس نے کہا۔

”بی بی زینب النساء عرف بیلا رانی! میں مصلح الدین ولد معین الدین تمہیں اپنے نکاح میں بوض دین مہر۔ ارے ہاں میں تو یہ پوچھنا ہی بھول گیا کہ مہر کی رقم کتنی ہوگی؟ اس وقت میرے پاس صرف بارہ روپے ہیں۔“

میری زبان سے بے اختیار نکل گیا ”میرا رٹ بارہ روپے نہیں ہے۔“

وہ ایک دم سے چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ مجھے بھی فوراً ہی عقل آگئی کہ نکاح کے وقت ایسا نہیں کہنا چاہئے۔ میں نے ندامت سے کہا۔

”مصلح! مجھے معاف کر دے۔ پتہ نہیں یہ بات میری زبان پر کیسے آگئی۔ مجھے مہر کی رقم بارہ روپے منظور ہے۔“

اس نے کہا ”لیکن میں نے یہ بارہ روپے کل صبح راشن لانے کے لیے رکھے ہیں۔“

”میں مہر کی اس رقم سے راشن لے آؤں گی۔“

”نہیں بیلا! نہ میں عورت کی کمائی کھاتا ہوں اور نہ ہی میں تجھے دی ہوئی مہر کی رقم راشن کے لیے واپس لوں گا۔ شادی سے پہلے وال روٹی کی فکر ضروری ہے۔ یہ پیسے راشن کے لیے رہیں گے۔“

”اگر نقد رقم نہیں ہے تو مہر معمل کی کیا ضرورت ہے جو فوراً ادا کیا جاتا ہے، ابھی مہر موصول ہونا چاہیے یعنی جب میں مطالبہ کروں گی تو مجھے وہ رقم ادا کرونا۔“



جاتی ہے، کل سے میں روز صبح یہاں آیا کروں گا اور اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر اسکول پہنچایا کروں گا۔ یہ اسکول کے نئے کپڑے پہنے گی اس کے نئے بستے میں نئی کتابیں ہوں گی اور ہم تینوں مل کر اسے ایک نئی اور صاف ستھری زندگی کا درس دیا کریں گے۔“

بیلا رانی کے آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ آنسوؤں کی جھللاہٹ میں اپنی بیٹی کے روشن مستقبل کو دیکھ رہی تھی اور اس کے مستقبل تک جو راستہ گیا تھا اس راستے کو آنسوؤں سے دھو رہی تھی۔



کبھی کبھی میری عیسی سیاست کا اکھاڑہ بن جاتی ہے۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہنگامے ہو رہے تھے، جلے جلوسوں کی ہنگامہ آرائیاں کا دیوار زندگی کو معطل کر رہی تھیں۔ شاہراہوں اور گلی کوچوں کے نقشے بدل گئے تھے۔ جہاں زندگی کی رونق تھی وہاں اسی زندگی کو ختم کرنے کے لیے گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ تیس برسوں میں کتنی ہی بار انقلاب لانے اور عوام کی حالت بہتر بنانے کا فریب دیا گیا۔ ہر فریب کے ساتھ ساتھ گولیاں بھی چلائی گئیں۔ اب پھر نئے انقلاب کے لیے چراغ روشن کیے جا رہے تھے اور یہ چراغ غریبوں کے لہو سے روشن ہو رہے تھے کیونکہ سڑکوں پر وہی مارے جا رہے تھے اور کرفیو کے واقعات میں آمدنی اور راشن کے بغیر وہی بھوکے مر رہے تھے۔ جنہیں کھانے کے لیے کچھ مل جاتا تھا وہ اپنے گھروں میں ناش کی بازیازں بنا رہے تھے جنہیں کچھ نہیں مل رہا تھا وہ چوریاں کر رہے تھے۔ جنہیں چوریوں سے دولت حاصل ہو رہی تھی وہ کرفیو کے سنہری مواقع کو اور طول دینے کے لیے سڑکوں پر ہنگامے کر رہے تھے۔ دیانت داری سے انقلاب لانے والے کم تھے اور کرپشن بڑھانے والے زیادہ تھے۔ یہ بات لوگوں کے سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ انقلاب لانے سے پہلے عوام کے ذہنوں میں قیمری انقلاب لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک غریبی اور جہالت رہے گی اس وقت تک کوئی بھی نظام سچائی سے قائم نہیں ہو سکتا۔

میں نے بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی عیسی کا میٹر خراب کر دیا تھا کیونکہ ان دنوں لوگ حواس باختہ تھے، ہنگامے کے دوران اوھر سے اوھر بھاگتے تھے اور مجھے منہ مانگا کرایہ دیتے تھے۔ میری عیسی میں دونوں طرف کے سیاسی کارکن دفعتاً فوجاً آکر بیٹھے تھے اور ایک

مصلح الدین باپ بن کر کسی شریف گھرانے میں اسے پایا ہے گا۔ میری آخری تمنا یہی ہے کہ میری گڑیا رانی کو ایک اچھا گھر اور ایک اچھا شوہر ملے۔ تم اسے دیکھو گے تو اس پر بڑا پیار آئے گا۔ کیا تم میری گڑیا رانی کو دیکھو گے؟“

”ہاں میں اس معصوم کلی کو ضرور دیکھوں گا جس کی حفاظت کے لیے تم نے منہا گار زندگی سے توبہ کر لی ہے اور اس بچی کے اطراف شرافت کی مضبوط دیواریں کھڑی کر دی ہو۔ اسی لیے تو میں اور بچی کی طرف جا رہا ہوں۔“

بیلا رانی نے حیرت سے کہا۔

”ارے ہاں! مجھے تو باتوں میں یاد ہی نہ رہا کہ تم میرے ہی گھر کی طرف جا رہے ہو۔ میں نے مصلح سے کہہ دیا تھا کہ وہ گھر میں رہے کیونکہ مونا وہاں اکیلی ہے۔ یہ سوچ کر کتنی خوشی ہوتی ہے کہ میری بیٹی کی حفاظت کے لیے اس کا ایک باپ موجود ہے۔“

وہ مجھے اپنے گھر کا راستہ بتانے لگی۔ پانچ منٹ کے بعد میں نے اس کے گھر کے سامنے عیسی روک دی۔ مصلح الدین نے باہر نکل کر ہمیں دیکھا۔ اس نے میری رہائی پر مبارکباد دیتے ہوئے مصافحہ کیا اور گھر کے اندر لے گیا۔ وہ ایک چھوٹے سے کمرے اور چھوٹے سے آنگن کا گھر تھا۔ اس گھر میں چھوٹی چھوٹی ضرورت کی چیزیں تھیں اور جو سب سے بڑی چیز تھی وہ مونا کا پیار تھا۔

وہ معصوم بچی ایک چارپائی پر سو رہی تھی۔ وہ صرف چھ برس کی تھی مگر قد میں ماں کے کاندھے کے برابر ہوتی جا رہی تھی۔ بچے یوں بھی معصوم ہوتے ہیں مگر نیند میں اور بھی معصوم نظر آتے ہیں۔ یہ ان کی زندگی کا وہ دور ہوتا ہے جب ان کے خوابوں میں صرف پریاں اور شہزادے آتے ہیں، اس زندگی کا کوئی البیہ ان معصوم خوابوں کو مجروح نہیں کرتا۔ میں تھوڑی دیر کے لیے زندگی کی تمام غلطیوں سے نکل کر ایک ایسی خوب صورت دنیا میں آیا جہاں صرف نئی نسل کے ننھے منوں کی معصومیت ہوتی ہے۔

میں وہاں بہت دیر تک بیٹھ کر باتیں کرتا رہا۔ ان کے ساتھ کھانا کھایا۔ پھر چائے پینے کے بعد میں نے جیب سے دس روپے نکال کر خوابیدہ مونا کی مٹھی میں رکھ دیے اور بیلا رانی سے کہا۔

”یہ صرف تم دونوں کی نہیں، میری بھی بیٹی ہے مجھے بتاؤ کہ یہ کس اسکول میں پڑھنے

میری تھی میری تھی بھراب میری نہیں رہی تھی۔ میرے سامنے اس کی جلی ہوئی لاش پڑی تھی۔

میں نے اس کے قریب جا کر دیکھا وہ باہر سے اور اندر سے اس قدر جل مٹی تھی کہ اب وہ مرمت کے قابل نہیں رہی تھی۔ اسے مرمت کرانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے سرے سے ایک نئی ٹیکسی بنانی پڑتی۔ یعنی اسے دوبارہ سڑک پر لانے کے لیے کم از کم اس چند ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ میں وہاں سے سر جھکا کر ایک کباٹریے کے پاس پہنچا۔ کباٹریے سے اس کا سودا کرتے وقت میرا دل رو رہا تھا۔

کباٹریے نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس آہنی ڈھانچے کی قیمت اتنی گرا دی کہ میں نے اسے پچنا مناسب نہیں سمجھا دو گھنٹے کے بعد جب میں اس ٹیکسی کی طرف واپس آیا تو اتنی دیر میں وہ آدھی رہ گئی تھی۔ جو کل پرزے کام کے رہ گئے تھے۔ لوگ انہیں کھول کر لے گئے تھے اب وہ ایک یوڑھی ملوا کف کی طرح اتنی کھوکھلی ہو گئی تھی کہ کوئی اس پر نظر ڈالنا ہی گوارہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے فروخت کرنا تو دور کی بات تھی، میں نے جھنجھلا کر اسے ایک لائٹ ماری اور اسے سڑک پر پھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

میں بہت دیر تک ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں ہوں؟ کیا کروں؟ میں شریں دلوں سے پوچھتا چاہتا تھا کہ وہ میری ٹیکسی کو جلا کر اور میرے سر سے دو روٹیاں جھین کر کون سا انقلاب لانا چاہتے۔ یہ وقت اور یہ ہنگامے گزر جائیں گے، کوئی نہ کوئی پارٹی اقتدار سنبھال لے گی مگر امن و امان کے بعد کسی کی سمجھ میں یہ نہیں آئے گا کہ غریب اور غریب ہو گئے ہیں اور بدکاری بے حیائی اور کرپشن اور زیادہ بڑھ گیا ہے۔

میں بھٹکتا ہوا بیلارانی کے دروازے پر پہنچ گیا۔ ان دنوں ہر گھر کے دروازے پر سناٹا ہایا ہوا تھا۔ اس دروازے پر بھی موت کی سی خاموشی تھی۔ اب سے پہلے میری گاڑی کی آواز سن کر مونا دوڑتی ہوئی دروازے پر آجاتی تھی، کبھی میرا ہاتھ پکڑ کر گھر میں لے جاتی تھی کبھی اسکول کی کتابیں اٹھائے میرے پاس ٹیکسی میں آکر بیٹھ جاتی تھی۔ جب سے وہ بھی بری ٹیکسی میں بیٹھنے لگی تھی تب سے میں نے فٹ پاتھ کی ٹیکسیوں کو پچھلی سیٹ پر بٹھانا جوڑا تھا۔ دو برس سے میں نے کسی بدکار عورت کا چہرہ نہیں دیکھا تھا صرف اس معصوم

جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے اور تمام راستے میں تقریر کرنے کے انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ پھر آپس میں بحث کرنے کے دوران مجھ سے بھی پوچھتے تھے کہ میں کس پارٹی کے ساتھ ہوں۔ میں ایک ناخدا ہوں جو سوار یوں کو ٹریفک کے سمندر سے گزار کر ساحل پر پہنچاتا ہے۔ میں کرائے کے سلسلے میں تھوڑی سی بے ایمانی کرتا ہوں مگر انہیں منجہدار میں کبھی ڈیوٹا نہیں۔ میں اپنے ہی جیسی ہی کسی پارٹی کے ساتھ تھا جو میری طرح تھوڑی سی بے ایمان ہو لیکن اتنی ایماندار ہو کہ عوام کے جان و مال کے ساتھ انہیں بخیریت ساحل پر پہنچا دیا کرے۔

اگر میں پچھلی سیٹ پر بیٹھے والوں سے یہ بات کہتا تو وہ میری پشت میں چھرا گھونپ دیتے۔ وہ صرف یہ سنتا چاہتے تھے ان کے سامنے آنے والا ہر شخص ان کی پارٹی کا ساتھ دینے والا ہے۔ اپنی ٹیکسی کو سلامت رکھنے کے لیے اور اپنے جسم کو توڑ پھوڑ سے بچانے کے لیے جو پارٹی سوائی بن کر میرے سامنے آتی تھی میں اسی کا ساتھ دینے کا وعدہ کرتا تھا۔ موقع محل کی مناسبت سے کامیاب لیڈروں کے وعدوں کی طرح میرے وعدے بھی بدلتے جاتے تھے۔ اتنی سیاست کے باوجود مجھے نقصان اٹھانا پڑا۔ ایک دن میری ٹیکسی ان ہنگاموں کی نذر ہو گئی۔ دو سیاسی پارٹیوں کے ٹکراؤ کے درمیان میری ٹیکسی آگنی تھی۔ میں نے وہاں سے ٹیکسی نکال کر لے جانے کی بہت کوشش کی مگر شمس خود پھراؤ کی زد میں آ گیا۔ مجھے مجبوراً ٹیکسی سے نکل کر کھانا پڑا۔ اتنے میں پولیس کی طرف سے لاٹھی چارج شروع ہو گیا۔ لوگوں کو دو دھماکے کے لیے ہوائی فائر بھی کیے گئے۔ فائرنگ کی وجہ سے بھگدڑ مچ گئی تھوڑی دیر بعد جب میدان صاف ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک جلتی ہوئی دکان کے سامنے میری ٹیکسی بھی جل رہی تھی۔

ہم ان ہنگاموں میں کس طرح لٹ جاتے ہیں، یہ میرے لئے کا منظر دیکھ کر سمجھ میں آسکتا ہے کہ میں نے دس برس پہلے وہ ٹیکسی قسطوں پر لی تھی۔ پورے آٹھ برس تک میں اس کی قسطیں بھرتا رہا تھا۔ قسطیں ادا کرتے کرتے وہ نئی ٹیکسی کھلا رہ بن گئی تھی۔ وہ بنار پڑتی تھی، میں اس کا علاج کرتا تھا۔ وہ مکی ہو جاتی تھی، میں اسے سلاتا تھا۔ وہ دوڑنے لگتی تھی، میں کارخانے میں لے جا کر اسے مٹاتا تھا جو کما تھا اس پر خرچ کرتا تھا۔ ایک غریبی بیوی کی طرح وہ روٹنے کی ادائیں دکھا دکھا کر میری جیب سے پیسے نکال لیا کرتی تھی۔ وہ

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس گھر کے باہر والی دنیا میں کیا ہو رہا ہے اس لیے وہ تفصیل سے  
لے کچھ بتا نہیں سکی۔ میں نے پوچھا۔

”تم نے کیا کھایا ہے؟“

”چاچا جی کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے، ابو دودھ سے پیار ہیں۔ کبھی کھانے کے  
لیے ملتا ہے کبھی ہم بھوکے رہتے ہیں۔ صبح اسی گھر میں تھیں کہ وہ آپ کے پاس جا رہی  
ہیں۔ آپ سے کچھ پیسے لے کر آئیں گی۔ آپ تو آگے مکر وہ ابھی تک نہیں آئیں۔“

میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”فکر نہ کرو بیٹے میں ابھی تمہارے لیے کھانا اور ابو کے لیے دودھ لے کر آتا ہوں۔ تم  
الٹیں روشن کرو اندر ہیرا ہو رہا ہے۔“

یہ کہہ کر میں نے دودھ لانے کے لیے برتن لیا اور گھر سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد  
’کباب‘ روٹیاں اور دودھ لے کر واپس آنے لگا تو بیلا رانی نظر آئی۔ وہ آگے آگے جا رہی  
تھی اور میں پیچھے تھا۔ اسے آواز نہ چاہتا تھا کہ اسی وقت وہ اپنے گھر کے دروازے میں  
داخل ہو گئی۔ جب میں دروازے کے قریب پہنچا تو اندر سے اس کی آواز سنائی دی۔ وہ مونا  
کہہ رہی تھی۔

”مٹی تمہارے چاچا جی ملے تھے انہوں نے مجھے ڈھیر سارے پیسے دیے ہیں۔ دیکھو  
میں تمہارے لیے کتنی چیز لے کر آئی ہوں۔“

اس کی باتیں سنتے ہی میں دروازے کے باہر ٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جھوٹ کہہ رہی  
تھی کہ مجھ سے ملاقات ہو چکی ہے اور جو پیسے اس کے پاس تھے وہ میں نے نہیں دیے تھے۔  
’مونا‘ کہاں سے لائی تھی؟ مونا کی آواز سنائی دی۔

”اسی کتنی ساری چیزیں ہیں۔ چاچا جی بھی میرے لیے کھانا اور ابو کے لیے دودھ لینے  
لے گئے ہیں۔“

”آں اس کی گھبراہٹ ہوئی سی آواز سنائی دی، کیا شیدے یہاں آیا ہے؟“

میں کمرے کے اندر آ گیا۔ بیلا رانی ایک دم سے گھبرا کر کبھی مجھے اور کبھی مصلح الدین  
کو دیکھنے لگی۔ مصلح الدین کی زبان بند تھی مگر کان کھلے تھے وہ سب کچھ سن چکا تھا اور بہت  
کچھ سمجھ چکا تھا۔ اس کے سماعت جسم میں اچانک لچل سی گئی تھی۔ وہ چپ لپٹے لیے لینے

بچی کا چہرہ اگلی سیٹ پر دیکھتا رہا جو میری مصلح الدین اور بیلا رانی کی بیٹی تھی۔ ہم تینوں اس  
موصوم بچی کی حفاظت کر رہے تھے اور وہ بچی ہم میں ایک صاف ستھری زندگی گزارنے کا  
جذبہ پیدا کر رہی تھی۔

اس روز مونا دروازے پر نہیں آئی کیونکہ اس نے دروازے پر گاڑی کی آواز نہیں  
سنی تھی۔ وہ ٹیکسی روزی کا ذریعہ نہ سہی ایک موصوم بچی کو اپنی طرف بلانے کا چلن پھرنا  
کھلوتا تھی۔ مجھ سے مجھ سے ٹیکسی اور مونا سے اس کا کھلونا چھن گیا تھا۔ میں دروازہ کھول  
کر اندر چلا آیا۔ شام کا وقت تھا، کمرے میں مدھم مدھم سی تاریکی پھیل رہی تھی۔ ایک  
چارپائی پر مصلح الدین لیٹا ہوا تھا، اسی چارپائی کے سرے پر مونا سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔  
دروازے پر آہٹ ہوئی تو اس نے پلٹ کر دیکھا مجھے دیکھتے ہی وہ دوڑتی ہوئی اور روٹی ہوئی  
اگر مجھ سے پلٹ گئی۔ پھر رونے کے درمیان سسکیاں لے کر کہنے لگی۔

”چاچا جی! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، اسی صبح سے گئی ہیں ابھی تک نہیں آئیں۔ ابو  
چپ چاپ پڑے ہیں کچھ بولتے نہیں ہیں۔ پڑوس کی ماسی کہہ رہی تھی کہ شہر میں بہت سے  
لوگ مر رہے ہیں۔ اس اندھیرے میں مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت سے لوگ مجھے بھی  
مارنے کے لیے آ رہے ہیں۔ چاچا جی آپ مجھے چھوڑ کر نہ جائیں، اسی بہت خراب ہیں مجھے  
چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔“

اب وہ اونچائی میں میرے کانہ سے تک پہنچ گئی تھی مگر ہمارے لاڈ پانے اسے دنیا  
والوں سے بہت دور ایک موصوم اور بھولی بھالی گڑیا بنا کر رکھا تھا۔ وہ یا تو گھر کی چار دیواری  
میں رہتی تھی یا میری ٹیکسی میں بیٹھ کر اسکول آتی جاتی تھی۔ اس کے آگے جو دنیا ہے اس  
نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ میں بڑے پیار سے اس کے سر کو سلاتا ہوا اور پیٹھ کو تھپکتا ہوا  
تسلیاں دیتا رہا۔ پھر میں مصلح الدین کے قریب آیا، وہ اپنے بستر پر ایک لاش کی طرح بڑا ہوا  
تھا۔ اس نے صرف دیدے گھما کر مجھے دیکھا، اس کے ہونٹوں پر پھینکی سی مسکراہٹ آئی۔  
میں نے خیریت پوچھی تو وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ مونا نے کہا۔

”ابو بہت بیمار ہیں باتیں نہیں کر سکتے ہیں۔“

”کب سے بیمار ہیں؟“

”جب سے رہڑو لوٹ لیا گیا ہے۔ باہر لوگ لونے بھی ہیں اور مارتے بھی ہیں۔“

وہ میرے ساتھ چلتی ہوئی بولے۔

”ابھی میں اس کے سامنے رہوں گی تو مجھے دیکھ کر اسے اور تکلیف پہنچے گی۔“

”بیلا! میں بچھلے دو ماہ سے یہاں نہیں آ سکا۔ میں بھی شریسندوں کی لپیٹ میں آ گیا تھا اور جیل میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ برسوں رہا ہو کر آیا تو سوچا کہ کچھ کمائی کروں پھر مونا کے لیے کچھ چیزیں خرید کر لے جاؤں گا مگر آج میری ٹیکسی جلادی گئی ہے۔ آمدنی کا جو واحد ذریعہ تھا وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔“

”شیدے! ان سیاسی ہنگاموں نے ہمیں برباد کر دیا ہے۔ مصلح الدین کا رٹھ لوٹ لیا گیا پھر اسے توڑ کر اس کی ٹکڑیوں کو لوگوں نے مار پیٹ کے لیے ہتھیار بنائے۔ اس نے اپنی آخری پونجی کو بچانے کی انتہائی کوششیں کیں۔ اسی دوران قانون کے محافظ آگئے۔ کسی کی پیشانی پر یہ نہیں لکھا ہے کون ظالم ہے اور کون مظلوم؟ قانون کے محافظ بھی کو ایک لاشی سے ہانکتے لگے۔ انہوں نے رات نفل کے کندے سے مصلح الدین کے بٹنے پر کئی ضربیں لگائیں۔ تب سے وہ خون کی تفریبا ہے۔ دواؤں سے افادہ ہوتا ہے مگر کچھ دنوں کے بعد پھر خون تھوکنے لگتا ہے۔ اس کے دل کے پاس کوئی رگ پھٹ گئی ہے۔ اگر توجہ سے علاج نہ ہو سکا تو وہ خون تھوکتے تھوکتے مر جائے گا۔“

یہ کہہ کر وہ رونے لگی اور اپنے آنچل سے آنسو پونچھنے لگی۔

”وہ بہت خوددار ہے شیدے۔ کتا ہے بھوکے مر جاؤ۔ مجھے دواؤں کے بغیر مار ڈالو مگر فٹ پاتھ پر نہ جاؤ۔ حرام کا ایک پیسہ بھی لاؤ گی تو میں مر جاؤں گا۔ میں نے کام کرنے کی بہت کوشش کی مگر کام کہاں ملتا ہے۔ کارخانے بند پڑے ہیں۔ دو چار دن کے لیے کھلتے ہیں تو وہاں نئی کام والیوں کے لیے نمونہ شائیں نہیں نکلتی۔ کسی گھر میں ہانڈی برتن دھونے کا کام بھی نہ مل سکا۔ بچھلے دنوں میں نے پانی پی کر اور مونا کو ایک دقت کھلا کر دن کاٹے ہیں۔ میں بھوکے رہ سکتی ہوں اور مصلح الدین کی خودداری کو قائم رکھنے کے لیے مر بھی سکتی ہوں مگر ایک معصوم بچہ کو مر جھانے کیسے دیکھ سکتی ہوں۔ اپنے مجازی خدا کو دواؤں کے بغیر کس طرح مرنے دیکھ سکتی ہوں۔ دوائیں بند ہو جاتی ہیں تو خون جاری ہو جاتا ہے۔ میں بہت مجبور ہو گئی تھی، شیدے میں بہت مجبور ہو گئی تھی۔ اس لیے پھر فٹ پاتھ پر چلی گئی۔ بچھلے دو دن سے میں نے یہ بات سنے سے چھپا رکھی تھی۔ میں نے سوچا اگر میں دھوکہ دے کر ایک

قہر قہر کانپ رہا تھا۔ بیماری اور نقاہت کے باوجود اس کا چہرہ ایک دم سے سرخ ہو گیا تھا۔ آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر ابلتی نظر آ رہی تھیں پھر ایک جھٹکے سے اس نے سر جھکا کر خون کی تفریبا کر دی۔ بلارانی چیختی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

”نہیں! تم مجھے غلط نہ سمجھو، میں حرام کے پیسے نہیں لائی ہوں۔ میں نے یہ پیسے شیدے سے ادھار مانگے ہیں۔ شیدے تم خاموش کیوں کھڑے ہو؟“

”وہ مصلح الدین کے پاس سے دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور مجھے جھنجھوڑتی ہوئی کہنے لگی۔“

”شیدے خاموش نہ رہو۔ اسے بتاؤ کہ یہ پیسے تم نے دیئے ہیں۔ تم نہیں بولو گے تو میری ذیالٹ جائے گی۔ یہ کئی بار خون کی تفریبا کر چکا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اس کا مکمل علاج نہیں ہو گا تو یہ۔۔۔ یہ۔۔۔“

وہ میرے پاس سے دوڑتی ہوئی پھر مصلح الدین کے پاس آئی اور اس سے لپٹ کر کہنے لگی۔

”نہیں! میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔ دیکھو میں تمہارے لیے کتنی دوائیں لے کر آئی ہوں۔ میں نے مزدوری کی ہے سنے۔ میری مزدوری کی لاچ رکھ لو۔ میری مونا کے لیے اتنے ہو جاؤ۔“

ساری باتیں میری سمجھ میں آ گئی تھیں۔ میں مصلح الدین کے قریب جا کر اسے سمجھانے لگا کہ بیلا رانی سچ کہہ رہی ہے۔ اس کی دوائیں میرے پیسوں سے آئی ہیں۔ مونا اپنے باپ کے چہرے گردن اور نکیے پر گرے ہوئے لو کو پونچھ رہی تھی مگر تیرے کمان سے نکل چکا تھا۔ میرا جھوٹ اس کے آگے نہ بن سکا۔ اس نے پھر تفریبا کر دی بیلا رانی تڑپ کر اٹھ گئی۔ پھر چیخ کر بولی۔

”شیدے! جلدی سے ڈاکٹر کر بلاؤ۔ دیکھو ظالموں نے میرے سنے کا کیا حال بنا دیا ہے؟“

میں جلدی سے پاٹ کر ڈاکٹر کو بلانے کے لیے گھر سے باہر آ گیا۔ میرے پیچھے بیلا رانی بھی آ گئی۔ میں نے اس سے کہا۔

”تم مصلح الدین کو چھوڑ کر نہ آؤ۔ میں ابھی ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔“

میں نے اپنی جیبیں نکل کر پیسے نکالے۔ میرے پاس اٹھائیس روپے تھے میں نے وہ روپے اسے دیتے ہوئے کہا۔

”مونا یہاں اکیلی گھبرائے گی، میں یہاں رہتا ہوں تم یہ روپے لے کر جاؤ اگر دوائیں واپس نہ ہو سکیں تو تنی دوائیں خرید کر لے آنا۔“

وہ روپے لے کر چلی گئی۔ میں نے مونا کے پاس آکر اسے پیار سے پچکارتے ہوئے کہا۔

”چلو بیٹے تم کھانا کھاؤ۔ تمہاری امی دوائیں لینے مگی ہیں۔ اب تمہارے ابو اچھے ہو جائیں گے۔“

وہ باپ کے پاس سے اٹھ کر چٹائی پر آکر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے سامنے کھانے کی چیزیں رکھ دیں پھر اس کے پاس بیٹھ کر ہلکا لقمہ اپنے ہاتھ سے کھلایا۔ اس کے بعد وہ اپنے ہاتھ سے لقمے اٹھا کر آہستہ آہستہ کھانے لگی۔ میں لائین کی روشنی میں اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے شادی نہیں کی، میری کوئی اولاد نہیں ہے مگر وہ مجھے اپنے ہی جگر کا کٹورا نظر آ رہی تھی۔ بچے کھاتے وقت بھی کتے معصوم اور ہر فکر سے کتے آزاد نظر آتے ہیں۔ اس کی بے فکری نے مجھے دنیا جہان کی فکر میں مبتلا کر دیا۔ ٹیکسی نہیں تھی، رہزہ نہیں تھا، مصلح الدین بیمار تھا اور میں بیکار تھا مگر زندگی کی ضرورتیں جیج رہی تھیں۔ ابھی مزید دو اوں اور انجمنوں کے لیے، روٹی اور کپڑے کے لیے، مونا کی تعلیم کے لیے اور اس کی معصوم ہنسی کو دائم اور قائم رکھنے کے لیے، صبح و شام پیسوں کی ضرورت تھی۔ پیسے کہاں سے آئیں گے؟ اس گھر میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جسے فروخت کر کے کچھ دنوں کے لیے زندگی کو بھلایا جاسکتا تھا۔ میں ٹیکسی سے چھوٹ کر پیدل ہو گیا تھا اور ہم سب پیدل کتنی دور تک چل سکتے تھے؟

مصلح الدین اچانک کھانسنے لگا۔ میں دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا اور اس کے سینے کو سہلانے لگا۔ کھانسی کے دوران پھر اس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے ابل رہی تھیں۔ وہ وحشت زدہ نظروں سے اس اندھیری دنیا کو دیکھ رہا تھا۔ شاید اس اندھیرے میں وہ بیلا رانی کو تلاش کر رہا تھا اور انکار میں سر ہلاتے ہوئے رات کی رانی کو اندھیرے میں بھٹکنے سے روک رہا تھا۔ اس کے سر بھٹنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ خود مار ہے، بے حیائی کا ایک پیسہ قبول نہیں

شریف آدمی کو زندہ رکھ سکتی ہوں تو اس کی شرافت کو زندہ رکھنے کے لیے مجھے ذلالت برا تر آنا چاہئے۔ ہاں میں ذلیل ہوں۔ جب وہ اچھا ہو جائے گا تو میں اپنے آپ پر تھوکوں کی مگر ابھی اسے خون تھوکتے نہیں دیکھ سکتی۔“

وہ کتے کتے اس طرح ہانپنے لگی جیسے صدیوں کی مسافت طے کر کے آ رہی ہو۔ پھر وہ زرا دم لے کر بولی۔

”میں مصلے کے اعتبار کو قائم رکھنے کے لیے رات کو گھر سے نہیں نکل سکتی تھی اس لیے دن کو فٹ پاتھ پر آگئی۔ میں نے سوچا بنگاموں میں لوٹ مار کے دوران کوئی مجھے بھی لوٹ کر لے جائے گا تو کم از کم میں بیچتیں روپے میری پھٹیلی پر رکھ دے گا مگر لوٹ مار کے وقت جہاں سے کپڑوں کے تھان، ریڈیو اور ٹی وی سیٹ ہاتھ آ رہے ہیں وہاں پر اپنی مشین کو اٹھا کر کون لے جاتا ہے؟“

اس کی باتیں سن کر میں نے اس پر نظر ڈالی تو وہ واقعی کھنڈر نظر آئی۔ وہ بالکل میری ٹیکسی کی طرح تھی جس کے اندر سے لوگ اپنے کام کے کل پرزے نکال کر لے جا چکے تھے اور بچکے ہوئے ڈھانچے کو چھوڑ دیا تھا۔

جس ڈاکٹر سے وہ مصلح الدین کا علاج کر رہی تھی وہ نہیں ملا۔ ہم دوسرے ڈاکٹر کو لے کر آگئے۔ اس نے مصلح الدین کو دیکھتے ہی کہا۔

”اس کی حالت بہت نازک ہے اسے دونوں وقت انجکشن لگانے ہوں گے۔ میں جو دوائیں لکھ کر دے رہا ہوں انہیں فوراً لے کر آؤ۔“

بیلا نے اپنی لائی ہوئی دوائیں اسے دکھائیں۔ ایک ڈاکٹر دوسرے ڈاکٹر کے علاج اور اس کی تجویز کردہ دوؤں سے خشن نہیں ہوتا۔ اس نے ڈھیر ساری دوؤں میں سے صرف ایک دو کا کارآمد بتایا۔ باقی دوؤں کا نسخہ خود لکھ کر دیا۔ اپنی فیس اور انجکشن کے پندرہ روپے لیے اور تسلیاں دے کر چلا گیا۔

مصلح الدین آنکھیں بند کیے چپ چاپ لیٹا ہوا تھا۔ بیلا رانی نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا۔

”میں جو پیسے لائی تھی وہ دوؤں میں ختم ہو گئے اگر وہ دکاندار یہ دوائیں واپس لے کر نئی دوائیں دے دے گا تو میرا خیال ہے پیسوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

اوسے پونے فروخت کر کے مصلح الدین کے لیے کفن خرید سکتا تھا۔

اب میری جب میں اسے پیسے نہیں تھے کہ میں رکشے میں بیٹھ کر وہاں تک جاسکتا۔ مجبوراً بس میں بیٹھ کر جانا پڑا لیکن وہاں پہنچا تو ٹیکسی کا ڈھانچہ غائب ہو چکا تھا۔ وہ کہاں گیا؟ اس کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا کیونکہ اس علاقے میں آٹھ بجے کر فوٹو گئے والا تھا اور اب آٹھ بجنے ہی والے تھے۔ تمام کانٹیں بند ہو چکی تھیں۔ اکا دکا لوگ جرجھاگے جا رہے تھے وہ نہیں بتا سکتے تھے کہ میری مردہ ٹیکسی کہاں لے جا کر دفن کر دی گئی ہے۔

میں بارہ بجپتہ تا کرواپس آیا۔ اس وقت تک بیلارانی کو ہوش آیا تھا کہ مصلح الدین کو مرنے کے بعد بھی پیسوں کی ضرورت ہے۔ جب تک پیسے نہیں ہوں گے تجبیڑ و ٹھٹھن کی رسیمیں ادا نہیں ہو سکیں گی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اپنی بساط بھر کر شش کرچکا ہوں کہیں سے پھولی کوڑی بھی حاصل نہیں ہوئی۔ اگر تین گھنٹے کے اندر ہم کفن وغیرہ خرید نہ لاسکے تو اس کے بعد کر فوٹو لگ جائے گا۔ کر فوٹو کے اوقات میں بھی مردے کو دفن کرنے کے لیے ختم بھی اپنا نہ مل جاتی ہے لیکن پہلے سے کفن وغیرہ خرید لینا ضروری ہے۔

تجربہ کیا ہو گا؟" بیلارانی پریشان ہو کر مصلح الدین کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ زندگی کے تمام مسائل سے نجات حاصل کر چکا تھا مگر بیلارانی کے لیے مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ محلے بدوس محلے سے مدد مانگنے چلی گئی۔ میں بھی باہر نکل کر کچھ کو شش کرنا چاہتا تھا مگر موتا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چاچا! مجھے ڈر لگتا ہے مجھے چھوڑ کر مت جائیے۔"

میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ ایک لاش کے ساتھ تنہا کمرے میں نہیں رہ سکتی تھی۔ بڑی عمر کی عورتیں بھی اپنے سگوں کی لاش کے قریب تنہا بیٹھتے ہوئے ڈرتی ہیں اور موتا کی ابھی عمر ہی کیا تھی وہ تو بچی تھی۔ زندگی کا تجربہ بس اتنا ہی تھا کہ اس نے پہلی بار اپنے گھر میں ایک انسان کو خون تھوک کر مرتے دیکھا تھا۔

میں اسے چھوڑ کر نہ جاسکا۔ ایک گھنٹے کے بعد جب ان ناناں ہاتھ داپر پہنچے اور اپنے آپٹیل سے آنسو پونچھتی ہوئی کہنے لگی۔

"سب اپنی اپنی پریشانیوں کا رونا رو رہے ہیں۔ سب ہی یہ کہتے ہیں کہ یہ ہنگامے ختم نہیں ہوں گے اسی لیے ہر ایک کو کل کی فکر ہے۔ ایسے میں کون دو چار روپے کی مدد کرنا

کرے گا۔

وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے کھانسنے کھانسنے پھر خون کی قے کی اور ایک دم سے ساکت ہو گیا۔ میں نے گھبرا کر اس کی نبض دیکھی۔ کان رکھ کر اس کے دل کی دھڑکتوں کو سننے کی کوشش کی مگر کچھ سنائی نہ دیا۔ بیلارانی کے لیے دھڑکنے والا دل بیشک کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ پتہ نہیں موتا نے میرے چہرے کو کیسے پڑھ لیا، وہ کھانا چھوڑ کر دوڑتی ہوئی آئی۔

"چاچا جی! کیا ہو گیا ابو کو؟ ابو پھر خاموش ہو گئے؟"

وہ باپ کے بتے ہوئے لہو کو پونچھنے لگی اور اسے آوازیں دینے لگی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ وہ اس کی آوازوں سے بہت دور چلا گیا ہے تو وہ باپ کے چہرے کو اپنے سینے سے لگا کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اسی وقت بیلارانی کمرے میں داخل ہوئی۔ میری آنکھیں خشک تھیں کیونکہ یہ چہرہ ملی آنکھیں رونا نہیں جانتیں مگر بیٹی کو ماتم کرتے دیکھ کر اس کے ہاتھوں سے دواڑیں چھوٹ گئیں۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سر کو جھکا لیا۔ وہ دوڑتی ہوئی آکر مصلح الدین کی لاش پر گر پڑی۔

کمرے کی میز و دفنا مال اور بیٹی کی آہ دیکا سے گونج رہی تھی۔ محلے کے بدوس والے تھوڑی دیر میں آنے لگے۔ عورتوں نے آکر افسوس کا اظہار کیا۔ مہر کی تلقین کی۔ پھر واپس چلی گئیں کیونکہ بارہ بجے سے کر فوٹو گئے والا تھا۔ سبھی کو کل شام تک کے لیے روٹی کی فکر کرنی تھی۔ کچھ لوگ محلے کے دو آدمیوں کی لاشیں لے کر آئے تھے جو ہنگامے میں مارے گئے تھے۔ ان کے کفن و دفن کے لیے چندہ لیا جا رہا تھا۔ مجھے بھی خیال آیا کہ پاس بھی پھولی کوڑی نہیں ہے اور مصلح الدین کی تجبیڑ و ٹھٹھن کا مسئلہ درپیش ہے۔ میں نے بیلارانی کو دیکھا اسے روتے اور بین کرتے وقت کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ وہ ہوش و حواس میں رہتی تب بھی اس کے پلے سے کچھ نہ ٹھٹھا کیونکہ اس کے پاس کچھ ہوتا تو وہ دواؤں کے لیے مجھ سے پیسے لے کر نہ جاتی۔

میں پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ دور دور تک خیالی دوڑ لگائی کہ کسی جان پہچان والے سے کچھ رقم ادا حاصل کی جاتی ہے یا نہیں؟ مگر ایسے وقت کوئی مہربان نظر نہ آیا۔ میں گھبرا کر مکان سے باہر آیا۔ باہر آتے ہی یاد آیا کہ ابھی میری ٹیکسی کا ڈھانچہ راستے میں پڑا ہو گا میں اسے

آجائیں گے۔ کیا تمہارے پاس دواؤں میں سے کچھ پیسے بچے ہیں؟“

”تمہارے اٹھائیس روپے میں سے صرف آٹھ روپے رو گئے ہیں۔ کیا آنے جانے کا کرایہ ہو جائے گا؟“

”چلو جانے کا کرایہ تو ہو جائے گا۔ واپسی میں ہم مصلح الدین کے والدین کے ساتھ آئیں گے۔“

میں مونا کا ہاتھ تھام کر باہر آگیا۔ بیلا رانی نے دروازے پر آکر مصلح الدین کی لاش پر الوداعی نظر ڈالی۔ وہ اسے تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی مگر مجبوری تھی۔ اس نے دروازے کو بند کر کے باہر سے تالا ڈال دیا۔ پھر ہم رکشے کی تلاش میں چل پڑے۔ ابھی سڑکوں پر لوگوں کی آمد رفت تھی۔ دوسرے دن شام تک گھروں میں بند رہنے کے لیے ضروری سامان کی خرید و فروخت ہو رہی تھی۔ ہمیں جلد ہی رکشہ مل گیا۔ ہم تین افراد کو رکشے میں بٹھانے کے لیے اس نے میز سے ایک روپیہ زیادہ لیا اور ہمیں رنجھوڑ لائن تک پہنچایا۔

سیاسی ہنگاموں کے دور ان رنجھوڑ لائن ایک ایسی جگہ تھی جہاں ہنگامے نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی کرنیو کی پابندیاں عائد کی جاتی تھیں۔ وہاں راتوں کو بھی اچھی خاصی رونق رہتی تھی۔ وہاں قانون سے کھیلنے والوں نے شراب، جوئے اور وی سی آر پر بھارتی فلمیں دکھانے کے اڈے قائم کر رکھے تھے اور عیاش طبع لوگ عورتوں کی تلاش میں سڑکوں پر بھٹکتے رہتے تھے ہم مصلح الدین کے گھر پہنچے تو کوٹھی کے چوکیدار نے بتایا کہ صاحب لوگ لاہور چلے گئے ہیں ہنگامے ختم ہونے کے بعد واپس آئیں گے۔

میں اور بیلا رانی ایک دوسرے کا ہاتھ تھکنے لگے۔ ہم پورے یقین کے ساتھ وہاں گئے تھے کہ والدین اپنی نافرمان اولاد سے کتنی ہی نفرت کریں مگر آخری بار اس کا دیدار ضرور کرتے ہیں اور تجنیزو تکفین کی آخری رسوم بھی ادا کرتے ہیں لیکن ہم مصلح الدین کے والدین تک اس کے مرنے کی خبر بھی نہیں پہنچا سکتے تھے۔

ہم باپس ہو کر وہاں سے لوٹ گئے۔ واپسی کے لیے پورا کرایہ نہیں تھا مونا میرے بازو سے لگی چل رہی تھی۔ اس نئی نسل کے ساتھ چلتے وقت احساس ہوا کہ میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں اور ہر طرف سے اتنا ٹوٹ چکا ہوں کہ ایک جوان ہونے والی بیٹی کا بھی سارا

ہے؟ اور کیا دو چار روپے میں کہیں کفن آتا ہے؟ ہم کتنے دروازوں پر جا کر کفن کے لیے چندہ مانگ سکتے ہیں۔ یہاں پہلے ہی دو لاشوں کے لیے چندہ اکٹھا کیا جا رہا ہے اور یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ جس شخص نے میرے اور میری بیٹی کے لیے اپنا گھر چھوڑ دیا اپنے خون کے رشتے توڑ دیئے، میری زندگی کا راستہ موڑ دیا، ہمارے لیے فٹ پاتھ پر رٹھو لگا تا رہا اور پولیس والوں سے کبھی مار کھانا رہا اور کبھی انہیں رشوت دے کر ہمارے لیے آوازیں لگا کر چھل پچھتا رہا، اب وہاں سے خون تھوکتا ہوا آکر صرف ایک کفن کا مطالبہ کر رہا ہے۔ زندگی میں کچھ نہیں مانگا مرنے کے بعد مانگ رہا ہے تو کیا میں اسے چندے یا خیرات کا کفن پہناؤں؟“

یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے کہا۔

”یہ آنسو زندگی میں کچھ نہیں دیتے، کسی کے مرنے کے بعد کیا دیں گے؟ صرف پیسہ ہی سب کچھ دیتا ہے۔ اب یہی ایک راستہ رہ گیا ہے ہم مصلح الدین کے والدین تک یہ خبر پہنچائیں۔“

بیلا رانی نے سر اٹھا کر آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر بڑے کرب سے بولی۔

”ہائے، میں اپنے منہ کے آخری وقت بھی کام نہ آسکی۔ تم ٹھیک کہتے ہو اس کے والدین کو معلوم ہو گا تو اسے عزت سے کفن نصیب ہو گا۔ اس کے ماں باپ رنجھوڑ لائن میں رہتے ہیں۔ تم میرے ساتھ چلو ہم ایک گھنٹے میں انہیں لے کر یہاں آجائیں گے۔“

”میں تمہارے ساتھ کیسے جاسکتا ہوں؟ یہاں مونا اکیلی نہیں رہے گی۔“

وہ پریشانی سے مونا کو دیکھ کر بولی ”میں بھی تنہا نہیں جاسکتی۔ جگہ جگہ فوج کے سپاہی راستہ روک کر پوچھیں گے کہ میں کس نیت سے اتنی رات کو تنہا گھوم رہی ہوں؟“

وہ تنہا نہیں جاسکتی تھی۔ مونا کو بھی تنہا نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ وہ پہلے ہی لاش کے پاس سے ہر آکر میرے پاس آگئی تھی۔ میں نے کہا۔

”ہم تینوں ساتھ چلیں گے۔ لاش تیار ہوا سکتی ہے۔ ہم دروازے کو باہر سے بند کر دیں گے۔ صرف گھنٹے آٹھ گھنٹے کی بات ہے اگر ہم رکشے میں جائیں گے تو جلدی واپس

نہیں بن سکتا۔ پیلا رانی یوں بڑبڑاتی جا رہی تھی جیسے ہوش و حواس کھو چکی ہو۔  
 ”میرا محلے کیوں مر گیا؟“ وہ سوال کر رہی تھی اور خود ہی جواب دے رہی تھی ”اس  
 لیے مر گیا کہ وہ خود دار تھا۔ اپنی زندگی میں وہ حرام کا ایک پیسہ بھی قبول نہیں کرنا چاہتا تھا۔“  
 ہم ایک گلی سے نکل کر سڑک پر آ گئے اور ایک تھلے کے پاس نیم تاریکی میں کھڑے  
 ہو گئے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم کہاں جائیں اور کیا کریں؟ وہ بدستور بڑبڑا رہی  
 تھی۔

اس کے بڑبڑانے کے دوران دو شرابی لڑکھڑاتے ہوئے آئے اور ہم سے ذرا دور رک  
 کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں نیم تاریکی میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ اچانک ہی  
 پیلا رانی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح ہمارے درمیان سے نکلی اور ان کے سامنے پہنچ  
 گئی۔ وہ دونوں نشے میں تھے۔ انہیں نئے اور پرانے مال، تازہ اور باسی کھانے کی پہچان نہیں  
 تھی نشے کی حالت میں وہ پیلا رانی کی عمر کا حساب نہیں کر سکتے تھے اس لیے خوش ہو کر سودا  
 کرنے لگے۔

اسی وقت ایک اسکوٹر موٹر گاڑی کا دھماکا ہوا وہاں سے گزرا۔ اس کی ہیڈ لائٹ کی روشنی مجھ پر  
 سے ہوتی ہوئی موٹا پر سے چمچھلتی ہوئی اور نیم تاریکی میں ایک کلی کے حسن کو اجاگر کرتی  
 ہوئی گزر گئی۔ اچانک ہی سودا کرنے والوں کو نئے اور پرانے کی پہچان ہو گئی۔  
 وہ جھپکے ہوئے ڈھانچے کو ایک طرف دھکا دیتے ہوئے نئی ٹیکسی کے سامنے کھڑے  
 ہو گئے۔ چشم زدن میں ایک کلی اپنی شاخ سے ٹوٹ کر طوفانی ہواؤں کی زد میں ادھر سے ادھر  
 ہوتی نظر آئی تو پہلی بار زندگی میں پہلی بار میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔  
 اب کس کے لیے بے حیائی کا کفن خریدنا تھا۔ ایک خود دار انسان کے لیے ایک  
 مرجھائے ہوئے پھول کے لئے یا ایک معصوم نوخیز کلی کے لئے۔؟

